کلیاتِ پریم چند

20



مُرتبہ
مدن گوپال

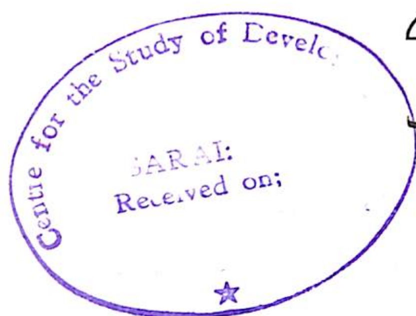
قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی





کلیاتِ پریم چند

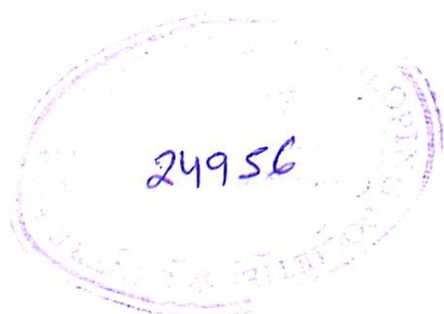
20



متفرقات

مرتبہ

مدن گوپال





قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)
ویسٹ بلاک 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066

Kulliyat-e-Premchand-20

Edited by : Madan Gopal

Project Assistant : Dr. Raheel Siddiqui

سنہ اشاعت : جنوری، مارچ 2003 شک 1924

پہلا اڈیشن : 1100

قیمت : =/167

سلسلہ مطبوعات : 1072

کمپوزنگ : اردو بک ریویو، نئی دہلی 110002

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر.کے.پورم، نئی دہلی 110066

طابع : لاہوتی پرنٹ ایڈز، 1397 پہاڑی املی، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی 110006

پیش لفظ

ایک عرصے سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ پریم چند کی تمام تصانیف کے مستند اڈیشن منظرِ عام پر آئیں۔ قومی اردو کونسل پریم چند کی تمام تحریروں کو ''کلیاتِ پریم چند'' کے عنوان سے 22 جلدوں میں ایک مکمل سیٹ کی صورت میں شائع کررہی ہے۔ ان میں ان کے ناول، افسانے، ڈرامے، خطوط، تراجم، مضامین اور اداریے بہ اعتبار اصناف یکجا کیے جارہے ہیں جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے :

ناول : جلد 1 سے جلد 8 تک، افسانے : جلد 9 سے جلد 14 تک،

ڈرامے : جلد 15 و جلد 16، خطوط : جلد 17،

تراجم : جلد 18 و جلد 19، متفرقات (مضامین اور اداریے) : جلد 20 سے جلد 22 تک

''کلیاتِ پریم چند'' میں متون کے استناد کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ مواد کی فراہمی کے لیے اہم کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ حسبِ ضرورت پریم چند کے ماہرین سے بھی ملاقات کرکے مدد لی گئی ہے۔

کلیات کو زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ سن اشاعت اور اشاعتی ادارے کا نام شائع کرنے کا التزام بھی رکھا گیا ہے۔

''کلیاتِ پریم چند'' کی یہ جلدیں قومی اردو کونسل کے ایک بڑے منصوبے کا نقش اوّل ہیں۔ اس پروجیکٹ کے تحت اردو ادب کے ان ادبا و شعرا کی کلیات شائع کی جائیں گی جو کلاسیکی حیثیت اختیار کرچکی ہیں۔ پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے کی اس پہلی کاوش میں کچھ خامیاں اور کوتاہیاں ضرور راہ پاگئی ہوں گی۔ اس سلسلے میں

قارئین کے مفید مشوروں کا خیر مقدم ہے۔

آئندہ اگر پریم چند کی کوئی تحریر/ تحریریں دریافت ہوتی ہیں، آئندہ ایڈیشنوں میں ان کو شامل کیا جائے گا۔

اردو کے اہم کلاسیکی ادبی سرمایے کو شائع کرنے کا منصوبہ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ان ادبی متون کے انتخاب اور ان کی اشاعت کا فیصلہ قومی اردو کونسل کے ادبی پینل نے پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کی سربراہی میں کیا۔ ادبی پینل نے اس پروجیکٹ سے متعلق تمام بنیادی امور پر غور کرکے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے میں ہماری رہنمائی کی۔ قومی اردو کونسل ادبی پینل کے تمام ارکان کی شکر گزار ہے۔ "کلیاتِ پریم چند" کے مرتب مدن گوپال اور پروجیکٹ اسسٹنٹ ڈاکٹر رحیل صدیقی بھی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے اور انھیں ترتیب دینے میں بنیادی رول ادا کیا۔

امید ہے کہ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی دیگر مطبوعات کی طرح "کلیاتِ پریم چند" کی بھی پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند،
نئی دہلی

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
	دیباچہ	VII
1۔	ہاتھی دانت	1
2۔	کرشن کنور	10
3۔	آئین قیصری اور محاربات عظیم	19
4۔	خاندان مشترکہ	32
5۔	دیسی اشیاء کو کیوں کر فروغ ہوسکتا ہے	39
6۔	سوانح عمری ملکہ معظّمہ وکٹوریا	44
7۔	راجہ ٹوڈرمل	50
8۔	اکبر اعظم	58
9۔	راجہ مان سنگھ	73
10۔	آنریبل گوپال کرشن گوکھلے	81
11۔	ڈرامہ جنگ روس و جاپان	97
12۔	حال کی بعض کتابیں	101
13۔	شرر و سرشار	108
14۔	حال کی بعض کتابیں	123
15۔	رانا پرتاپ	136
16۔	فن تصویر	150
17۔	اردو زبان اور ناول	158
18۔	گیری بالڈی	166
19۔	ٹامس گینس برو	180
20۔	تنقید (حال کی بعض کتابیں)	196
21۔	سوامی دیویکا نند	204

22- ترکی میں آئینی سلطنت 222

23- دارا شکوہ کا دربار 225

24- رینالڈس 240

25- صوبہ متحدہ میں ابتدائی تعلیم 252

26- زلیخا 260

27- جون آف آرک 278

28- گالیاں 286

29- کلام اکبر پر ایک نظر 293

30- رہنمایانِ ہند 314

31- ہندوستانی مصوری 328

32- رنجیت سنگھ 337

33- ہندو وفن حکمت 347

34- ہندو تہذیب اور رفاہ عام 354

35- رامائن اور مہا بھارت 364

36- قدیم ہندو علم ریاضی 368

37- کلا بھون 375

38- قیس 381

39- بھارتندو بابو ہریش چندر 395

40- ڈاکٹر سر رام کرشن بھنڈارکر 403

41- ہندوستانی ریلوں کی تاریخ 411

42- مقدمہ۔ اکسیر سخن 416

43- کالی داس کی شاعری 433

44- کلا 446

45- سرور اور شاکر کے خطوط (اکسیر سخن کے بارے میں) 447

46- سرور اور شاکر 460

دیباچہ

منشی پریم چند پہلے اردو ادیب ہیں جنھوں نے اردو ادب میں ہندوستان کی عام زندگی کی ترجمانی کی۔ ان کی تحریریں ایک سماجی معنویت رکھتی ہیں۔ انھوں نے آزادی حب الوطنی اور انسانی دوستی کو اپنی تصانیف کا موضوع بنایا۔

پریم چند کے ناولوں اور افسانوی کو شہرت ملی۔ مگر ان کے اردو صحافت سے مسلسل چھتیس سالوں کے تعلقات کو محققین نے اتنی اہمیت نہیں دی جتنی ضرورت تھی۔

پریم چند نے اندر ناتھ مدان کو ایک خط میں لکھا تھا کہ وہ کبھی جرنلسٹ نہیں رہے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اپنے ہی خط میں پریم چند نے یہ بھی لکھا تھا کہ ''جب میں سرکاری ملازم تھا تو فرصت کے وقت کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا تھا۔ میرا پہلا مضمون ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا اور پہلا ناول ۱۹۰۳ء میں۔'' ان کے پہلے مضمون کا موضوع کیا تھا اور یہ کہاں شائع ہوا اس کی جانکاری آج دستیاب نہیں ہے۔ سن ۱۸۹۹ء میں وہ ایک اسکول میں ماسٹر ہوگئے تھے۔ چنار سے 'اخبار چنار' نام کا ایک رسالہ نکلتا تھا۔ اس کے مدیر ایک نامی صحافی بال مکند گپت تھے جو یہاں سے چھٹی ملنے کے بعد لاہور کے مشہور اخبار کوہ نور کے مدیر ہوگئے تھے۔ یہ اخبار ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا کرتا تھا۔ اس کی فائلیں تو اب دستیاب نہیں ہیں مگر نیشنل آرکائیوز کی ''نیٹو نیوز پیپرز'' کی فائلوں میں اس رسالہ کا ذکر ملتا ہے۔ پریم چند کا رجحان صحافت کی طرف تھا اور قیاس کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اس رسالہ سے ضرور تعلق پیدا کیا ہوگا۔

اب تک کی معلومات کے مطابق دھنپت رائے کا پہلا مضمون تھا آلیور کروم ویل۔ یہ بنارس کے آواز خلق کے 4-9-03 کے شمارے میں شائع ہوا تھا (اسی رسالہ میں اسرار معابد کی پہلی چار قسطیں شائع ہوئی تھیں)اس رسالہ میں سودیشی تحریک پر ایک

مضمون بھی شائع ہوا۔ رسالہ آزاد (لاہور) میں اتفاق طاقت ہے۔ اور زمانہ (کانپور) میں دیشی اشیاء کو کیوں کر فروغ ہوسکتا ہے۔ خاندان مشترکہ پر مضمون مولانا حضرت موہانی کے اردو معلیٰ میں شائع ہوا۔ ان سب مضامین کا اشارہ ان کی حب الوطنی کی طرف ہے

کلیات کی افسانوں سے تعلق رکھنے والی جلدوں میں بتلایا گیا ہے کہ بیسویں صدی کے شروع میں انگریزی سرکار کی نظروں میں کسی بھی ہندوستانی کے دل میں حب الوطنی کا جذبہ سیڈیشن کی نشانی تھا۔ جب ہمیر پور کے برٹش کلکٹر کو پتہ چلا کہ ان کے علاقہ کے ایک اسکول ماسٹر دھنپت رائے نے سوز وطن نام کی ایک کتاب لکھی ہے جس میں حب الوطنی کے پانچ افسانے شائع ہوئے ہیں تو دھنپت رائے کو طلب کیا گیا۔ کلکٹر صاحب نے پوچھا کیا مصنف نواب رائے کے نام سے یہ کتاب سوز وطن تم نے لکھی ہے۔ دھنپت رائے نے قبول کیا ''صاحب نے ایک ایک کہانی کا مطلب پوچھا اور آخر میں بگڑ کر کہا تمھاری کہانیوں میں سیڑیشن بھرا ہوا ہے۔ اپنی خوش قسمتی سمجھو کہ انگریزی راج میں ہو۔ اگر مغلوں کا راج ہوتا تو تمھارے دونوں ہاتھ کاٹ دیے جاتے۔ تم نے انگریزی راج کی ہتک کی ہے۔'' فیصلہ یہ ہوا کہ ''سوز وطن کی ساری جلدیں سرکار کے حوالے کردو اور صاحب کی اجازت کے بغیر کچھ نہ لکھوں۔ میں نے سوچا چلو سستے چھوٹے۔ ایک ہزار کاپیاں چھپی تھیں، ابھی مشکل سے تین سو بکیں تھیں۔ باقی سات سو کاپیاں میں نے زمانہ پریس سے منگوا کر صاحب کی خدمت میں پیش کردیں۔ میں نے سوچا تھا بلا ٹل گئی۔ مگر افسروں کی اتنی آسانی سے تسلی نہ ہوسکی۔''

یہ واقعہ ۹-۱۹۰۸ء کا ہے کچھ ہی دن پہلے دھنپت رائے نے ایک مضمون ''زمانہ'' کو بھیجا تھا جس کا عنوان تھا ''صوبۂ متحدہ میں پرائمری تعلیم۔'' اس مضمون میں بھی حب الوطنی کا جذبہ غالب تھا۔ زمانہ میں مئی ۱۹۰۹ء کے شمارے میں شائع اس مضمون میں نواب رائے نے مشہور صحافی سنت نہال سنگھ کے کلکتہ کے ماڈرن ریویو میں شائع مضمون کو لے کر صوبہ متحدہ میں پرائمری اسکولوں کی خستہ حالت پر افسوس ظاہر کیا تھا۔ نواب رائے نے لکھا تھا۔ ''اسے پڑھ کر ہمیں حیرت بھی ہوئی اور مایوسی بھی۔ حیرت اس لیے کہ تہذیب کی جو آسانیاں اور اسباب امریکہ کے اس گاؤں میں ہیں، وہ ہندوستان

کے بڑے بڑے شہروں کو نصیب نہیں ہیں اور مایوسی اس لیے کہ شاید ہندوستان کی قسمت میں ترقی کرنا لکھا ہی نہیں ہے۔ دو ہزار آبادی کا موضع اور اس کی عمارات، اس کے کتب خانے، اس کی لیبوریٹری پر ہندوستان کا کوئی کالج ناز کرسکتا ہے۔ ہندوستان کے بھی کبھی ایسے نصیب ہوں گے؟''

صوبۂ متحدہ کے تعلیم کے محکمے کے افسروں نے نواب رائے کے اس مضمون کو پڑھا تو اس کے مصنف کو وارننگ دینے کی کاروائی شروع ہوئی۔ دھنپت رائے عرف نواب رائے کو بتلایا گیا کہ کلکٹر صاحب نے جو روک لگائی تھی وہ صرف افسانوں پر نہیں ہر طرح کی تصنیفات پر تھی۔

۱۳رمئی ۱۹۰۹ء کے خط میں دھنپت رائے نے دیا نرائن نگم کو لکھا ''دوبارہ یاد دہانی ہوئی ہے کہ تم نے معاہدہ میں گو اخباری مضامین نہیں لکھے مگر اس کا نشانہ ہر قسم کی تحریر سے تھا۔ گویا میں کوئی مضمون خواہ کسی موضوع پر ہاتھی دانت پر ہی کیوں نہ لکھوں مجھے پہلے جناب فیضیاب کلکٹر صاحب بہادر کی خدمت میں پیش کرنا پڑے گا یہ تو میرا روز کا دھندا ٹھہرا۔ ہر ماہ ایک مضمون صاحب والا کی خدمت میں پہنچے گا تو وہ سمجھیں گے میں اپنے فرائض سرکاری میں خیانت کرتا ہوں اور زیادہ کام میرے سر تھوپا جائے گا۔''

نگم کو یہ بھی عرض کیا گیا کہ جب میرے مضمون کی کتابت ہوجائے تو مسودہ کو جلا دیا جائے۔ مارچ ۱۹۱۰ء کے زمانہ میں ایک افسانہ ''گناہ کا اگنی کنڈ'' شائع ہوا۔ مصنف کا نام دیا گیا۔ ''افسانہ کہن'' پانچ مہینے بعد نواب رائے کا ایک افسانہ رانی سارندھا شائع ہوا،منصف کا نام نہیں دیا گیا۔

اپنے خط میں دیا نرائن نگم کو صاف لکھا تھا ''کچھ دنوں کے لیے نواب رائے مرحوم ہوئے۔ ان کے جانشین کوئی اور صاحب ہوں گے۔''

نگم نے دوسرا قلمی نام ''پریم چند'' دیا۔ اکتوبر ۱۹۱۰ء نگم کو لکھا ''پریم چند اچھا نام ہے۔ مجھے بھی پسند ہے۔ افسوس صرف یہ ہے کہ پانچ چھ سال میں نواب رائے کو فروغ دینے کی جو محنت کی گئی وہ سب بیکار ہوگئی یہ حضرت قسمت کے ہمیشہ لنڈرے رہے اور شاید رہیں گے۔''

ایک دلچسپ بات یہ ہے جس موضوع (خواہ ہاتھی دانت ہی کیوں نہ ہو) کا ذکر دھنپت رائے نے نگم کو لکھے خط میں کیا، اسی موضوع پر ایک مضمون نواب رائے کے نام سے علی گڑھ کے اردو معلیٰ میں شائع ہوچکا تھا۔ یہ کسی مجموعہ میں شامل نہیں کیا گیا۔ کلیات کی اس جلد میں پیش ہے۔ دھنپت رائے لاہور کے آزاد اور علی گڑھ کے اردو معلیٰ میں تو لکھتے ہی تھے جب کوئی نیا رسالہ نکلتا وہ اس میں لکھنا شروع کردیتے۔

الٰہ آباد سے ادیب نکلا، لاہور سے کہکشاں اور تہذیب نواں اور پھول، ہمایوں بھی، لکھنو سے الناظر اور صبح امید۔ نواب رائے کے نام سے وہ رسائل میں بھی لکھتے، مگر عام طور پر انھیں افسانے ہی بھیجتے تھے۔ زمانہ جو کانپور سے ۱۹۰۳ء میں شروع ہوا اس میں وہ مسلسل لکھنے لگے۔ اس کے مدیر دیا نرائن نگم سے پریم چند کے نزدیکی تعلقات ہوگئے۔ گو نگم ان سے دو سال چھوٹے تھے مگر پریم چند ان کی بڑے بھائی کی طرح عزت کرتے تھے۔ جب نگم نے آزاد نکالنا شروع کیا تو وہ اس میں بھی لکھنے لگے۔

نگم سے ان کا تعلق اتنا گہرا تھا کہ انھوں نے ۱۹۰۶ء میں زمانہ میں اعلان شائع کردیا کہ نواب رائے اب زمانہ کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل ہوگئے ہیں۔ زمانہ اور آزاد کے لیے وہ ایک کالم رفتار زمانہ بھی لکھتے تھے۔

دھنپت رائے کی تمنا تھی کہ نگم کی طرح ان کا بھی اپنا پریس ہو۔ اپنا رسالہ ہو اور پبلشر کا کام کریں۔ جب دیا نرائن نگم نے پوچھا۔ کیا وہ جنگ اخبار کے مدیر بننا چاہیں گے تو انھوں نے انکار کردیا۔ یہ کام جنگ کے سلسلے میں اردو اخبار کا تھا جس کا مطلب تھا مترجم کا کام۔ دھنپت رائے کے مطابق مدیر کا کام بہت ذمہ دارانہ ہونا چاہیے۔ ایک افسانہ میں انھوں نے اس کی تشریح کی اور لکھا ''اخبار کا ایڈیٹر ہمیشہ قوم کا غلام ہوتا ہے اور وہ جو کچھ دیکھتا ہے تو وسیع النظری سے اور جو کچھ سوچتا ہے، اس پر قومیت کی مہر لگی ہوتی ہے۔ ہمیشہ قومی خیالات کے وسیع فضا میں گھومتے رہنے سے شخصی اہمیت کا دائرہ اس کی نگاہ میں تنگ ہوجاتا ہے۔ اور وہ شخصیت کا حقیر اور ناقابل توجہ خیال کرنے لگتا ہے۔ شخصیت کو قومیت پر قربان کرنا اہم ترین ہے۔ حتی کہ اکثر وہ اپنی ذات قوم پر نچھاور کردیتا ہے۔ اس کی زندگی اقتضا کا موقع عظیم اور اس کا معیار،

پاکیزہ ہوتا ہے۔

جب پریم چند نے ۱۹۲۱ء میں سرکاری عہدے سے استعفیٰ دیا تو گورکھپور سے ایک اردو اخبار نکالنا چاہتے تھے مگر وہاں سے ایک پرانے اخبار نے دوبارہ اشاعت کا اعلان کردیا۔ پریم چند نے بعد میں بنارس میں اپنا سرسوتی پریس لگایا۔ اس میں صرف ہندی کا کام شروع کیا۔ اردو میں بھی اشاعت کا ارادہ تھا۔

اس سے قبل پریم چند اردو میں ہی لکھتے تھے۔ حالانکہ ہندی ادب اور صحافت سے ان کا تعلق نزدیکی تھا۔ ہم خرما ہم ثواب کا ہندی ترجمہ پریما کے عنوان سے کیا۔ جب 'سوزِ وطن' شائع ہوئی تو ایک کاپی ہندی کے مشہور رسالہ سرسوتی کے ایڈیٹر کو تبصرے کے لیے بھیجی۔ ایک بار نگم کو لکھا کہ وہ انھیں زمانہ کے ہندی ایڈیٹر سمجھ لیں۔ یہی نہیں بھارتندو ہرشچندر، کشیو، بہاری، کالی داس وغیرہ پر مضامین بھی لکھے۔ کچھ مضامین اس شمارے میں شامل ہیں۔ ہندی فن حکمت قدیم علم ہندو ریاضی تہذیب اور رفاہ عام وغیرہ پر مضامین شائع ہوئے۔ سودیشی تحریک اور زراعتی ترقی کیسے ہوسکتی ہے ان پر بھی پریم چند کو سیاست میں بڑی دلچسپی تھی۔ روس اور جاپان میں جنگ، ترکی میں آئین، پلیٹو کی ریپبلک کا تبصرہ وغیرہ۔ تاریخ میں خاص دلچسپی تھی، تاریخ وہ پڑھاتے بھی تھے۔ ان کا مضمون والیور کرام ویل اور دارا شکوہ کا دربار دونوں مضامین اس شمارے میں شامل ہیں۔ ادب، شاعری، آرٹ، مصوری پر مضامین لکھے مگر سوانحی مضمونوں کی اہمیت زیادہ تھی۔ کیوں کہ پریم چند کا عقیدہ تھا کہ حب الوطنی کو بڑھانے کے لیے مشہور تنظیموں کے کارکنوں کی سوانح پیش کی جائیں۔ مان سنگھ، ٹوڈرمل، رانا پرتاب، رانا جنگ بہادر، رنجیت سنگھ، گوپال کرشن بھنڈارکر، گوکھلے وغیرہ۔ کچھ سوانحی مضامین باکمالوں کے درشن کے عنوان سے ٹیکسٹ بک کمیٹی کو پیش کی گئی تاکہ یہ اسکول کی جماعتوں کے لیے منظور ہو۔ جب یہ منظور نہیں ہوئی تو سوچا شاید اس لیے کیونکہ اس میں مسلمان مشاہیر نہیں تھے۔ کچھ مشاہیر کی جگہ سید احمد خاں، بدر الدین طیب جی، عبدالحلیم شرر اور وحید الدین سلیم کی سوانح کو شامل کیا گیا۔ یہ کتاب منظور ہوئی اور کئی سال تک اسکولوں میں پڑھائی جاتی رہی مگر اب اس کی کوئی کاپی دستیاب نہیں ہوسکی۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کی مدد سے ان سوانحوں کو اکٹھا کیا جاسکا۔ انھیں اس شمارے میں شامل کیا

گیا ہے۔

پریم چند کے اردو میں مضامین کا سلسلہ ان کی وفات تک چلتا رہا۔ وفات سے کچھ ماہ قبل انھوں نے ترقی پسند ادیبوں کی لکھنؤ میں کانفرنس میں صدریہ ایڈرس اردو میں پیش کیا تھا۔ وفات سے ایک ماہ قبل مہاجنی تمدن پر ایک مضمون کلیم میں لکھا۔ مگر سرکاری نوکری سے استعفیٰ دینے کے بعد وہ زیادہ تر ہندی میں لکھتے تھے۔

ہندی میں مضامین کی شروعات تو کانپور کے مشہور اخبار پرتاب سے ہوئی تھی۔ بعد میں رسالہ مریادا کے مدیر رہے۔ ۱۹۲۷ء میں انھیں ماہنامہ مادھوری کا معاون مدیر تعینات کیا گیا پھر انھوں نے اپنا ماہوار ہنس نکالا جو سرسوتی پریس سے شائع ہوا۔ تین سال بعد جاگرن بھی نکالنا شروع کیا۔ ان سارے ہی رسائل میں پریم چند مضامین ایڈیٹوریل نوٹس، تبصرے وغیرہ لکھتے رہے۔ ان کا صحافتی وقفہ چھتیس برسوں کا ہے۔ پریم چند کے چھوٹے فرزند امرت رائے نے مختلف رسائل کی پرانی فائلوں سے ان کے بہت سے مضامین اکٹھے کیے۔ اردو کے ۱۹۲۰ء تک کے مضامین کو وودھ پرسنگ کی پہلی جلد میں پیش کیا۔ ہندی رسائل سے ان کی تخلیقات کو وودھ پرسنگ کی دوسری اور تیسری جلدوں میں پیش کیا۔

یہ بہت ہی مشکل کام تھا مگر امرت رائے نے جس لگن سے اسے پورا کیا اس کے لیے اردو اور ہندی ادب ان کا شکر گزار رہے گا۔ وودھ پرسنگ کے حصہ اول میں امرت رائے نے اٹھائیس مضامین پیش کیے تھے۔ ان سب مضامین کو اس جلد میں شامل کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ چالیس اور مضامین اکٹھے کیے گئے ہیں جو یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔ کچھ مضامین تو وہ ہیں جن کی تلاش امرت رائے اور بعد میں کمل کشور گوئنکا نے کی اور انھیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ کچھ ایسے مضامین بھی جن کے بارے میں ابھی محققین کو علم نہیں تھا۔

کلیات کی اس جلد میں صرف وہی مضامین یا تبصرے پیش کیے جا رہے ہیں جنھیں منشی جی نے اردو میں لکھا تھا۔ ان کی تعداد ستر سے زیادہ ہے۔ امرت رائے نے وودھ پرسنگ کے حصہ اول میں اردو مضامین کو ہندی میں پیش کیا تھا۔ حالانکہ ہندی پیش کرتے وقت اس بات کا دھیان رکھا گیا کہ منشی جی کی زبان اور طرز تحریر کی پوری

حفاظت کی جائے اور صرف وہی الفاظ یا خیال بدلے جائیں جن کے بغیر کام نہ چلتا ہو۔'' اس جلد کے لیے ہم نے مضامین کے اوریجنل متن حاصل کیے۔ سودیشی تحریک بنارس کے آواز خلق میں شائع ہوا تھا۔ اس اخبار کی فائلیں دستیاب نہیں ہوسکیں اس لیے اس مضمون کو وودھ پرسنگ حصہ اول سے لیا گیا ہے۔

پریم چند کے دو مضامین ملکانہ راجپوتوں کی شدھی اور پیارے لال شاکر کا کالی داس کے رتو سنگھار کے ترجمے بحث و مباحثہ کے موضوع بن گئے تھے۔ اس بحث و مباحثہ میں پریم چند کے دوستوں نے بھی شرکت کی تھی۔ ان کے باہمی تعلق کے مدنظر ہم نے کچھ مضامین یا اقتباسات کو اس جلد میں پیش ہے۔

پریم چند نے ہندوستانی اکادمی الہ آباد کے لیے ہم عصر ڈاکٹر گوری شنکر ہیرا چند اوجھا کے تین لکچروں کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب پر یہ آسانی کے ساتھ دستیاب نہیں ہے۔ انھیں اس جلد میں پیش کیا گیا ہے۔

کلیات کی اگلی دو جلدوں میں پریم چند کے ہندی میں لکھے مضامین، تبصرے، اڈیٹوریل، جو ہنس مادھوری جاگرن میں شائع ہوئے تھے اور جو وودھ پرسنگ کی دو جلدوں میں اور ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا کے اپراپیہ ساہتیہ میں شائع ہوئے ہیں انھیں پیش کیا جا رہا ہے۔ کچھ مضامین ایسے بھی ہیں جو آج تک کسی مجموعے میں شائع نہیں ہوئے۔

امید ہے یہ جلد قارئین کے لیے اہم ثابت ہوگی۔

مدن گوپال

ہاتھی دانت

ہاتھی دانت کیا ہے؟

عوام کا خیال ہے کہ ہاتھی دانت صرف ہاتھی کا دانت ہے جس کو کاٹ کر استعمال میں لاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے مگر غلطی یہ ہے کہ اس کا مآخذ صرف ہاتھی کا دانت سمجھا جاتا ہے حالانکہ چند اور جانور ہیں جن کے دانتوں سے ہاتھی دانت نکلتا ہے۔ پس یہ دیکھنا بہت آسان ہے کہ یہ نام غلط ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ پہلے لوگوں کو ان جانوروں کا علم نہ تھا جن کے دانتوں سے ہاتھی دانت، نکلتا ہے۔

جیسے ہڈی میں دو جزو ہوتے ہیں۔ ایک اوپر کا سخت خول اور دوسرا اندر کا نرم مغز۔ ویسے ہی دانت میں بھی دو جزو ہوتے ہیں۔ ایک تو سفید چکنا نہایت سخت خول ہوتا ہے اور دوسرا خول سے زیادہ چکنا، مگر اس سے کسی قدر نرم اندرونی حصہ ہوتا ہے۔ باہری حصے کو خول دنداں اور اندرونی حصہ کومغز دنداں کہتے ہیں۔ جس چیز کا نام ہاتھی دانت ہے وہ چند دانتوں کا مغز ہے ۔ ہم آگے چل کر ان جانوروں کا مختصر تذکرہ لکھیں گے جن کے دانتوں سے ہاتھی دانت ملتا ہے۔

اگر ہم اپنے دانتوں کو غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ بناوٹ کے لحاظ سے تین قسم کے ہیں۔ پہلے تو سامنے قینچی نما دانت ہیں جن سے ہم ماکولات کو کاٹتے ہیں۔ ان دانتوں کے بغل میں دائیں بائیں دو دو نکیلے تیز دانت ہیں جو گوشت کی سی چمڑی چیزوں کو چیرنے پھاڑنے کے لیے بنائے گئے ہیں اور ان نکیلے دانتوں کے بغل میں دونوں طرف چند چپٹے، چوڑے مضبوط دانت ہیں جن سے ہم نگلنے سے پہلے لقمے کو چباتے ہیں۔ قسم اوّل کے دانتوں کو انسائزرس (قینچی نما) قسم دوئم کو کینائن یعنی (سگ

صفت یا کتوں کے سے دانت) اور قسم سویم کو مولر (یعنی آسیا صفت یعنی چکی کے سے دانت) کہتے ہیں۔

فطرت نے کوئی شے بلا مصلحت نہیں بنائی۔ ہر شے سے ایک نہ ایک فائدہ ، کوئی نہ کوئی غرض مد نظر ہے۔

اونٹ کے چوڑے گدی دار، چپٹے سم اس لیے بنائے کہ وہ ریگستانوں میں آسانی سے چل سکے۔ اس کی گردن لمبی اس لیے بنائی کہ اپنا سر زمین تک جھکا سکے۔ برفستانی خطوں کے جانوروں کے جسم پر گھنے اور لمبے بال رکھے تاکہ سردی کی اذیت سے ہلاک نہ ہوجائیں۔ برعکس اس کے گرم ملک کے جانوروں کی کھال پر بہت چھدرے اور چھوٹے چھوٹے روئیں ہوتے ہیں۔ اسی طرح مختلف جانوروں کے دانتوں کی بناوٹ بھی ان کی ضروریات کے مطابق ہے۔ گوشت خور جانوروں کے دانت لمبے، نکیلے اور ذرا خم دار ہوتے ہیں تاکہ وہ کچے گوشت کو آسانی سے چیر پھاڑ سکیں۔ گھاس کھانے والے جانوروں کے سامنے کے دانت سیدھے چاقو کی پھل کی طرح تیز ہوتے ہیں تاکہ وہ گھاس کو آسانی سے کاٹ سکیں۔ ان کے چبانے والے دانت بھی چپٹے اور مضبوط ہوتے ہیں۔

فطرت کا یہ ایک مسلمہ مسئلہ ہے کہ استعمال سے اعضائے جسم کے نشو ونما میں ترقی ہوتی ہے۔ بڑھئی کی کلائی کے رگ اور پٹھے شب و روز کے استعمال سے نہایت مضبوط ہوجاتے ہیں۔ علی ہٰذا القیاس۔ جسم کے ہر ایک عضو کو جداگانہ طاقت پہنچانے کے لیے خاص خاص کھیل اور کسرتیں مقرر ہیں۔ برعکس اس کے اگر کسی عضو کو بیکار چھوڑ دو تو رفتہ رفتہ اس کی طاقت زائل ہوجاتی ہے۔ رگیں سست ہوجاتی ہیں اور وہ عضو اپنا فرض منصبی انجام نہیں دے سکتا۔ ایسی مثالیں بسا اوقات سادھوؤں میں ملتی ہیں جو نفس شکنی کے عوض اعضا شکنی کر بیٹھتے ہیں۔ کوئی منہ سادھ لیتا ہے۔ اشاروں کنایوں سے اپنے اپنے خیالات کا ناکافی طور پر اظہار کرتا ہے۔ آخر چند برسوں میں زبان بیکار پڑے رہنے سے قوت گویائی سے محروم ہوجاتی ہے۔ کوئی یہ خیال کرکے کہ نفسانی حرکات ہاتھوں ہی سے سرزد ہوتے ہیں، ہاتھوں کے استعمال سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ بھی معلوم ہے۔

فطرت کا یہ مسلمہ مسئلہ اور اعضا کی طرح دانتوں پر بھی راست آتا ہے۔ گوشت خورجانوروں کے (Canenes)اور گھاس کھانے والوں کے (Incissors) اور دانتوں سے زیادہ بڑھتے اور مضبوط ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ بسا اوقات قسم اول کے جانوروں کے انسائزر اور قسم دوئم کے جانوروں کے کینائن ہوتے ہی نہیں۔ یا تو فطرت نے ان کو یہ دانت عطا ہی نہیں کیے یا پشتہا پشت کے بیکار پڑے رہنے سے ان کا وجود ہی جاتا رہا۔

ہاتھی دانت کہاں سے آتا ہے؟

یہاں ہم ان جانوروں کا مختصر حال لکھتے ہیں جن کے دانتوں سے ہاتھی دانت نکلتا ہے۔

(ا) ہاتھی جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے گھاس کھانے والے جانوروں میں ہے۔ پس اس کے انسائزرس دوسرے دانتوں سے زیادہ بڑھتے ہیں۔ ان دانتوں کی حیرت انگیز بالیدگی کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ دانتوں کے نیچے والی قطار میں اس قسم کا کوئی دانت نہیں ہوتا کہ ان کی بالیدگی میں مخل ہوسکے۔ ہاتھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک افریقہ کا ہاتھی، دوسرا ایشیا کا ہاتھی۔افریقہ کا ہاتھی قریب قریب تمام افریقہ میں پایا جاتا ہے اور ایشیائی ہاتھی سے قدوقامت میں کچھ نکلتا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے دانت بھی ایشیائی ہاتھی سے بڑے ہوتے ہیں۔ افریقی ہاتھی بالعموم دنتار ہوتے ہیں حتیٰ کہ ہتھنیوں میں بھی شاذ ایسی ہوتی ہیں جن کے دانت نہیں ہوتے۔ افریقہ کے وحشیوں نے اس جانور کا شکارکرنے کے لیے مختلف طریقے نکالے ہیں۔

ہاتھی عموماً غول باندھ کر چرنے کے لیے نکلا کرتے ہیں۔ پس جب وہ ایسے مرغ زاروں میں جا نکلتے ہیں جہاں گھاس سوکھی اور لمبی ہوتی ہے تو شکاری ان مرغ زاروں میں آگ لگا دیتے ہیں۔ جب چوطرفہ شعلہ ہی شعلہ نظر آنے لگتا ہے تو ہاتھیوں کا غول کہیں نکل کرجا نہیں سکتا اور دم گھٹ جانے سے نیز جل جانے سے وہیں ڈھیر ہوجاتا ہے۔ گو اس طرح شکار کرنے سے سینکڑوں کا وارا نیارا دم کے دم میں ہوجاتا ہے مگر اس میں علاوہ اس کے کہ وحشیانہ پن اور قساوت قلبی کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک نقص یہ بھی ہے کہ آگ کی آنچ لگ جانے سے دانت سیاہ ہوجاتے ہیں اور اکثر جل کر چونے کی طرح بھربھرے ہوجاتے ہیں۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ یہ ہاتھیوں کی چراگاہوں میں بڑے بڑے گڑھے کھودتے ہیں اور ان پر پتلی پتلی لکڑیاں بچھا کر گھاس پوس، پتے وغیرہ سے ڈھک دیتے ہیں۔ جب ہاتھیوں کا غول خطرے سے بے خبر چرتا ہوا آنکلتا ہے تو ان گڑھوں میں گر پڑتا ہے اور کسی طرح نہیں نکل سکتا۔ شکاری ان کو ہفتوں تک بھوکا پڑا رہنے دیتے ہیں۔ آخر جب وہ غذا کے نہ ملنے سے نحیف و بے دم ہوجاتے ہیں تو ان کو ایک ایک کرکے نکال لیتے ہیں۔ زندہ نکالنا اسی صورت میں ہوتا ہے جب کہ شکاریوں کو گوشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر صرف دانت لینا چاہتے ہیں تو بیچارے ہاتھیوں کو گڑھے میں بھوکوں مار ڈالتے ہیں۔

افریقی ہاتھی کا ہاتھی دانت نہایت قیمتی ہوتا ہے۔اس کا وزن عموماً ۸۰ پونڈ سے ۱۰۰ پونڈ تک ہوتاہے۔ مگر بعض اوقات ایسے دانت بھی پائے جاتے ہیں جن کا وزن ۴۰۰ پونڈ ہوتا ہے اور لمبائی ۱۰ فٹ۔ اس قسم کے ایک جوڑی دانت کی قیمت ایک حبشی کا پانچ ہزار پونڈ ملے تھے۔

ایشائی ہاتھی جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں افریقی ہاتھیوں سے ڈیل ڈول میں کچھ دبتا ہوتا ہے۔ اور برما، سیام، لنکا، گجرات و چند دیگر جنگلی مقاموں میں پایا جاتاہے۔ اس قسم میں صرف ہاتھیوں کے دانت ہوتے ہیں۔ ہتھنیاں عموماً بلا دانت کے ہوتی ہیں۔

(۲) دوسرا جانور جس کے دانت سے ہاتھی دانت نکلتا ہے دریائی گھوڑا (Hippopotamus) ہے۔ یہ جانور سوروں کی قسم سے ہے۔ مگر ہندوستانی سوروں سے کہیں جسیم ہوتا ہے۔ اونچا تو بھینس سے زیادہ نہیں ہوتا مگر لمبان میں بھینس کا ڈیوڑھا ہوتا ہے۔ اس کا وطن افریقہ ہے، چونکہ آب و ہوا وہاں کی نہایت گرم ہوتی ہے اور یہ جانور گرمی کو برداشت نہیں کرسکتا۔ عموماً دریا کے کنارے سایہ دار مقاموں میں رہتا ہے اور سارے دن پانی میں ڈوبا رہتا ہے۔ گو اس کی خوراک گھاس و نباتات ہے اور قاعدے کے مطابق اس کے انسائزرس کو بڑھنا چاہیے مگر چونکہ اسے محافظت کے لیے دوسرے جانوروں سے لڑنا اور ان کو زخمی کرنا پڑتا ہے۔ اس کام کے لیے کینائن زیادہ موزوں ہوتے ہیں اور یہی دانت دوسرے دانتوں سے زیادہ بڑھتے اور ہاتھی دانت کے کام میں آتے ہیں۔ یہ ہاتھی دانت نہایت سخت سفید ہوتا ہے اور جلد خراب نہیں ہوتا۔

مگر اتنا بڑا نہیں ہوتا کہ اس سے چارپائی کے پائے یا شمع دان یا اسی قسم کی آرائش کی کوئی دوسری چیز بن سکے۔ اس سے صرف شطرنج کے مہرے، چوپڑ کے پانسے، بلیرڈ کھیلنے کی گیند اور نقلی دانت بناتے ہیں۔ اس جانور کو شکار کرنے کا وحشیوں نے یہ طریقہ نکالا ہے کہ لوہے کے لمبے لمبے نوک دار بھالے بنواتے ہیں اور کشتیوں میں بیٹھ کر شکار کو نکلتے ہیں۔ کیونکہ دریائی گھوڑا زیادہ تر پانی ہی میں رہتا ہے مگر چونکہ وہ طبعاً خشکی کا جانور ہے، پانی میں دو تین منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا پس جوں ہی وہ سانس لینے کے لیے سرکوباہر نکالتا ہے ووں ہی شکاری جو تاک میں لگے ہوئے ہوتے ہیں اپنے اپنے بھالے اس پر سر کرتے ہیں۔ آخر متواتر واروں سے گھبرا کر وہ پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ مگر تنفس کی ضرورت چند منٹوں میں پھر سر کو باہر نکالنے پر مجبور کردیتی ہے اور پھر پہلے کی طرح بھالوں کی بوچھار پڑنے لگتی ہے یہاں تک کہ یہ جانور خون کے ضائع ہوجانے یا کاری زخموں کے لگنے سے مرجاتا ہے اور کئی گھنٹوں کے بعد اس کی لاش پانی کے اوپر تیرتی دکھائی دیتی ہے۔ بعض اوقات تو وہ اتنا برہم ہوجاتا ہے کہ اپنے حملہ کرنے والوں کی کشتیوں کو الٹ دیتا ہے اور شکاریوں کا شکار کر ڈالتا ہے مگر خصلتاً کسی قدر ڈرپوک ہوتا ہے اور جوں ہی شکاریوں کی بو اس کی ناک میں پہنچتی ہے وہ بھاگ جانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں تک کہ بعضے بعضے ایک رات میں سینکڑوں میل طے کرتے ہوئے پائے گئے ہیں۔

آج سے چالیس پچاس برس پہلے اس جانور کا وجود یورپی دنیا میں مطلق نہ معلوم تھا۔ مگر اب تو وہ یورپ کے عجائب خانوں میں عام طور پر دیکھا جاتاہے۔ اس کی کھال ایک انچ سے زیادہ موٹی ہوتی ہے۔ بندوق کی ایک گولی اگر سر میں نہ لگے تو اسے مار نہیں سکتی۔ افریقہ کے وحشی اس کا گوشت بڑے چاؤ سے کھاتے ہیں اور ایک انگریزی سیاح کا قول ہے کہ اس کا گوشت دبلے ہرن کے گوشت سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔

(۳) تیسرا جانور جس کے دانت سے ہاتھی دانت نکلتا ہے والرس (Walrus) یا دریائی شیر ہے۔ یہ جانور یورپ کے شمال کے سمندر میں پایا جاتا ہے۔ یہ خطے سال کے بڑے حصے میں برف سے ڈھکے ہوتے ہیں۔ والرس گوشت خور جانوروں کی قسم سے ہے۔ پس اس کے دو کیناین بہت زیادہ بڑھتے ہیں۔ مگر یہ ہاتھی دانت بہت قیمتی نہیں

ہوتا کیونکہ اس کی رنگت زردی مائل ہوتی ہے اور بہت جلد خراب ہوجاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ اس جانور میں عقل انسانی کا جتنا حصہ ہے اتنا شاذ کسی دوسرے جانور میں ہوگا۔ یہ چشم دید روایت ہے کہ ایک بار کسی شکاری نے ایک والرس پر بندوق چلائی۔ وہ اس گولی سے ہلاک نہ ہوا۔ اور فوراً پانی میں ڈوب گیا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد بہت سے دریائی شیر کشتی کے آس پاس تیرتے دکھائی دیے اور کشتی کو اپنی پشت سے الٹ دینے کی کوشش شروع کی۔ پہلے تو شکاری بہت خائف ہوئے مگر کوئی چارہ نہ دیکھ کر بندوقوں کی متواتر باڑیں سر کرنی شروع کیں۔ تب کہیں جا کے یہ بلا سر سے ٹلی۔

(۴) آج سے کئی ہزار برس پہلے سیبریا میں ایک خاص قسم کا ہاتھی پایا جاتا تھا جو موجودہ ہاتھیوں سے قد و قامت میں کہیں بڑا ہوتا تھا اور جس کے جسم پر بڑے بڑے روئیں ہوا کرتے تھے۔ اب یہ جانور صفحۂ زمین پر کہیں نہیں رہا۔ اس کو علمائے علم حیوانات نے (Mammoth) میمتھ کہا ہے۔ سائبریا دنیا کے نہایت سرد حصوں میں ہے اور وہاں برف باری کی یہ حالت ہے کہ ایک ایک رات میں زمین پر کئی کئی فٹ برف جم جاتی ہے۔ اگر کوئی ذی روح قسمت کا مارا ان برف کے تودوں کے تلے دب گیا تو پھر اس کو اٹھنا نصیب نہیں ہوتا۔ غالبًا ان ہاتھیوں کا بھی یہی حال ہوا کیونکہ آج کل جب برف معمول سے زیادہ پگھل جاتی ہے تو کبھی کبھی ہڈی اور دانت کے ڈھیر کے ڈھیر ملتے ہیں۔ واضح رہے کہ برفستانی مقاموں میں سردی کے باعث چیزیں نہیں سڑ تیں اور یہ دانت باوجود ہزارہا برس سے پڑے رہنے کے ابھی تک صحیح و سالم پائے جاتے ہیں۔ ہاں بعض حالتوں میں وہ چونے کی طرح بھربھرے ہوجاتے ہیں۔ ان دانتوں اور ہڈیوں کے انبار کا ملنا یہ ثابت کرتا ہے کہ میمتھ غول باندھ کر رہا کرتا تھا۔ اور وقتاً فوقتاً غول کا غول انھیں برف باریوں کا شکار ہوا کرتا تھا۔ ان دانتوں سے نکلا ہوا ہاتھی دانت ادنیٰ درجے کا ہوتا ہے کیونکہ مدت تک پڑے رہنے سے اس کی خوبی میں کچھ نہ کچھ فرق آجاتا ہے۔ علاوہ اس کے جوں ہی وہ برف سے باہر نکلتا ہے اس میں زمانے کا اثر ہونے لگتا ہے۔

ہاتھی دانت کی خاصیتیں

ہاتھی دانت ہڈی سے بہت مشابہ ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ دونوں میں تمیز کرنا آسان کام

نہیں ۔ ہڈی بھی سخت و سفید ہوتی ہے اور ہاتھی دانت بھی۔ مگر یہ اس سے زیادہ وزنی، زیادہ چکنا ہوتا ہے اور اس کے اجزا آپس میں خوب گتھے ہوتے ہیں۔ سب سے نمایاں اور بین فرق یہ ہے کہ ہاتھی دانت میں پتلی پتلی سیاہی مائل دھاریاں ہوتی ہیں جیسی سنگ مرمر میں اور اکثر لکڑیوں میں ہوا کرتی ہیں۔ ایسی دھاریاں ہڈیوں میں مطلق نہیں ہوتیں۔ جب بازار میں ہاتھی دانت کی کوئی چیز خریدنے جاؤ تو پہلے اسے خوب غور سے دیکھو۔ اگر اس میں دھاریاں نظر آئیں تو اس کے ہاتھی دانت ہونے میں کوئی کلام نہیں ورنہ سمجھ لو کہ ہڈی ہے۔

ہاتھی دانت کا استعمال

ہاتھی دانت ایسی خوب صورت، مضبوط، دیرپا شے ہے کہ اس سے روزانہ ضروریات و تکلفات کی ہزاروں ہی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ چاقو کے دستے، چھاتے اور چھتریوں کی مٹھیاں، بٹن، مسطحی، پیمانے، انگریزی قلم کے ہولڈر، قطزن وغیرہ وغیرہ نہایت عام چیزیں ہیں۔ اس کے نقلی دانت بھی بنتے ہیں جو بڑے داموں پر فروخت ہوتے ہیں۔ جاپان اور چین میں ہاتھی دانت پر اس خوبی و صفائی سے نقش کاری کرتے ہیں کہ یہ دونوں ملک اس صنعت کے لیے مشہور ہیں۔ یونان کی پرانی خانقاہوں میں ہاتھی دانت کی تراشی ہوئی مورتیں پائی جاتی ہیں جو باوجود مرور ایام کے ابھی تک زمانے کے ہاتھوں سے بچی ہوئی ہیں۔ مارواڑ میں اس کی چوڑیاں عام طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ امرتسر میں اس کے ریشے نما تار تراش کر خوب صورت مور چھل بنا لیتے ہیں جو بالکل بال کے معلوم ہوتے ہیں۔ آبنوس کی لکڑی چونکہ بہت سیاہ ہوتی ہے اس پر ہاتھی دانت کی کیلیں، خوب صورت پھول وغیرہ نہایت زیب دیتے ہیں۔ میسور میں ہاتھی دانت کا کام ابھی تک بہت اچھا بنتا ہے۔ ابھی حال میں مہاراجہ صاحب بہادر بنارس کے پاس ہاتھی دانت کی چند آرائشی چیزیں تھیں جو انھوں نے لارڈ کرزن کے نذر کردیں۔ ہندوستان میں مشکل سے کوئی پرانا قدیم گھرانا ہوگا جہاں ہاتھی دانت کی دو ایک نادر اشیا نہ پائی جائیں۔ ایسی نایاب چیزیں گو اب تقریباً معدوم ہیں اور نہ ان کا کوئی پرسان حال ہے مگر قدیم صنعتوں کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں ہاتھی دانت کی نقش کاری اعلیٰ درجے پر پہنچی ہوئی تھی۔ احمد آباد اور مدراس کی نمائش گاہوں میں جو نیشنل کانگریس کے

ضمن میں منعقد ہوئی تھیں ہاتھی دانت کی عجیب و غریب چیزیں پیش کی گئی تھیں۔ ان کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ہندوستان اہل فن صناعوں سے خالی نہیں ہے مگر زمانے کی ناقدری نے انھیں دل شکستہ بنا دیا ہے۔

ہاتھی دانت کی تجارت

فی زمانہ یورپ تمام زمانے کی تجارت کا مرکز ہو رہا ہے۔ چنانچہ ہاتھی دانت کے خرید وفروخت کا بازار وہیں لگتا ہے۔ کل یورپ میں تین شہر بالخصوص اس تجارت کے لیے مشہور ہیں۔ لندن اور لیورپول انگلستان میں۔ اورانٹورپ ڈنمارک میں۔ انگریزی مقبوضات میں جہاں جہاں ہاتھی دانت پایا جاتا ہے (مثلاً ہندوستان، برما، لنکا، مشرقی افریقہ، جنوبی افریقہ) وہاں سے لندن یا لیورپول کو بھیجا جاتا ہے۔ کیونکہ ملکی تعلقات سے تجارتی تعلقات بڑھتے ہیں۔ کانگو کی خود مختار سلطنت جو وسطی افریقہ میں ہے ہاتھی دانت کا سب سے زرخیز انبار خانہ ہے کیونکہ وہاں ہاتھی اور دریائی گھوڑا دونوں بکثرت پائے جاتے ہیں اور چونکہ ہاتھی دانت وہاں تجارت کی قیمتی جنس سمجھا جاتا ہے۔ ان جانوروں کی قانوناً محافظت کی جاتی ہے۔ اس سلطنت کا ملکی تعلق ڈنمارک سے ہے (کیونکہ پہلے پہل ڈچ کسانوں نے اس خطے کو نو آباد کیا تھا) پس یہاں کا ہاتھی انٹورپ کو جاتا ہے جو ڈنمارک کا تجارتی مقام ہے۔ ہندوستان میں اس کو خاص تجارتی جنس نہیں سمجھتے پس تاجروں کا خیال بھی اس کی جانب کم راغب ہے۔

ہاتھی دانت کے متعلق چند متفرق معلومات

لکڑی کی طرح ہاتھی دانت میں بھی بعض اوقات بدنما دھبے اور داغ پڑ جایا کرتے ہیں جس سے اس کی وقعت میں فرق آجاتا ہے۔ بعض اوقات دانت بجائے سیدھے بڑھنے کے نصف دائرہ نما شکل میں بڑھتے ہیں جس سے ان کا ہاتھی دانت بھی ٹیڑھا ہوجاتا ہے۔ جیسے گیلی لکڑی کی بنی ہوئی چیزوں میں سوکھنے پر کسی قدر خم آجاتا ہے اسی طرح تازہ ہاتھی دانت کی چیزوں میں بھی۔ پس قبل اس کے کہ اس سے چیزیں بنائی جائیں اس کو دھوپ میں اچھی طرح خشک کرلیتے ہیں۔ کم عمر ہاتھی کا دانت ایسا ٹھوس نہیں آتا جیسا پرانے ہاتھی کا۔ عموماً مغز دنداں دانتوں کے سرے کی طرف ہوتا ہے۔ جڑ کھوکھلی ہوا کرتی ہے۔ ہاتھی دانت کو بعض اوقات تراش کے کتابوں کے

سے پتلے پتلے اوراق بنا لیتے ہیں اور کیمسٹری ہم کو ان مرکبات کا پتہ بھی بتلاتی ہے، جن سے ہم ان اوراق پر حروف کندہ کرسکتے ہیں۔

اردو معلیٰ، اکتوبر ۱۹۰۴

کرشن کنور

ہمارے پاس حکیم برہم صاحب ''مشہور انشا پرداز ہند'' کا ناول کرشن کنور ریویو کے لیے آیا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اس پر کچھ لکھنے کی جرات کریں بہتر ہوگا کہ ہم ناول کے اصول و فروع ناظرین کے سامنے پیش کریں۔

ناول انگریزی نقادان سخن کی رائے کے مطابق لفظی تصاویر کا ایک مجموعہ ہوتا ہے۔ افسانہ اور ناول میں صرف یہ فرق ہوتا ہے کہ افسانہ نگار صرف واقعات کی توسیع کرتا ہے اور ناولسٹ واقعات کو رنگین الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ان کی بولتی ہوئی تصویر نظروں کے سامنے کھینچ دے۔ ناول کا میدان فی زمانہ بہت وسیع ہوگیا ہے۔ کہیں تو اس میں زندگی کے کسی اہم مسئلے پر بحث کی جاتی ہے۔ جس کی محمد علی صاحب نے بڑی کامیابی کے ساتھ کوشش کی ہے۔ کہیں اس میں عادات انسانی کی تشریح کی جاتی ہے۔ دلی جذبات، امیدوں اور مایوسیوں کے نقشے اتارے جاتے ہیں۔ کہیں قبائح اخلاقی کے دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ناولسٹ کبھی مونس ہوتا ہے کبھی واعظ ، کبھی فلسفی بنتا ہے کبھی علم حکمت کا ماہر۔ پس ناول بجائے خود ایک صنف سخن ہوگیا ہے اور دیگر اصناف سخن کی طرح اس کی بھی مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً معاشرتی ناول، سراغ رسانی کے ناول، ادب و اخلاق کے ناول، تاریخی ناول وغیرہ۔ فی الحال ہم کو دیگر اقسام سے کوئی بحث نہیں۔ ہمارے پاس ریویو کے لیے جو ناول آیا ہے وہ تاریخی ہے۔ کیونکہ اس میں تاریخ سے مدد لی گئی ہے۔ اور ہم سطور ذیل میں دیکھیں گے کہ اس تاریخی حیثیت میں وہ کتنی وقعت سے دیکھے جانے کا مستحق ہے۔ تاریخی ناول کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ وہ گذشتہ واقعات اور جس زمانے میں وہ واقعات ہوئے ان کا ایک رنگ آمیز فوٹو ہے۔ مصنف صاحب نے صرف تاریخی واقعات کا ایک بہت دھندلا خاکہ کھینچا ہے۔ جس کو

دیکھ کر نہ واقعات ہی کی تصویر نظروں کے سامنے آتی ہے اور نہ اس زمانے کے طرز معاشرت کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کہیں کہیں رنگ بھی چڑھایا ہے مگر نہایت پھیکا۔ تاریخی نتیجہ عام یہ نکلتا ہے کہ اس زمانہ میں تفریق و عناد کی گرم بازاری تھی بس۔ اتنی بات تو ہر شخص معمولی تاریخ کے مطالعے سے بھی حاصل کرسکتا ہے۔

مگر یہ ہماری ہٹ دھری ہے اگر ہم حکیم صاحب کو اس بات کا الزام دیں کہ انھوں نے اس ناول کو بحیثیت ایک تاریخی ناول کے کسی اعلیٰ رتبہ پر پہنچانے میں کامیابی نہیں حاصل کی۔ انھوں نے اس بات کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ دیباچے میں خود فرماتے ہیں ''میری اصل غرض اس کتاب کی اشاعت سے یہ ہے کہ فخر الملک عالی جناب نواب میر خاں صاحب بہادر فردوس مکان ٹونک پر جو الزام مورخین نے لگایا ہے وہ اٹھ جائے اور معلوم ہوجائے کہ قتل کرشن کنور میں دراصل کس کا قصور تھا۔''اس حالت میں اس ناول کا مقصد عام نہیں ہے بلکہ خاص ہے اور اس تاریخی الزام کی تردید کے لیے مناسب تھا کہ حکیم صاحب تاریخ کے صفحات کی طرف رجوع کرتے اور کل واقعات کی بے تعصبی سے جانچ پڑتال کرکے ایک پرزور محاکمہ لکھتے۔ اس حالت میں شاید اس الزام کی تنسیخ ہوسکتی ۔ مگر قصہ سے کسی ایسے تاریخی واقعے کی تردید کرنا جس کو بہت سے مستند و معتبر مورخین نے مرفوع القلم ثابت کردیا ہو تحصیل لاحاصل ہے۔ بلکہ تاریخی واقعات افسانے میں لانے سے ان کی وقعت اور بھی کم ہوجاتی ہے۔ کیونکہ عوام فطرتاً افسانے کو اصل سے دور خیال کرتے ہیں۔ اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ اس قسم کے ناول اردو زبان میں لکھے گئے ہیں۔ تاہم حکیم صاحب کا مقصد پورا نہیں ہوتا کیونکہ اس کتاب کے پڑھنے سے ناظرین کو میر خان صاحب سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں پیدا ہوتی۔ اس امر کو واضح طور پر ظاہر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ چند لفظوں میں پلاٹ بیان کیا جائے۔

ناول کی ہیروئن مہارانا اودے پور میواڑ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اس کی منگنی جودھپور کے راجہ بھیم سنگھ سے ہوئی تھی۔ مگر شادی سے پہلے راجہ کا انتقال ہوگیا۔ اس کا بھائی مان سنگھ اس کی جگہ گدی پر بیٹھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ راجہ مرحوم کی ایک رانی حاملہ تھی۔ اور سوائی سنگھ نے جو جودھپور کا جاگیردار ہونے کے علاوہ بھیم سنگھ کے زمانہ میں وزیر

بھی رہ چکا ہے جودھپور کے تمام رؤسا کو مقام چمپاوت پر جمع کرکے اس امر کو ظاہر کیا۔ اس پر مان سنگھ نے تسلیم کیا کہ رانی کے اگر کوئی لڑکا ہوا تو وہ میرا جانشین ہوگا۔ مدت معینہ پر رانی کے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام دھونکل سنگھ رکھا گیا۔ چونکہ رانی کو اپنے لڑکے کی سلامتی میں اندیشہ تھا اس نے اس کو خفیہ طور پر سوائی سنگھ کے پاس بھیج دیا، جس نے دو برس تک پوشیدہ طور پر اس کی پرورش و پرداخت کی۔ اس وقت اس نے پھر جودھپور کے رؤسا کو جمع کیا اور مان سنگھ نے دوبارہ وعدہ کیا کہ میں اپنے عہد پر قائم رہوں گا۔ مگر جب دھونکل سنگھ بالغ ہوا تو راجہ اپنے قول سے پھر گیا اور تحقیقات کرنا شروع کیا کہ دھونکل سنگھ بھیم سنگھ مرحوم کا بیٹا ہے یا نہیں۔ رانی کی محبت مادری پر خوف غالب آ گیا، اس نے دھونکل سنگھ کی ماں ہونے سے صاف انکار کیا۔ سوائی سنگھ جس کی ہزاروں امیدیں دھونکل سنگھ کی تخت نشینی سے وابستہ تھیں واقعات کے اس طرح پلٹ جانے سے نہایت برہم ہوا۔ کھلم کھلا مان سنگھ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اور یہ سوچنے لگا کہ کس طرح راجہ کو جڑ سے اکھاڑ دوں۔ اس کو بہت جلد ایک ترکیب سوجھ گئی۔

چونکہ کرشن کنور کی منگنی راجہ بھیم سنگھ مرحوم سے ہوئی تھی۔ اب حمیت قومی اس کی مقتضی تھی کہ اس کا جانشین منگیتر کو بیاہ لائے۔ خاندانی غیرت یہ کب گوارا کرسکتی تھی کہ جودھپور کی منگیتر کو کوئی اور بیاہ لے جائے۔ چنانچہ مان سنگھ مہاراجہ میواڑ سے نامہ و پیام کر رہا تھا۔ سوائی سنگھ نے مان سنگھ کو زک دینے کے لیے اسی نازک معاملہ کو پسند کیا۔

جے پور کا راجہ جگت سنگھ ایک عیاش مزاج، عاشق تن آدمی تھا۔ سوائی سنگھ نے اس کے روبرو کرشن کنور کے حسن جہاں سوز کی خوب تعریفیں کیں اور دھونکل سنگھ کی خوب وکالت کی۔ آخر راجہ اس میواڑ کی دیوی کا نادیدہ مشتاق ہوگیا۔ اس طرح سوائی سنگھ نے دو سلطنتوں میں نفاق کا بیج بویا۔

چونکہ راجہ جگت سنگھ تنہاراجہ مان سنگھ کے مقابلے کی تاب نہ لاسکتا تھا اس نے صرف کثیر سے نواب میر خان صاحب (جن کی بریّت کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے) و مرہٹہ سدا شیو راؤ و چند دیگر فرماں رواؤں کو اپنی رفاقت پر رضا مند کرلیا۔ ادھر سوائی

سنگھ نے اپنی حکمت عملیوں سے مان سنگھ کے رفیقوں اور مددگاروں کو بدظن کر کے اپنا طرف دار بنا لیا۔ چنانچہ جب لڑائی شروع ہوئی تو مان سنگھ کے ہمراہ صرف چار سردار رہ گئے۔ تاہم اس نے میدان جنگ سے منہ موڑنا مردی کے خلاف سمجھ کر شام تک خوب داد شجاعت دی۔ جب اس کی تمام فوج وہیں ڈھیر ہوگئی تو ناچار اپنے وفادار سرداروں کی صلاح سے بھاگ کر جودھپور کے قلعہ میں پناہ لی۔ جے سنگھ اس فتح سے پھول اٹھا۔ ایک پیغامبر تو راجہ میواڑ کی خدمت میں روانہ کیا اور خود جودھپور کے محاصرے کی تیاریاں کرنے لگا۔

اسی اثنا میں نواب میر خان صاحب کے ممبروں نے خبر پہنچائی کہ جے پور کا خزانہ اب بالکل ختم ہے۔ اتنا سننا تھا کہ نواب صاحب نے فوراً جے پور پر دھاوا کردیا۔ جگت سنگھ تو کوسوں کی دوری پر پڑا ہوا محاصرے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ بس خان صاحب نے خالی میدان پاکر خوب بڑھ بڑھ کے ہاتھ مارے۔ شاہی خزانے کا بھی وارا نیارا کیا اور رعایا کے ستانے سے جو کچھ ہاتھ آیا وہ سب لے دے کر اپنا راستہ لیا۔

اب مصنف صاحب سے ہمارا یہ سوال ہے کہ یہ حرکت نواب صاحب کی وفاداری کا پرتو ہے یا بیوفائی کا عکس۔ پہلے تو جے پور کا خزانہ بھرا دیکھ کر اس کی طرف ڈھلے۔ جب دیکھا کہ اب اس سے اور کچھ ہاتھ لگتا نہیں نظر آتا تو پرانے مراسم یک لخت بھول گئے۔ اور آستین کا سانپ ہوکر بیچارے جگت سنگھ ہی کو کاٹ کھایا۔ یہ کہاں کی پالیسی ہے۔ اگر اس غارت گری سے ان کو جودھپور کی بھلائی مدنظر تھی تو اس لڑائی کی کیا ضرورت تھی۔ بلا جنگ و جدل کے فیصلہ ہوسکتا تھا۔ لڑائی کے وقت جگت سنگھ کو سلام کرکے مان سنگھ سے آملتے۔ جگت سنگھ اس طرح نہتا ہوکر مقابلے کی جرأت نہ کرتا۔ نہ لڑائی ہوتی نہ جھگڑا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرز عمل میں نواب صاحب پر دغابازی کا الزام عائد ہوتا۔ مگر اب تو ایک چھوڑ کر تین تین الزام آجاتے ہیں۔ دغابازی، غارت گری اور مکاری، چونکہ مصنف صاحب ایک تاریخی واقعے کو جھٹلانے بیٹھے تھے مناسب ہوتا کہ نواب صاحب کے اس طریقۂ عمل کی توضیح کرتے۔ تاریخ نہ جھوٹی ہوتی نہ سہی۔ ان کا مطلب تو حاصل ہوجاتا مگر ساری کتاب میں اس واقعے پر روشنی ڈالنے کی کہیں کوشش نہیں کی گئی۔ القصہ یہ طرز عمل خواہ حکمت عملی پر مبنی ہو خواہ

شجاعت یا ضرورت پر، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ میر صاحب کے سر پر یہ الزام قیامت تک رہے گا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ تاریخ کے صفحوں میں ایسی مثالیں نہیں ملتی ہیں۔ اہل یورپ اور دیگر مہذب قوموں کے کارنامے ان مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ مگر جہاں ایسی مثالیں ہوتی ہیں ہمیشہ ذلت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں اور کوئی خواہ مخواہ پبلک کے سامنے روکھے پھیکے پچڑے گا کر کوؤں کو ہنس بنانے کی کوشش نہیں کرتا۔

جے پور کا ستیا ناس کرنے کے بعد نواب صاحب جودھپور کی طرف رجوع ہوئے۔ راجہ بے چارہ شکست کھاکر منہ کھولے بیٹھا تھا۔ میر صاحب کی رفاقت کو نعمت غیر مترقبہ سمجھا۔ بڑے اخلاق سے پیش آیا حتیٰ کہ میر صاحب نے پگڑیوں کا بھی ادل بدل کیا جو یگانگت کا سب سے مضبوط عہد سمجھا جاتا ہے۔ اب کیا تھا، مان سنگھ نے اپنا سارا خزانہ نواب صاحب کے سامنے کھول دیا۔ اور نواب صاحب نے بجائے اس کے کہ روپیہ اپنے صرف میں لاتے اسی وقت فوج کو تقسیم کردیا۔ اور جودھپور کے نمک نے یہاں تک زور باندھا کہ سوائی سنگھ کو اس کی بغاوت کا مزہ چکھانے کے لیے تیار ہوگئے۔ اسے مع اپنے ہمراہیوں کے ایک دعوت میں بلایا اور گولیاں پڑوا دیں۔ جس شخص سے ایسے حرکات نادر سرزد ہوں اس کی شفاعت کرنا ہمارے مصنف صاحب ہی کا حصہ ہے۔ مانا کہ سوائی سنگھ نے بغاوت کی، مگر وہ حیرت انگیز استقلال و یکجہتی کے ساتھ اپنے ارادوں پر اَڑا رہا۔ اگر اس کی بغاوت کی سزا یہ سمجھی گئی کہ اس کو دغا بازیوں کا شکار بنایا جائے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ میر صاحب اپنے حرکات کے لیے کس سزا کے مستحق تھے۔

ہم ذیل میں نواب میر خان صاحب کے چکیدہ زبان چند جملے لکھتے ہیں جن سے ان کے عادات و خیالات کا صاف پتہ چلتا ہے۔

(ا) جگت سنگھ نے جب اثنائے گفتگو میں کہا کہ میں نے یہ لڑائی دھونکل سنگھ کے واسطے مول لی ہے تو خان صاحب نے فرمایا ''اجی راجہ صاحب! آپ مجھ سے ایسی باتیں کرتے ہیں اور مجھے بناتے ہیں۔ کسی غیر شخص کے واسطے کوئی اتنی ہمدردی صرف کرنے والا نہیں ہے'' گویا حاجت مندوں کی مدد کرنا فرائض انسانی میں داخل نہیں۔

(۲) آگے چل کر مان سنگھ سے سوائی سنگھ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''خدا وند تعالیٰ نے اس کو اس کے اعمال بد کی سزا دی۔ وہ اپنے کردار کو پہنچا، ایسے نمک حراموں کے ساتھ دغا فریب جو کچھ کیا جائے اس کا کچھ گناہ نہیں اور لڑائی تو مکر و فریب کا نام ہے'' کیا بالا معیار ہے لڑائی کا؟ سوائی سنگھ جو اپنے قدیم راجہ کے فرزند کے لیے اپنی جان قربان کر رہا ہے نمک حرام ہے اور نواب صاحب جو روپیہ کے لیے حرکات ناگفتنی کے مرتکب ہوتے ہیں نمک حلال ہیں اور شجاع ہیں اور فخر القوم ہیں؟

اب ہم قصہ کا آخری اور درد ناک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ راجہ اودے پور یعنی کرشن کنور کا باپ جگت سنگھ اور مان سنگھ دونوں سے ڈرتا ہے۔ اس کا خزانہ خالی ہے۔ چاروں طرف مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے۔ کبھی تو جے پور کی طرف ڈھلتا ہے کبھی جودھپور کی طرف۔ اسی اثنا میں نواب صاحب سوائی سنگھ کو واصل جہنم کرنے کے بعد جودھپور کے وکیل بن کر اودے پور تشریف لے جاتے ہیں اور راجہ صاحب سے ملاقات کرکے ان کو ایک ایسی ہمدردانہ صلاح دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کرشن کنور کے گلے پر چھری پھر جاتی ہے۔ حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ کرشن کنور کو راجہ اودے پور نے اپنی مرضی سے قتل کیا۔ اس کا الزام نواب صاحب پر نہیں ہے۔ مگر کیا وجہ ہے کہ نواب صاحب سے ملاقات ہونے کے بعد راجہ صاحب نے ایسا خوفناک فیصلہ کیا۔ دونوں رقیبوں کو کشت و خون پر آمادہ دیکھ کر کیوں نہ لڑکی کا خاتمہ کردیا جس سے ہزاروں بندگان خدا کی جانیں بچ جاتیں۔ضرور ہے کہ نواب صاحب نے اس امر پر زور دیا ہوگا اور یہی نہیں راجہ صاحب کو مجبور کیا ہوگا کیونکہ ان کو ایسی حرکت ناکردنی پر مجبور کرنے سے نواب صاحب کو اپنی حفاظت کا یقین تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ گو اس وقت مان سنگھ دب کر میری خوشامد کر رہا ہے مگر جوں ہی موقع پائے گاضرور بری طرح پیش آئے گا۔ اور یقینی امر تھا کہ جب کرشن کنور کی شادی مان سنگھ سے ہوتی تو دونوں سلطنتوں میں ضرور اتفاق ہوجاتا اور مان سنگھ یہ نئی کمک پاکر نواب صاحب کو ضرور پرانی بے عنوانیوں کا مزہ چکھاتا۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ اودے پور اور جے پور میں تعلق پیدا ہونا بھی خان صاحب کے واسطے کچھ کم خطرناک نہیں تھا۔ کیونکہ اس صورت میں جگت سنگھ اودے پور کی مدد پاکر تازیانہ لیے ہوئے نواب صاحب کی سرپر آ پہنچتا۔

پس ان قیاسی بلاؤں کارد انھوں نے یہی سوچا کہ کسی طرح اس لڑکی کو مروا ڈالوں۔ حکیم صاحب کتاب کے خاتمے پر ایک نوٹ میں لکھتے ہیں ''میر خان نے ایک مناسب رائے دی تھی کہ آپ مہاراجہ مان سنگھ کے ساتھ شادی کردیں۔ وہ مستحق بھی ہے اور فریفتہ بھی ہے'' یہ مشورہ بیشک اچھا تھا مگر ناول میں اس کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ نوٹ ناول کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ مناسب ہوتا کہ حکیم صاحب کسی باب میں راجہ اودے پور اور خان صاحب کی ملاقات کراتے اور اس ملاقات میں خان صاحب کی زبان سے یہ الفاظ ادا کراتے۔ اس حالت میں گو تاریخی واقعے کا پلٹنا تو دشوار ہے۔ ہاں اتنا ہوجاتا کہ پڑھنے والوں کے دلوں میں خان صاحب سے کچھ ہمدردی ہوجاتی اور شاید ان کی بے گناہی کا یقین بھی ہوجاتا۔ مگر سارے ناول میں اس کو کہیں واضح طور پر کیا اشارتاً کنایتاً بھی نہیں لکھا بلکہ ایک شخص جوان داس کی زبانی جو کرشن کنور کے پاس پیغام مرگ لے کر آیا ہے یہ الفاظ کہلائے ہیں ''بات یہ ہے کہ میر خان جودھپور سے آئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے دربار سے کہا کہ تم اپنی لڑکی پدمنی کی شادی مان سنگھ کے ساتھ کردو۔ سری دربار نے کہا جے پور والا بگڑا ہوا ہے۔ میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا ... اس پر میر خان نے کہا کہ اگر تم کو یہ خوف ہے تو اس مایۂ فساد لڑکی کو مار ڈالو تاکہ ہزارہا بندگان خدا کی جانیں نہ ضائع ہوں۔ ایک ہی جان پر خاتمہ ہوجائے۔'' ان آخری الفاظ سے میر خان کی جرأت و عالی ہمتی ہرگز نہیں ظاہر ہوتی۔ بلکہ پہلے کی بزدلانہ حرکتوں کا جب ان سے موازنہ کیجیے تو مکاری کی بو پائی جاتی ہے۔ خوب ! نوع انسانی کی خونریزی کے انسداد کا خیال اسی شخص کو پیدا ہوا جو چند دنوں پہلے جے پور کے لوٹنے سے نہ ہچکا اور جس نے ہزاروں بے گناہ بندگان خدا کے خون سے ہاتھ رنگے۔ اور ذرا مصنف کی غلطی کو ملاحظہ کیجئے جو الزام خان صاحب کے سر سے اٹھانے بیٹھے تھے وہ اور بھی تھوپ دیا۔ یعنی خان صاحب نے راجہ اودے پور کے روبرو دو راستے پیش کیے۔ یا تو کرشن کنور کی شادی مان سنگھ سے کردے یا اس کو قتل کردے۔ صورت اول میں یہ پخ تھی کہ جگت سنگھ بگڑا ہوا ہے۔ دوسری صورت خطروں سے پاک تھی اور نواب صاحب نے راجہ صاحب کو یہی طریق اختیار کرنے کی رائے دی۔ خوب وکالت کی۔ میر خان صاحب اس خطا کو کبھی معاف نہ کریں گے۔ ان کی روح کو اس

الزام کے لد جانے سے صدمہ پہنچے گا۔

اگرہم مان لیں کہ میر خان صاحب نے راجہ اودے پور کو جو صلاح دی وہ بالکل فلاحیت پر مبنی تھی تو ان کے عادات میں ایک زبردست تغیر کے ہونے کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ ایک باخبر ناولسٹ اس امتزاجی تغیر کو اس خوبی سے دکھاتا کہ علاوہ ایک اخلاقی نتیجہ پیدا ہونے کے سائکالاجکل ناول کا مزہ آتا۔ حکیم صاحب. آگے چل کر اسی نوٹ میں پھر لکھتے ہیں۔ ''یہ مہارانا کی کمزوری تھی کہ اپنی خاندانی عظمت کو انھوں نے قائم نہ رکھا اور لڑائی کے ڈر سے اپنی دوشیزہ لڑکی کو سخت بے رحمی سے مار ڈالا۔ میر خان کو وہ جواب دے سکتے تھے اور اگر وہ نہ مانتے تو مہارانا ان کو بزور شمشیر منوا کے چھوڑتے ...جب کرشن کنور قتل ہوچکی تو خود میر خان صاحب نے مہارانا کو قائل کیا کہ تم اسی راجپوتی پر مرتے ہو۔''

سچ پوچھیے تو سارے قصے کا لب لباب اسی نوٹ میں موجود ہے بلکہ اس کے لکھنے سے ناول کی کوئی ضرورت ہی نہیں باقی رہ جاتی۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ مہارانا اپنی لڑکی کو قتل کرنے پر راضی ہوئے۔ وہ سوائے اس کے اور کرکیا سکتے تھے۔ ان کی حالت ایسی کمزور ہو رہی تھی کہ خاندانی عظمت کے قائم رکھنے کا خیال تو دور رہا خود اپنی سلطنت کا وجود قائم رکھنے کی فکر میں غوطے کھا رہے تھے۔ اس بے چارگی میں میر صاحب کی بات نہ مانتے تو کیا کرتے۔ اگر ان میں اتنی ہی قوت ہوتی کہ میر صاحب کو بزور شمشیر منوا کے چھوڑتے تو اپنی لڑکی کو قتل ہی کیوں کرتے، جگت سنگھ سے لڑ نہ جاتے۔ اور لڑجانا آسان بھی ہوتا کیونکہ مان سنگھ بھی ساتھ دیتا اور شاید میر خان صاحب بھی ہاتھ بٹاتے۔ ان تینوں دولتوں کے مقابلے میں جگت سنگھ اکیلے کیا بنا لیتے۔ یہ بات شاید مہارانا اودے پور کے ذہن میں آئی نہیں۔ بس یہی خیال ہوتا ہے کہ میر خان صاحب کو مان سنگھ اور رانا صاحب کے درمیان اتفاق ہوجانا ناگوار تھا جس کے وجوہات ظاہر ہیں اس لیے انھوں نے کرشن کنور کے قتل کی تحریک کی ہوگی اور رانا صاحب بمصداق اس کے کہ مصیبت پڑنے پر عقل رفو چکر ہوجاتی ہے۔ خان صاحب جیسے غازی مرد کی بات کو ٹالنا مصلحت سے بعید سمجھے ہوں گے۔ خان صاحب الزام سے اس حالت میں بری ہوسکتے تھے اگر وہ جگت سنگھ کو ڈرا دھمکا کر دبا لیتے اور تب مان

سنگھ کی شادی بلاخر خشہ کرشن کنور سے ہوجاتی۔ جگت سنگھ اکیلے مان سنگھ کا کچھ نہ بگاڑ سکتا کیونکہ اگر اس میں یہ قابلیت ہوتی تو آغاز جنگ سے پہلے میر خان صاحب سے امداد کا ملتجی نہ ہوتا۔

زمانہ، فروری ۱۹۰۵

آئین قیصری اور محاربات عظیم

(مصنفہ خان بہادر شمس العلماء مولانا مولوی ذکاء اللہ صاحب دہلوی)

(۱) آئین قیصری

کچھ عرصہ ہوا کہ مسٹر رومیش چندردت نے ایک انگریزی کتاب ''ہندوستان بعہد ملکہ وکٹوریا'' تصنیف کی تھی جس کا صرف ہندوستان ہی میں بڑی گرم جوشی سے استقبال نہیں کیا گیا بلکہ امریکہ و انگلستان کے محققین نے بھی اس کو مقبولیت کا درجہ دیا۔ بعض انگریزی اہل الرائے نے اس کو سر ولیم ہنٹر کی بے بہا اور قابل یادگار تواریخ کا ہم پلہ ٹھہرایا ہے۔ ہماری اردو زبان میں اس قسم کی کوئی تصنیف نہ تھی جس کو پڑھ کر اردو داں پبلک اپنی گورنمنٹ اور اس کی تبدیلیوں اور ترقیوں کا حال معلوم کرسکے۔ مولوی ذکاء اللہ صاحب نے اس عام ضرورت کو پورا کیا ہے۔ مگر در حالیکہ مسٹر دت کی کتاب اول سے آخر تک تازہ تحقیقات و پرمعنی اعداد و اسناد سے مملو ہے۔ مولوی صاحب کی تصنیف محض چند انگریزی تصانیف کا قلم برداشتہ ترجمہ ہے۔ مسٹر دت نے گورنمنٹ کے تاریک و روشن دونوں پہلوؤں پر غیر متعصبانہ نگاہ ڈالی ہے اور ساری کتاب میں ایسے ایسے پرمغز مشورے دیے ہیں کہ اگر گورنمنٹ ان پر عمل کرے تو رعایا کے لیے واقعی ستجگ کا زمانہ آجائے گا۔ مگر مولوی صاحب نے ابتدا سے انتہا تک ایک گیت گایا ہے جو نثر میں ہونے سے بالکل بدمزہ ہوگیا ہے۔کاش انھیں واقعات پر مولوی صاحب قصیدہ لکھتے تو وہ زیادہ وقعت سے دیکھے جانے کا مستحق ہوتا۔

مولوی صاحب آسمان اردو کے آفتاب ہیں۔ جب تک اردو زبان زندہ رہے گی آپ کا نام شمس نصف النہار کی طرح روشن رہے گا۔ مگر صرف بہ بحثیت ایک عالم زبان داں کے۔ ان کی تاریخیں جن پر انھوں نے اپنی پیرانہ سالی کو قربان کردیا ہے

بہت جلد فراموش کردی جائیں گی۔ مولانا حالی کی حیات جاوید، مولانا آزاد کی آب حیات، مولانا حیرت دہلوی کی تاریخ حمیدیہ بیشک اس قابل ہیں کہ اردو انشا پردازی کا بہترین نمونہ قرار دی جاسکیں۔ مگر مولوی صاحب کی ''آئین قیصری'' ہرگز اس رتبے کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔

یوں تو سرسید احمد خاں کے تمدنی و ملکی اصولوں سے ہمیشہ اختلافات رہا ہے مگر حق بات یہ ہے کہ ابھی تک ہم کو ان اصولوں کے مفہوم کچھ یوں ہی سے معلوم تھے۔مولوی ذکاء اللہ صاحب نے ان تمام اصولوں کے معنی آفتاب کی طرح روشن کردیے ہیں۔

ایک ایسی کتاب پر جس کی ضخامت ڈھائی سو صفحات سے کم نہیں اور جس میں ہندوستان کی پیچیدہ گورنمنٹ کے متعدد صیغوں پر رائے زنی کی گئی ہے چند صفحات میں محاکمہ کرنا نہایت مشکل ہے۔ پس ہم چند خاص و معرکہ کے مضامین اقتباس کرکے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

ہندوستانیوں کا اعلیٰ عہدوں پر مقرر ہونا

مولوی صاحب خیال فرماتے ہیں کہ ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں جو اختیارات موجودہ ہیں وہی درجۂ اعتدال سے تجاوز کرگئے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں اور اختیار دینا رعایا کے لیے مضر اور گورنمنٹ کے لیے مہلک ہوگا۔ ''اس بات کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اس اصول کے قائم رکھنے میں ہم کو ذرا بھی تامل کبھی نہیں ہوگا کہ ہندوستان کے آدمیوں کے لیے ہمارے فرائض میں سے اول فرض یہ ہی تھا کہ ہم اپنی سلطنت کی سلامتی کی خیر منائیں۔ ہم کو اپنے انتظام کے مفید ہونے کا پورا یقین ہے اور ظن غالب ہے کہ اگر ہم اپنی گورنمنٹ ہندوستانیوں کے حوالے کردیں تو بدعملی، بے نظمی دوبارہ نمودار ہوگی۔ پس ہماری گورنمنٹ کی استواری و قیام کے لیے یہ پالیسی بنیاد ہونی چاہیے کہ اعلیٰ عہدوں پر زیادہ تر انگریزوں کا تقرر ہو یہ ایک اصلی چیز ہے۔'' [1]

مولوی صاحب کو سخت افسوس ہے کہ اس ملک میں عدالت و ایگزیکیٹو سب کا سب ہندوستانیوں ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ کاش اور انگریز آجاتے۔ فرماتے ہیں ''جو لوگ

---

[1] یہ ترجمہ ہے ایک انگریزی کتاب سے۔ مولوی صاحب نے اس ترجمہ کو اپنے خیالات کا مظہر بنایا ہے۔

یہ مانتے ہیں کہ ہندوستان میں سول انتظام کا بڑا حصہ انگلش مین کے ہاتھ میں ہے اور اس میں ہندوستانی اعلیٰ عہدوں کے پانے سے محروم ہیں۔ اس سے زیادہ کوئی بات سچ سے پرے نہیں ہوسکتی" مولوی صاحب خود میور کالج کے پروفیسر ہوگئے تھے۔ ان کے نزدیک اب اس سے اونچا کوئی عہدہ کیوں ہونے لگا جس کی کوئی ہندوستانی کوشش کرے۔ اسی سلسلے میں پھر فرماتے ہیں "پبلک سروس میں ہندوستانی ملازمین کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ انگلینڈ میں بہت ہی تھوڑے انگریز مقرر ہوتے ہیں۔ ان کے سوا کوئی شاذ و نادر صورت ایسی ہوگی جس پر ہندوستانی نہ مقرر ہوتے ہوں" افسوس! ایک انگریز جو ولایت میں ہندوستانی عہدہ پاتا ہے اس کی تنخواہ عموماً ڈھائی سو کلرکوں کے برابر ہوتی ہے۔ بسا اوقات اس سے کہیں زیادہ۔

کیا مولوی صاحب نہیں جانتے کہ کسی زمانے میں یہ ایکٹ پاس ہوا تھا کہ کسی محکمہ میں دو سو یا اس سے کم کے عہدوں پر کوئی انگریز نہ رکھا جائے۔ آج تار گھر اور سکریٹریٹ اور انسپکٹر جنرل کا دفتر محکمۂ ریل اور خدا جانے کتنے سرکاری دفاتر ہیں جن میں پچاس روپے سے زیادہ تنخواہ کے جتنے عہدے ہیں ان پر بالعموم یورشین نظر آتے ہیں۔کئی صیغے تو ایسے ہیں جن میں کوئی ہندوستانی نظر ہی نہیں آتا۔ اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ ہمارے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے سو دو سوروپیہ کی تنخواہوں کے بہت سے عہدے ہیں تاہم ان عہدوں سے ہماری قومی وقعت مطلق نہیں ظاہر ہوتی۔ جیسا مسٹر گوکھلے نے فرمایا تھا کہ جب ہم عہدوں کا ذکر کرتے ہیں تو پانچ سو یا اس سے زیادہ تنخواہ کے عہدوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کیا اس میں کوئی شک ہے کہ اس تنخواہ کے ہندوستانی عہدہ داروں کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں، مگر ہم بھولے جاتے ہیں۔ مولوی ذکاء اللہ صاحب ہندوستانیوں کو محض اسی خیال سے اعلیٰ عہدوں کے قابل نہیں سمجھتے "کہ ان کے لیے ایسی سائنٹفک و ٹیکنیکل تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ علم ہندوستانیوں میں بہت کم ہوتا ہے۔" بلکہ آپ کو ان کی دیانت داری اور راست بازی میں بھی احتمال ہے۔" غرض ہندوستانی ججوں و مجسٹریٹوں کی راست بازی اور دیانت داری اس سبب سے ہے کہ وہ انگلش دیانت مند عہدہ داروں کے حوالے میں رہتے ہیں۔" مصنف صاحب نے اپنی وفاداری اور نمک خواری کے جوش میں اپنے بھائی بندوں کو گالی

دینا شروع کردیا! آپ کی نظروں میں ''اب ہندوستانیوں کو زیادہ رعایت کی ضرورت نہیں ہے مگر انگریزوں کو ہندوستانی خدمات پر مامور کرنے کی ترغیب دینے کے لیے ضروری ہے کہ ان کو زیادہ آمدنیوں اور فرلو کے استحقاق دیے جائیں ... ہندوستانیوں کے لیے ملازمت کا میدان وسیع ہوتا جاتا ہے اور یورپین کے لیے تنگ'' اس کو کہتے ہیں نمک خواری و نمک حلالی! بے چارے بے دست و پا بے صدا انگریزوں کی کیسی وکالت کی ہے۔ کاش لارڈ کرزن کی نگاہ اس جملے پر پڑجائے۔ معاذ اللہ خوشامد کی بھی کوئی انتہا ہے۔ افسوس مولوی صاحب نے مسٹر گوکھلے کا وہ نوٹ نہیں دیکھا جو ان کی آخری بجٹ اسپیچ کے ساتھ اخباروں میں شائع ہوا ہے کیونکہ اس سے ان کو معلوم ہوجاتا کہ آخری چار پانچ برسوں میں کتنے نئے عہدے قائم ہوئے اور ان میں کتنے ہندوستانیوں کو ملے اور کتنے انگریزوں کے ہاتھ لگے۔ شاید اس نتیجہ سے ان کو کچھ تسکین ہوتی۔ پبلک سروس کمیشن کی رپورٹ دیکھیے اور جانچیے کہ ان ہدایتوں کی کہاں تک تعمیل ہو رہی ہے۔

محاصل ملکی

زمین کی آمدنی۔ مولوی صاحب نے اس اہم مضمون پر کچھ روشنی نہیں ڈالی۔ ہاں صرف اتنا کہہ دیا ہے کہ ''ہم کو یاد نہیں کہ ہندوستان میں اراضی کے فوائد میں کبھی کسی گورنمنٹ نے اپنا حصہ اتنا کم لیا ہو۔'' اکبر نامہ و دیگر کتب و ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابتدائی رپورٹوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زمین کا ٹیکس پیداوار پر ایک تہائی سے ایک چوتھائی تک تھا۔ اب اکثر حصوں میں پچاس فیصدی ہے۔ بعض اوقات اس سے کہیں زیادہ۔ مسٹر گوکھلے نے اپنے بجٹ اسپیچ میں ایک نقشہ پیش کیا تھا جس میں انھوں نے یہ اعداد معتبرہ و دلائل قاطع دکھایا ہے کہ تمام متمدن دنیا میں کہیں کل پیداوار پر آٹھ فیصد سے زیادہ ٹیکس نہیں۔ ہندوستان میں پندرہ فیصدی سے پچیس فیصدی تک ہے نہ کہ جیسا مولوی صاحب فرماتے ہیں ''سوائے مستثنیٰ صورتوں کے سات یا آٹھ فیصدی کل پیداوار کا نہیں ہے'' اس میں کوئی شک نہیں کہ جو شرح لگان ۱۸۳۰ء میں تھی اس سے اب کسی قدر کم ہے۔ مگر اس زمانے کا آج ذکر کرنا ہی فضول ہے۔ ایسٹ انڈیا کو اپنے حلوے مانڈے سے کام تھا۔ رعایا کی جو حالت تھی وہ ناگفتہ بہ تھی۔ اس سلسلے میں ہم کو مصنف صاحب کے ایک ریمارک سے نہایت حیرت ہوتی ہے۔

فرماتے ہیں'' زمین بھی اگرچہ پبلک روینیو کے بڑے حصے کا سر انجام دیتی ہے بعض اوقات بالکل وہ اپنی حیثیت کے مناسب ٹیکس کی مقدار نہیں دیتی ... اس کی مشہور مثال بنگال ہے جس میں غلطی سے سو برس ہوئے کہ بندوبست استمراری ہوا ہے جس کے سبب سے نہایت زرخیز صوبے کے زمیندار سرکار کو غیر کافی مال گزاری دیتے ہیں اور ٹیکسوں سے بھی بری رہتے ہیں'' مولوی صاحب شاید دعا کرتے ہوں کہ بہت جلد بنگال کا استمراری بند وبست منسوخ کردیا جائے اور ہر صوبے میں مدراس کا رعیت داری طریقہ جاری ہوجائے۔ سارا زمانہ معترف ہے کہ استمراری بندوبست رعایا کے لیے آب حیات ہے اور مبارک ہوگا وہ دن کہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں بھی اس کا جواز ہوجائے گا۔ مگر مولوی صاحب کے اصول سیاسہ نرالے ہیں۔ بجائے ان بے معنی باتوں کے بہ حیثیت ایک مورخ کے مولوی صاحب پر یہ بتلانا فرض تھا کہ موجودہ طریقہ ٔ زمینداری وکاشتکاری کا ہندوستان کے مختلف صوبوں میں کیوں کر وجود ہوا۔ اور ان سے کیا کیا نفع اور نقصانات ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر مولوی صاحب موصوف پیرانہ سالی کی وجہ سے اس قدر دماغ سوزی نہیں کرسکے۔

روینیو کے دیگر ذرائع

مصنف صاحب نہیں چاہتے کہ گورنمنٹ ''مالا مال نہ رہے'' چناچہ وہ انکم ٹیکس اور نمک ٹیکس اور افیون روینیو، اور اسٹامپ کے روینیواور شراب اور دیگر مسکرات کے روینیو وغیرہ وغیرہ کو نہایت پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور ان سب ذرائع کو گورنمنٹ کی آمدنی کالازمی ذریعہ خیال کرتے ہیں بلکہ ان جملہ مخزنوں کو ناکافی سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں اوسط ٹیکس فی آمدنی صرف تین روپے ہے۔ افسوس! اگر یہ صحیح بھی مان لیا جائے تاہم کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ اس آبادی پر جس کی آمدنی ڈیڑھ روپیہ فی کس سے زیادہ نہ ہو دو ماہ کی آمدنی کا ٹیکس لگا دیا جائے۔

شراب کی آمدنی کی روز افزوں زیادتی سے مقتدایان قوم نالاں ہیں۔ مگر مولوی صاحب ان کی اصلاح ان الفاظ میں کرتے ہیں ''آبکاری کی آمدنی کی افزائش اس بات کو نہیں ثابت کرتی کہ آدمیوں کو شراب پینے کی عادت زیادہ ہوگئی ہے بلکہ وہ نتیجہ اس کا ہے کہ شراب پر شرح ٹیکس علی العموم بہت زیادہ بڑھا دیا گیا ہے۔'' اور خفیہ طور

پر ناجائز شراب بنانے کی ممانعت ہوگئی ہے۔ آپ انڈیا اور انگلستان کا مقابلہ کرتے ہیں کہ انگلستان میں ۲۴۲ آدمیوں کے اندر ایک شراب کی دوکان ہے اور انڈیا مین ۲۴۰۰ سے زیادہ آدمیوں پر ایک دوکان ہے۔ آبکاری کی آمدنی بالاستقلال بڑی آمدنی ہوگئی ہے۔ انگلینڈ میں فیض رساں آدمیوں نے ان اعداد کو دیکھ کر اپنی جہالت و لاعلمی سے گورنمنٹ پر اپنا بڑا غصہ نکالا کہ وہ اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے یہ شرارت کرتی ہے کہ ہندوستانیوں کے لیے مے نوشی آسان کرتی جاتی ہے۔ ایسی ہی ہندوستانیوں کو بھی رائے ہے مگر اس کی کچھ اصل نہیں۔''

اگر مولوی صاحب کو پیرانہ سالی اجازت دیتی اور وہ ایک روز کسی شراب خانے میں جاکر دیکھتے کہ کتنے جولاہے، شیخ، پٹھان بوتلوں پر بوتلیں لنڈھاتے جاتے ہیں۔ تو کچھ حقیقت کھلتی اور یہ لوگ وہ ہیں جو زمانہ پیشیں میں شراب کو حرام سمجھا کرتے تھے۔ تعجب ہے کہ مولوی صاحب ایسے متقی و متشرع ہوکر بھی گورنمنٹ کے اس ناجائز ذریعۂ آمدنی کو اچھا سمجھتے ہیں۔

روئی کے کپڑے پر محصول

اس مضمون پر مولوی صاحب نے چند تغیرات و کمی بیشی کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ''دسمبر ۱۸۹۴ء میں اس روئی کے کپڑے اور سوت پر جو ہندوستان میں ملیں بنائیں پانچ روپے فیصدی قیمت پر محصول لگ جائے۔'' اس بے انصافی پر مولوی صاحب نے زبان نہیں کھولی ہم ان کے بہت مشکور ہوئے کہ انھوں نے اس کے منصفانہ پہلو پر دُر فشانی نہیں کی۔ یہ وہ ٹیکس ہے جس کو ساری مہذب دنیا حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور جو انگریزی قوم کی خودغرضی اور سختی کی نہایت اچھی مثال ہے۔

ہندوستان کی تجارت ۔ مال درآمد و برآمد

یہ علم اقتصاد کا ایک مسئلہ مسلمہ ہے کہ اگر کسی ملک میں متواتر سالہا سال تک مال درآمد کی مقدار مال برآمد سے زیادہ ہوتو وہ ملک روز بروز مفلس و محتاج ہوتا جاتا ہے۔ علمائے علم اقتصاد مثل مِل و فاسٹ نے اس مسئلہ کو براہین ساطعہ سے ثابت کر دکھایا ہے اور اب کسی کو ان پر چوں و چرا کرنے یا مین میکھ نکالنے کی گنجائش نہیں ہے۔ مگر ہمارے مصنف صاحب فرماتے ہیں ''اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ اس بات کو

ضروری ماننا پڑتا تھا کہ وہی ملک فائدے میں رہتا ہے جس میں برآمد مال بہ نسبت در آمد مال کے زیادہ ہوتا ہے۔ یہ دقیانوسی رائیں ہیں۔" اس امر کے ثبوت میں آپ انگلستان کو پیش کرتے ہیں۔ آپ کو شاید نہیں معلوم کہ ہندوستان کی حالت انگلستان سے بالکل جدا ہے۔ اگرانگلستان کا مال در آمد برآمد سے زیادہ ہے تو اس کو زیادہ اندیشہ نہیں۔ کیونکہ وہ خام اشیاء کا ایک بے انتہا ذخیرہ اپنے ملک میں بڑھاتا جاتا ہے۔ ہندوستان صنعتی ملک نہیں اور جو تجارت ہے وہ بھی عملی طور پر سولہ آنہ انگریزوں کے ہاتھ میں ہے۔ نیل، شکر، چائے، قہوہ، روئی وغیرہ کی خرید و فروخت انگریز ہی کرتے ہیں۔ کلکتہ، بمبئی، مدراس، کانپور وغیرہ کی ملوں کے مالک بھی زیادہ تر وہی لوگ ہیں۔ ہاں اگر ان تجارتوں سے ملک کو فائدہ ہے تو اتنا ہے کہ چند غریب محتاجوں کے لیے روکھی روٹی کا سہارا موجود ہے۔ گو دس بیس پنکھا قلیوں کی جان جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ہندوستانی تجارت کا مسئلہ ایسا دلچسپ ہے کہ خواہ مخواہ طبیعت کو زیادہ واقفیت کی تلاش ہوتی ہے۔ مگر کتاب زیر تنقید سے مطلق اطمینان نہیں ہوتا۔ ایک منصف مزاج انگریز کا قول ہے کہ ہندوستان کی تجارتی تباہی جو انگلستان کے ہاتھوں ہوئی ہے اس کی مثال تجارت کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ ۱۸۲۰ء میں ہندوستان یورپ کو کروڑہا روپیہ کا مال روانہ کرتا تھا۔ ۱۸۲۰ء میں اس کی تجارتی سرد بازاری شروع ہوگئی اور ۱۸۵۰ء تک یہ ملک صنعت کے لحاظ سے معدوم ہوگیا۔ ہماری تجارت کا خون کرنے کے لیے انگلستان نے جو جو تدابیر کی ہیں ان کو آج پڑھ کر رونا آتا ہے۔

چیمبرس آف کامرس جو کانپور، کلکتہ وغیرہ میں قائم ہیں ان سے پبلک کو فائدہ نہیں ہوتا۔ ہاں وہ انگریزی تجات کے خیالات کا آلہ سمجھے جاتے ہیں۔ انھیں کی تحریک سے تبت کومشن روانہ ہوا اور غالباً انھیں کے فائدے کے لیے اب فارس سے تجارتی تعلقات بڑھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اگر ان چیمبروں سے ملک کو کچھ فائدہ ہے تو اتنا ہی ہے کہ وقتاً فوقتاً دس پانچ لاکھ روپے کا مصارف جنگ میں اضافہ ہوجاتا ہے اور ہزار دو ہزار آدمی قربان ہوجاتے ہیں۔

مصنف صاحب نے اس ضمن میں ان تجاویز اور مشورات کا ذرا بھی تذکرہ نہیں کیا جو ہندوستان کی تجارت کو فروغ دینے کے لیے گورنمنٹ کے روبرو پیش کیے جاتے ہیں۔

ان میں سے ایک تجویز وہی ہے جس پر عمل کرنے سے گورنمنٹ جرمنی نے جرمن شکر کو ہندوستانی بازاروں میں یہ قابلیت بخشی ہے کہ دیسی شکر کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرے۔

تعلیم

مصنف نے مختلف کالجوں کے قائم ہونے، انگریزی تعلیم کے رواج پانے اور تعلیم کے رفتہ رفتہ ترقی پانے کا مختصر تذکرہ کیا ہے۔ تعلیم نسواں کے متعلق فرماتے ہیں کہ ابھی عام رائے اس کے خلاف ہے جو ایک حد تک صحیح ہے۔ اسی باب میں یہ بھی لکھا ہے کہ زراعت پیشہ آبادی میں تعلیم کبھی نشو ونما نہیں پاسکتی۔ یہ خیال بالکل دقیانوسی ہے۔ آسٹریلیا، کناڈا خاص طور پر زراعتی ملک ہیں۔ مگر وہاں تعلیم میں اعلیٰ درجے کی ترقی ہے۔ گو اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلیم کے اعتبار سے زراعتی ملک کبھی صنعتی ملک کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ جبری تعلیم کے مسئلے پر جو ایک عرصے سے معرض بحث میں ہے آپ بالکل خاموش ہیں۔ شاید اس وجہ سے کہ یہ کانگریس کی تجاویز کا ایک جزو ہے۔ صرفۂ تعلیم کی نسبت اتنا ہی لکھا ہے کہ ''گورنمنٹ اس سے زیادہ نہیں کرسکتی۔'' اسی سلسلے میں علی گڑھ کالج کا مختصر تذکرہ لکھا ہے اور اپنے پیشوا و مرشد سرسید احمد خاں کو بھی دوچار کلمات خیر سے یاد کیا ہے۔ صنعتی تعلیم، زراعتی تعلیم وغیرہ کا بھول کر بھی ذکر نہیں کیا۔

کالج کی تعلیم سے آپ سخت بدظن ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں اس کا کچھ اچھا اثر نہیں ہوا۔ آج تک کوئی عالی دماغ نہیں پیدا ہوا۔ برا نتیجہ جو ہوا وہ یہ ہے کہ لوگ پڑھ پڑھ کر گورنمنٹ پر نکتہ چینی کرتے ہیں جس کو مولوی صاحب گناہ کبیرہ خیال کرتے ہیں۔

کانگریس

کانگریس مولوی صاحب کی آنکھوں میں کھٹکتا ہوا کانٹا ہے۔ چنانچہ آپ نے کتاب کے آخری صفحوں میں اس پر چند لفظی تیر سر کیے ہیں۔

''ہندوستانی تعلیم یافتوں نے ایک نیشنل کانگریس بنائی ہے جس میں کبھی کبھی پولیٹکل مباحثے بڑی شد ومد سے ہوتے ہیں۔ یہ مناظرے مباحثے اکثر طالب علموں کے سے ہوتے ہیں۔ برٹش گورنمنٹ کے برخلاف ایسے مسائل بھی بے سرو پا پیش ہوتے ہیں کہ ہندوستانی فائی نینس کا اہتمام کریں اور برٹش گورنمنٹ ملک کی شاہانہ محافظت

کرے۔ غالبًا ایسے پراگندہ و پریشان خیالات خود بخود مردہ ہوجائیں گے یا گورنمنٹ ان کو افسردہ کردے گی۔"

مولوی صاحب کو خبر نہیں کہ وہ پرمغز مباحث جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں ہوتے ہیں ایک مرتبہ مسٹر بدر الدین طیب جی کی پریسیڈنٹی میں منعقد ہوچکے ہیں اور مسٹر موصوف کانگریس کی روح رواں ہیں۔ مسٹر حیدری مسٹر سیانی مرحوم، مسٹر طیب جی اور نواب مسٹر محمد حسین مدراسی جیسے جیسے بزرگوار کانگریس کے معاون ہیں۔ ایسے دانشمندوں کو طالب علم یا طفل مکتب کہنا مصنف صاحب ہی کا گردہ ہے۔

نہایت افسوس ہے کہ مسلمان رہنمایان قوم ابھی تک زمانہ و طرز زمانہ پر ذرا بھی نظر نہ ڈال کر آنکھ مونڈے سرسید احمد کے بتلائے ہوئے راستے پر چلے جا رہے ہیں۔ مولوی صاحب سرسید کے ارشد تلاذہ میں ہیں اور غالبًا اپنی حیات میں اپنے استاد مرحوم سے اختلاف کرنا بیوفائی خیال کرتے ہیں۔

ہم ذیل میں اردوے معلٰی کی ایک فارسی تحریر سے اقتباس کرتے ہیں جو ایک بزرگوار نے امریکہ سے لکھ کر بھیجا ہے اور جو مارچ کے نمبر میں شائع ہوا ہے۔ نہایت محققانہ تحریر ہے۔

"انڈین نیشنل کانگریس تنہا ہماں ذریعہ ہست کہ عرض حال ہمہ ہندوستانیان را بسمع قبول پارلیمنٹ انگلستان خواہد رسانید۔ فریاد وزاری یک فرقہ یا دو فرقہ مانند آواز طوطی در نقار خانہ میباشد۔ اما وقتیکہ ہمہ ابنائے ملک باتفاق حال زار خویش را بیک آواز ادا کنند یک صدای تندر (گرج) آسا آفاق عالم را گیرد... ہرچندکہ درین بیت سال گذشتہ دعائے کانگریس قبول نہ شد ... اما انڈین نیشنل کانگریس در نظر عالم متمدن اعتبارے حاصل کردہ است۔ و کوشش بانیائش ہم رایگاں نرفتہ۔"

ہندوؤں کا حال

کتاب کے آخری صفحوں میں مولوی صاحب نے ہندوؤں کے حال زار پر بھی عنایت فرمائی ہے۔ آپ نے جو اس قوم کی تصویر کھینچی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ قوم بالکل وحشیوں کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ ازسرنو ستی کی رسم کو جاری کرنا چاہتے ہیں۔ دخترکشی کرتے ہیں، انسانی قربانیاں دن دہاڑے کرتے ہیں۔ بیواؤں کو

زندہ در گور کرتے ہیں اور ان کی اصلاح میں ذرا بھی کوشش نہیں کرتے۔ ہادیان قوم اصلاح تمدن سے گھبراتے ہیں اور خدا جانے کیا کیا مزخرفات لکھے ہیں۔ ہم باوجود خوف طوالت کے اس موقع پر مولوی صاحب کی کتاب سے چند اقتباسات کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

''انگریزی حکومت کی حالتیں ایسی ہیں کہ ان عہدوں پر جن میں خوف سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے یورپین ہی مقرر ہوں۔''

ستی ''اگر برٹش گورنمنٹ اپنی دیکھا بھالی و خبرداری میں ذرا سی بھی غفلت کرے تو مشکل سے کوئی پرووِنس (صوبہ) ایسا ہوگا کہ جس میں یہ ظالمانہ وحشت ناک مراسم بڑی شد و مد سے نہ ہونے لگیں۔ بہت تھوڑے ہی ہندو ایسے ہوں گے جن کو ستی کا موقوف ہونا پسند ہو۔''

انسانی قربانی۔ ''ان اضلاع میں جہاں تعلیم نے سب سے زیادہ ترقی کی ہے کالی دیوی اب تک انسانی قربانی کا دعویٰ کیے جاتی ہے۔ اس کی مثالیں واقع ہوتی ہیں۔''

یہ خوفناک واقعات جو ہوتے ہیں (دختر کشی، و انسانی قربانی) ان پر عام لعنت ملامت نہیں کی جاتی اور گورنمنٹ جو ان کاموں کے بند کرنے میں کوشش کرتی ہے اس کو لوگ پسند نہیں کرتے اور تعلیم یافتہ آدمی تک بھی گورنمنٹ کے ساتھ اس میں دلسوزی نہیں کرتے۔ قدیمی رسموں میں گورنمنٹ جو مداخلت کرتی ہے اس سے ہندو نہایت نفرت رکھتے ہیں۔ خواہ یہ رسم ان کی اپنی ہو یا نہ ہو۔''

''لیکن کم بختی تو یہ ہے کہ ان تمدنی و معاشرتی کے سوالات میں گورنمنٹ کو بہت ہی کم صلاح یا مشورہ دیا جاتا ہے۔''

''لیکن یہ بات آسان نہیں ہے کہ ایسی مثالیں دی جائیں کہ کسی ذی جاہ و صاحب ثروت ہندوستانی نے اپنے تئیں تمدن و معاشرت کی ترقی میں پیشوا و مقتدا بنایا ہو۔''

ہم نے ان اقتباسوں کے ساتھ تردیدی نوٹ لکھنا ضروری نہیں سمجھا ان کو دہرا

دینا ہی ان کی تردید کرنا ہے۔ ناظرین ان رایوں کے بلاوساطت غیرے منصف بن سکتے ہیں۔ ہم کو اس کا مطلق افسوس نہیں ہے کہ ہندوؤں پر کسی نے ایسے بیجا حملے کیے۔ ہاں افسوس اس کا ہے کہ جس نے حملے کیے وہ بوجہ اپنی پیرانہ سالی کے دندان شکن جوابات کا متحمل نہ ہوسکے گا۔

علاوہ امور مندرجہ بالا کے اس کتاب میں نظام گورنمنٹ، عیسائی تعلیم اور اس کا اخلاق پر اثر، وضع قوانین، کونسل امپیریل و پراونشل، مینوسپل اصلاحیں سیاہ ہند۔ مصارف گورنمنٹ وغیرہ وغیرہ پر خامہ فرسائی کی گئی ہے جو ہر شخص Citizen of India اور Strachey's British Empire کے مطالعہ سے بخوبی معلوم ہوسکتا ہے۔

عبارت و طرز تحریر

گو مولوی صاحب دہلوی ہیں اور اردو زبان کے ماہر۔ گو انھوں نے اپنی ساری قیمتی زندگی تصنیف و تالیف ہی میں صرف کی ہے مگر افسوس ہے کہ یہ کتاب ادبی حیثیت سے اس عزت کی بھی مستحق نہیں جو اس کو تاریخی حیثیت سے حاصل ہے۔ انگریزی کے بڑے بڑے مغلق الفاظ بلا کسی تشریحی نوٹ کے لکھ دیے گئے ہیں جن کو سمجھنے کے لیے علاوہ عربی و فارسی کے انگریزی کی بھی اچھی استعداد ہونی چاہئے۔ بعض بعض مقامات پر ایسے ایسے پیچیدہ جملے لکھے ہیں کہ ان کے معنی ذہن میں مطلق نہیں آتے۔ خصوصاً جہاں انگریزی کتابوں سے ترجمے کیے ہیں وہاں کی عبارت بالکل مہمل ہوگئی ہے۔

خاتمۂ کتاب

مولوی صاحب نے اپنی کتاب کے خاتمے پر یوں لکھا ہے ''اب میں اپنی کتاب کو ختم کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جو ضعیف العقل آدمی برٹش گورنمنٹ کی خوبیوں و نیکیوں اور نعمتوں و برکتوں کے سمجھنے میں مغالطے و دھوکے کھاتے ہیں۔ اس کتاب کے پڑھنے سے ان کے دلوں سے وہ مغالطے اور دھوکے دور ہوجائیں گے'' ہم کو واقعی افسوس ہوگا اگر مولوی صاحب کے یہ فقرے گورنمنٹ تک نہ پہنچے کہ جس کے وہ اس قدر مداح ہیں۔

(۲) محاربات عظیم

اس کتاب میں مولوی صاحب نے وہ تمام اہم و قابل یادگار واقعات و مہمات قلم بند کیے ہیں جو ملکہ معظمہ مرحومہ کے عہد سلطنت میں انگلستان میں واقع ہوئے مگر یہ کتاب تاریخی اعتبار سے ایسی کم وقعت ہے کہ اس کو مولوی صاحب جیسے جید و تجربہ کار مصنف کے ساتھ منسوب کرتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے۔ موجودہ زمانے میں تاریخ نویسی کا معیار نہایت اعلیٰ ہوگیا ہے۔ اب کسی واقعے کو محض سادہ زبان میں بیان کردینے کا نام تاریخ نہیں ہے۔ مورخ کا فرض ہے کہ وہ جس واقعے کو لکھے اس پر اچھی طرح قادر و حاوی ہو۔ اس پر صائب رائے دے سکے اور اس کے اسباب و نتائج پر مدلل بحث کرے۔ اس حیثیت سے کتاب زیر تنقید بہت کم امتیاز کی مستحق ہے۔ اس میں کسی واقعے پر مبسوط بحث نہیں کی گئی بلکہ ان کو چند تاریخوں سے اخذ کرکے سرسری طور پر لکھ دیا ہے۔ ہاں جنگ کریمیا کے ساتھ خاص رعایت کی گئی ہے۔ مگر کسی جنگ یا محاصرے کی تاریخ موثر نہیں ہوسکتی تاوقتیکہ عرصۂ جنگ کی تصویر یا اس کا صحیح نقشہ نظروں کے سامنے موجود نہ ہو۔ اس کتاب میں اس قسم کی ایک تصویر یا ایک نقشہ بھی نہیں ہے جس نے اس کی تعلیمی وقعت کو بہت کم کردیا ہے۔ علاوہ اس کے چند اور امور میں جن کا اعادہ کرنا مناسب ہے۔

(۱) جنگ فرانس و پروشیا جس نے دنیا کی تاریخ میں شہرت حاصل کی ہے نہایت اختصار کے ساتھ لکھی گئی ہے۔

(۲) مسٹر گلیڈسٹن کے بل متعلقہ تعلیم پر جو ایک قابل یادگار واقعہ ہے کچھ روشنی نہیں ڈالی گئی۔

(۳) ترکی کے متعلق گلیڈسٹن اور لارڈ بکنیسفیلڈ کی پالیسیوں میں جو فرق بین ہے اس کو کہیں ظاہر نہیں کیا۔

(۴) بعض بعض مقامات پر جہاں خرج یا آمدنی کا ذکر کیا ہے پونڈ میں کیا ہے۔ روپیہ میں ہونا چاہئے تھا۔

(۵) انگریزی اسماء کے مقابل رومن رسم الخط میں نام لکھنا چاہئے تاکہ تلفظ میں غلطی نہ ہو۔

زبان اس کتاب کی ''آئین قیصری کی زبان سے بھی گری ہوئی ہے۔ بڑے

بڑے اور مشکل الفاظ بلا ضرورت رہنے دیے گئے ہیں۔ مثلاً قوت و سطوت و شوکت و صولت چاروں ہم معنی الفاظ بار بار ساتھ ساتھ آئے ہیں۔ اسی طرح استیلا و استعلا وغیرہ اور بعض بعض مقامات پر تو جملے ایسے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتے۔ غالباً یہ اس وجہ سے ہے کہ مصنف نے انگریزی تاریخ کو سامنے رکھ کر ان کا خلاصہ کیا ہے۔ اگر واقعات پر حاوی ہو کے لکھتے تو وہ انگریزی الفاظ کے غیر مانوس ترجمے نہ نظر آتے جو اکثر ملتے ہیں۔

''زمانہ'' اپریل ۱۹۰۵

خاندان مشترکہ

ان تجاویز کے زمرے میں جو اصلاح معاشرت سے تعلق رکھتی ہے، خاندان مشترکہ کا مسئلہ بھی نہایت اہم و نتیجہ خیز ہے۔ مگر برعکس دیگر مسائل کے ابھی تک اس پر مصلح قوم کے سحر نگاریوں اور آتش بیانیوں کا جادو نہیں چلا۔ کئی مسئلوں کی اہمیت تو امر مسلمہ ہوگئی ہے اور ان کا کچھ نہ کچھ عملی اثر بھی ہو چلا ہے۔ مسئلہ ازدواج بیوگان کو ہی لے لیجئے جو ابھی تک اس کا رواج عام نہیں ہوا اور نہ ایک صدی تک ہم یہ امید کرنے کی جرات کرسکتے ہیں۔ تاہم گاہے ماہے ہم کو ایسی شادیوں کی مثالیں مل جایا کرتی ہیں۔ اور گورنمنٹ نے بھی ازدواج بیوگان کا ایکٹ پاس کرکے ان تمام تردداد و تنازعات کو جو ایسی شادیوں سے ضرور واقعے ہوئے، رفع کر دیا۔ ایک اور مسئلہ انسداد شادی صغر سنی کا ہے۔ اس امر میں ریفارمروں کو قابل اطمینان اور قابل مبارک باد کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ نہ یہ کہ چند ہندوستانی سربر آوردہ ریاستوں نے اس کی قانونی امداد کی، بلکہ اصلاح معاشرت کے ہر جلسے میں اس پر بڑے شدومد کے ساتھ بحث کی جاتی ہے۔ اور کوئی ایسی مجددانہ جماعت نہ ہوگی جس نے اس مسئلے کا عملی ہیبت میں لانے کی کوشش نہ کی ہو۔ لہٰذا اور بھی چند مسائل ہیں جو اب مناظرہ و مباحثہ کی سخت مدارج طے کرکے امر مسلمہ کے پائے تک پہنچ چکے ہیں۔ مگر خاندان مشترکہ کا مسئلہ کچھ ایسا پیچیدہ ہے اور ہمارے قومی عادات گذشتہ کا ایک ایسا اچھا نمونہ ہیں کہ ان کے خلاف کچھ کہتے یا لکھتے طبیعت ہچکچاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ طرز معاشرت و طرز تعلیم نے اس کے اثر کو کمزور کرنا شروع کر دیا ہے۔ مگر تاہم ابھی تک ماسوائے ان حضرات کے جو غیر ممالک سے اعلیٰ درجے کی تعلیم پاکر آئے ہیں۔ متوسط طبقے میں اس کا رواج اگر بڑھتا نہیں ہے تو گھٹ بھی نہیں رہا ہے۔ اس کے کئی

اسباب ہیں۔ اصلاح کے جتنے دوسرے مسئلے تھے، ان کی تائید و تسکین کم و بیش مذہبی کتابوں سے دی گئیں، علمائے دین کے فتوے لیے گئے۔ یہ زور دے کر کہا گیا کہ ہم ریفارم کے نئے رواج نہیں پھیلانا چاہتے، بلکہ سلف کے رواجوں کے مردہ قالب میں از سرِ نو روح پھونک رہے ہیں۔ مسئلہ جوائنٹ سسٹم کی تائید کسی کتاب سے نہ ہو سکی، دوم یہ کہ دوسرے مسئلوں کا وجود مدت دراز سے ہیں۔ مثلاً عقد بیوگان کا مسئلہ ایشور چندر وڈیا ساگر مرحوم و مغفور کی دور بینی کا نتیجہ ہے۔ مسئلہ زیر بحث کی عمر ابھی بیس بائیس سال سے زیادہ نہیں، اور اس زمانے میں بھی اس کی پرورش و پرداخت پر کافی توجہ نہیں دی گئی۔ سب سے بڑی رکاوٹ جو اس مسئلے کی ترقی میں ہوتی وہ غالباً ہمارے طرز معاشرت کی جانب سے ہوئی۔ کیونکہ برعکس دیگر مسائل کے اس میں دستور اعلان کے اصولوں میں نہایت قریبی تعلق ہے۔

یہ تو تمام باخبر اصحاب جانتے ہیں کہ ہر ملک کے تہذیب کا ابتدائی زمانہ جنگ و جدل کے اوصاف سے متصف ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت رزق کا دارومدار حرب و ضرب پر ہوتا ہے۔ یہی حال ہندوستان کا بھی تھا، جب کسب معاش کا بجز شکار کے اور کوئی دوسرا وسیلہ نہ ہو اور شب و روز وحشی جانوروں کے حملے کا اندیشہ ہو تو تقاضائے فطرت یہی ہے کہ انسان وحشی بن جائے۔ چنانچہ اس وقت آدمیوں اور جانوروں میں سوائے شکل و شباہت کے کوئی دوسرا فرق نہ تھا۔ درندوں کی طرح ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہوتا تھا۔ بات بات پر خون کی ندیاں بہتی تھیں۔ مرنا مارنا ایک دلچسپ مشغلہ سمجھا جاتا تھا۔ ایسی حالت میں لازم آیا کہ انسان بھی جانوروں کی طرح جتھے بنا بنا کر رہے، اور اپنی جماعت کو گزندوں سے بچا لے۔ جب تہذیب کی یہ حالت ہو تو عورتوں کی حالت کا کیا ذکر۔ وہ کنیزیں خیال کی جاتی تھیں، اور ان کا کام تھا کہ مردوں کو کھلائیں پلائیں اور حتی الوسع ان کی خدمت کریں۔ حقوقِ نسواں تہذیب کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ نشو و نما پاتے ہیں۔

امریکہ کے مشہور فلاسفر ایمرسن کا قول ہے کہ ہر ایک ملک کی تہذیب کا سب سے اعلیٰ قیاس یہ ہے کہ وہاں عورتوں کی کیا حالت ہے۔ یہ رسم کسی زمانے میں بقائے وجود کی غرض سے نکالی گئی تھی ۔ اب بگڑتے بگڑتے خاندان مشترکہ کی موجودہ حالت کو

پہنچ گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں زمانہ قدیم میں یہی رسم ہمارے وجود کے قائم رکھنے کا باعث تھی۔ اسی کی پابندی پر زندگی کا دارومدار تھا اور وہ اب ہمارا طرز معاشرت بالکل بدل گیا ہے۔ تاہم اس رواج کی پابندی سے ملک کو بڑا فائدہ ہے۔ ہمارے یہاں بیوائیں کسب معاش کے لیے مجبور نہیں کی جاتیں۔ اگر ایک گھر میں چار بیوائیں ہیں اور کمانے والا صرف ایک، تو ان چاروں کی پرورش کرتا ہے، اور اگر ایسا نہ ہو تو زمانہ اس کو مطعون کرتا ہے۔ یورپ میں یہ حال ہے کہ اگر شوہر نے مرتے وقت تک اپنی عیال کی کفالت کا کوئی معقول انتظام نہ کیا تو بے چاری بیوہ کی حالت نہایت نازک ہو جاتی ہے۔ عزیز و اقارب اس کی دست گیری کرنے کو رحم خیال کریں تو کریں فرض نہیں خیال کرتے۔ وہ تحصیل معاش کے لیے در بدر خاک چھانتی پھرتی ہے تاوقتیکہ اس کا کوئی دوسرا خریدار پیدا نہ ہوجائے۔ اور اگر وہ بدقسمتی سے جوانی سے گری ہوئی ہے تو بیچاری کی بقیہ زندگی روتے ہی کٹتی ہے۔ بوڑھے جوان بیٹے کے ہوتے چکی پیستی ہے۔ یہ اسی رسم کی پابندی کا فیض ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کی اتنی تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں ماں باپ کے سامنے حقہ پینا یا ہنس کر بولنا کنگھی آئینہ کرنا بے ادبی میں داخل ہے۔ ہم چاہے اپنی جان دے دیں، مگر والدین کا کہنا نہیں ٹالتے۔ غرض اسی رسم نے سخاوت، غربا پروری، نفس کشی اور بزرگوں کی تعظیم نیز دیگر خصائل حمیدہ ہماری شرست میں خمیر کردیے ہیں۔

مگر جب ہم ان فائدوں کا ان نقصانات عظیم سے مقابلہ کرتے ہیں جو اس رواج کے باعث پیدا ہوگئے ہیں کہ تو مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ اس رسم کی پابندی ہمارے لیے جاں گزاں ہے۔ ایک تجربہ کار فلاسفر کا قول ہے کہ جس قوم کے افراد کو سدا خاندانی خوشیاں میسر نہیں ہیں تو وہ کبھی پائے عروج پر نہیں پہنچ سکتی۔ اور جس نے یہ کہا بہت ٹھیک کہا ہے کہ ہم لوگ خاندانی مسرتوں سے محروم ہیں۔ ہمارے گھروں میں آئے دن بم چخ مچی رہتی ہے۔ کبھی ساس بہو سے منہ پھلائے بیٹھی ہے، کبھی بہو ساس سے روٹھی ہے، نند اور بھاوج کے جھگڑے ہمارے یہاں گیتوں، رقصوں اور کہانیوں میں عام طور پر مشہور ہے۔ اگر گھر میں بے چاری ایک بہو ہے اور مردانے میں دس آدمی تو وہ

ان دسوں کی کنیز سمجھی جاتی ہے۔ ان کے لیے کھانا پکانا، ان کی باہمی ضروریات کو رفع کرنا اس کا فرض کہا جاتا ہے۔ بیشمار ایسی بیویاں ہوں گی جو اس زندگی پر کنیزوں کی زندگی کو ترجیح دیں اور جو کہیں گھر میں کوئی بوڑھی ساس ہوئی تو اس گھر کی کیفیت نہ پوچھو۔ دنیا میں کوئی بادشاہ ایسا مطلق العنان، ایسا خود رائے ، ایسا اطاعت خواہ ایسا خوشامد پسند، ایسا ظالم اور کٹر اور ایسا زود رنج اور اپنے رتبے کو ایسے حاسدانہ نگاہوں سے دیکھنے والا نہ ہوگا۔ جیسی یہ بوڑھی ساس ہوتی ہے اس کے مارے بیچاری بہوؤں کی زندگی دوبھر ہوجاتی ہے۔ اور تاوقتیکہ اس کے کوئی بچے نہ ہوجائیں اور ان کی بیویاں گھر میں نہ آجاویں اس بہو کی قسمت واقعی ناگفتہ بہ ہوتی ہے۔ سدا نازک اندام، نئی نویلی بہوئیں ان ہی مظالم کا عین جوانی میں شکار ہوجاتی ہیں۔ اور سدا اگر مر نہیں جاتیں تو اپنی تندرستی ضرور کھو بیٹھتی ہیں۔ بیچارہ نوجوان شوہر اپنی ماں کے مقابلے میں بیوی کی ذرا بھی طرفداری نہیں کرسکتا۔ اور اگر کرے تو کچھ تو اس کو خود ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ اور کچھ اہل زمانہ اس کو بدنام و رسوا کرنے لگتے ہیں۔ جب عورت کی زندگی ایسی ہو کہ اس کو دلی خوشیاں حاصل نہ ہوتی ہوں اسے کبھی آرام سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا ہو، وہ جب بیٹھتی ہو تو گھونگھٹ نکال کر اور سات پردوں کے اندر تو وہ خود کیوں کر تندرست رہ سکتی ہے؟ اور اس کی اولاد کیوں کر تندرست ہوسکتی ہے اور وہ اپنے شوہر کو جو بیچارہ سارے کنبے کی معاش کی فکر میں اپنی جسم کو گھلا رہا ہو کیا خوش کرسکتی ہے۔ شوہر بیچارہ ساس اور بہو، نند اور بھاوج کے جھگڑے سن سن کر اپنی قسمت پر روتا ہے۔ غرض سارا خاندان ناخوشی، بدمزاجی اور اداسی کا مسکن معلوم ہوسکتا ہے۔

یہ تو خانگی زندگی کا حال ہے، تمدنی نقصانات جو ملک کو اس رسم سے ہوتے ہیں ان کا تو کچھ شمار ہی نہیں۔ ہمارے یہاں بہت کم ایسے کمانے والے ہوں گے جن کے گھر پر آئے دن دس پانچ مہمان اڑے نہ رہتے ہوں۔ کوئی خالہ زاد بھائی ہے کوئی ماموں زاد بھائی کوئی پٹی دار ہے، کسی کا سسرال سے تعلق ہے۔ غرض بیچارہ صاحب خانہ گو اتنے مہمانوں کے تصرفات کے بوجھ سے دبا جاتا ہے مگر اشارتاً کنایتاً کبھی اپنی بے بسی کا اظہار نہیں کرسکتا۔ سینکڑوں اچھی تنخواہ والے تو انھیں میں تباہ ہوجاتے ہیں۔ جب ہماری تمام ضروریات زندگی بلا ہاتھ پیر ہلائے رفع ہوجائیں تو ہم کو کیا غرض ہے

کہ خواہ مخواہ محنت و مشقت کریں۔ ان میں زیادہ تر تو ایسے ہوتے ہیں جو اپنے کو عالی خاندان و عالی دودمان بتلاتے ہیں۔ اور محنت و مشقت کرنے کو کسر شان سمجھتے ہیں۔ اگر مفت کی پھلوریاں ملنے کی امید نہ ہوتو یہی حضرات جھک ماریں اور ٹوکرے ڈھوئیں۔ اس طرح کاہلوں کی مدد کرکے خاندان مشترکہ کاہلی اور آرام طلبی کی تحریک کرتا ہے۔ اتنا ہی نہیں آرام طلبی اور مفت خوری کے نتیجے ہمیشہ برے ہوتے ہیں۔ یہ حضرات ہمیشہ ناکردنی حرکت کیا کرتے ہیں۔ ان کے خیالات نہایت گندے ہوتے ہیں، ان کے افعال نہایت نیچ، خود تو کیا بدنام ہوں گے صاحب خانہ کو البتہ بدنام کرتے ہیں۔ بلامشقت کی روٹی ہمیشہ خون فاسد پیدا کرتی ہے۔ صاحب خانہ جب تک جیتا ہے، انھیں لواحقین کی ساز و پرداخت میں اپنی تمام کمائی صرف کرتا ہے اور جب یکا یک پنجہ اجل میں گرفتار ہوجاتا ہے تو اس کے بال بچوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔

رعایا کی تمدنی حالت کبھی مستقل اور اطمینان بخش نہیں ہوسکتی۔ تاوقتیکہ ہر فرد بشر اپنی ضرورتیں آپ رفع کرنے کی کوشش نہ کرے۔ ہر شخص کو آزادی حاصل کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ دوسرے کی دی ہوئی روٹی کھانے سے چاہے اور طرح کا آرام ہو مگر انسان کا نفس متمول، ڈرپول اور دبو بن جاتا ہے حالانکہ ہر ایک قوم کی عظمت و عروج کے لیے ضروری ہے کہ اس کے افراد جوش آزادی اور خود مختاری سے بھریں۔ اور جب اپنے ہاتھوں سے آزادی کو چھنتے ہوئے دیکھیں تو اس کو ہاتھ سے نہ جانے دینے کی پرزور کوشش کریں۔ جس شخص نے خود اپنی روزی حاصل نہیں کی وہ آزادی کا مزہ نہیں جان سکتا اور جب آزادی کے مزہ سے واقف نہیں ہے تو اس کو اس سے محروم ہونے کا افسوس کیوں کر ہوسکتا ہے۔ اب اس کشاکش کے زمانے میں جب گورنمنٹ کل اختیارات اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی ہے رعایا کا صبر وتحمل اور بزدلی نقصانات سے خالی نہیں۔ ضرورت ہے اس کی کہ قوم میں آزادی کی روح آجائے، کیونکہ جب تک یہ جوش ساری قوم کے دلوں میں موجزن نہ ہو، قومی اتحاد و اتفاق ناممکن ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ جس شخص میں اپنے پیٹ کو پالنے کی قوت نہیں، اس سے قومی بہبود کی کیا امید کی جاسکتی ہے۔ مفت خوری انسان کو بے شرم، بے حیا، بزدل اور خوشامدی بنا دیتی ہے۔

بعض اوقات خاندان مشترکہ کے مخالفین سے اعتراضاً کہا جاتا ہے کہ ابھی ہماری قوم اس رسم کو اٹھا لینے کے لیے مطلق تیار نہیں ہے۔ کیونکہ درحالیہ ایک کی کمائی دس کھاتے ہیں روز گار عنقا ہو رہا ہے اور جبکہ متلاشیان روزگار کی تعداد اور بڑھ جاوے گی تب تو اور بھی مشکل آپڑے گی۔ یہ اعتراض بالکل بے جا ہے۔ روزگار انسان کے پاس نہیں آتا، انسان خود اس کی تلاش کرتا ہے۔ جب ہم روکھی روٹی اور پتلی دال پر قناعت کرکے دوسرے کے ماتھے کھانے لگتے ہیں تو وہ حوصلہ اور وہ تمکنت جو آزاد مزاجوں میں ہوتی ہے، مردہ و افسردہ ہوجاتی ہے۔ اگر آدمیوں کو اپنی بیکاری و بے شغلی محسوس ہونے لگے تو وہ ضرور کسب معاش کے نئے راستوں کی ٹوہ لگالیں اور قوم کے مالدار و خوشحال اشخاص دوسروں کے بھار سے ہلکے ہوکر اپنا اپنا پسماندہ حرفت و صنعت کی ترقی میں خرچ کریں، سرمایہ کی بڑھتی ہوئی کارخانے کھلنے لگیں اور تحصیل معاش کا راستہ وسیع ہوجائے۔ تیس کروڑ کی آبادی میں کم سے کم دس کروڑ عورتیں اور پانچ کروڑ لڑکے ایسے ہیں جو کوئی کام نہیں کرسکتے۔ اگر مفت خوروں کی تعداد پانچ کروڑ اور بڑھا دیجیے تو بیکار طبقہ بیس کروڑ ہوجاتا ہے۔ باقی دس کروڑ کی آبادی میں کتنے ہی بوڑھے، کتنے ہی مریض، کتنے ہی ڈاکو، کتنے ہی بھک منگے، کتنے سادھو شامل ہیں۔ اس حساب سے کمانے والوں کی تعداد مشکل سے پانچ کروڑ تک پہنچتی ہے۔ اور ایک آدمی کو بہ حساب اوسط چھ آدمیوں کی پرورش کرنا پڑتی ہے۔ پروفیسر منوہر لال صاحب زتشی نے 'زمانہ' کے دسمبر۔ نومبر میں اس مضمون پر لکھتے ہوئے یوں فرمایا ہے کہ ''کسی رواج کے حسن و قبح کو جانچنے کے لیے ہم دو معیار مقرر کرسکتے ہیں۔ اول یہ کہ وہ افراد کو خوشی و خرمی سے زندگی بسر کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ عام جماعت میں متفقہ کوشش یا مل کر کام کرنے کی قابلیت پیدا کرتا ہے۔''

سطور مندرجہ بالا میں ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اس رسم سے ان دو فائدوں میں ایک بھی حاصل نہیں ہوتا۔ پس جتنی جلد قوم اس رسم کو خیر باد کہے اتنا ہی اچھا ہے۔

دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس رسم کے اٹھ جانے سے عزیز و اقارب میں وہ مضبوط رشتہ قائم نہ ہوگا جو اب ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ وہ دن جلد آئے جب

یہ رشتے کمزور ہوجائیں۔ کیونکہ اس سے قوم کو بے حد نقصان ہو رہا ہے۔ یورپ کا ایک بیس برس کا نوجوان گھر سے ہزاروں میل کے فاصلے پر بلا کھٹکے چلا جاتا ہے نہ اس کی ماں روتی ہے نہ باپ آنسو بہاتا ہے۔ ہمارے یہاں یہ حال ہے کہ اگر ماں سنے کہ بیٹا باہر جا رہا ہے تو وہ مہینوں سے دانا پانی ترک کردے اور یا تو بیٹے کو روک لے یا تو اپنی جان دے دے۔ نیچی ذاتوں میں خاندان مشترکہ عملاً معدوم ہے کیونکہ ایک آدمی کی کمائی صرف اسی کو کافی ہوسکتی ہے۔ گھر کا ہر شخص اپنی روزی کماتا ہے عورتیں اور بچے بھی بیکار نہیں بیٹھ سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں حوصلہ اور جوش باقی ہے۔ لاکھوں اہر، چمار، کرمی، کمہار اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر افریقہ، امریکہ کی راہ لیتے ہیں اور وہاں روپیہ کما کر اپنے ملک کو مالا مال کرتے ہیں۔ نہ تو ماں دامن پکڑ کر روتی ہے اور نہ باپ۔ برعکس اس کے شرفاء برما یا رنگون اسی حالت میں جانا پسند کرسکتے ہیں جب اپنے وطن میں روزی ملنے کا کوئی سہارا نہ ہو اور افریقہ یا امریکہ کا نام سن کر تو ان کے ہوش ہی پرائے ہوجاتے ہیں۔ اس بودے پن کی یہی وجہ ہے کہ وہ خاندان مشترکہ کی قیود میں اچھی طرح جکڑے ہوئے ہیں۔

اس رسم کا اٹھ جانا اصلاح معاشرت کے اور کئی مسائل کے حق میں بھی آب حیات ہوجائے گا۔ مثلاً صغر سنی کی شادیاں آپ ہی آپ بند ہوجائیں گی۔ ضرورت معاش بیواؤں کو بھی ازدواج پر راضی کرلیں گی۔ اور تعلیم نسواں روز افزوں ترقی کرنے لگے گی۔ جب اس ایک اصلاح سے اتنی اصلاحیں خود بخود ہوسکتی ہیں تو کیوں نہ اس کی تقویت میں زیادہ توجہ کی جائے۔

''اردوئے معلیٰ''

اپریل ۱۹۰۵

دیسی اشیا کو کیوں کر فروغ ہوسکتا ہے

آج کل جب اس امر پر بحث چھڑتی ہے کہ ہندوستانی صنعتوں کو ترقی کیوں نہیں ہوتی تو عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ابھی عوام میں حب الوطنی و قومی ہمدردی کا خیال ایسا راسخ نہیں ہوا ہے کہ وہ شخصی نفع کو نظرانداز کرکے اپنے دیس کی چیزوں کو باوجود ان کے عیوب و نقائص کے غیر ممالک کی چیزوں پر ترجیح دیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ دلیل ایک معتد بہ حد تک راستی و واقعات پر مبنی ہے۔ مگر ہم یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ ہماری تجارتی سرد بازاری صرف اسی باعث سے ہے۔ اس کے چند اور اسباب بھی ہیں جو سطور ذیل سے ظاہر ہوں گے۔

اول امر مانع تجارت یہ ہے کہ ابھی تک ہمارے ہم وطنوں کو ہندوستانی صنعتوں اورکارخانوں کی طرف سے بالکل لاعلمی ہے۔ جن لوگوں کو اخباروں سے ذوق ہے وہ البتہ چند کارخانوں سے واقف ہیں۔ عام طور پر یہ ہم کو نہیں معلوم کہ ہندوستان میں کون سی چیز کہاں بنتی ہے۔ اس لاعلمی کو رفع کرنے کا صرف یہی علاج ہے کہ اشتہارات سے بدرجۂ اتم فائدہ اٹھایا جائے اور مختلف دیسی زبانوں میں سلیس اشتہارات شائع کیے جائیں۔ ان کو شارع عام پر کثرت سے چپکایا جائے۔ ہر شہر کے مقتدر اشخاص کی فہرست مرتب کرائی جائے اور وہ وقتاً فوقتاً اشتہارات ان کے پاس بھیجے جائیں۔ کارخانوں اور ان کے مقاموں کے نام خوب روشن کردیے جائیں۔ جن کارخانوں نے اس حکمت سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کو آج اچھی ترقی حاصل ہے۔ سیالکوٹ، کانپور وغیرہ شہروں میں خاص خاص اشیاء کے کارخانے خوب رونق پر ہیں۔ دیسی دوائی کے اشتہارات بکثرت چھپتے ہیں اور شارع عام پر بھی بکثرت نظر آتے ہیں۔ اس وجہ سے ہماری دیسی دوائیں بمقابلہ انگریزی دواؤں کے بہت زیادہ ابتر

حالت میں نہیں ہیں۔ کئی آیورویدک دواخانوں کی خاصی آمدنی ہے۔ ابھی بہت عرصہ نہیں گزرا کہ بنارس میں نئے طرز کے ریشمی کپڑے بننے شروع ہوئے اور آج کاشی سلک کو مقبولیت عام حاصل ہے۔ ایسا کون سا وضع کا پابند شخص ہوگا جس کے صندوق میں دو ایک جوڑے کاشی سلک کے نہ ہوں گے۔ اس فوری ترقی اور مقبولیت کی یہی وجہ ہے کہ ہر قسم کے نمونوں کے ٹکڑے اطراف و اکناف میں بہ کثرت روانہ کیے گئے۔ چند تعلیم یافتہ اشخاص ہر وضع کے کپڑے لے لے کر دور دور کے شہروں میں گئے اور ان کے محاسن اور خوبیاں عوام کے دلوں پر اچھی طرح جمادیں۔

ایک بار ہم نے ایک بزاز سے پوچھا کہ تم کانانور سے دیسی کپڑے کیوں نہیں منگاتے۔ اس نے جواب دیا کہ ان کپڑوں کی بکری میں نفع بہت کم ہوتا ہے۔نفع کی یہ کمی ملکی اصولوں سے تعلق رکھتی ہے جن پر ہم اس وقت بحث نہیں کرنا چاہتے۔ کیسا اچھا ہوتا کہ ہر شہر کے چند زندہ دل، پرجوش، تعلیم یافتہ اصحاب کمر ہمت چست باندھ کر تھوڑا سا سرمایہ فراہم کرلیتے اور اس سرمایہ سے دیسی کپڑے منگا کر مول کے داموں پر فروخت کرتے۔ یہ ضرور نہیں ہے کہ یہ اصحاب ایک باقاعدہ دوکان کھولیں اور دوکان کا کرایہ اور دوکاندار کی تنخواہ بڑھا کر کپڑے کو اور بھی گراں کردیں بلکہ ایک صاحب جوش حب وطن کو کام میں لاکر آنریری منیجر ہوجائیں اور شام سویرے گھنٹہ دو گھنٹہ وقت اس کام کے لیے وقف کردیں۔ جب عوام سے ان کی کوششوں کی داد ملنے لگے۔ دیسی کپڑوں کی مانگ زیادہ ہوجائے تو سرمایہ بھی بڑھایا جاسکتا ہے۔ دوکان و دوکانداری کا صرفہ بھی برداشت کیا جاسکتا ہے۔

جو اصحاب اپنے سرمایہ سے تجارتی اصولوں پر دیسی کپڑوں کی دوکانیں کھولیں۔ ان کو چاہیے کہ گاہکوں کی آؤ بھگت، خاطر و مدارات خاطر خواہ کریں۔ دیسی وضع کے پابند لوگوں کے لیے دو ایک بیڑا پان، دوچار الائچیاں، ذرا سا تمباکو، اور انگریزی وضع اختیار کرنے والوں کے لیے ایک آدھ سگریٹ یا ایک پیالی چائے کافی ہوگی۔ اس قلیل صرفہ میں یقین ہے کہ گاہکوں کی تعداد بہت جلد بڑھ جائے گی۔ کیونکہ لوگوں کو اس دوکان سے ایک خاص الفت ہوجائے گی۔ دوکاندار بھی تعلیم یافتہ ہونا چاہئے جو خریداران سے مہذبانہ طریقے پر گفتگو کرسکے۔ ایسے دوکانداروں کو گاہکوں کے ساتھ اس بے نیازی،

بے غرضی اور روکھے پن سے نہیں پیش آنا چاہئے جس سے عام طور پر معمولی سوداگر پیش آیا کرتے ہیں۔اگر ان دوکانوں پر دو ایک انگریزی و اردو اخبار بھی مہیا کرنے کا بندوبست کردیا جائے تو یہ مزید دلچسپی بہت سے خریداروں کو کھینچ لائے گی۔ تعلیم یافتہ حضرات یہاں آ کر بیٹھیں گے تو موقع اور وقت کا تقاضا یہی ہوگا کہ ترقی تجارت کے متعلق گفتگو ہو۔ اور اس گفتگو سے لوگوں کے دلوں میں جوش پیدا ہوگا اور یہ جوش دیسی تجارت کو فروغ دینے والا ہوگا۔

بعض بعض مقامات پر دیسی اشیاء کا جس جوش ہمدردی سے استقبال کیا گیا ہے وہ امید دلاتا ہے کہ اب ہندوستان کی تجارتی بیداری بہت دور نہیں۔ لاہور کے آریہ سماج ممبروں کو سر سے پیر تک ہندوستانی ساخت کی چیزوں سے آراستہ دیکھنا واقعی نہایت دلچسپ اور قابل یادگار نظارہ تھا۔ ہم اپنے سماجی بھائیوں کی حب الوطنی وجوش قومی کے ہمیشہ سے مداح ہیں اور ہم کو امید ہے کہ ہماری تجارتی ترقی میں یہ لوگ اسی اعزاز و شکریہ کے مستحق ہوں گے جس کے کہ وہ قومی و تمدنی اصلاح میں ہیں۔ بمبئی اور کلکتہ جیسے شہروں میں سدیسی تحریک بڑے زوروں کے ساتھ کی جا رہی ہے۔ مگر ہم کو اس سے بدرجہا زیادہ مسرت اس امر پر ہوتی ہے کہ ہمارے خوابیدہ صوبے میں بھی اس قسم کی کمزور آوازیں کبھی کبھی سنائی دے جاتی ہیں۔ ہم کو یقین ہے کہ امسال بنارس میں کانگریس کا منعقد ہونا بنارس و لکھنؤ و کانپور کی تجارت کے حق میں فال نیک ثابت ہوگا، مگر صرف تعلیم یافتہ اصحاب کی سرپرستی و ہمدردی سے ہماری تجارت کو کبھی خاطر خواہ ترقی نہیں ہوسکتی۔ تاوقتیکہ آبادی کا وہ کثیر حصہ بھی جو ملکی و قومی معاملات سے نابلد ہے اس کارخیر میں ہاتھ نہ بٹائے۔ تعلیم یافتہ حضرات کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ ان کے مذاق اور ان کی فرضی ضروریات سے کچھ ایسا رنگ پکڑ لیا ہے کہ ابھی ان کو پورا کرنے کے لیے ہماری تجارت کو ایک مدت درکار ہے۔

ہماری آبادی کا بہت بڑا حصہ دیہاتوں میں آباد ہے۔ جس میں بلامبالغہ ۹۹ فی صدی تو ایسے ہیں جو الف کے نام بے بھی نہیں جانتے۔ اور جن کو شہروں میں آنے کا بہت کم اتفاق ہوتا ہے۔ پس شہروں میں سدیسی دوکانوں کا کھلنا خواہ وہ کیسی ہی نادر اصولوں پر کیوں نہ ہوں تجارت کو بہت فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اس صورت میں مناسب

ہے کہ ہمارے تجار بھی وہی طرز اختیار کریں جو عرصے سے ولایتیوں نے اختیار کیا ہے۔

ناظرین جانتے ہیں کہ دیہاتی کسانوں کی ضروریات زیادہ تر قرض دام سے رفع ہوا کرتی ہیں۔ اگر آج آپ کسی کسان کو پچاس روپے کی چیز ادھار دے دیجیے تو وہ بلا یہ سوچے کہ مجھ میں اس جنس کے خریدنے کی قابلیت ہے یا نہیں فوراً مول لے لیتا ہے اور پھر کسی نہ کسی طرح رو دھوکر اس کی قیمت ادا کرتا ہے۔ ولایتیوں نے دیہاتیوں کے اس خاصے کو بخوبی سمجھ لیا ہے۔ چنانچہ وہ جتھے کے جتھے آتے ہیں۔ شہروں میں پردیسی اور ردی مال سستے داموں پر خرید کرتے ہیں اور تب گاؤں میں جاکر کسی ایک معتبر شخص کی ضمانت پر کسانوں کے ہاتھ سودا بیچتے ہیں۔ کسان اپنی مالی حالت سے بالکل بے خبر ہوتا ہے۔ اس میں عاقبت اندیشی نہیں ہوتی۔ جوق کے جوق کپڑے خریدنے کو ٹوٹ پڑتے ہیں۔ آج کل اگر آپ کسی گاؤں میں نکل جائیے تو بجائے اس کے کہ لوگ گزی گاڑھے پہنے ہوئے نظر آئیں۔ کوئی تو اٹلی کی بنی ہوئی بنیائن پہنے دکھائی دیتا ہے۔ کوئی امریکہ کی بنی ہوئی چادر، وہی چیز جو بازاروں میں ماری ماری پھرتی ہے دیہات میں جاکر ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہے اور یہ اسی وجہ سے کہ کسانوں کو خریدتے وقت قیمت نہیں ادا کرنا پڑتی۔ ان ولایتیوں نے کتنے ہی جلاہوں کو تباہ کر ڈالا۔ اور جولاہوں کی تباہی سے پوربی سوت کی مانگ جاتی رہی۔ اس طرح دیسی روئی کو مجبوراً انگلستان کی خوشامد کرنا پڑی۔

ہمارے دیسی تاجروں کو وہ دقتیں ہرگز نہیں در پیش آسکتیں جو ولایتیوں کو پیش آتی ہیں۔ ان کو صدہا کوس کی منزل طے کرنا پڑتی ہے۔ گاؤں میں بااثر اشخاص کا توسل ڈھونڈھنا پڑتا ہے اور بعض اوقات قیمت کی وصولی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ دیسی تاجروں کو ان ترددات کے عوض صرف اتنا کرنا ہے کہ گاؤں میں معتبر ایجنٹوں کو روانہ کریں۔ ان کو ادھار مال بیچنے کی اجازت دیں اور حتی الوسع نفع کم لیں۔ دیہاتی عموماً ایماندار ہوتے ہیں۔ سودا لے لیا تو اس کی قیمت ادا کرنے میں دخل فصل نہیں کرتے۔ اگر خدانخواستہ ان کا ایمان ذرا ڈگمگایا بھی تو وہ ڈرپوک ایسے ہوتے ہیں کہ دوچار دھمکیوں میں راہ راست پر آجاتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ولایتیوں کو دام وصول

کرنے میں بہت کم دقت ہوتی ہے۔ بے چارہ کسان سود پر قرض لاتا ہے اور وقت معینہ پر جنس کی قیمت ادا کرتا ہے۔ جب ولایتیوں کو وصولی میں کوئی دقت نہیں ہوتی تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے دیسی ایجنٹوں کو اس امر میں کوئی دقت واقع ہو۔ بس جاڑے میں جنس دے آئے اس کی قیمت فصل تیار ہونے پر وصول کرلی۔ اور گرمی میں جو مال بیچا اس کی قیمت اوکھ پیرنے کے وقت وصول کرلی۔ نہ کوئی ٹھک ٹھک نہ کوئی بکھیڑا، یہ طریقہ تجارت اس سے کہیں نفع بخش اور حب الوطنانہ ہے جس کو ہنڈی کہتے ہیں۔ بنارس، مرزاپور، الٰہ آباد وغیرہ شہروں میں ہنڈی کا عام رواج ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر ایک گاؤں میں مہاجن کی طرف سے چند آدمی نوکر ہوتے ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ دیہاتیوں کو روپیہ قرض دیں اور ان سے ایک مدت معینہ کے اندر ایک کا سوایا وصول کرلیں۔ اس طرز تجارت سے چاہے مہاجن کو فائدہ ہو ملک یا قوم کو سراسر نقصان ہوتا ہے۔ کیونکہ بیچارے کسان کو دونوں طرف سے نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ ادھر تو مغل سوداگروں کو ایک کا ڈیڑھ دیا اور ادھر اپنے مہاجنوں کو ایک کا سوایا دینا پڑا۔ بے چارے کی قلیل آمدنی مہاجنوں ہی بھر کی ہوگئی۔

''نواب رائے''

زمانہ، جون ۱۹۰۵

سوانح عمری ملکۂ معظمہ وکٹوریا

اگر انگلینڈ جیسے کثیر التصانیف ملک میں مسٹر مارلی کی تصنیف سوانح عمری مسٹر گلیڈسٹن کو وہاں کے پریس نے ''مہینہ کی نادر کتاب'' کا لقب بخشا تھا تو ہندوستان جیسے ٹٹ پونجیے ملک میں مولوی ذکاء اللہ صاحب کی اس تازہ تصنیف یا تالیف کو ''سال کی نادر کتاب'' کا معزز لقب انصاف کے ساتھ دیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک ضخیم کتا ب ہے۔ اور گو ان معلومات کے مخازن انگریزی زبان میں بے تعداد ہیں تاہم کئی کتابوں کا مطالعہ کرنا اور ان سے خوشہ چینی کرکے کوئی جامع کتاب لکھنا آسان کام نہیں ہے۔ ہم مولوی صاحب کو ان کی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اردو زبان میں اب تک اس ہر دل عزیز ملکہ کی کوئی قابل یادگار سوانح عمری نہیں شائع ہوئی تھی اور گو اس میں کلام ہے کہ یہ کتاب بھی قابل یادگار ثابت ہوگی یا نہیں تاہم فی الحال اس کے مفید ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے۔ اردو داں پبلک پر مولوی صاحب نے واقعی بڑا احسان کیا ہے۔

(ا) عبات و طرز تحریر

اس کتاب کی عبارت مولوی صاحب کی دیگر تازہ تصانیف کے مقابلہ میں بدرجہا بہتر ہے۔ گو فارسی کے ثقیل الفاظ جابجا لڑھکا دیے گئے ہیں اور بلا ضرورت مشکل الفاظ کی بھرمار کردی گئی ہے تاہم عبارت کی سلاست اور متانت میں بہت زیادہ فرق نہیں آنے پایا۔ بعض مواقع پر جو سین بیان کیے ہیں وہ مزہ لے لے کر پڑھنے کے قابل ہیں۔ خصوصاً نمائش اعظم کو خوب وضاحت سے بیان کیا ہے۔ ترجمے جو انگریزی کتابوں سے اقتباس کیے ہیں ان کے مفہوم پر بجائے لفظی معنوں کے زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ ہاں کہیں کہیں انگریزی الفاظ اس کثرت سے استعمال کیے ہیں کہ وہ عبارت بیچارے غیر انگریزی زبان کے لیے لاطینی سے کم نہیں ہے۔ مثلاً ۲۷ کو ملکہ معظمہ کو ونڈسر کیتل

میں مینوسپلٹیون اور فرینڈلی سوسائٹیوں اور پروفیشنل ایسوسی اشنون اور پبلک بوڈیوں غرض
انگلینڈ ... ڈیپوٹیشن مبارکباد دینے آئے۔"

مصنف صاحب نے دیباچہ میں بیان فرمایا ہے کہ اس کتاب سے ملکہ وکٹوریا کے
عہد سلطنت کی تاریخ مدنظر نہیں بلکہ اس میں ان کے ذاتی حالات قلم بند کیے گئے ہیں
مگر خوش قسمتی سے مولوی صاحب نے اس تمہید کا بہت زیادہ لحاظ نہیں رکھا ہے۔ کیونکہ
نہ صرف ذاتیات کی دلچسپیاں بیان کی ہیں بلکہ عہد سلطنت کی بھی اور حق تو یہ ہے کہ
ملکہ کو ان کے زمانہ سے علاحدہ کرنا مشکل ہے۔ دونوں ایک تھے اور جب ایک کی
تاریخ لکھی جاتی ہے تو دوسرے کا ذکر کرنا امرلازم ہوجاتا ہے۔

(۲) ملکہ کے اوصاف حمیدہ

ملکہ کے اوصاف ملک داری و آئین فرماں روائی چاہے جو پایہ رکھتے ہوں اس
میں کلام نہیں کہ یہ بابرکت ذات اوصاف حسنہ و عادات خجستہ کا مخزن تھی۔ رحم دلی اور
ہمدردی ان کی سرشت میں خمیر تھی۔ وہ جب بالمورل یا ونڈسرکیسل میں تشریف لے
جاتیں تو اکثر بیواؤں اور بینواؤں کے جھونپڑیوں میں بیٹھ کر ان کے ساتھ ہمدردی و دل
سوزی کا اظہار فرماتیں۔ جب انگریزی فوج روسیوں کے مقابلہ میں ٹرکی کی اعانت کے
لیے گئی تھی اس وقت ملکہ اور ان کے کنبہ نے اپنے ہاتھوں سے مجروح و منقلب
سپاہیوں کے لیے جراب اور کرتے تیار کیے تھے۔ ملکہ کی طبیعت نہایت محبت پذیر واقع
ہوئی تھی شوہر یا بچوں کی جدائی ایک دم کے لیے سوہان روح ہوجاتی تھی اور جس گرم
جوشی و خلوص طبع و عزت آمیز محبت سے وہ اپنے شوہر سے پیش آتی تھیں اس سے
ہماری ہندوستانی خواتین نہایت قیمتی سبق حاصل کرسکتی ہیں۔ ملکہ بحیثیت ایک بیوی کے
ہندوستان کی خواتین سے بہ نسبت یورپ کی بیویوں کے زیادہ ملتی جلتی ہیں۔ اہل علم و
کمال کی قدر و منزلت کرنا ان کے مزاج میں فطرتی تھا۔ جس وقت لارڈ ڈزرائلی نے
انتقال فرمایا ملکہ نے چاہا کہ اس کی لاش ویسٹ منسٹر ایبی میں دفن کی جائے مگر جب
لارڈ مغفور کے ورثا راضی نہ ہوئے تو ملکہ نے وہاں ان کی ایک آہنی پیکر اپنے صرفہ
سے بنواکر رکھ دی۔ عیب جوئی و نکتہ چینی سے ان کی طبیعت نفور تھی۔ کہتے ہیں اپنے
روزنامچہ میں یورپ کے فرماں رواؤں اور اہل کمال کے عادات پر اکثر قلم زنی کی ہے

مگر کسی کی شان میں کوئی سخت کلمہ نہیں لکھا۔

(۳) وکٹوریا بحیثیت ملکہ انگلستان

ملکہ کا رتبہ اس حیثیت میں ایسا اونچا نہ تھا جس کی مثال ملکہ الزبتھ سے دی جاسکے۔ پہلے پہل انھوں نے پارلیمنٹ کے لبرل فرقہ کی طرف توجہ کی۔ مگر لارڈ میلبورن جیسا تجربہ کار شخص اس وقت وزارت پر ممتاز تھا۔ اسی نے رفتہ رفتہ ملکہ کے دل سے طرف داری کے خیالات دور کردیے۔ کیونکہ فرماں روا کا کسی فرقہ کا طرف دار ہونا ملک کے حق میں مہلک ہے۔ بعد ازاں لارڈ ابرڈین، ورابرٹ پیل وڈیوک آف ولنگٹن۔ ولارڈ پامرسٹون، ولارڈ ڈزرائلی و گلیڈسٹن جیسے جیسے بزرگان قوم وزارت پر ممتاز ہوئے مگر ملکہ کے مراسم سب سے نہایت دوستانہ رہے۔ بعض اوقات لارڈ پامرسٹون کی جنگجو پالیسی البتہ ان کو ناگوار خاطر ہوتی تھی اس لیے دول خارجیہ سے جو خط و کتابت ہوتی تھی اس کے مسودے پڑھنے پر ملکہ بہت زور دیا کرتی تھیں۔ کیونکہ ان کو لارڈ پامرسٹون پر اعتماد نہ تھا۔ اس عہد سلطنت میں اصلاح کے نہایت اہم قوانین وضع ہوئے مگر ملکہ کو درد سری کی کبھی ضرورت نہ درپیش ہوئی۔ ان کا اصول تھا کہ بادشاہ کو قوم کے ساتھ ساتھ آزادی کے میدان میں قدم رکھنا چاہیے نہ خود آگے چل کر راستہ بنانا چاہئے اور نہ پیچھے رہ کر اپنی حکومت کے قیود ڈھیلے کرنے چاہئیں۔ تمام وزرا و عوام الناس ملکہ کی وقعت و محبت دل میں رکھتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملکہ پر کئی بار مہلک حملے کیے گئے مگر ہر بار ثابت ہوگیا کہ یہ حملے شخصی خود غرضیوں اور ذاتی بدمزاجیوں اور جہالتوں کا نتیجہ تھے۔ ملکہ کی تخت نشینی کے چند ہی سال بعد بڑے بڑے شہروں میں چارٹسٹون نے خوب اودھم مچایا۔ یہ ان مزدور پیشہ آدمیوں کی جماعت تھی جن کو رفارم بل سے کوئی حقوق نہ حاصل ہوئے تھے ملکہ ہمیشہ کوشاں رہتی تھیں کہ ملک میں مستقل فوج بکثرت رہا کرے۔ چنانچہ ہندوستان کی بغاوت کے چند سال پہلے جب ہندوستانی فوج تخفیف میں آگئی تھی اس وقت ملکہ نے اس تجویز سے اختلاف کیا تھا۔ جب فرانس میں انقلاب عظیم واقع ہوا اس وقت تاجداران یورپ پر خواب و خور حرام تھا مگر ملکہ بیخوف و خطر ہوا خوری و سیر کے لیے نکلا کرتی تھیں۔انھوں نے رعایا کے دلوں میں گھر کرلیا تھا۔ جب کبھی ان کی سالگرہ ہوتی یا وہ کسی دوسرے شہر میں تشریف

لے جاتیں اس وقت ان کا خیر مقدم بڑے جوش و خروش سے کیا جاتا تھا۔ یہ زمانہ انگلستان کے لیے ترقیوں کا زمانہ تھا۔ اگر ملکہ الزبتھ کے زمانے میں لٹریچر کو ترقی ہوئی۔ جہاز رانی کا شوق و شغف رعایا کے دلوں میں پیدا ہوا تو ملکہ وکٹوریا کے زمانہ میں وہ صنعتی ترقیاں ظہور میں آئیں جن کو ملکہ الزبتھ معجزے سمجھتی۔

(۴) پرنس البرٹ

ملکہ اور پرنس البرٹ ایک جان دو قالب تھے۔ ممکن نہیں کہ اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھ کر ناظرین کو پرنس سے وہی انس نہ ہوجائے جو کسی اچھے ناول کے ہیرو کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ شہزادۂ نیک نہاد ملکہ وکٹوریا کے ماموں زاد بھائی تھے۔ پہلے پہل انگریزی شرفا کے طبقہ میں ان کا اعزاز و احترام قرار واقعی نہیں کیا گیا۔ لوگ ان کو غیر ملک کا باشندہ ہونے کی وجہ سے اجنبی خیال کرتے تھے۔ پرنس نے اپنی باریک نگاہوں سے اس سردمہری کو تاڑ لیا اور اپنی بقیہ زندگی انگریزی قوم کی بہبود و فلاح کی کوششوں پر وقف کردی۔ ۱۸۸۱ء میں جو نمائش اعظم ولایت میں منعقد ہوئی تھی اور جس نے اس وقت عالمگیر شہرت پائی تھی وہ شہزادہ صاحب ہی کے طبع وقاد وعملی قابلیتوں کا نتیجہ تھی۔ اس زمانہ میں نمائشوں سے ملکی خطرات پیدا ہونے کا احتمال تھا۔ چنانچہ چند سربرآوردہ اصحاب نے پرنس کو ان کے ارادہ سے باز رکھنا چاہا مگر پرنس نے قابل تعریف یک دلی و استقلال سے اس کام کو انجام تک پہنچایا۔ اور اس نمائش نے نہ صرف انگلستان کا قومی وقار بڑھایا بلکہ انگریزی صنعت کو اس سے زبردست تقویت پہنچی۔ اس کامیابی نے شہزادۂ نیک نہاد کے حوصلوں کو اور بھی بلند کردیا۔ وہ دل و جان سے قوم کی بھلائی میں لگے۔ جہاں کہیں تعلیم یا اصلاح معاشرت پر کوئی جلسہ منعقد ہوتا اس کے صدر نشین پرنس بنائے جاتے تھے۔ اس نمائش کی دیکھا دیکھی اور بھی بہتیری نمائشیں ہوئیں اور ہر موقع پر کارکنوں نے پرنس کے وسیع تجربہ سے فائدہ اٹھایا۔ وہ سائنس اور علم فنون لطیفہ و صنعت کی ترقی کے شیدا تھے۔ اور ان کو ''صنعت کا پیارا اور حرفت کا لاڈلا'' کہنا نہایت موزوں ہے ان مشاغل کثیرہ کے علاوہ شہزادۂ نیک نہاد ملکہ کے فرائض کی بجا آوری میں بھی اعانت کرتے تھے۔ بلکہ ان کے خاص مشیر و وزیر تھے۔ ان کو انگلستان کی حکومت کی کیل کہنا بے جا نہ ہوگا۔ لارڈ ٹنی سن مشہور انگریزی

شاعر نے ان کی شان میں ایک نادر قصیدہ لکھا ہے۔

مگر گو پرنس البرٹ تمام ترقی کی تحریکوں کے روح رواں تھے اور انگلینڈ میں عقل سلیم رکھنے والے لوگ ان کی کارگزاریوں کے معترف تھے تاہم ایک موقع پر جب روس کی مصالحت کا مسئلہ در پیش ہوا تو چند وزرا نے پرنس پر خفیہ جاسوس و مخبر ہونے کا الزام لگایا اور اسی الزام پر ان کو ٹاورمین قید بھی کردیا۔ ملکہ کو اپنے ملک کی اس ناشکری و احسان فراموشی سے سخت صدمہ ہوا۔ مگر جب پارلیمنٹ پھر مجتمع ہوئی تو لارڈ گرینول نے نہایت عالی دماغی سے پرنس کے سر سے تمام الزامات دور کردیے۔

(۵) پرنس کے مراسلات و مکاتبات

سوانح نگاروں کا تجربہ ہے کہ ہیرو کے ایک خط کی وقعت مصنف کے دس بیس صفحوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ مولوی صاحب نے بھی پرنس و ملکہ کے متعدد خطوط کے ترجمے لکھے ہیں۔ ان خطوط سے شہزادہ کے نیک نہاد و پاک نفس ہونے کا صاف پتہ چلتا ہے۔ خاص کر جو خطوط انھوں نے اپنے استاد و دوست صادق بیرن اسٹاک میر کو لکھے ہیں وہ عقل و دانش کا گنجینہ معلوم ہوتے ہیں۔ اکثر خطوط میں اصول فرماں روائی و فلسفیانہ مسائل پر بڑی خوبی سے بحث کی گئی ہے۔ پرنس کے ایڈریس ہر موقع پر بڑی دلچسپی سے سنے جاتے تھے۔ انھوں نے بڑی ریاضت سے انگریزی تحریر و تقریر میں وہ ملکہ حاصل کیا تھا جس سے لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ خاص کر ایک ایڈریس جو انھوں نے ''علم اعداد'' کے فوائد و وقائق پر دیا ہے وہ ان کے کل ایڈریسوں میں خصوصیت سے ذکر کرنے کے قابل ہے۔مولوی صاحب نے اس کا ترجمہ بڑی خوبی سے کیا ہے گو عبارت ذرا سخت ہوگئی ہے۔

(۶) چند متفرق باتیں

اور مندرجہ بالا کے علاوہ اس کتاب میں ملکہ کے روز نامچہ سے جابجا دلچسپ انتخابات کیے گئے ہیں۔ ان کے سفر نامے، ان کی شاہی ملاقاتوں کے تذکرے، ان کے سیر و تفریح کے حکایات، چھوٹے شہزادوں کے کھیل تماشے، کم عمری کے حکایات صالح، خانگی انتظامات، بچوں کی تعلیم و تربیت اور دیگر حالات روز مرہ بڑی خوبی سے لکھے گئے ہیں۔ ملکہ کی عدل گستری و فیاضی کی روایتیں جو نہایت پراثر ہیں۔ تمام کتاب میں جابجا

موتیوں کی طرح بکھیر دی گئی ہیں۔ تاریخی واقعات مجملاً لکھ دیے گئے ہیں اور اکثر ان پر بڑی خوبی سے رائے زنی بھی کی گئی ہے۔

''زمانہ''

اگست ۱۹۰۵

راجہ ٹوڈرمل

یوں تو اکبر کا دربار علم و فضیلت ،کاروانی و کارپردازی کا گنجینہ تھا مگر تاریخ کے صفحات پر جس آب و تاب کے ساتھ ٹوڈرمل کا نام چمکا اور انتظام سلطنت و ملک داری میں جو قابل یادگار خدمات اس کے نام سے وابستہ ہیں وہ اس کے معاصرین میں سے کسی کو میسر نہیں۔ خان خاناں و خان زماں و خان اعظم کے جہاں سوز تیغے تھے جنہوں نے اکبری دنیا میں ایک غلغلہ مچا رکھا تھا، مگر وہ بجلی تھے کہ یکایک کوندے اور پھر نظروں سے پنہاں ہوگئے۔ ابو الفضل و فیضی کی جگر کاویاں تھیں کہ اگر متلاشیان علم چاہیں تو آج بھی ان سے معلومات کے سبق لے سکتے ہیں۔ مگر ٹوڈرمل کے یادگار وہ آئین سلطنت ہیں جو باوجود ترقی تہذیب و تمدن کے آج تک وقیع نگاہوں سے دیکھے جاتے اور عقیدت کے ساتھ برتے جاتے ہیں نہ تو زمانہ کی روبہ ترقی رفتار اور نہ طرز حکومت کے تغیرات نے ان پر دست برد کرنے کی جرأت کی۔

ٹوڈرمل ذات کا کھتری اور گوت کاٹن تھا۔ اس کے وطن کی نسبت اختلافات ہیں۔ مگر ایشیاٹک سوسائٹی کی جدید تحقیقاتوں نے فیصلہ کردیا ہے کہ موضع لاہر پور علاقہ اودھ کو اس کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے۔ والدین گو غربت و تنگ حالی میں مبتلا تھے، اس پر اور مصیبت یہ پڑی کہ ابھی ٹوڈرمل کے ہاتھ پاؤں نہ سنبھلنے پائے تھے کہ باپ کا سایۂ حمایت سر سے اُٹھ گیا اور اس کی بیوہ ماں نے نہیں معلوم کن دقتوں سے ہونہار بچے کو پالا مگر خدا کی کارسازی دیکھیے کہ یہی یتیم اور بے دست و پا بچہ شہنشاہ اکبر کا وزیر اعظم ہوا۔ جس کا قلم سارے ہندوستان پر محیط تھا۔ دنیا میں بہت کم ایسی مائیں ہوں گی جن کے لڑکے ایسے سپوت نکلے ہوں گے اور کم کسی ولی کی دعائیں درگاہ الٰہی میں ایسی مقبول ہوئی ہوں گی۔

اس زمانہ میں جب تعلیم اعلیٰ طبقے کے لوگوں ہی تک محدود تھی اور آج کی تعلیمی آسانیوں کا نام بھی نہ تھا۔ اس مفلس لڑکے کی کیا تعلیم ہوتی۔ ہاں وہ خلقتاً ایک ذہین، جفاکش، سلیقہ شعار لڑکا تھا، اور یہ عادتیں عمر کے ساتھ ساتھ مضبوط ہوتی گئیں۔ ابھی بالغ بھی نہ ہونے پایا تھا کہ معاش کی ضرورت نے گھر سے باہر نکالا۔ شیر شاہ سوری ان دنوں ہندوستان کی قسمتوں کا مالک ہو رہا تھا اور اس کا وزیر مظفر خان زمین کے بندوبست میں سرگرم تھا۔ اس کی سرکار میں معمولی متصدیوں کے خدمات انجام دینے لگا۔ مگر فطری عطیات و خلقی صفات کب چھپے رہتے ہیں۔ اپنی کار پردازیوں اور جاں فشانیوں کی بدولت پیش پیش رہنے لگا۔ اور دفاتر کے اکثر صیغے زیر قلم ہوگئے چونکہ اس کو ابتدا سے مطالعہ کتب و تحقیقات کا شوق تھا۔ بہت جلد امورات دفتر حالات معاملات سے ماہر ہوگیا۔ اسی اثنا میں زمانے نے کروٹ بدلی۔ سوری خاندان پر زوال آیا اور ہمایوں کے بھاگ جاگے، مگر وہ بھی چند دنوں میں جنت کو سدھارا اور اکبر نے تاج شاہی سر پر رکھا۔ وہ آدمیوں کا پرکھنے والا تھا۔ ایک ہی نظر میں تاڑ گیا کہ یہ نوجوان متصدی ضرور نام و نمود حاصل کرے گا۔ اسے اپنی سرکار میں بلے لیا اور حضوری میں رہنے کا حکم دیا۔

مگر اکبر کا دربار وہ گلشن نہ تھا جس میں کوئی نرا سپاہی یا نرا منشی شہرت یا اعزاز کے پھول چن سکتا۔ ٹوڈرمل اب تک قلم ہی کے جوہر دکھاتا رہا مگر ۱۵۶۵ء میں ضرورت ہوئی کہ وہ یہ دکھلائے کہ میں کس رگ اور پٹھے دم خم کا سپاہی ہوں۔

ان دنوں حسین قلی خان خان زمان نے مفسدہ پردازیوں پر کمر باندھی تھی۔ وہ اپنے وقت کا نہایت واقف کار، جری، شیر دل سپاہی تھا اور بارہا جان نثاریوں کے ثبوت دے چکا تھا۔ خود تو بہار اور جونپور کا صوبہ دبائے بیٹھا تھا،اور اپنے چھوٹے بھائی بہادر خان کو جو دلاوری میں اسی کا ہم پلہ تھا اودھ کی طرف روانہ کیا تھا۔ اکبر نے میر معز الملک کو بھیجا کہ بہادر خان کو گرفتار کرکے حاضر دربار کرے۔ مگر میر صاحب سے کوئی کام نہ بنتے دیکھ کر ٹوڈرمل کو بھیجا کہ سرشور نمک حراموں کی فہمایش اور اگر فہمایش سے کام نہ نکلے تو سرزنش کرے۔ ٹوڈرمل فوراً اس مہم پر روانہ ہوا۔ مگر مقابلہ ایسا کرارا تھا اور میر معز الملک جس کے نام سپہ سالاری تھی ایسا ناقص فن سپاہی تھا کہ فوج شاہی

کو پیچھے ہٹتے ہی بن پڑی۔ ہاں ٹوڈرمل کو آفرین ہے کہ میدان سے نہ ٹلا اور اس بار میں بھی گویا اس کی جیت ہی رہی۔ اکبر نے پہلی بار امتحان لیا تھا۔ اس میں پورا اترا۔ پھر تو اس کے قلم کی طرح اس کا تیغہ بھی جولانیاں کرنے لگا۔ اور جس مہم پر جاتا فرخندہ بختی کامیابی سہرا اس کے سر باندھتی اور جانفشانی سرخروئی کا جیمال اس کے گلے ڈالتی۔ چتوڑ، رنتھنبور، سورت کی فتحوں میں اس نے اپنا لوہا منوا دیا۔ وقت کے پختہ کار، ذی وقار سپہ سالاروں میں شمار ہونے لگا۔

مگر سب سے بڑی مہم جس نے اس کی جانبازیوں کا سکہ بٹھا دیا اور جس میں اس نے اپنی زندگی کے سات سال صرف کیے۔ بنگالہ کی مہم تھی۔ خان زمان ۱۵٦۷ء میں کیفر کردار کو پہنچا۔ اور منعم خان خان خانان اس کا نعم البدل قرار دیا گیا۔ مگر کچھ تو خانخاناں خود ہی صلح پسند تھا اور کچھ بنگالہ کے افغان شورہ پشت، لڑائی نے طول کھینچا۔ آخر خدمت گزاران شاہی کا آٹھوں پہر کی دوڑ دھوپ، دوا دوش سے ناک میں دم آ گیا۔ جی چرانے لگے۔ اکبر کو ان تمام ماجروں کی درپردہ خبر لگتی رہتی تھی۔ ارادہ ہوا کہ اس وقت کسی ایسے قومی ہمت قواعد داں شخص کو بنگالہ بھیجے جو ساری سپاہ کو قواعد کے شکنجے میں کس کر ان کی رگیں ڈھیلی کردے۔ ایسا شخص بجز ٹوڈرمل کے اور کوئی نہ نظر آیا۔ چنانچہ راجہ چند نامور جنگجو دلاوروں کے ساتھ بنگالہ کو چلا۔

بنگالہ میں راجہ ٹوڈرمل نے وہ وہ کارنمایاں کیے جن سے تاریخ کے صفحے ہمیشہ مزین رہیں گے یہ اسی کی خرد پژوہی تھی جس نے سارے بنگالہ میں اکبری خطبہ پڑھوایا۔ اس کے ایک ہاتھ میں تلوار ہے۔ دوسرے میں تیغہ مشاغل کثیرہ سے دم لینے کی فرصت نہیں ہے۔ کہیں تو وہ شجاعت کے جوہر دکھاتا ہے۔ کہیں کاغذی گھوڑے دوڑاتا ہے۔ جنگ کے وقت جہاں اڑ جاتا ہے وہاں سے ہٹنا نہیں جانتا۔ سپاہیوں کو ایسا بڑھاتا ہے ایسا للکارتا ہے کہ ہاری ہوئی لڑائی جیت لیتا ہے۔ یہ اسی کا گردہ ہے کہ ترک و تاتاری سپاہیوں کو بیوفائی جن کی گھٹی میں پڑی ہے، کہیں دوستانہ فہمائش سے، کہیں ڈراوے سے، کہیں لالچ سے قابو میں رکھتا ہے۔ اس کے متواتر فتوحات نے افغانوں کے چھکے چھڑا دیے۔ داؤد خاں آخری بار اپنے دل کے ارمان نکال کر قتل ہوا۔ صوبہ بنگالہ پر اکبری پھریرا لہرانے لگا اور ٹوڈرمل فتح و نصرت کے نقارے بجاتا، اقبال

کے گھوڑے پر سوار دارالخلافہ کو لوٹا اور وزارت کے خدمات انجام دینے لگا۔ معتمد الدولہ خطاب ہوا۔ نقارہ اور علم نے اور بھی اعزاز بڑھایا۔

اسی اثناء میں خبر پہنچی کہ وزیر خان کی بے عنوانیوں نے گجرات میں بدنظمی پھیلا رکھی ہے۔ ٹوڈرمل کو فوراً حکم ہوا کہ جاکر وہاں کے معاملات سدھارے۔ راجہ صاحب روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر دفتر مالیات وغیرہ کا معائنہ کرنے لگے۔ اتنے ہی میں یہ شگوفہ کھلا کہ گجرات کے چند مفسدوں نے بغاوت مچادی۔ وزیر خان کی ہمتیں چھوٹ گئیں۔ قلعہ بند ہوگیا اور ساتھ ہی قاصد دوڑائے کہ بھاگا بھاگ ٹوڈرمل کو خبر کریں۔ راجہ کو تاب کہاں کہ ایسی ڈراونی اور متوحش خبر سنے اور ایک دم کی بھی تاخیر کرے۔ اسی وقت باغیوں پر دھاوا کیا۔ وزیر خان کو مرد بنا کر قلعہ سے باہر نکالا اور دشمنوں کو دو لقہ کے تنگ میدان میں جالیا وہاں خوب گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ حریفوں کی نیت تھی کہ راجہ کو ٹھکانے لگا دیں۔ پہلے ہی سے گھات لگائے بیٹھے تھے۔ مگر راجہ کی شیرانہ للکار اور برق دم تلوار نے ان کا سب تانا بانا توڑ ڈالا۔ یہ مہم مار کر دارالخلافت کو سرخرو لوٹا۔ اعزاز دو بالا ہوگیا۔

مگر وہ زمانہ ہی کچھ ایسا واقعہ خیز تھا اور وفادار کار پردازوں کا کچھ ایسا قحط تھا کہ ٹوڈرمل جیسے سرگرم خدمت گار کو چین سے بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ گجرات سے آیا ہی تھا کہ بنگالہ میں پھر زور و شور سے غبار اٹھا۔ مگر اب کی آندھی کا رنگ کچھ اور ہی تھا۔ سپاہ اور سرداران سپاہ، سپہ سالار سے باغی ہوگئے تھے اکبر نے ٹوڈرمل کو روانہ کیا۔ اور اس بلوے کو راجہ نے ایسی حکمت عملیوں اور پسندیدہ تدبیروں سے فرد کیا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ورنہ حریف کب سر اٹھانے سے باز رہتا۔ ہاں چند کینہ جو، سیہ باطن حاسدوں نے گھات لگائی تھی کہ موجودات کے وقت راجہ کا کام تمام کردیں، مگر وہ ایک ہی سیانا تھا۔ ایسے حضرات کے پنجے میں کب آسکتا تھا، صاف نکل گیا۔

۱۵۸۱ء میں آگرے کو لوٹا، جاں نثاریوں نے سلطنت کا دیوان کل بنا دیا اور بائیس صوبوں پر اس کا قلم دوڑنے لگا۔ اس وقت سے اور زمانہ وفات تک ٹوڈرمل کو اپنے قلم کے جوہر اور اپنی مدبرانہ جدت کے کرشمے دکھانے کا خوب موقع ملا۔ صرف ایک بار یوسف زئیوں کی مہم میں راجہ مان سنگھ کی کمک کو جانا پڑا تھا۔

گو راجہ نہایت نیک طینت، صاف باطن آدمی تھا مگر ۱۵۸۹ء میں کسی حریف نے اس پر تلوار چلائی۔ خوش قسمتی سے راجہ بال بال بچ گئے۔ اس کا خمیازہ ایک سیہ بخت کھتری بچے کو اٹھانا پڑا۔ مگر گمان غالب ہے کہ یہ اشارہ کینہ خواہ امرا کی طرف سے تھا۔

مگر غالبًا یہ حملہ موت ہی کا تھا کیوں کہ اس حادثے کے تھوڑے ہی دنوں بعد راجہ کو اس دنیا سے رخصت ہونا پڑا۔ ۱۵۹۰ء میں ظالم نے دوسرا حملہ بخار کی صورت میں کیا اور اب کی جان ہی لے کر چھوڑا۔

ٹوڈرمل پر مورخین نے خوب رائے زنی کی ہے۔ مگر جن لوگوں کو اس کا حد درجہ کا اختلاف ہے وہ بھی اس کو دعائے خیر سے یاد کرتے ہیں۔ وہ اکبر کے تمام امراء میں سب سے زیادہ سچا اور معتمد خیر اندیش تھا۔ بجز اس کے اور کوئی امیر ایسا نہ تھا جو بیوفائی اورنمک حرامی کا داغ اپنے اوپر نہ لے گیا ہو۔ وہی ایک مرد ہے جس کی شہرت کی چادر بگلے کے پر کی طرح صاف ہے۔ متعصب مورخین نے دھبے لگانے کی کوشش ضرور کی ہے۔ مگر ناکام رہے ہیں۔

اس کی کارگزاریوں کو بیان کرنا گویا اکبر کے زمانے کی تاریخ لکھنا ہے۔ ایسا کون سا صیغہ تھا۔ دیوانی یا مالیات یا فوجی، جس پر ٹوڈرمل کی کارفرمائیوں اور اصول تراشیوں نے اپنی مہر نہ لگائی ہو، پہلے لشکر شاہی کوسوں میں اترا کرتا تھا۔ فیل خانہ کچھ یہاں ہے کچھ وہاں توپ خانہ کا ایک حصہ اس سرے پر ہے تو دوسرا اس سرے پر۔ الغرض بڑی بے ترتیبی رہا کرتی تھی۔ ٹوڈرمل کی قواعد پسند طبیعت نے پیادہ، سوار، توپ خانہ، رسد، بازار لشکر وغیرہ کے اتارنے کے لیے تجویزیں نکالیں۔ اسی سلسلے میں آئین داغ کی تشریح بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ پہلے مستقل فوجیں نہ رکھی جاتی تھیں۔ امرا کو دربار شاہی سے جاگیریں مل جایا کرتی تھیں۔ اور ان کو حکم تھا کہ عند الطلب مع اپنی مقررہ فوج کے حاضر دربار ہوا کریں۔ امراء اس میں داؤں پیچ نکال کر اپنی جیب بھرتے۔موجودات کے وقت تو گھوڑوں کی مقررہ تعداد ادھر ادھر سے مانگ جانچ کر دکھادیتے۔ جب یہ بلا سر سے ٹل جاتی تو پھر وہی روش اختیار کرتے۔ ٹوڈرمل نے اس کا انسداد یوں کیا کہ موجودات کے وقت گھوڑوں پر داغ لگا دیا جاتا تاکہ جعل سازی کا

کوئی موقع نہ رہے۔

سکندر لودی کے زمانے تک ہندو عموماً فارسی یا عربی نہ پڑھتے تھے۔ اسے ملکش بدّیا کہتے تھے۔ راجہ نے تجویز کی کہ کل قلم رو ہند میں یک قلم دفتر فارسی ہوجائیں۔ پہلے تو اس تجویز سے ہندو چونکے۔ مگر ٹوڈرمل نے ان کے دلوں پر یہ خیال اچھی طرح جمادیا کہ بادشاہ وقت کی زبان رزق کی کنجی ہے۔ اگر اونچے مناصب، اعزاز و وقار چاہتے ہو تو اس زبان کے سیکھنے سے پاسکتے ہو۔ اکبر نے بھی سہارا دیا۔ تجویز چل نکلی، اور چند سال کے عرصے میں بہت سے ہندو فارسی داں اور فارسی خواں بن گئے۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ٹوڈرمل زبان اردو کا مورث اعلیٰ ہے۔ کیونکہ یہ اسی کی دور بینیوں کا ثمرہ ہے کہ فارسی ہندوؤں میں رائج ہوئی۔ فارسی الفاظ معمولی گھریلو بول چال میں مستعمل ہونے لگے اور اس طرح اردو کی بنیاد ریختہ سے استوار ہوئی۔

ٹوڈرمل حقائق سیاق میں اپنے وقت کا مسلم الثبوت استاد تھا۔ پہلے شاہی دفتر حساب بالکل برہم تھا۔ کہیں کاغذات فارسی میں تھے کہیں ہندی میں۔ ٹوڈرمل نے اس پریشان دفتر کو بھی قواعد و ضوابط کے شیرازے میں کسا۔ گو اس زمرے میں خواجہ شاہ منصور مظفر خان اور آصف خان نے بھی بڑے بڑے کام کیے۔ مگر ٹوڈرمل کی شہرت کی چمک دمک کے سامنے ان کی کچھ وقعت نہ رہی۔ بہت سے نقشے اور فردوں کے نمونے آئین اکبری میں درج ہیں۔ آج بھی انھیں کی خانہ پری کی جاتی ہے۔حتیٰ کہ اصطلاحوں میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

مگر سب سے مہتم بالشان کام جو ٹوڈرمل کی یادگار ہے اور جس نے ساری مہذب دنیا میں اس کو فائننشل مدبروں میں ممتاز درجہ دے رکھا ہے وہ اس کا بندوبست مال گزاری ہے جس کو ہم باوجود خوف طوالت مجملاً بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

پہلے مال گزاری کا انتظام تخمین پر تھا ۔ ٹوڈرمل کی تجویز سے کل ممالک محروسہ کی پیائش کی گئی۔ جریب رسی کی ہوتی تھی۔ اس سے تر و خشک میں فرق ہوجاتا تھا اس لیے بانس کی ٹوٹوں میں لوہے کے حلقے ڈال کر جریبیں تیار ہوئیں تمام اراضی خشک و تر مع اقسام زمین ، کوہستان، بیابان، جنگل ، اوسر، بنجر سب کو ناپ ڈالا۔ چند گاؤں کا پرگنہ، چند پرگنوں کی سرکار اور چند سرکاروں کا ایک صوبہ قرار پایا۔ بندوبست دہ سالہ

مقرر کیا گیا (اب سی سالہ ہے)

محصول کا آئین یہ باندھا کہ غلہ زمین بارانی میں نصف کاشت کار کا۔ نصف بادشاہ کا۔ غیر بارانی میں ہر قطعہ پر چوتھائی اخراجات اور اس کی خرید و فروخت کی لاگت لگا کر غلہ میں ایک تہائی بادشاہی۔ نیشکر وغیرہ کہ جنس اعلیٰ کہلاتے ہیں اور پانی نگہبانی اور کمائی وغیرہ کی محنت غلہ سے زیادہ کھاتے ہیں۔ ان پر ۱/۴، ۱/۵، ۱/۶ یا ۱/۷ حسب مراتب حق بادشاہی، باقی حق کاشت کار اس کا دستور العمل آئین اکبری میں جنس وار لکھا ہوا ہے۔

عظمائے یورپ کی طرح ٹوڈرمل نے بھی اصول پسندی وقواعد بندی کو اپنا شعار بنایا تھا۔ تمام صیغوں کے دفاتر کٹھ پتلی کی طرح اس کی انگلی کے اشارے پر کام کرتے تھے۔ ممکن نہ تھا کہ اکبر جیسا جوہر شناس بادشاہ ان اوصاف کی قدر نہ کرتا، اس میں کوئی شک نہیں کہ بسا اوقات اس کی بندشیں اور پابندیاں امرا کے دلوں کو جلاتی تھیں یہی وجہ ہے کہ مورخین عہد اکبری نے اسے کینہ خواہ اور مغرور بتایا ہے۔ مگر واضح رہے کہ جو لوگ باقاعدہ روش اختیار کرتے ہیں وہ اکثر غرض مند لوگوں کی افزا پردازیوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ یہ ٹوڈرمل کی سلامت روی تھی کہ وہ اپنی عزت و آبرو سنبھالے رہا، ورنہ امرا نے اس کی بدخواہی میں کوئی کسر نہ رکھی تھی۔

اس کو مغرور و مدمغ کہنا واقعات پر خاک ڈالنا ہے۔ بنگالہ میں اس نے سات برس تک تیغہ چلایا اور گوساری سپاہ اسی کی ابرو کے اشارے پر چلتی تھی مگر اس نے کبھی سپہ سالاری کا دعویٰ نہیں کیا۔ اس نے اپنے کو بلند کرنا سیکھا ہی نہ تھا اور اکبر جیسا جوہر شناس آقا اس کو نہ مل جاتا تو متصدیوں کا عہدہ اس کے لیے معراج ترقی ہوکر رہ جاتا۔ اس کسر نفسی کے ساتھ آزادی بھی مزاج میں ایسی تھی کہ بنگالہ میں جس وقت منعم خان خانخاناں نے داؤد خان سے صلح کی تو ٹوڈرمل نے اس سے اختلاف کیا اور اپنی بات پر ایسا اڑا کہ صلح نامہ پر مہر تک نہ کی۔اسی آزاد پسندی کو حاسدوں کی کم نظریوں نے نخوت وتکبر بنا دیا ہے۔ اس آزادی کے ساتھ صاف گوئی بھی اس کے حصے میں خوب آئی تھی۔ بادشاہ کے منہ پر بھی حق کہنے سے نہ چوکتا، سیکڑوں داڑھی والے ملاؤں نے دربار کی ہوا میں آکر لامذہبی کا کلمہ پڑھنا اختیار کرلیا تھا۔ مگر راجہ

مرتے دم تک راسخ الاعتقاد ہندو بنا رہا۔ جب تک ٹھاکر جی کی پوجا نہ کرلیتا دانہ نہ کھاتا، اس سے بڑھ کر آزادی خیال کا اور کیا ثبوت مل سکتا ہے۔

''زمانہ''

اکتوبر ۱۹۰۵

اکبر اعظم

نام کو اللہ اکبر کیا ترے توقیر ہے
داخل ہر بانگ ہے شامل بہرتکبیر ہے

بابر کی اولو العزمی نے چاروں طرف سے مایوس ہوکر پٹھانوں کی خانہ جنگیوں کی بدولت ہندوستان میں پاؤں رکھنے کی جگہ پائی تھی کہ عام روایات کے بموجب محبت پدری کے جوش میں اپنی جان بیٹے کی صحت پر قربان کی اور اس کا لاڈلا بیٹا ابھی عروس سلطنت سے ہم آغوش بھی نہ ہونے پایا تھا کہ پٹھانوں کی متفرق قوت شیر خاں سور کی حوصلہ مندی کی شکل میں نمودار ہوئی۔ ہمایوں کی اس وقت عجب حالت تھی۔ سلطنت کو اگر دیکھو تو صرف چند شہروں پر محدود اور حکومت برائے نام تھی اور وہ خود اگرچہ اعلیٰ صفات انسانی سے آراستہ تھا مگر اس میں اصابت رائے اور قوت فیصلہ کی جو تمام سلطنت کے لیے ضروری ہے کمی تھی۔ گھر کی حالت دیکھو تو وہی خانہ جنگی جس نے پٹھانوں کو اس کے باپ کی تدبیر اور شجاعت کا شکار بنایا تھا مسلط تھی۔ اور بھائی بھائی کا روا دار نہ تھا۔ اراکین سلطنت اگرچہ پختہ کار اور شجاع تھے مگر اس خانہ جنگی کی بدولت وہ بھی ڈانوا ڈول ہو رہے تھے۔ کبھی ایک بھائی کا ساتھ دینے میں اپنا فائدہ سمجھتے تھے اور کبھی دوسرے کی طرف ہوجاتے تھے۔ غرض کہ ادبار و تباہی کے تمام سامان جمع تھے اور ایسی حالت میں وہ شیر خاں کی پرجوش اولو العزمی اور پرمغز خوش تدبیری اور راسخ ارادوں کے سامنے ٹھہرتا تو کیوں کر۔ نتیجہ وہی ہوا جو پہلے سے نظر آرہا تھا کہ شیر خاں کا اقبال بڑھا اور ہمایوں کا گھٹا اور بالآخر اس کو سلطنت سے ہاتھ دھوکر فرار کو ذریعہ نجات سمجھنا پڑا۔ وہ وقت بھی عجب بیکسی کا تھا۔ کبھی گھبرا کر بیکانیر و جیسلمیر کے

صحرائے بے آب میں ٹکراتا پھرتا تھا اور کبھی ضعیف سی امید پر جودھپور کے سنگلاخ میدانوں کی طرف بڑھتا تھا مگر دغابازی دور ہی سے اپنا ڈراؤنا چہرہ دکھا کر قدم اکھاڑ دیتی تھی۔ ادبار کی گھٹا ہر طرف چھائی ہوئی ہے۔ خون سفید ہوگیا ہے۔ بھائی بھائی کے کھانے کو دوڑتا ہے۔ برائے نام دوست بہت ہیں مگر دوستی کا وقت آیا اور انجان بنے۔ امید کی جھلکی بھی کبھی کبھی نظر آجاتی ہے۔ مگر فوراً ہی مایوسی کے غبار میں غائب ہوجاتی ہے۔ انتہا ہوگئی کہ جب راستہ میں اتفاقاً ہمایوں کا گھوڑا نظر سے اوجل ہوگیا تو سخت دل تردی بیگ نے جو اس کے باپ کا رفیق اور خود اس کا مشیر تھا اس مصیبت زدہ بادشاہ کو اپنے اصطبل سے ایک گھوڑا دینے میں بھی انکار کیا جس کی وجہ سے اس کو اونٹ کی ناہموار سواری نصیب ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ایک ترک کے لیے جو گویا ماں کے پیٹ سے نکل کر گھوڑے کی پیٹھ پر آنکھ کھولتا ہے اس سے بڑھ کر کیا مصیبت ہوسکتی ہے۔ مگر غنیمت ہوا کہ اس کے ایک رفیق ندیم خاں کو جو بیچارہ اپنی بوڑھی ماں کو اپنے گھوڑے پر سوار کرکے خود پیدل جا رہا تھا رحم آگیا اور اس نے بے دریغ اپنا گھوڑا ہمایوں کی نذر کیا اور اس کے اونٹ پر اپنی ماں کو سوار کیا۔ غضب یہ ہے کہ حالت تو ایسی ہو رہی ہے کہ رونگٹا رونگٹا دشمن معلوم ہوتا اور زمین و آسمان پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہے مگر دشت غربت میں ہمایوں کی چہیتی بی بی حمیدہ بانو بیگم بھی ساتھ ہے اور وہ بھی اس شان سے کہ پورے دن ہیں اور ہر قدم پر خوف ہے کہ کہیں یہیں تکالیف مادری سے مقابلہ نہ کرنا پڑے۔ خیر خدا خدا کرکے یہ بینوا قافلہ سندھ کے بے گیاہ جنگلوں کو قطع کرتا ہوا امرکوٹ پہنچا اور وہاں پاؤں رکھنے کی جگہ بھی ملی مگر گرگ صفت بھائی ہر طرف سے تاک میں لگے ہوئے تھے اور اس لیے اس کو بی بی کو وہیں چھوڑ کر ان کے مقابلے کے لیے روانہ ہونا پڑا۔ اس وقت غریب حمیدہ بانو بیگم کی جو حالت ہوگی وہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ نہ تن پر کپڑا نہ پیٹ کے لیے کھانا۔ نہ کوئی مونس نہ غمخوار یہاں تک کہ شوہر بھی سربازی میں مصروف۔ اس پر اجنبی ملک اور اجنبی لوگ لیکن جس طرح کہ عین کشش باراں کے زمانے میں ہر طرف سے کالی گھٹائیں اٹھ کر دم میں صحرائے بے گیاہ کو مرغزار بنا دیتیں یا دفعتاً گھنگھور اندھیرے میں دل بادل پھٹ کر دنیا کو آفتاب کی تیز شعاعوں سے منور کردیتے ہیں یا جس طور پر

ستارہ صبح عشرت کا شب ماتم نکلتا ہے

اسی طرح بتاریخ ۵/ رجب ۹۴۹ھ شب یک شنبہ وہ نیر برج سعادت طلوع ہوا جو بالآخر آفتاب ہوکر چمکا۔ اکبر جیسے عالم سراسیمگی میں پیدا ہوا تھا ایسی ہی بیچارگی میں اس کا بچپن بھی گزرا۔ ابھی پورا ایک برس کا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ مرزا عسکری کے دغا و فریب کے خوف سے ماں باپ کا ساتھ بھی چھٹا اور بے رحم چچا کے ہاتھ پڑا مگر خدا بھلا کرے اس کی بی بی سلطان بیگم اور اکبر کی دائیوں ماہم بیگم اور جی جی انگا کا کہ بچے کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائی۔ جب اکبر کی عمر دو سال سے کچھ اوپر ہوئی تو ہمایوں نے پھر کابل فتح کیا اور اس کو باپ کا دیدار نصیب ہوا مگر ابھی پانچ برس کا نہ ہوا تھا کہ پھر ظالم کامران کے ہاتھ پڑ گیا اور جبکہ ہمایوں قلعہ کابل کے محاصرہ میں مصروف تھا ایک مورچے پر جہاں گولے بڑے زور و شور سے برس رہے تھے اس ننھی سی جان کو لقمہ اجل بنانے کے لیے بٹھا دیا گیا۔ مگر شاباش ماہم کی وفاداری کو کہ وہ اس کو اپنے گرد چھپاکر مورچے کی طرف پشت کرکے بیٹھ گئی۔ ایسی پریشانی اور خانہ بربادی کی حالت میں ظاہر ہے کہ تعلیم تو کیا کسی بات کا بھی انتظام نہیں ہوسکتا اور اسی لیے اکبر باپ کے تربیت بار سایہ سے جدا ہوکر حرف آشنا بھی نہ ہوسکا لیکن جس طرح کہ اس نے بیکسی کی گود میں پرورش پائی تھی اسی طرح اس کی تعلیم و تربیت بھی مصیبت ہی کے اعلیٰ مدرسے میں ہوئی۔ اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ابتدا ہی میں وہ اعلیٰ صفات انسانی اس میں پیدا ہوگئیں جو کشمکش حیات میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے لازمی ہیں۔ بارہ برس آٹھ مہینے کی عمر میں وہ سرہند کی لڑائی میں شریک ہوا اور ابھی پورے چودہ سال کا سن نہ ہونے پایا تھا کہ ہمایوں کی ناگہانی موت سے اس کو یتیمی کا تمغہ اور سلطنت کا چھتر ملا اور اس نے ۲/ربیع الثانی ۹۶۳ھ کو تخت شاہی پر قدم رکھا۔ بادشاہ بچہ اور سلطنت برائے نام تھی مگر بیرم خاں اتالیق کی وفاداری و کاروانی ہر وقت آڑے آنے کے لیے موجود تھی۔ بیرم خاں نے ابتدائی معرکوں میں نہایت ہی خوش تدبیری سے کام لیا اور خوب ہی دادِ شجاعت دی۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ افغانی سازشوں کا استیصال اور ہندوستان کا ایک معتدبہ حصہ سلطنت مغلیہ میں داخل ہوگیا۔ جلوس کے پہلے ہی سال میں جبکہ پٹھانوں کا مشہور جنرل ہیموں بقال گرفتار ہوکر آیا تو باوجود بیرم

خاں کے اصرار کے اکبر کی حوصلہ مندی نے اپنی تلوار کو ایک بیکس قیدی کے خون سے رنگین کرنا پسند نہ کیا۔ چار برس کی خود مختاری نے کچھ تو بیرم خاں کا سر پھرایا اور ادھر ترقی عمر کے ساتھ اکبر نے بھی پر پُرزے نکالے اورکچھ باقی امراء کے دل میں حسد کی آگ مشتعل ہوئی اور انھوں نے طرح طرح پر بادشاہ کو اپنے ہاتھ میں عنان سلطنت لینے کے لیے آمادہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیرم خاں کے اقبال کا چراغ گل ہوا اور اکبر نے براہ راست حکومت شروع کی۔ تقریباً بیس سال تک اکبر ہندوستان کے مختلف صوبوں کے فتح کرنے اور اپنے باغی امراء کی سازشوں کو توڑنے اور بغاوتوں کے فرو کرنے میں مصروف رہا۔ یہاں تک کہ صوبۂ پنجاب و دہلی کے علاوہ جو اس کو میراث میں ملے تھے۔ کابل، قندھار، کشمیر، سندھ، میواڑ، گجرات، اودھ، بہار، بنگالہ، اڑیسہ، احمد نگر، مالوہ اور خاندیس سب اس کے دائرۂ حکومت میں داخل ہوگئے۔ گویا کہ مغرب میں اس کی سلطنت کا ڈانڈا ہندوکش سے ملا ہوا تھا اور مشرق میں خلیج بنگالہ سے اور اگر شمال میں کوہ ہمالیہ سے ٹکراتا تھا تو جنوب میں مغربی گھاٹ سے۔ یہ فتوحات نہ صرف اکبر کے جنرلوں کی خوش تدبیری وکاروانی کا نتیجہ تھیں بلکہ ان میں پوری طور پر اس نے خود بھی اپنی دانائی، دور اندیشی، مستعدی، ان تھک، جفا کشی، نڈر شجاعت اور تیز ہوشی کا ثبوت دیا تھا جبکہ اس کے جنرل دور دراز مہموں پر مصروف ہوتے تھے اور وہ ذرا بھی ان کو بے عنوانیوں کی طرف جھکتا ہوا دیکھتا یا ان کی کوششوں میں سستی پاتا تھا تو دفعتاً بجلی کی طرح ایک ایک ہفتہ کی راہ ایک ایک دن میں طے کرکے ان کے سر پر جادھمکتا تھا۔ مالوہ، گجرات اور بنگالہ کی یلغاریں آج تک اس کی مستعدی و جواں مردی پر شہادت دے رہی ہیں۔ اس کی خداداد طباعی نے فنون جنگ کو جہاں پایا تھا وہیں نہیں چھوڑا بلکہ ان کی ہر ایک شاخ کو ترقی دی۔ اس زمانے میں توپوں کے بنانے اور ان سے کام لینے میں جس قدر ترقی ہوئی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے مگر اکبر اس قدیم زمانے ہی میں اس کی ضرورت سے واقف ہوگیا تھا اور اس نے ایک ایسی توپ ایجاد کی تھی جو ایک شتابہ میں سترہ فیر کرتی تھی اور بعض ایسی توپیں بھی بنوائی تھیں جن کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ایک مقام سے دوسرے مقام کو آسانی سے لے جاسکتے تھے۔ ہندوستان میں قدیم سے سپہ سالاروں اور منصب داروں کی بے عنوانیوں کی بدولت فوج

کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ سپاہیوں اور سواروں کی تنخواہوں کی بابت امراء کو بڑی بڑی جاگیریں دی گئیں تھیں۔ لیکن اگر فوج کو دیکھو تو پتہ بھی نہیں اور اگر کچھ تھی بھی تو اس کی عجب حالت تھی۔ اگر کسی کے پاس زین ہے تو گھوڑا نہیں اور ہتھیار ہے تو لباس نہیں۔ اکبر نے سب سے پہلے اپنی نظر اصلاح اسی طرف متوجہ کی اور سپاہیوں کو امراء کے دست حرص سے نکال کر علم شاہی کے سایہ میں لیا اور نقد تنخواہیں مقرر کر کے سپاہیوں کی چہرہ نویسی اور گھوڑوں کے داغ کے ذریعہ سے ان کو بدنیتی کے چنگل سے آزاد کیا اور اس طور پر ایک کار آمد اسٹینڈنگ آرمی کی بنیاد ڈالی۔ گویا کہ اکبر ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان میں قدیم فیوڈل سسٹم کو توڑ کر شاہی قوت و اقتدار کی بنیاد ڈالی۔ اگرچہ دنیا کے عظیم الشان فاتحوں کی تاریخ میں بھی اکبر کو اپنی مہموں کی کامیابی اور وسعت کے لحاظ سے ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ لیکن جس چیز نے کہ در اصل اکبر کو اکبر بنایا وہ اس کے جنگی کارنامے نہیں ہیں بلکہ وہ مادّیات سے گزر کر روحانیات تک پھیلی ہوتی ہے۔ اکبر نے ابتدا ہی میں مدرسۂ مصیبت میں ایسی تعلیم نہ پائی تھی کہ وہ اپنے باپ کی تباہی اور کھڑے کھڑے ہندوستان سے نکالے جانے اور در بدر خاک بسر مارے مارے پھرنے سے نتیجہ خیز سبق نہ لیتا اور خواہ یہ صحیح ہویا نہ ہو کہ اس کے باپ کو شاہ طہماسپ صفوی نے ہندوستان کی واپسی کے وقت دو نصیحتیں کی تھیں۔ ایک تو یہ کہ افغانوں کو تجارت میں لگائے۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان کی دیسی قوموں کو اپنا بنائے لیکن زمانے نے خود اس کو بتا دیا تھا کہ اگر سلطنت کے استحکام کی کوئی تدبیر ہوسکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ اس کی بنیاد بجائے تلوار کی باریک دھار کے رفاہ خلق اللہ کے ذریعے سے رعایا کے دلوں میں رکھی جائے۔ چنانچہ پہلے ہی سال اس نے ایک ایسا حکم دیا جو انگلستان کی موجودہ ترقی کا راز ہے مگر جو صدیوں تک ٹھوکریں کھانے کے بعد اس کو معلوم ہوا ہے۔ یعنی تجارت کو ہر قسم کے محصولات سے جو اس کی ترقی کے حارج تھے آزاد کردیا اور گو ابتدا میں اس کی کم سنی اور بے دست و پائی کی وجہ سے اس کا پوری طرح پر نفاذ نہ ہوسکا۔ لیکن جب عنان حکومت اس کے ہاتھ میں آئی تو وہ اس کو جاری کر کے رہا۔ یہ تو وہ سلوک ہے جو اندرونی تجارت کے ساتھ کیا گیا۔ بیرونی تجارت کی روک بعض سنگین محصولوں سے ہوتی تھی جو میر بحری یا سی

کسٹمس کے نام سے مشہور تھے۔ اکبر نے ان محاصل میں بھی اس قدر تخفیف کی کہ وہ صرف برائے نام اڑھائی فی صدی رہ گئے۔ اور اس سے جیسا فائدہ کہ بیرونی تجارت کو پہنچاہوگا وہ محتاج نہیں ہے۔ اگرچہ برٹش گورنمنٹ کا اوڑھنا بچھونا فری ٹریڈیعنی آزادی تجارت ہے۔ لیکن اس زمانے میں بھی سی کسٹمس (محاصل بحری) کی شرح کہیں اکبر کی مقررہ شرح سے زیادہ ہے۔ تمام دنیا کے قانون کا یہ میلان رہا ہے کہ ابتدا میں نہایت سخت سزائیں چھوٹے چھوٹے جرائم کے لیے بھی تجویز کی جاتی ہیں۔ لیکن جب تمدن میں ترقی اور قوم کی حالت اصلاح پذیر ہوجاتی ہے تو سزاؤں میں بھی نرمی ہوتی جاتی ہے۔ ہندوستان میں بھی قدیم سے بعض وحشیانہ سزاؤں کا رواج چلا آتا تھا۔مثلاً ہاتھ پاؤں کاٹنا یا اندھا کرنا وغیرہ لیکن اکبر کی روشن ضمیری نے ۶ھ جلوس میں ان سزاؤں کو قطعاً موقوف کردیا۔ قدیم زمانے میں یہ طریقہ تھا کہ جنگ میں جو جانباز قید ہوتے تھے وہ عمر بھر کے لیے آزادی کو خیر باد کہہ کر غلامی کا خلعت پاتے تھے۔ گوکہ سیاست کے لحاظ سے اس کا کیسا ہی اثر پڑتا ہولیکن انسانیت کے اعتبار سے یہ طریقہ جس قدر بے رحمی وظلم سے مملو ہے وہ محتاج تصریح نہیں اور اس لیے اکبر کے لیے یہ امر باعث فخر ہے کہ اس نے ۷ھ جلوس میں یہ قاعدہ بنا دیا کہ جوشخص جنگ میں قید ہو وہ غلام نہ بنایا جائے اور موجودہ غلاموں سے بھی داغ غلامی اس حد تک دھو دیا کہ ان کے خاص حقوق قرار دیے اور ان کا نام بھی حیثیت کے ساتھ بدل کر چیلہ قرار دیا۔ اسی کے ساتھ غلاموں کی عام خرید و فروخت کی بھی قطعاً ممانعت کردی۔ اس کے دوسرے سال جاتریوں سے جو جابرانہ محصول لیا جاتا تھا اس کو موقوف کیا اور یہ گویا کہ پہلی مرتبہ اس امر کا اعلان تھا کہ ہر شخص اپنے معتقدات مذہبی کے لحاظ سے آزاد ہے اور ان کے ادا کرنے میں کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہونی چاہیے۔ ۷ء جلوس میں جو خیال کہ کسی قدر دبی زبان سے ظاہر کیا گیا تھا۔ اگلے سال خوب ہی زور وشور سے اس کا اعلان کیا گیا اور اکبر نے ایسا کام کیا جس نے فی الواقع حاکم ومحکوم کی حیثیت سلطنت کے سامنے ایک کردی یعنی جزیہ معاف کیا۔ (جزیہ دراصل ایسا پر رسوائی ٹیکس نہیں ہے جیسا کہ یورپین مصنفین نے سمجھا ہے بلکہ وہ مفتوح قوموں سے فوجی خدمات سے مستثنیٰ ہونے کی وجہ سے لیا جاتا تھا تاکہ جس طرح فاتح قوم امن عامہ کے قیام میں اپنی جان لڑائی

تھی اسی طرح مفتوح قومیں اپنے مال سے مدد کریں۔ اگر تاریخ ہندوستان کا غور سے مطالعہ کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ ابتدا میں سرکار کمپنی بہادر جو دیسی ریاتوں میں بعض فوجیں امدادی یا کنٹجنٹ کے ناموں میں سے مقرر کرکے ان کے اخراجات وصول کرتی تھی وہ بھی ایک قسم کا جزیہ ہی تھا اور اس زمانہ میں بھی جو اخراجات فوجی یا شہنشاہی کہلاتے ہیں اور جن میں اہل ملک کا کوئی دخل یا حصہ نہیں ہوتا ان پر بھی خواہ کچھ ہی ان کا نام رکھا جائے۔ جزیہ کی تعریف صادق آسکتی ہے) مسلمانوں میں قدیم سے کانس کرلپن کا طریقہ یعنی وقت پر ہر شخص فوجی خدمت انجام دینے پر مجبور ہو، جاری ہے اور اس لیے اس سے مستثنیٰ ہونے کا اختیار ایک بہت بڑا حق تھا اور بصورت امکان غالبًا بہت سے مسلمان بھی اس سے فائدہ اٹھاتے لیکن چونکہ اکبر کا منشاء فاتح و مفتوح کا فرق اٹھا کر اپنی سلطنت کو گویا کہ ہندوستان کی قومی سلطنت بنانا تھا جس کی اصلی ترقی کے لیے ہندوؤں کی تیز ہوشی و جرأت و ہمت کی بھی اسی طرح ضرورت تھی جس طرح کہ مسلمانوں کی کاروانی اور شجاعت کی اور ملک کے امن و امان کی حفاظت اور توسیع میں ہندو بھی اسی طرح حصہ لینے کے مستحق تھے جس طرح کہ مسلمان۔ اس لیے جو امتیاز کہ جزیہ کے ذریعہ سے فاتح و مفتوح میں قائم کیا گیا تھا وہ دراصل باقی نہ رہا تھا اور جزیہ فی الحقیقت ایک جابرانہ ٹیکس ہوگیا تھا۔ اس لیے اکبر نے اس کو موقوف کرکے رعایا کے تمام طبقوں کے مساوی ہونے کا اعلان کردیا۔ گوکہ اکبر نے کبھی ہماری فیاض گورنمنٹ کی طرح اس امر کا اعلان نہیں کیا کہ امور سلطنت میں کوئی امتیاز خون یا رنگت یا مذہب کا روا نہ رکھا جائے گا لیکن عملی طور پر وہ تقررات میں خواہ ملکی ہوں یا فوجی یا مالی عبداللہ اور رام داس میں کوئی فرق نہ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ کوئی منصب اور کوئی عہدہ ایسا نہ تھا جو ہندو مسلمان دونوں کے لیے یکساں کھلا ہوا نہ ہو۔ اس کی بے تعصبی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ مان سنگھ کو خود صوبۂ کابل کی گورنری کا اعزاز بخشا جہاں کی آبادی بالکل مسلمان تھی۔ اسی طرح مہمات فوجی اگر خان خاناں اور خان اعظم کے سپرد ہوتے تھے تو بھگوان داس اور مان سنگھ کا درجہ بھی ان سے کم نہ رہتا تھا۔ اور اگر معاملات ملکی و مالی میں مظفر خاں کے مشورے پر عمل کیا جاتا تھا تو ٹوڈرمل کی رائے اس سے بھی زیادہ وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ اسی طرح اگر

فیضی و ابوالفضل دربار کی زینت تھے تو بیربل بھی اکبر کے تاج کا ایک بے بہا جوہر تھا۔ یہی وہ چیز تھی کہ جس نے راجپوتوں اور برہمنوں کو سلطنت کا اس درجہ خیر خواہ بنا دیا تھا کہ وہ اپنے باغی ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کے مقابلے میں لڑنے اور جان دینے میں بھی تامل نہ کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کو رات دن یہی فکر رہتی تھی کہ وہ ہندوستان کی مختلف قوموں کو ایک کرکے ایک زبردست قومی سلطنت قائم کرے اور اسی لیے اس نے قدیم راجپوت خاندانوں سے رشتہ داری کی بنیاد ڈالی تاکہ خاندان شاہی سے جو مغائرت تھی وہ یگانگت سے بدل جائے اور اسی غرض سے ۲۳ھ جلوس میں اس نے عبادت خانہ فتح پور سیکری میں ان قابل یادگار مذہبی مناظروں کو قائم کیا، جن میں ہر قوم و ہر مذہب کے علماء حصہ لیتے اور نہایت آزادی سے اپنے اپنے مذہب کے اصول کی تشریح کرتے تھے۔ ان مناظروں کا یہ نتیجہ ہوا کہ اکبر جو زیور علم سے عاری تھا اس بلندی خیال پر پہنچ گیا جو خاص فلاسفروں کا حصہ ہے اور جہاں سے ہر مذہب کے ابتدائی اصول یکساں حقانیت کا رنگ لیے ہوئے آتے ہیں۔ ان کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ جو لوگ شریک ہوئے تھے ان میں وسعت نظر کی ترقی کی وجہ سے تعصب خواہ مخواہ کم ہو گیا ۔اس زمانے میں مذہب اسلام کی بھی صدیوں کی تقلید اور پیشوایان مذہب کی طبع آزمائیوں کی وجہ سے عجب کیفیت ہو رہی تھی ۔سادگی جو اسلام کے لیے مخصوص ہے نام کو باقی نہ رہی تھی اور مذہب خارج از عقل اعتقادات اور بے جا توہمات اور تقلیدی تخیلات کا ایک مجموعہ ہو گیا تھا اور پیشوایان مذہب کی اس سے بھی بدتر حالت تھی کہ گو ریا کاری کا جامہ ہر وقت زیب بدن رہتا تھا لیکن جاہ طلبی کے پیچھے احکام مذہبی کو بازیچۂ اطفال سمجھتے تھے اور جیسا موقع ہوتا تھا ویسا ہی فتویٰ دینے کے لیے موجود ہو جاتے تھے۔ اس کے متعلق مخدوم الملک اور صدر جہاں کے کارنامے اور دنیا سازی قابل ملاحظہ ہیں۔ انھیں وجوہ سے اکبر کا ابتدائی جوش مذہبی جو اسے اجمیر شریف کو پا پیادہ لے جاتا اور یا معین کے وظیفے میں دن رات مصروف رکھتا تھا ٹھنڈا ہوتا گیا اور وہ اس نتیجے کے نکالنے پر مجبور ہوا تاوقتیکہ تقلید کے اس مضبوط جال سے جس نے لوگوں کے اذہان کو مقید کر رکھا ہے نجات نہ ملے کسی پائیدار اصلاح کی امید نہیں ہوسکتی۔

چنانچہ اس نے ۲۴ھ جلوس میں علما سے اجتہاد کی سند حاصل کی۔[1] اور مذہب الٰہی کی بنیاد ڈالی جو تمام مروجہ مذاہب کے لوگوں کے لیے یکساں کھلا ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کام ایک جاہل ترک کی قدرت اور منصب سے بالاتر تھا اور اسی وجہ سے اس میں باوجود ابو الفضل و فیضی کی ذہانت آرائیوں کے جیسی کامیابی کہ چاہئے تھی نہ ہوئی بلکہ کھیل تماشہ بن کر رہ گیا۔ لیکن اس کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ تعصب کی بلا جو اہل ملک کو باہمی اختلافات کی وجہ سے سر نہ اٹھانے دیتی تھی یک لخت رفع ہوگئی اور تنگ دلی کی جگہ وسعت خیال نے لوگوں کے دلوں میں لی۔ گو وہ خود علم سے بے بہرہ تھا لیکن وہ بخوبی جانتا تھا کہ تعصب کی بنیاد جہالت ہے اور اس کے رفع اور اقوام ماتحت پر ٹھیک طور پر حکومت کرنے کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ ان کے حالات و علوم سے زیادہ واقفیت حاصل کی جائے اور اسی لحاظ سے اس نے خلفائے بغداد کی طرح ایک سررشتۂ ترجمہ قائم کرکے بیسیوں سنسکرت کتابوں کے ترجمے شائع کرائے۔ ڈاڑھی منڈوانے ، گائے کے گوشت اور لہسن پیاز کے کھانے سے اجتناب کرنے اورغم کے موقعوں پر بھدرا کرنے کی غرض و غایت بھی یہی تھی کہ حاکم ومحکوم کے خیالات میں جو اختلاف ہے وہ باقی نہ رہے۔ اکبر بخوبی جانتا تھا کہ وہ مسلمان تو ہے ہی اور اس لیے اگر اتحاد و یکجہتی قائم کرنے کے لیے اس کو ضرورت ہے تو ہندوؤں کی باتیں اختیار کرنے کی ہے۔ قوموں اور مذاہب کے اختلافات رفع کرنے کے بعد اس نے ان اصلاحوں کی طرف توجہ کی جو جماعت انسانی کی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ نظام معاشرت کا دارومدار شادی بیاہ پر ہے، اور ان کے متعلق آئے دن لڑائی جھگڑے پیدا ہوتے رہتے ہیں جو خاندانوں کو تباہ کردیتے یا خود شوہر یا زوجہ کی زندگی خاک میں ملا دیتے ہیں یا اگر ابتداء میں کافی احتیاط نہ کی جائے تو ان کا اثر موجودہ نسل سے لے کر آئندہ نسل تک پہنچتا ہے۔ اکبر نے نہایت دور اندیشی سے قرار دیا کہ قریب کے

---

[1] بعض انگریز مورخوں مثل الفنسٹن و بلاک میں نے اس محضر کو بہت بڑی چیز سمجھا ہے مگر در اصل کوئی نئی بات نہ تھی۔ خلفائے راشدین کے علاوہ خلفاء بنی امیہ و بنی عباس کی امامت معاملات مذہبی میں مسلم تھی اور اسی طرح ترکوں میں شیخ الاسلام اب تک مجتہد کا مرتبہ رکھتے ہیں اور اہل تشیع میں کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوتا جس میں چند مجتہد موجود نہ ہوں۔

رشتہ داروں میں شادیاں نہ ہوا کریں اور اسی طرح کسی کی شادی سن بلوغ کو پہنچنے سے پہلے یا اگر عورت کی عمر مرد سے بارہ سال سے زیادہ ہو نہ ہوا کرے اور ایک سے زیادہ عورت کرنا بھی ناپسندیدہ ہے، اور ان امور کی نگرانی کی غرض سے یہ قاعدہ بنا دیا کہ تمام شادیوں کا داخلہ دفاتر سرکاری میں رہا کرے۔ ہندوستان کی اعلیٰ قوموں میں بیواؤں کے عقد ثانی کا رواج نہ ہونے سے نظام معاشرت میں جو خرابیاں پڑتی ہیں وہ محتاج بیان نہیں ہیں اور گو اس قسم کے امور میں قانونی مداخلت مناسب نہیں ہوتی لیکن اکبر نے اس کے متعلق بھی دور اندیشی سے ایک نہایت مفید قاعدہ بنا دیا اور وہ یہ کہ اگر کوئی بیوہ عقد ثانی کرنا چاہے تو اس کا روکنا داخل جرم ہوگا۔ان میں سے اکثر وہ اہم اصلاحیں ہیں جن کے لیے آج کل کے سوشل رفارمر زور دے رہے ہیں مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کوئی نہیں سنتا۔ ستی کی ظالمانہ اور قبیح رسم کے انسداد کا فخر بھی اکبر ہی کو حاصل ہے۔ اور وہ اپنے قوانین کا ایسا دلدادہ تھا کہ ایک مرتبہ جب راجہ جے مل مہم بنگالہ کے راستے میں بمقام چانسہ پہنچ کر فوت ہوا اور اس کے رشتہ داروں نے اس کی رانی کو ستی ہونے پر مجبور کیا تو اکبر ایک طول طویل سفر کرکے خود جا پہنچا اور ان کو اس شرمناک فعل سے باز رکھا۔

تعلیم چونکہ غذائے روح ہے اور قومی ترقی کا اس پر دارومدار ہے اس لیے اکبر نے اس طرف بھی پوری توجہ کی اور ایک مفید نصاب مقرر کرکے طریقہ تعلیم میں بھی ایسی مفید اصلاحیں کی کہ بہ قول ابو الفضل کے جو بات برسوں میں نصیب ہوتی تھی وہ مہینوں میں حاصل ہونے لگی۔ لوگوں کی بداخلاقی کو محاصل آبکاری قائم کرکے کبھی اس نے اپنے خزانے کے بھرنے کا ذریعہ نہیں بنایا۔لیکن اسی کے ساتھ بمقتضائے

محتسب را درون خانہ چہ کار

یہ بھی تاکید کردی کہ اگر کوئی چھپ چھپا کر مسکرات کا استعمال کرے تو اس سے مزاحمت بھی نہ کی جائے۔ اس زمانے میں محاصل آبکاری اور مسکرات پر جس قسم کے اعتراضات ہمارے پولٹیکل رفارمر کیا کرتے ہیں وہ محتاج تشریح نہیں ہیں اور نہ اس امر کے بیان کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ کس حد تک اکبر کے انتظام پر عائد ہوسکتے ہیں۔ غلہ اور مویشی اور صنعت و حرفت کی ترقی کے لیے اس نے یہ تدبیر اختیار کی کہ

ہر ایک شے کی ترقی کا ایک ایک امیر کو ذمہ دار قرار دیا اور اس امر کی نگرانی کے لیے کہ انھوں نے اپنے اس خاص فرض پر کس حد تک توجہ کی ہے جشن نوروز کے بعد خاص محلات شاہی میں ایک بڑا بازار لگتا تھا جس میں خود بادشاہ اور امرا اور محل کی بیگمات خرید و فروخت کرتی تھیں اور ہر شخص اپنا کمال دکھانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس بازار کو موجودہ نمائشوں کی ابتدا سمجھنا چاہئے۔ دوسرے طور پر بھی اس کو تجارت کی ترقی کا بے حد خیال تھا۔ جس کا ایک شمہ دلالوں کا تقرر بھی تھا۔ غرباء کی امداد کے لیے پائے تخت کے باہر دو عالیشان مکان پورہ اور دھرم پورہ کے نام سے تعمیر کرائے جن میں سے ایک مسلمانوں کے لیے مخصوص تھا اور دوسرا ہندوؤں کے لیے۔ اور ان میں ہر وقت ہر شخص کو تیار کھانا ملتا تھا اور جب ان مکانوں میں جوگی زیادہ جمع ہونے لگے جس سے دوسروں کی حق تلفی ہوتی تھی تو ان کے لیے ایک علاحدہ مکان بنام ''جوگی پورہ'' تعمیر کرایا گیا۔ انتظام سلطنت کی خوبی کا دارومدار چند امور پر ہے۔ شخصی آزادی، امن و امان، محصولوں کا معتدل ہونا اور مقررہ شرح سے لیا جانا۔ اور راستوں کا درست حالت میں رہنا۔ اگر اس اعتبار سے اکبر کے عہد پر نظر ڈالی جائے تو وہ بھی کسی سے پیچھے نہ نظر آئے گا۔ شخصی آزادی کی تو یہ کیفیت تھی کہ ہر شخص کو اختیار تھا کہ جو مذہب چاہے اختیار کرے۔ اور اس میں یہاں تک اہتمام تھا کہ اگر کوئی ہندو لڑکا بچپن میں مسلمان ہوجائے تو سن بلوغ پر پہنچنے کے بعد اس کو اپنے آبائی مذہب پر عود کرنے کا پورا اختیار ہوگا اور اسی طرح اگر کوئی ہندو عورت کسی مسلمان کے گھر میں پائی جائے تو وہ اپنے ورثا کے پاس پہنچا دی جائے۔ اس زمانے میں پادری لوگ شخصی آزادی کے بھیس میں جو سلوک مختلف قوموں کے یتیم بچوں سے کرتے یا بعض صورتوں میں زنانہ مشن کے ذریعے سے جاہل عورتوں کو ان کے آبائی مذہب سے متنفر کرکے خانہ بربادی کا موجب ہوتے ہیں اس کے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قیام امن و امان کے متعلق بھی اکبر نے نہایت دانشمندانہ احکام جاری کیے تھے جیسا کہ اشخاص جرائم پیشہ و وارد و صادر کی نگرانی ہر محلہ میں ایک ایک شخص کے بنام میر محلہ ذمہ دار انتظام قرار دئے جانے اور کوتوال اور چوکیداروں کے فرائض اور ذمہ داریوں سے معلوم ہوتا ہے۔ اور خلق اللہ کی داد رسی اور ان کے نزاعات باہمی کے تصفیہ کے لیے قاضی و میر عدل

مقرر تھے جن میں سے قاضی کا کام تحقیقات، اور میر عدل کا فیصلہ صادر کرنا تھا اور سب کی نگرانی کے لیے ایک اعلیٰ عہدہ دار بنام صدر جہاں مقرر تھا۔ فرائض کی اس تقسیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ انصاف رسانی کا کام کیسی احتیاط سے ہوتا ہوگا اور لطف یہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ شخص بلا کسی خرچ کے عدالت ہائے شاہی سے فیضیاب ہوسکتا تھا کیونکہ اس زمانے میں نہ کوئی قانونی اسٹامپ تھا اور نہ گروہ وکلا۔ محصولات کے متعلق اکبر کی جو توجہ ابتدا سے تھی اس کا ذکر پہلے ضمناً آچکا ہے۔ اس نے نہایت استقلال اور دانشمندی کے ساتھ ان تمام محصولات کو قطعاً موقوف کردیا جو قومی ترقی میں حارج یا لوگوں کی دل آزاری کا موجب تھے اور جو محصول باقی رکھے ان کے متعلق بھی صاف و صریح قاعدے بنا دیے۔ انتظام مال گزاری کے متعلق بہت ضروری اصول یہ ہیں کہ اراضی زیر کاشت کا رقبہ معین ہو۔ لگان چندسال کی اوسط پیداوار کے لحاظ سے بہ لحاظ اقسام اراضی ایسی معتدل شرح سے معین کیاجائے جس میں بری اور بھلی دونوں قسم کی فصلوں کا لحاظ رہے اور کاشتکاروں کو علاوہ اپنی مقبوضہ زمین کے اراضی افتادہ کے لینے کی بھی ترغیب ہو۔ یہ اصول تو نفع سرکاری کے لحاظ سے ضروری ہیں لیکن کاشتکاروں کا فائدہ اس میں ہے کہ زمین کے متعلق ان کو حق مقابضت حاصل ہو کہ ترقی اراضی وکاشت کی ترغیب ہو۔ اور لگان کی شرح معین اور معلوم ہو کہ عمال کو زیادہ ستانے کا موقع نہ ملے اور اس قدر نرم ہو کہ اس کو ہر سال کچھ پس انداز ہوتا رہے تاکہ بصورت خرابی فصل بسر اوقات بہ آسانی ہوسکے۔ یہی اصول تھے جن پر ٹوڈرمل اور مظفر خاں کا بندوبست مال گزاری مبنی تھا اور وہی اس وقت تک قوانین مال گزاری کی بنیاد ہیں۔ضلع کا حاکم مال عامل گزار کہلاتا تھا جس کو وصول زر مال گزاری کے متعلق بلحاظ حالات فصول وسیع اختیار ہوتے تھے اور صوبہ کا گورنر سپہ سالار ہوتا تھا۔ علم اعداد جس کو اس زمانہ میں اس قدر ترقی ہوئی ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے ایک مستقل سر رشتہ مقرر کیا اورجملہ دفاتر سرکاری کا بڑا وقت ترتیب نقشہ جات میں گزرتا ہے اور جو نتائج کہ ان سے متخرج ہوتے ہیں ان سے نگرانی و انتظام میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس کی بنیاد بھی ہندوستان میں اکبر ہی نے ڈالی تھی اور جو کیفیتیں کہ افسران مفصلات روزانہ اور ہفتہ وار اور ماہانہ پیش کرتے تھے ان سے حکام صدر کو نگرانی کا عمدہ موقع ملتا تھا۔

اب اگر آسانی راہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ محاصل راہداری تو قطعاً موقوف کردئے گئے تھے اور حسن انتظام کی وجہ سے ہر شخص بے خوف ایک مقام سے دوسرے مقام پر جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ ابتدائی عہد میں آگرہ سے اجمیر شریف تک ایک پختہ سڑک جس پر کوس کوس بھر کے فاصلے پر چھوٹے چھوٹے مینارے اور کنوئیں اور ہر منزل پر سرائیں جہاں کھانا تیار ملتا تھا ۔ اکبر کی خوش اعتقادی نے بنوادی تھیں۔ مگر ۴۸ ھ جلوس میں رفاہ خلق اللہ کے خیال نے اس حکم کو عام کردیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کو اس کی تکمیل کا موقع نہیں ملا۔ ۱۴۱ھ جلوس میں ایک قحط پڑا اور اکبر نامہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے غرباومحتاجوں کی امداد کا خاص انتظام کیا اور اس کام کے لیے خاص خاص عہدہ دار بھی مقرر کیے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مبارک طریقے کا بانی بھی جس نے برٹش گورنمنٹ کے روشن زمانے میں متعدد فیمن کمیشنوں کی بدولت بہت کچھ ترقی کی ہے اکبر ہی تھا۔ ہم نے صرف ان بڑے بڑے صیغوں کا مختصر سا حال لکھا ہے جن کا اثر خلق اللہ پر پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ باقی جتنے صیغے مثل دار الضرب و خزانہ و شترخانہ و فیل خانہ وغیرہ وغیرہ تھے ان کے آئین بھی نہایت باریک نظری سے مدون کیے گئے تھے۔ غرض کہ سلطنت کا کوئی صیغہ ایسا نہ تھا جس کو اکبر کی دانشمندی سے فائدہ نہ پہنچا ہو۔ اب اگر سرکاری انتظامات سے گزر کر اکبر کی پرائیویٹ لائف (نج کی زندگی) کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ عجب محبت کے قابل آدمی تھا۔ اس کی خوش مزاجی کی یہ کیفیت تھی کہ کیسا ہی خشک آدمی اس کی مجلس میں شریک ہو ممکن نہیں کہ باغ باغ نہ ہوجائے۔ مروت ورحم کا تو وہ پتلا تھا۔ جس شخص کی بھی اس تک رسائی ہوجاتی عمر بھر کے لیے فارغ البال ہوجاتا تھا اور جس دشمن نے سر اطاعت اس کے سامنے جھکایا اس کا دریائے عفو و کرم جوش میں آیا اور اس کو اپنے امراء خاص میں داخل کیا۔ کھانا صرف ایک وقت کھاتا تھا اور خواہشات نفسانی کا بھی پابند نہ تھا۔ گو پڑھا لکھا نہ تھا مگر اپنا اکثر وقت علمی مجلسوں اور ہر قسم کی کتابوں کے سننے میں صرف کرتا تھا اور علماء کی خواہ وہ کسی قوم اور مذہب کے ہوں بڑی قدر کرتا تھا۔ اس میں مردم شناسی کا مادّہ اعلیٰ درجے کا تھا۔ اور انتخاب کی یہ خوبی تھی کہ جو شخص جس کام کا اہل ہوتا تھا وہی اس کے سپرد کیا جاتا تھا اور اسی وجہ

سے اس کے منصوبے بہت کم ناکامی کی شکل دیکھتے تھے اور اس کی بدولت وہ وہ جواہر بے بہا اس کے دربار کی زیب و زینت کا باعث تھے جو وکرما جیت کے نورتن کو مات کرتے تھے۔ شکار کا بے حد شوق تھا اور ہاتھیوں کا تو عاشق ہی تھا اور فن موسیقی کے رموز سے ناواقف نہ تھا۔ تعمیرات عامہ کی طرف بھی بہت توجہ تھی اور بہت سے عالیشان قلعے اور عمارتیں آج تک اس کے حسن اور شاہانہ اولو العزمی پر شہادت دینے کے لیے موجود ہیں۔ قدرت نے جیسا حسن سیرت سے آراستہ کیا تھا ویسا حسن ظاہری بھی عطا فرمایا تھا۔ جہانگیر نے بیٹے کی محبت اور نقاش کے قلم سے اس کی تصویر تزک جہانگیری میں کھینچی ہے جس کا ترجمہ ناظرین کی دلچسپی کے لیے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

> ''بلند بالا۔ قدمیانہ، گندمی رنگ، آنکھوں کی پتلیاں اور بھنویں سیاہ، رنگت گوری تھی مگر اس میں پھیکاپن نہ تھا۔ نمکینی زیادہ تھی۔ شیر اندام، سینہ کشادہ، چھاتی ابھرا ہوا، دست و بازو لمبے، بائیں نتھنے پر ایک مسّہ چنے کے برابر جس کو ماہرین فن قیافہ شناسی بہت مبارک سمجھتے تھے۔ آواز بلند اور گفتگو میں ایک خاص لوچ اور قدرتی نمکینی تھی اور سج دھج سا عام لوگوں کو ان سے کچھ مناسبت نہ تھی۔ شکوہ خداداد ان کے چہرہ سے ظاہر تھی۔''

آخر میں نالائق اولاد نے اس محبّ وطن بادشاہ کو بہت سے داغ دیے اور وہ اسی رنج و غم میں ۲۰ر جمادی الآخر ۱۰۱۴ھ مطابق (ستمبر ۱۶۰۵ء) کو دنیائے فانی سے عالم جاودانی کو سدھارا اور سکندرہ کے عالیشان مقبرے میں اپنے پرعظمت کارنامے ہمیشہ کے لیے یادگار چھوڑ کر دفن ہوا۔ اگرچہ اکبر میں چندرگپت کی شجاعت اور اولو العزمی اشوک کی نیک نفسی اور انضباط قوانین، اور وکرما جیت کی شان و شوکت اور قدردانی علم و ہنر جمع تھے لیکن اس نے جس کام کی بنیاد ڈالی تھی وہ ایک شخص کے بس کا نہ تھا اور چونکہ اس کے جانشینوں میں کوئی اس کا ہم خیال پیدا نہ ہوا اس لیے وہ پوری طرح بارآور نہ ہوسکا۔ لیکن پھر بھی اکبر کی پرسوز کوششیں بیکار نہ گئیں اور یہ انھیں کی برکت تھی کہ ہندو مسلمان باوجود حکام وقت کی بے پروائی کے نہایت سلوک اور اتفاق سے کئی صدیوں تک رہے اور اب زمانے میں بھی جبکہ اجزائے اختلاف ہر طرف سے جمع ہوکر ایک پرسوز سیلاب کی شکل میں نمودار ہو رہے ہیں اور قوی اتحاد کی کشتی کو ڈبونے کے لیے

بھائیں بھائیں کرتے بڑھ رہے ہیں۔ اگر کوئی امید ہے تو اسی کے مبارک نام سے ہے جو ہمارے بیڑے کو پار لگانے میں اسم اعظم کی تاثیر دکھائے گا۔ پس اے ہندو مسلمانو! خواب غفلت سے بیدار ہو۔ اٹھو اور سکندرہ کی راہ لو۔ تاکہ اس کے مقدس مزار پر اگر ہم دو پھول چڑھائیں تو اے ہندو بھائیو! تم بھی تھوڑا پانی ڈال کر اس کی روح کو خوش کرو۔ کیا عجب ہے کہ اس کے فیضان سے ہمارے بے بنیاد اختلافات رفع ہوکر پھر یک جہتی کی صورت پیدا ہوجائے۔ افسوس اور شرم کا مقام ہے کہ برٹش گورنمنٹ باوجود اجنبی ہونے کے اپنے آپ کو اس کا قائم مقام اور اس کی تقلید کو باعث فخر سمجھے لیکن تم اپنے محب وطن قومی بادشاہ کی قیمتی میراث کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو!!!

''زمانہ''

اکتوبر ۱۹۰۵ء

راجہ مان سنگھ

دربار اکبری کے جادو طراز مصور نے کیا خوب کہا ہے :

''اس عالی خاندان راجہ کی تصویر دربار اکبری کے مرقع میں سونے کے پانی سے کھینچنی چاہئے۔''

بیشک! اور نہ صرف مان سنگھ کی بلکہ اس کے نامور باپ راجہ بھگوان داس و مشہور دادا راجہ پہاڑا مل کی تصویریں بھی اسی اعزاز اور سنگار کی مستحق ہیں۔ راجہ پہاڑا مل وہ پہلا عالی دماغ، وسیع نظر راجہ تھا جس نے ہزاروں برس کے مذہبی تعصبات مصالح ملکی پر قربان کر کے مسلمانوں سے ناتا جوڑا اور ۹۶۹ھ میں اپنی فرخندہ صفات لڑکی اکبر کی عروسی میں دی۔ آمیر کے خاندان کچھواہہ کو آزاد خیالی اور بے تعصبی کے میدان میں پیش قدمی کرنے کا فخر حاصل ہے۔ اور جب تک ان اوصاف خجستہ کی وقعت زمانے کی نگاہوں میں رہے گی اس خاندان کے نام پر ہمیشہ اعزاز کا فاتحہ پڑھا جائے گا۔

مان سنگھ امبیر میں پیدا ہوا۔ اور اس کی طفولیت کا زمانہ اسی ملک کے پرجوش و جنگجو باشندوں میں گزرا جن سے اس نے دلاوری و جانبازی کے سبق پڑھے۔ مگر جب شباب نے دل میں جوش اور جوش میں امنگ پیدا کی تو دربار اکبری کی طرف رخ کیا۔ جو اس زمانے میں اعزاز و وقار، منصب و اقتدار کی کان سمجھا جاتا تھا۔ بھگوان داس کی خیر اندیشیوں اور جاں نثاریوں نے اسے بارگاہ سلطانی میں عزت کی مسند پر بٹھا دیا تھا۔ اس کے ہونہار جوان بخت بیٹے کی جتنی آؤ بھگت ہونی چاہئے اس سے زیادہ ہوئی۔ اکبر اس کے ساتھ پدرانہ شفقت سے پیش آیا اور جب ۱۵۷۲ء میں گجرات میں فوج کشی کی تو اس نوجوان کنور کو ہمراہی کا افتخار بخشا۔ اس مہم میں اس نے وہ بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارے کہ اکبر کی نظروں میں جچ گیا۔ اگر کچھ کور کسر تھی تو وہ اس وقت

پوری ہوگئی جب خان اعظم احمد آباد میں گھر گئے اور اکبر نے آگرے سے کوچ کر کے دو مہینے کی راہ سات دن میں طے کی۔ نوجوان کنور اس یلغار میں بھی ہمرکاب رہا یہ گویا اس کی تعلیم و امتحان کے دن تھے۔

اب وہ زمانہ آیا کہ معتمد خدمات کی دستار فضیلت اس کے سر باندھی جائے۔ حسن اتفاق سے موقع بھی جلد ہاتھ آیا۔ شولاپور کی مہم مارے چلا آرہا تھا کہ راستے میں مقام کوئمیر پر رانا پرتاپ سنگھ سے ملاقات ہوئی۔ رانا کچھواہہ خاندان پر اس کی آزاد خیالیوں کے باعث سے تنا بیٹھا تھا کہ اس نے راجپوتوں کے ماتھے پر کلونس کا ٹیکہ لگایا۔ مان سنگھ پر طعن و تشنیع کے چبھتے ہوئے تیر سر کیے جو اس کے کلیجے کے پار ہوگئے۔ ان زخموں کے لیے سوائے انتقام کے اور کوئی شفا بخش مرہم نظر نہ آیا۔

مان سنگھ نے آگرہ میں آکر اکبر سے تمام و کمال ماجرا بیان کیا۔ اکبر عالی ہمت بادشاہ تھا۔ غضب میں آگیا۔ رانا پر فوج کشی کی تیاری کی،شہزادہ سلیم کے نام سپہ سالاری ہوئی اور مان سنگھ اس کا مشیر مقرر ہوا۔

شاہی فوج پہاڑوں جنگلوں کو طے کرتی رانا کے ملک میں داخل ہوئی۔ رانا پرتاپ سنگھ بھی اپنے بائیس ہزار جاں نثار راجپوتوں کے ساتھ ہلدی گھاٹ کے میدان میں اڑا کھڑا تھا۔ یہاں خوب گھمسان کی لڑائی ہوئی، خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ پہاڑوں کے پتھر شنگرف ہوگئے۔ میواڑ کے بیر مان سنگھ کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے ایسے جان توڑ توڑ کر حملے کرتے تھے کہ اگر سد سکندر بھی ہوتی تو شاید اپنی جگہ پر قائم نہ رہ سکتی۔ مگر مان سنگھ بھی شیر کا دل رکھتا تھا۔ اس پر جوانی کا جوش، حوصلہ کہتا تھا ساری فوج کی نگاہیں تجھ پر ہیں۔ دکھادے کہ راجپوت اپنی تلوار کا دھنی ہوتا ہے!آخر اقبال اکبری غالب آیا، رانا کے بیروں کے قدم اکھڑ گئے۔ چودہ ہزار سورما کھیت رہے صرف آٹھ ہزار اپنی جانیں سلامت لے گئے۔ کہاں ہیں اسپارٹا کی تعریف میں ورقوں کے سیاہ کرنے والے آئیں اور دیکھیں کہ ہندوستان کے جودھا کیسے بے جگری کے ساتھ جان دیتے ہیں!!

رانا لڑائی تو ہار گیا مگر ہمت نہ ہارا، اس کی ہیکڑی اس کے گلے کا ہار بنی رہی۔ جب کبھی میدان خالی پاتا اپنے جانبازوں کے ساتھ قلعہ سے نکل پڑتا اور قرب و جوار میں طوفان برپا کرتا۔ اکبر نے کچھ دنوں تک طرح دی، مگر جب رانا کی زیادتیاں جادۂ

اعتدال سے متجاوز ہوگئیں تو ۱۵۷۶ء میں اس پر پھر فوج کشی کی تیاری کی۔ خود تو اجمیر میں آ کر ٹھہرا اور مان سنگھ کو خطاب فرزندی کے ساتھ اس مہم کی سپہ سالاری پر ممتاز کیا۔ راجہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوکر دم کے دم میں گوکندا پر جا دھمکا۔ جہاں رانا اپنے برے دن کاٹ رہا تھا۔

رانا نے بھی اب کی مرنے مارنے کی ٹھان لی تھی۔جوں ہی دونوں فوجیں مقابل میں آراستہ ہوئیں اور ڈنکے پر چوٹ پڑی ووں ہی لڑائی دست بدست ہونے لگی۔ رانا کے غیور راجپوت ایسی بے جگری سے جھپٹے کہ شاہی فوج کے دونوں بازوؤں کو درہم و برہم کردیا۔ مگر مان سنگھ جو قلب فوج میں تھا استقلال سے ڈٹا کھڑا رہا۔ یکا یک اس کے تیور بدلے، شیر کی طرح گرجا، اپنے ساتھیوں کو للکارا اور بجلی کی طرح رانا کی فوج پر ٹوٹ پڑا۔ رانا غصے میں بھرا خم ٹھونک کر سامنے آیا اور دونوں دلاور گتھ گئے۔ اوپر تلے کئی وار ہوئے اور رانا گھائل ہوکر پیچھے ہٹا۔ اس کے ہٹتے ہی اس کی فوج میں کھلبلی پڑ گئی۔ ان کے قدم اکھڑے تھے کہ مان سنگھ کے جہاں سوز تیغے نے ہزاروں کو خاک پر سلا دیا۔ اس کی شجاعت نے آج وہ کرتب دکھائے کہ اچھے اچھے جنگ آزما مغل جو بابری تلوار کی کاٹ دیکھے ہوئے تھے۔ دانتوں تلے انگلی دبا کر رہ گئے۔

اس فتح نے کنور مان سنگھ کی سپہ سالاری کی دھوم مچادی مگر ۱۵۸۱ء میں اس کی تلوار نے وہ تڑپ دکھائی کہ ''ہندی لوہے نے ولایتی کے جوہر مٹا دیئے'' ملک بنگال میں چند امرا نے شورش کی، اور اکبر کے سوتیلے بھائی مرزا حکیم کو چڑھا لانے کی بندشیں باندھناشروع کیں۔ مرزا باغ باغ ہوگیا اپنی فوج لے کر پنجاب کی طرف بڑھا ۔ ادھر سے راجہ مان سنگھ سپہ سالار بن کر اس کے مقابلے کو روانہ ہوئے۔ مرزا کاکو کہ شادمان جو ایک دلیر آدمی تھا۔ اٹک کا محاصرہ کیے پڑا تھا نقارے کی گھن گرج آواز کان میں پڑی تو چونکا۔ مگر اب کیا ہونا تھا مان سنگھ سر پر آپہنچا تھا۔ اس کی فوج طرفۃ العین میں تتر بتر ہوگئی اور شادمان خاک پر پڑا دکھائی دیا۔

مرزا نے جب یہ خبر بدسنی تو سخت برہم ہوا۔ فوراً کمر ہمت چست باندھی، اور یہ سمجھ کر کہ اکبر بنگالہ کے معاملات میں الجھا ہوا ہے۔ لاہور تک درّاتا ہوا گھس آیا۔ مگر جوں ہی سنا کہ اکبر دھاوا مارنے ادھر چلا آرہاہے اس کے اوسان خطا ہوگئے۔

پہاڑوں کو پھاندتا، دریاؤں کو پار کرتا کابل کو بھاگا۔ مان سنگھ بھی بموجب حکم بادشاہی پشاور پر جا پڑے اور کابل کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ اکبر اقبال کا لشکر لیے اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

مان سنگھ بے خوف و خطر گھستا ہوا خورد کابل تک جا پہنچا۔ اور یہاں ٹھہرا کہ حریف میدان میں آئے تو دور دراز منزلوں کی تھکن دور ہو۔ مرزا حکیم بھی بڑے شش و پنج کے بعد فوج لیے ایک گھاٹی سے نمودار ہوا اور ہنگامہ کارزار گرم ہوگیا۔ دونوں طرف سے دلاور خوب دل توڑ کر لڑے۔ گو مقابلہ بہت سخت تھا۔ اور راجپوت ایسی ناہموار زمین پر لڑنے کے عادی نہ تھے مگر مان سنگھ نے سپاہیوں کو ایسا ابھارا اور ایسے موقع موقع سے کمک پہنچائی کہ آخر میدان مارلیا۔ حریف بھیڑوں کی طرح بھاگے۔ راجپوتوں کے ارمان دل کے دل ہی میں رہ گئے۔ مگر دوسرے دن سورج بھی نہ نکلنے پایا تھا کہ مرزا کا ماموں فریدوں خان پھر فوج لے کر پہنچا۔ مان سنگھ نے بھی اپنی فوج اس کے مقابل کھڑی کی اور چٹ پٹ خون کی پیاسی تلواریں میانوں سے نکلیں اور توپوں نے گولے اگلے اور ریل پیل ہونے لگی۔ دو گھنٹے تک تیغے چلتے رہے۔ آخر دشمن پسپا ہوا اور مان سنگھ مظفر و منصور کابل میں داخل ہوا۔ مگر اکبر کی کریم النفسی و دریا دلی پر ہزار آفرین ہے کہ اس ملک پر جو اتنی خونریزیوں کے بعد فتح ہوا تھا متصرف نہ ہوا بلکہ مرزا کی خطائیں معاف کیں اور اس کا ملک اس کو دے دیا۔ پشاور اور سرحدی ملک کے اختیارات مان سنگھ کے سپرد کیے اور دو برس تک راجہ نے ان خدمات کو بڑی فراست و متانت سے انجام دیا۔ اس ملک کا ایک ایک چپہ فتنہ و فساد کا اکھاڑا ہو رہا تھا۔ راجہ نے اپنی حکمت عملیوں اور جگر داریوں سے بڑے بڑے مفسدوں کی رگیں ڈھیلی کردیں، اس کے ساتھ ہی اس کے لطف و اخلاق نے شرفا پر تسخیر کا عمل پڑھا۔ غول کے غول سلام کو حاضر ہونے لگے تاہم رعایا کو عرصے تک آسودہ نہ رکھ سکا۔ اس کے سپاہی آخر راجپوت تھے۔ افغانوں کی بدنیتیں اور اس کے مظالم یاد کرتے تو بے اختیار پیشانیوں پر بل پڑ جاتے اس جذبہ میں آکر رعایا کو ستاتے۔ چنانچہ اس کی شکایتیں دربار شاہی میں پہنچیں اور راجہ بہار بھیج دیے گئے۔

بنگالہ سلطنت اکبری کا وہ نازک حصہ تھا جہاں فاسد مادہ مجتمع ہوکر پکا کرتا تھا۔

افغانوں نے اپنی تین سو برس کی عملداری میں اس ملک پر خوب اچھی طرح تسلط جما لیا تھا۔ اکثر وہیں آباد ہوگئے تھے۔ اور گو اکبر نے کئی بار ان کا نشہ ہرن کردیا تھا، مگر اب بھی چند ایسے سر باقی تھے جن میں سلطنت کا سودا سمایا ہوا تھا۔ اور وہ وقتاً فوقتاً فتنہ انگیزیاں کیا کرتے تھے۔ وہاں کے ہندو راجاؤں نے بھی ان کے ساتھ رشتہ اتحاد استوار کر رکھا تھا اور وقت ضرورت پر حق رفاقت ادا کرتے تھے۔

کنور مان سنگھ جاتے ہی راجہ پورن مل کندھوریہ پر چڑھ گیا اور اس کے گھمنڈ کا قلعہ ڈھا دیا۔ راجہ سنگرام کو بھی تلوار کے گھاٹ اتارا اور چند دیگر راجاؤں کو زیر کرکے بہار کو مفسدوں سے پاک و صاف کردیا۔ ان خدمات معتبرہ کے صلے میں اس کو راجگی کا خطاب، خلعت خاصہ، اسپ بازیں زرّین اور منصب پنج ہزاری عطا ہوا۔

مگر ایسے اولو العزم جوشیلے راجپوت سے کب خاموش بیٹھا جاتا تھا ۱۵۹۰ء میں اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اڑیسہ میں داخل ہوگیا۔ان دنوں یہاں قتلو خان افغان حکومت کرتا تھا۔ مقابلے پر آمادہ ہوا مگر حسن اتفاق اسی اثنا میں افغانوں میں ناچاقی ہوگئی۔ قتلو خان قتل ہوا، باقی سرداروں نے اطاعت اختیار کی۔اور کئی سال تک حلقہ بگوش رہے مگر یکایک ان کی ہمتوں نے پھر سر ابھارا۔ بادشاہی ملک پر چڑھ آئے۔ راجہ کو بیکاری وبال جان ہو رہی تھی حیلہ ہاتھ آیا۔ فوراً فوج لے کر بڑھا اور حریفوں کے علاقے میں نشان اکبری نصب کردیا۔ افغان بڑے جوش و خروش سے مقابلے کو آئے مگر راجپوت سورماؤں کے آگے ایک بھی پیش رفت نہ گئی دم کے دم میں ستھراؤ ہوگیا۔ بقیۃ السیف اپنی جان لے کر بھاگے اور بہار سے لے کر دریائے شور تک اقبال اکبری کا پھریرا لہرانے لگا۔

راجہ مان سنگھ جیسا جنگ آزمائی کے فن میں ماہر تھا۔ ویسا ہی ملک داری کے اصولوں سے آگاہ تھا۔ اس کی تعمق نے صاف دیکھ لیا کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے کی نہیں۔ یوں عملداری کبھی قائم نہ رہے گی تاوقتیکہ ایک ایسا شہر آباد نہ کیا جائے جو دریائی حملے سے محفوظ ہو اور ایسے مرکزی مقام پر واقع ہو کہ وہاں سے چاروں طرف آسانی سے کمک بھیجی جاسکے۔ آخر بڑی ردّوکد صلاح و مشورہ کے بعد اکبرنگر کا بنیادی پتھر رکھا گیا۔ گویا جنگل میں منگل ہوگیا۔ چند ہی سالوں میں یہ شہر ایسی رونق پر ہوگیا

کہ طلسمات کا عالم دکھانے لگا۔ یہ شہر آج راج محل کے نام سے مشہور ہے اور جب تک صفحہ ہستی پر قائم رہے گا اپنے بانی کا نام روشن کرتا رہے گا۔ اس شہر کے بیچوں بیچ میں ایک مستحکم ومنیع قلعہ تعمیر کیا گیا۔ اور پھر دوبارہ افغانوں کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔ راجہ نے چار ہی پانچ سال کی جانفشانیوں میں سارے بنگال سے اکبر کے قدموں پر سجدہ کرادیا۔ خان زمان، خانجاناں، راجہ ٹوڈر مل جیسے جیسے ناموروں نے بنگالہ پر جادو پھونکے مگر وہاں تسلط جمانے میں ناکام رہے۔ مورخین نے اس فضیلت کا تمغہ مان سنگھ کے نام پر لکھا ہے۔ ان مہموں میں نوجوان جگت سنگھ نے بھی مردانگی کے خوب جوہر دکھائے اور ۱۵۹۸ء میں کوہستان پنجاب کی صوبہ داری سے سرفراز ہوا۔ مگر یہ سال مان سنگھ کے لیے نہایت منحوس تھا۔ اس کے دو بیٹے عین عنفوان شباب کے زمانے میں جبکہ نعمت زندگی سے متمتع ہونے کے دن آرہے تھے اجل کا شکار ہوئے اور باپ کی امیدوں کی کمر توڑ گئے۔

مگر غالباً راجہ اب ان تمام نعمتوں سے حظ اٹھا چکا تھا جو قسام ازل نے اس کی پیشانی تقدیر میں لکھی تھیں۔ ان پر ملال، جانگداز سانحوں کے دو ہی سال بعد اس کے دل نے ایسے ایسے زخم کھائے جن سے وہ جانبر نہ ہوسکا۔

میواڑ کا رانا ابھی تک گوش گزاروں کے حلقے میں نہیں آیا تھا۔ اور اکبر کے دل سے لگی ہوئی تھی کہ اسے اطاعت کا جوا پہنائے، ابھی تک جتنی فوجیں اس مہم پر گئی تھیں ناکام لوٹی تھیں۔ اب کی بار بڑے وسیع پیانے پر تیاریاں ہوئیں۔ شہزادہ سلیم کے نام سپہ سالاری ہوئی اور راجہ مان سنگھ اس کے صلاح کار بنے۔ ہونہار جگت سنگھ بنگالہ میں باپ کا جانشیں ہوا۔ خوش خوش پنجاب سے آگرے آیا اور سامان سفر میں مصروف تھا کہ یکایک دنیا سے اٹھ گیا۔ نہایت خوش رو، خوش اخلاق جوان تھا۔ کچھواہہ خاندان کے گھر گھر کہرام مچ گیا۔ مان سنگھ کو یہ خبر ملی تو اس کی آنکھوں میں جگت سونا ہوگیا۔ دو بیٹوں کے زخم ابھی نہ بھرنے پائے تھے کہ یہ زخم اور کاری لگا۔ ہائے! جوان اور ہونہار بیٹے کی موت کا صدمہ کوئی اس کے دل سے پوچھے! اکبر کو بھی اس جوانا مرگ کا سخت رنج ہوا۔ مرنے والے کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس کے بیٹے مہان سنگھ کو بنگالہ بھیجا۔ مگر کنور ابھی ناتجربہ کار تھا۔ افغانوں سے شکست کھائی اور سارے بنگال میں

باغیوں نے خود سری کے نشان بلند کردیے ادھر شہزادہ سلیم کی طبیعت بھی رانا کی مہم سے اُچاٹ ہوئی۔ عیش وعشرت کا بندہ تھا، پہاڑوں سے سر ٹکرانا پسند نہ آیا۔ بلا بادشاہ کی اجازت کے الٰہ آباد کو لوٹ پڑا۔ راجہ بھی بنگالہ کو چلا کہ بغاوت کی آگ کو مفسدوں کے خون سے بجھائے۔ مگر افسوس! بڑھاپے میں بدنامی کا دھبہ لگا، جس کا راجہ کو نہایت سخت ملال ہوا، اکبر کوشبہ ہوا کہ شہزادہ سلیم راجہ ہی کے اشارے سے لوٹا ہے۔ گو اس کی کچھ بنیاد نہ تھی، کیونکہ شہزادہ راجہ سے پہلے سے بدظن تھا۔ مگر راجہ کی کارگزاریوں و جان بازیوں نے یہ شبہ بہت جلد رفع کردیا۔ چند ہی مہینوں میں بنگالہ پھر سربسجود ہوگیا۔ اور ۱۵۰۴ء میں اکبر کی قدردانی نے اس کو شہزادہ خسرو کی اتالیقی پر ممتاز کرکے ہفت ہزاری، چھ ہزار سوار کے منصب پر سربلند کیا۔ اب تک یہ معراج کسی امیر کو میسر نہ ہوئی تھی۔ مگر بجز راجہ ٹوڈرمل کے دوسرا کون تھا جو وفاداری و جاں نثاری میں اس کی برابری کرسکتا۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ خود بھی ایک نامی گرامی خاندان کا چراغ تھا۔ جس کے ساتھ بیس ہزار دلاور ہر دم پسینے کی جگہ خون بہانے کو تیار رہتے تھے۔ مگر افسوس! فلک ناہنجار نے اس اعزاز و اکرام سے زیادہ عرصے تک دامن بھرنے نہ دیا۔ ۱۶۰۵ء میں اکبر نے اس دارفانی سے رحلت کی اور اسی تاریخ سے مان سنگھ کا ستارہ بھی زوال میں آیا۔ تاہم جہانگیر کے عہد میں بھی اس نے نو برس تک عزت و آبرو کے ساتھ نباہا۔ اس کی عقل سلیم و سلامت روی کی داد دینی چاہئے کہ جیسا زمانہ دیکھتا تھا ویسا کرتا تھا۔ اور جہانگیر کی بلند حوصلگی کو بھی آفرین ہے کہ گو راجہ کو خسرو کی فتنہ انگیزیوں کا بانی سمجھتا تھا مگر اس کا مرتبہ اور منصب سب بحال رکھا۔ خانخاناں اور مرزا عزیز مصلحت بین نگاہیں نہ رکھتے تھے۔ اکبر کے بعد جب تک جیے، زندہ درگور، ادبار کی مصیبتیں جھیلتے رہے۔

۱۵۱۴ء میں جہانگیر نے ایک زبردست فوج خان جہاں کی سپہ سالاری میں مہم دکن پر بھیجی۔ راجہ مان سنگھ بھی جو کہ دربار کی سرد مہریوں و بے نیازیوں سے بیزار ہو رہا تھا، اس مہم کے ساتھ چلا کہ اگر ممکن ہو تو بڑھاپے میں جوانی کے جوش دکھا کر بادشاہ کے دل میں جگہ پائے۔ مگر موت نے یہ ارمان نہ نکالنے دیا۔ بیٹوں میں سے صرف بھاؤ سنگھ جیتا بچا تھا۔ جہانگیر نے اسے مرزا راجہ کا خطاب دے کر چار ہزاری

منصب پر ممتاز کیا۔

راجہ ملک داری و ملک گیری کے اصولوں سے خوب ماہر تھا۔ اور ان پر خوبی کے ساتھ کاربند ہونا جانتا تھا۔ جس مہم پر گیا سرخرو لوٹا۔ افغانستان کے لوگ ابھی تک اس کا نام عزت سے لیتے ہیں۔ ان فضائل کے ساتھ متواضع ملنسار، خوش اخلاق، نیک محضر اور شگفتہ مزاج تھا۔ اس کی دریا دلی اس زمانے میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتی تھی۔ جس کی ایک روایت یوں بیان کی جاتی ہے جس وقت دکن کو مہم جا رہی تھی بالا گھاٹ میں غلہ کا ایسا قحط ہوا کہ ایک روپے کے آٹے میں بھی آدمی کا پیٹ نہیں بھرتا تھا۔ ایک دن راجہ نے کچہری سے اٹھ کر کہا کہ اگر میں مسلمان ہوتا تو ایک وقت طعام ہزار مسلمانوں کے ساتھ کھاتا مگر میں سب کی ریش سفید ہوں مجھ سے سب بھائی برگ تنبول قبول کریں سب سے اول خان جہاں لودی نے ہاتھ سر پر رکھ کر کہا کہ مجھے قبول ہے پھر اوروں نے بھی قبول کیا۔ راجہ نے یومیہ ایک سو روپے پنج ہزاری کا اور اسی حساب سے اوروں کا صرفہ دعوت مقرر کیا۔ ہر رات کو ایک خریطہ میں ہر شخص کے پاس یہ روپیہ پہنچ جاتا۔ خریطہ پر اس کا نام لکھا ہوتا۔ سپاہیوں کو رسد پہنچنے تک سستی قیمت پر جنس مہیا کرواتا۔ حتیٰ کہ راہ میں مسلمانوں کے واسطے حمام اور کپڑے کی مسجد بنا کر ایستادہ کرواتا، اس کو فیاضی کہتے ہیں اور دریا دلی اس کا نام ہے۔ باغ و بہار میں شہزادی بصرہ کا قصہ پڑھیے اور اس کا موازنہ اس تاریخی روایت سے کیجیے۔

راجہ ٹوڈرمل کی طرح راجہ مان سنگھ بھی مرتے دم تک اپنے آبائی مذہب پر راسخ رہا۔ مگر تعصب سے اس کی فطرت کو ذرّہ بھر بھی لگاؤ نہ تھا۔ متعصب آدمی کا دور اکبری میں عروج پانا ناممکنات سے تھا۔ اکبر نے راجہ سے ایک بار کنایتاً تبدیلیٔ مذہب کی تحریک کی تھی۔ مگر راجہ نے ایسا برجستہ جواب دیا کہ بادشاہ کو خاموش ہونا پڑا۔ کتابوں میں بہت سے تذکرے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ راجہ لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی و نکتہ فہمی میں بھی اوروں سے دو قدم آگے تھا۔ یہی اوصاف تھے جو اس کے عروج کے زینے تھے۔

مگر ہماری نظروں میں تو اس کی وقعت اس لیے ہے کہ اس کے خاندان نے پہلے پہل متضاد عناصر میں اجتماع پیدا کرنے کی کوشش کی۔

'زمانہ' نومبر ۱۹۰۵ء

آنریبل گوپال کرشن گوکھلے

نامورانِ ہند کے سوانح زندگی بالعموم نہایت حوصلہ افزا وجرأت بخش مطالعے ہیں۔ مگر اس بے غرض حب الوطنی اور قربانی نفس کی نظیر جس نے گوپال کرشن گوکھلے کو آج ساری قوم کا مایہ ناز و افتخار بنا رکھا ہے مشکل سے کہیں اور مل سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قوم میں ایسے بزرگوار موجود ہیں جن کی ذہنی قابلیتیں بالاتر ہیں۔ جن کی استعداد علمی زیادہ دقیق ہے۔ جو عزووقار، جاہ و حشمت کے لحاظ سے آپ پر فوق رکھتے ہیں۔ مگر وہ سچا جوش وطن جس نے آپ کو فنا فی القوم بنا دیا ہے اپنی وسعت، عمیق اور مصروفیت میں فرد ہے۔ آپ کی زندگی پرجوش نوجوانوں کے لیے اولو العزمی اور بلند حوصلگیوں کا ایک نہایت مفید سبق اور قابل تقلید نمونہ ہے۔ آج آپ کو قوم کے پولیٹکل حلقوں میں نہایت ممتاز درجہ حاصل ہے۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ آپ کے ہم وطن آپ کی پرستش کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے کہ مہاتما گاندھی جیسے قابل تعظیم بزرگ بھی آپ کو اپنا مرشد تسلیم کرتے ہیں اور اس میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ مجلس قانون ساز میں آپ نے جو نمایاں کام کیے وہ اس کی تاریخ میں یادگار رہیں گے۔

آپ ۱۸۶۳ء میں بمقام کولہا پور میں پیدا ہوئے۔ والدین اگر عسرت و تنگ حالی میں نہ مبتلا تھے تو کسی طرح خوشحال بھی نہ تھے۔ آپ نے وہیں کے اسکول میں ایف۔ اے۔ کی سند حاصل کی۔ بعد ازاں بمبئی کے الفنسٹن کالج میں تحصیل علم کے لیے گئے۔ یہ کالج ہندوستان کے سب کالجوں کا کیا بلحاظ قدامت اور کیا بلحاظ خدمات سرتاج ہے۔ دادا بھائی نوروجی، سرفیروز مہتا جیسے ہادیان قوم کی تعلیم و تربیت کا فخر اسی کالج کو حاصل ہے۔ یہاں مسٹر گوکھلے کی خداداد قابلیتوں کی بہت جلد دھوم مچ گئی۔ طلباء اور پروفیسر سبھی

اعزاز کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ریاضی سے آپ کو خاص مناسبت تھی اور مسٹر ہاتھارن جو اس کالج کا پروفیسر ریاضی تھا اپنے ہونہار شاگرد کی عطیات پر فخر کیا کرتا تھا۔ چونکہ آپ کے والدین تعلیمی اخراجات کے متحمل نہ ہوسکتے تھے یہ ازبس ضروری تھا کہ آپ امتحان میں وظیفہ دار قرار پائیں۔ اور کوئی بھی جو آپ کی ذات و صفات سے واقف تھا آپ کی کامیابی پر ذرہ بھر بھی شک نہ کرسکتا تھا۔ مگر کچھ ایسے اتفاقات پیش آگئے کہ آپ سند اعزازی حاصل کرنے سے قاصر رہے۔ اس نامبارک ناکامی سے جو صدمہ و ملال آپ کو ہوا اس کااندازہ وہی خوب کرسکتا ہے جس کی امیدوں پر بھی اسی طرح پانی پھر گیا ہو۔ آخر فکر معاش نے آپ کو پونا میں پہنچایا۔ یہاں انجینئرنگ کالج میں داخل ہونے کا قصد تھا جس کے لیے آپ کی ریاضی نے آپ کو بہت موزوں بنا دیا تھا۔ مگر ناکامی نے روئے بد دکھایا۔ داخلہ کا امتحان ختم ہوچکا تھا اور پرنسپل نے آپ کو داخل کرنے سے معذوری جتائی۔ یہ تازہ ناکامی اور بھی دل شکنی کا باعث ہوئی۔ اگر نتیجہ حسب دل خواہ ہوتا تو آپ کسی ڈویژن کے انجینئر ہوجاتے اور دولت و ثروت کے لحاظ سے آپ کی حالت بدرجہا بہتر ہوتی۔ مگر پھر نہیں معلوم آپ کی اعلیٰ دماغی و دلی اوصاف کا اظہار کس دائرہ میں ہوتا۔ حق تو یہ ہے کہ آپ کی قسمت میں ملک و قوم پر نثار ہونا لکھا تھا۔ آپ کی وہ ناکامیاں جو ذاتی مقاصد میں حارج ہوئیں قوم کے لیے عطیۂ عظمیٰ ثابت ہوگئیں۔خدا کرے ایسی ناکامیاں جس کے مبارک نتیجوں پر ہزاروں کامیابیاں رشک کرتی ہیں ہر شخص کو حاصل ہوں۔

اسی زمانہ میں دکن کے چند دریا دل، پرجوش ہمدردان قوم نے عوام کی تعلیم کے لیے ایک انگریزی مدرسہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ اور مسٹر تلک مسٹر اپٹے اور چند دیگر بزرگوں کی سرپرستی میں ایک تعلیمی انجمن قائم ہوئی تھی۔ جس کا مقصد اعلیٰ تعلیم کی اشاعت تھا۔ مسٹر گوکھلے نے کسب معاش کی کوئی اور صورت نہ دیکھ کر اسی مدرسہ میں ایک اسامی قبول کرلی۔ آگے چل کر یہی مدرسہ ترقی پاکر فرگسن کالج پونا کے نام سے مشہور ہوا اور آج تک دکن کی ہمدردی جوش حب وطن اور ایثار کی زندہ یادگار ہے۔ تعلیمی انجمن کے ہر ممبر کا یہ عہد ہوتا تھا کہ وہ اس کالج میں بلاخیال معاوضہ تعلیمی خدمات بحسن تمام انجام دے گا۔ ہندوستان ان بزرگوں کی نفس کشی کا قیامت تک مشکور رہے گا جنہوں

نے ذاتی مفاد کونظر انداز کر کے اپنی زندگی قومی خدمات کے نذر کی، فرگسن اور جن کی مساعی جمیلہ کی بدولت ایک چھوٹا سا اسکول آج ہندوستان کے نہایت نامی و گرامی قومی کالجوں میں ہے۔ شکر ہے کہ وہی قومی جوش جس نے فرگسن کالج کو پالا پوسا آج ہمارے تاریک صوبہ میں بھی نمایاں طور پر ظاہر ہو رہا ہے۔ چند روشن خیال حامیانِ قوم نے ہندو سنٹرل کالج کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردی ہیں جو زمانہ ٔ آئندہ میں ضرور بالضرور بارآور ہوں گی۔

دیگر متوسط الحال نوجوانوں کی طرح مسٹر گوکھلے کے سینہ میں بھی علاوہ نام و نمود کے دولت و ثروت کے ارمان بھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے یہ ملازمت ضرورت سے مجبور ہوکر محض عارضی طور پر قبول کرلی تھی۔ مگر جب تعلیمی انجمن کے ممبروں کے ساتھ رہنے سہنے اٹھنے بیٹھنے اور تبادلہ ٔ خیالات کا موقع ملا تو ان کے فیاضانہ و ہمدردانہ خیالات کا زبردست اثر مسٹر گوکھلے پر بھی پڑا۔ آپ بھی اسی رنگ میں رنگ گئے۔ اور حب وطن کا جوش یہاں تک اُنڈا کہ نام و نمود، دولت و ثروت کے ہوائی قلعے یک لخت منہدم ہوگئے۔ آپ جیسے نوجوان شخص کے لیے جس کی موروثی جائداد کچھ نہ تھی اور نہ توسیع آمدنی کے دوسرے ذرائع موجود تھے اس تعلیمی انجمن کی کوششوں میں ہاتھ بٹانا معمولی کام نہ تھا۔ خصوصاً اس حالت میں جب کہ متوسلین کی ایک معقول تعداد آپ کی کفالت کی محتاج ہوا۔ عہد نامہ پر دستخط کرنے سے پہلے کچھ عرصے تک آپ بڑے پس و پیش میں مبتلا تھے مگر آخرش حب وطن کی کشش غالب آئی۔اور آپ دکن تعلیمی انجمن میں شریک ہوگئے۔ جس کے معنی یہ تھے کہ آپ پچھتر روپے ماہوار کی تنخواہ کو معراج ترقی سمجھ کر بیس برس تک تعلیمی خدمات انجام دیں گے۔ اس قربانی سے ظاہر ہوسکتا ہے کہ آپ کی نگاہوں میں رفاہ عامہ کا درجہ دنیا کے دوسری مادی خواہشوں کے مقابلے میں کہا تھا۔ جب یہ خیال کیجیے کہ اس وقت آپ کی عمر کل اٹھارہ سال کی تھی جب کہ دل میں ولولے اور امنگوں کا دریا جوش مارتا ہوتا ہے تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آپ واقعی فرشتہ خصلت بزرگوار تھے۔ ایسے محبان وطن تو بہت ملیں گے جو لذات دنیا سے کامل طور پر سیر ہوجانے کے بعد حیات چند روزہ کے چند آخری دن قومی کاموں کے نذر کرتے ہیں۔ مگر ایسے کتنے ہیں جو مسٹر گوکھلے کی طرح قوم کے لیے تن من دھن سبھی سونپ

دینے پر آمادہ ہوجائیں گے؟

اس انجمن میں شریک ہونے کے بعد آپ نے نہایت دل سوزی، سرگرمی و یکسوئی کے ساتھ سلسلۂ تدریس جاری کیا۔ آپ کی پرجوش کوششوں نے بہت جلد آپ کو پروفیسروں میں ممتاز جگہ دے دی۔ اور چند ہی دنوں میں آپ اس کالج کے روح رواں ہوگئے۔ اس وقت کالج کی مالی حالت ایسی ابتر ہو رہی تھی کہ مجبوراً ایک معمولی عمارت میں گذر کرنا پڑتا تھا۔ آپ نے اس کے لیے ایک شاندار شایان شان عمارت بنوانے کا قصد مصمم کرلیا اور اپنے ہم پیشہ اصحاب کے ساتھ دکن کا دورہ کرنا شروع کیا۔ تقریباً تین برس کی جانفشانیوں کے بعد آپ نے دو لاکھ روپے فراہم کرلیے۔ اس کامیابی نے آپ کی حسن کوشش، خوبیٔ تدبیر اور قابلیت انتظام کا سکہ بٹھا دیا۔ کالج کے لیے بہت جلد ایک عالیشان عمارت تعمیر ہوئی جو ہمیشہ اصحاب دکن کی سچی قومی ہمدردی اور بے لوث کوششوں کا مظہر رہے گی۔ اس عظیم الشان کالج اور اس کے دلدادہ کارکنان کے سعی موفور کی داد جن الفاظ میں لارڈ نارتھ کوٹ اور دیگر قدردانوں نے دی ہے وہ واقعی نہایت حوصلہ افزا ہے۔ چونکہ ملک کو آپ کی خدمات حسنہ کا مشکور ہونا تھا اس کے سامان بھی غیب سے مہیا ہوتے گئے۔ تعلیمی خدمات کا انجام دیتے ابھی تین برس بھی نہیں گزرے تھے کہ آپ کو اس ذی کمال، فرشتہ خصال، کریم النفس بزرگوار سے عقیدت مندی کا مبارک موقع ملا، جس کا آج ہندوستان کا بچہ بچہ گا رہا ہے۔ ایسا کون ہوگا جو مہادیو گوبند رانا ڈے مرحوم کی نام نامی سے واقف نہ ہو۔ ہندوستان کا ہر در و دیوار اس نیک مرد کی تعریف میں ترنم ساز ہے۔ ان کی زندگی دنیا کے سارے اوصاف حمیدہ کی ایک مثال ہے۔ اس حبیب وطن کے دل میں ملک و قوم کی یاد ہر دم بنی رہتی تھی۔ ہندوستان کی ایسی کوئی سوسائٹی یا انجمن نہ تھی جس کو اس مرد نیک نفس کی ذات بابرکات سے فیض نہ پہنچا ہو۔ ان دنوں ان کو پونا کی سارو جنک سبھا کے متعلق اخبار نکالنے کے لیے ایک جفاکش، ذی حوصلہ، روشن خیال پرجوش اور دیانت مند نوجوان ایڈیٹر کی ضرورت تھی۔ مسٹر گوکھلے کا سن اس وقت بائیس سال سے زیادہ نہ تھا۔ کتنے ہی پروتم، جہان دیدہ حضرات اس خدمت کے داعی تھے۔ مگر مسٹر رانا ڈے کی مردم شناس نگاہوں میں اس کام کے لیے کوئی شخص آپ سے زیادہ موزوں نہ معلوم ہوا۔

سبحان اللہ! کیا نبض شناسی ہے۔ واقعات نے ثابت کردیا کہ مسٹر رانا ڈے کا انتخاب اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

ایڈیٹری کا قلم دان دست مبارک میں لیتے ہی آپ نے ملکی، مالی و تمدنی پیچیدہ مسائل کا محققانہ مطالعہ شروع کیا۔ اور ان گتھیوں کو سلجھانے کے لیے مسٹر رانا ڈے سے بڑھ کر کس کے ناخن فکر ہوسکتے تھے۔ ایک بزرگوار کا قول ہے کہ ''مسٹر گوکھلے، ایک قومی ترکہ ہیں جو رانا ڈے مرحوم نے ملک کو بخشا ہے'' اور یہ قول نہایت صادق ہے۔ اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ آپ اپنے پیرو مرشد کے رنگ میں ہمہ تن ڈوبے ہوئے تھے۔ آپ نے ایک اسپیچ میں خود شاگردانہ افتخار سے فرمایا تھا کہ ''مجھے بارہ برس تک اس مرد نیک سے فخر تلمذ رہا، اور اس مدت میں ان کے ارشادات سے بغایت مستفید ہوا۔'' ان الفاظ سے جس قدر جوش عقیدت ٹپکتا ہے محتاج بیان نہیں۔ سبحان اللہ! کیسا فرشتہ خصال استاد تھا۔ اور کیسا ذی کمال شاگرد، آج مسٹر رانا ڈے کی روح جنت میں اپنے شاگرد کے بے لوث حب وطن پر وجد کر رہی ہوگی۔ آپ کو ملک کے مالی مسائل اور برسات پر جو قدرت حاصل تھی وہ اسی بزرگوار کے فیضان صحبت کا اثر تھا۔ آپ نے اس دوازدہ سالہ تلمذ میں متعدد مالی رپورٹوں اور رسالوں کے خلاصے کیے۔ جو تصحیح و تہدید کے لیے مسٹر رانا ڈے کی خدمت میں پیش کیے جاتے تھے اور کیا اس میں کوئی شک ہے کہ ان کی اصلاحیں وفادار، عقیدت مند شاگرد کے لیے حرز جان ہوجاتی تھیں۔ یہ انھیں عرق ریزیوں کی برکت ہے کہ آپ سرکاری مالی رپورٹوں کی بھول بھلیاں کی ذرا بھی حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ اور چٹکی بجاتے میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرکے دکھادیتے تھے۔

مسٹر رانا ڈے کی خدمت میں نیاز حاصل ہونے سے آپ کو صرف یہی فائدہ نہیں ہوا کہ آپ کو ملکی مسائل کے دقیق و عمیق نکات پر عبور حاصل ہوگیا بلکہ شب و روز کی قربت نے آپ کے لوح دل پر اپنے مرشد کی حیرت انگیز جفاکشی، وسعت نگاہ، بے تعصبی، قوت امتیاز اور صادق الطبعی کا نقش کردیا جو زمانہ کے ساتھ ساتھ بجائے مٹنے کے اور بھی نمایاں طور پر ظاہر ہوتا گیا۔ آٹھ برس تک آپ نے علاوہ تعلیمی خدمات کے ساروجنک سبھا کا اخبار مسٹر رانا ڈے کی زیر ہدایت بڑی قابلیت سے چلایا۔ آپ کی

رائیں ایسی پختہ وصائب ہوتی تھیں اور آپ کے ملکی مضامین میں وہ تازگی، جدت اور زور قلم ہوتا تھا کہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ رسالہ تعلیم یافتہ حلقوں میں اعزاز کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ اور ملک کو معلوم ہوگیا کہ آپ کی ذات سے یہاں کی پبلک لائف میں ایک قابل قدر اضافہ ہوگیا ہے۔ اس کا عملی ثبوت یہ ملا کہ آپ بمبئی پراونشل کاؤنسل کے سکریٹریٹ پر ممتاز ہوئے۔ اور چار سال تک ان فرائض کو کمال تندہی و لیاقت سے ادا کیا۔ ان خدمات سے آپ کی شہرت ہندوستان کے دیگر صوبجات میں بوئے مشک کی طرح پھیلنے لگی۔ اور آخرش ۱۸۹۷ء میں آپ انڈین نیشنل کانگریس کے سکریٹریری مامور ہوئے۔

اسی سال آپ کو اظہار حب وطن کا ایک اور نہایت نادر موقع ہاتھ لگا۔ نیشنل کانگریس اور دیگر ہمدرداں قوم کی متواتر شکایت نے کہ مناصب جلیلہ پر بالعموم انگریز ہی مامور ہوتے ہیں اور ہندوستانی باوجود زیادہ قابلیت رکھنے کے محروم رہتے ہیں پارلیمنٹ کی توجہ اپنے جانب پھیری۔ ایک شاہی کمیشن لارڈ ولبی کی صدارت میں مقرر کی گئی تاکہ وہ اس امر کی تحقیقات کرے کہ یہ شکایتیں کس حد تک واقعات پر مبنی ہیں۔ اور چند ایسی عملی تجاویز پیش کرے جو گورنمنٹ ہندوستان کے لیے بمنزلۂ دستور العمل ہوں۔ افسوس کہ یہ انگریزی دیانت مندی و معدلت پروری کا آخری اظہار تھا اور جس بے رحمی سے اینگلو انڈین طبقہ نے ان تجاویز کی خلاف ورزی کی ہے اور وہ ہمیشہ ان کے طرز عمل پر دھبہ لگاتی رہے گی!

مسٹر گوکھلے کی نکتہ فہمی، پرزور قوت بیان، ہندوستانی معاملات سے باخبری اور اقتصادی مسائل کی موشگافی کی قابلیت نے جس کا اس وقت تک سارے ہندوستان میں غلغلہ مچ رہا تھا آپ کو اصحاب دکن کا وکیل بنا کر دلبی کمیشن کے روبرو اظہار خیالات کے لیے بھیجا۔ اور آپ مسٹر سوریندر ناتھ بنرجی۔ مسٹر ونشا ایڈل جی واچا اور مسٹر سبریمنا آئر کے ساتھ اسی سال انگلستان تشریف لے گئے۔ وہاں کمیشن کے سامنے آپ نے جو اسپیچ فرمائی وہ فصاحت حسن بیان، پر زور دلائل اور جوش حب الوطنی کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ باوجودیکہ یہ اسپیچ بہت مطول تھی مگر کمشنروں نے اس کی بڑی فراخدلی اور خندہ پیشانی سے داد دی اور اس میں شک نہیں کہ اس کا پر زور اثر ان کی تجویزوں پر

بھی پڑا۔ آپ نے ہندوستان کے افلاس اور گورنمنٹ کی بیجا سختی کا درد ناک الفاظ میں تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا۔

''موجودہ نظام سلطنت کا یہ اثر ہو رہا ہے کہ ہمارے قوائے دماغی و جسمانی روز بروز ضعیف و نحیف ہوتے جاتے ہیں۔ ہم مجبور کیے جاتے ہیں کہ ذلت و حقارت کی زندگی بسر کریں۔ قدم قدم پر ہم کو یاد دلایا جاتا ہے کہ تم ایک پادر افتادہ قوم کے ممبر ہو۔ ہماری آزادیوں کا بے رحمی سے گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ اور یہ سب محض اس لیے کہ موجودہ نظام کی تقویت ہو۔ انگلستان کا ہر نوجوان جس کو خدا نے ذہن اور حوصلہ عطا فرمایا ہے امید کرتا ہے کہ کسی نہ کسی دن میں بھی قومی جہاز کا ناخدا بنوں گا۔ کسی نہ کسی دن میں گلیڈسٹن کا رتبہ اور نلسن کی شہرت حاصل کروں گا۔ یہ خیال، گو خواب ہی کیوں نہ ہو، اس کی اولو العزمیوں اور امنگوں کو اُبھارتا ہے۔ وہ ہمہ تن کسب کمال میں محو ہوجاتا ہے۔ ہمارے ملک کے بدقسمت نوجوان ایسے حوصلہ بڑھانے والے خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔ وہ ایسے عالیشان ہوائی قلعے بھی نہیں بنا سکتے۔ موجودہ نظام کے ہوتے ممکن نہیں کہ ہم ان بلندیوں تک پہنچ سکیں جس کے قابل ہم کو قدرت نے بنا دیا ہے۔ وہ اخلاقی قوت جو ہر آزاد قوم میں ہوتی ہے ہم میں معدوم ہوتی جاتی ہے۔ آخرش اس کا عبرت ناک نتیجہ یہی ہوگا کہ رفتہ رفتہ ہماری انتظامی جنگی قابلیتیں ترک استعمال سے ملیامیٹ ہوجائیں گی۔ اور ہماری قوم ایک ایسی ذلیل قوم ہوجاوے گی جو بجز لکڑیاں کاٹنے اور پانی بھرنے کے اور کسی کام کی نہ رہے گی۔''

کمیشن کے روبرو شہادت دینے کے بعد مسٹر گوکھلے نے لندن اور دوسرے اضلاع انگلستان میں دورہ کرنا شروع کیا تاکہ اپنی پرجوش تقریروں سے انگریزی عوام الناس کے دلوں میں ہندوستان سے ہمدردی پیدا کریں اور ان کی اس قابل افسوس بے خبری کو جو ہندوستانی معاملات سے ہے رفع کریں۔ آپ کی ان مساعی جمیلہ کی داد انگریزی رعایا نے خوب دل کھول کر دی۔ آپ کی تقریروں سے بڑی دلچسپی ظاہر کی گئی، چوطرفہ تحسین

و آفرین کی صدائیں بلند ہوئیں۔ مبارکباد کے خطوط آنے لگے اور چند ہی دنوں میں آپ کی فصاحت و بلاغت ہمہ دانی و خوش بیانی مسلمہ ہوگئی۔ مگر عین اس وقت جب آپ سرخرو و کامیاب ہوکر ہندوستان کو واپس آنے والے تھے ایک نامبارک واقعہ پیش ہوا جس نے کچھ دنوں تک آپ کو اپنے بے خبر ہم وطنوں کی ناہمدردی، سرد مہری اور علانیہ تضحیک کانشانہ بنا دیا۔ ان دنوں بمبئی کی زمام حکومت لارڈ سینڈ ھرسٹ کے ہاتھوں میں تھی۔ لارڈ موصوف نے انسداد پلیگ کے لیے بڑے سخت قوانین وضع کیے تھے اور وہ اہلکاران جو ان قوانین پر کاربند ہونے کے لیے مامور تھے ان پر حاشیہ چڑھا کر رعایا کے ساتھ ایسی بے عنوانیاں اور مظالم کرتے تھے جو ناگفتہ بہ ہیں۔ چنانچہ جب پونا اس مہلک وبا کا شکار ہوا اور اہلکاران گورنمنٹ اس کے انسداد کے جوش میں اندھیر مچانے لگے تو رعایا برانگیختہ ہوگئی۔ تعلیم یافتہ اصحاب کو بھی سرکار کی یہ رخنہ اندازیاں ناگوار معلوم ہوئیں۔ انھوں نے اس کی پرزور مخالفت کی۔ اخباروں نے بھی ان کا جنبہ کیا۔ مگر نوکر شاہی خواب خرگوش سے نہ چونکی۔ آخرش انگریز صاحبان رینڈ اور آئرسٹ کو جو عوام کی نگاہ میں ان تمام بے عنوانیوں کے محرک اور بانی سمجھے جاتے تھے گورنمنٹ کی بے اعتدالیوں اور رعایا کے جوش غضب کا خمیازہ اٹھانا پڑا۔

ان دو انگریزوں کے قتل سے انگریزی حکام کے کان کھڑے ہوئے ان کو شبہ ہوا کہ یہ ہنگامہ تعلیم یافتہ فرقہ کا برپا کیا ہوا ہے۔ انگریزی اخبارات نے بھی ہائے واویلا مچانی شروع کی۔ اور جوش انتقام میں خدا معلوم کیا کیا زبان درازیاں اور خامہ فرسائیاں کیں۔ کسی نے صلاح دی ہندوستانی اخبارات کی دھجیاں اڑا دو، کسی نے فرمایا پونا کو نیست و نابود کردو، ہندوستانی اخبارات کی جرأت بھی قابل تعریف ہے کہ وہ حق کہنے سے نہ چوکے۔ انگریزوں کا خوب ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اور انجام کار یہ ہوا کہ گورنمنٹ نے چند رہنمایان قوم کے خون سے اپنے آتش غضب کو ٹھنڈا کیا۔ اینگلو انڈین حضرات نے گھی کے چراغ جلائے۔ خوشیاں منائیں اور گورنمنٹ کے بغایت ممنون ہوئے۔

ابھی مسٹر گوکھلے انگلستان ہی میں تھے کہ ان کے احباب نے گورنمنٹ ہند کی جور و تعدی کے دل ہلادینے والے واقعات پونا سے لکھنے شروع کیے۔ ان کو امید تھی کہ

آپ انگلستان میں گورنمنٹ کی ان بیجا کارروائیوں کی تشہیر کرکے ان کی طرف پارلیمنٹ کی توجہ مبذول کرائیں گے۔ ممکن نہ تھا کہ اپنے ہم وطنوں کی یہ بری گت ایسے فدائی قوم کا جوش نہ ابھارتی۔ تاہم آپ نے بڑے ضبط و استقلال سے کام لیا۔ آپ کوخوب معلوم تھا کہ گورنمنٹ پر ان الزامات ـَے عائد کرنے کے لیے ثبوت بہم پہنچانا محال ہوجائے گا۔ اور قبل اس کے کہ آپ ان واقعات کا اعلان کریں آپ نے بڑے غور و خوض سے کام لیا۔ مگر اسی اثنا میں رینڈ اور آئرسٹ کے قتل کی ہولناک خبر پہنچی۔ اور اس نے انگریزی رعایا میں عجیب ہل چل مچا دی۔ ہندوستانیوں کی سرزنش کرنے کے لیے تدبیریں سوچی جانے لگیں۔ افواہ اڑی کہ شہر کے پچیس سربرآوردہ رؤسا دار پر کھینچے جائیں گے۔ علیٰ ہذا اور بھی ایسی ہی وحشت ناک خبریں جو بالکل بے بنیاد نہ تھیں، مشہور ہوئیں۔ آپ سے اب ضبط نہ ہوسکا۔ لازم آیا کہ آپ بھی اپنی آواز بلند کریں ۔ چنانچہ آپ نے انھیں خطوط کی بنیاد پر جو آپ کے احباب نے پونا سے لکھے تھے گورنمنٹ کے تشددات اور بے موقع سختیوں کا پرزور اعلان کیا۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی یہ رعایا کا قصور نہیں ہے کہ وہ برگشتہ ہو رہی ہے۔ بلکہ یہ گورنمنٹ کی نادانی ہے کہ وہ رعایا کو اس طرح آزردہ کرکے اشتعال دلا رہی ہے۔ آپ نے جو کچھ فرمایا بالکل انھیں خطوط کی بنا پر تھا۔ مگر لارڈ جارج ہملٹن نے جو اس وقت سکریٹری ہندوستان تھے آپ کے ان الزامات و بیانات کی تردید لارڈ سینڈ ہرسٹ کے تحریر کی بنا پر کی۔ اور اب آپ کے لیے بجز اس کے اور کوئی طریق نہ تھا کہ یا تو واقعات اور مشاہدات سے اپنے دعوؤں کو پایۂ ثبوت تک پہنچائیں یا ان کو ندامت کے ساتھ واپس لیں۔ چنانچہ آپ ہندوستان لوٹے مگر اسی اثنا میں بمبئی گورنمنٹ نے پونا کے سرغناؤں کی گرفتاری کے احکام نافذ کردیئے تھے۔ اور جب آپ عدن میں پہنچے تو آپ کو انھیں مخبر احباب کے خطوط ملے جن میں التجا کی گئی تھی کہ ہمارے نام شائع نہ کیے جائیں۔ گرفتاری کے احکام نے ان لوگوں کو ایسا خوف زدہ کردیا تھا کہ وہ قسم کھانے پر آمادہ تھے کہ وہ خطوط ہمارے لکھے نہ تھے۔ اس وقت اس تشویش و دل خستگی کا اندازہ لگانا محال ہے جو دوستوں کی بیوفائی و بزدلی سے آپ کے سینہ بے کینہ میں پیدا ہوئی۔ کچھ دن تک تو سب کو خدشہ تھا کہ اب آپ ہمیشہ کے لیے پبلک تحریکوں سے علاحدگی

برتنے پر مجبور کیے جائیں گے۔ آپ کو یقین ہوگیا کہ ان الزامات کی جو میں نے گورنمنٹ پر لگائے تھے ثابت کردینا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ لہٰذا اب اقتصائے شرافت و مردی یہی تھا کہ آپ اپنی معذرت سے ان الفاظ کی تلافی کریں جن سے گورنمنٹ کے روائے عصمت پر دھبہ لگتا تھا۔ اپنے دعوؤں پر مستقل رہنا جبکہ ان کے ثابت کرنے کی کوئی صورت نہ نظر آتی تھی آپ کی منصفانہ نگاہوں میں گورنمنٹ کی توہین ناحق تھی۔ چنانچہ آپ نے ہر ایک پہلو سوچنے کے بعد اپنا مشہور و معروف معذرت نامہ شائع کیا مگر آپ کے ہم وطن جو روداد سے کما حقہ آگاہ نہ تھے آپ سے فوراً بدظن ہوگئے۔ آپ کے اس فعل کو تلون طبعی اور بزدلی سے منسوب کیا۔ آپ بڑی بے رحمی سے تیر ملامت کا نشانہ بنائے گئے۔ حتیٰ کہ آپ پر جنگ زرگری اور خوشامد کا جرم لگایا گیا حالانکہ اس وقت بھی ہندوستان اور انگلستان دونوں ہی ملکوں میں ایسے منصف مزاج، راسخ الخیال بزرگوار تھے جنہوں نے آپ کی اس جرأت و دلیرانہ حرکت کی بڑی فراخ دلی سے داد دی۔ جسٹس راناڈے مرحوم و مغفور نے جو اپنے قابل فخر اور سعادت مند شاگرد کی نقل و حرکت کو پدرانہ شفقت و دلچسپی سے دیکھ رہے تھے آپ کی اس صفائی قلب کے ثبوت پر اظہار خوشنودی کیا۔ مگر سبحان اللہ! کیا ہمت عالی اور کیا حوصلہ رفیع ہے کہ دوستوں و ہمدردوں کی دل شکن و مایوس کن اقوال و افعال نے آپ کی ہمتوں کو ذرا بھی پسپا نہ کیا۔ آپ نے ''ہرچہ از دوست میر سد نکوست'' کے مصداق پر ان تمام اہانت آمیزکلمات کو جو آپ کی شان میں استعمال کیے گئے تھے ماتھے پر چڑھا لیا۔ایسی حالت میں ایک نمائشی محبّ وطن اپنے ہم وطنوں کی ناشکری اور احسان فراموشی کا مرتکب ٹھہراتا۔ اپنے ملک کی ناقدری و بیوفائی کا رونا روتا۔ اور غالبًا ہمیشہ کے لیے پبلک معاملات سے منہ پھیر لیتا۔ مگر آپ ان محبان وطن میں نہیں تھے۔ جنم بھومی کی محبت اور بھائیوں کی بھلائی آپ کی سرشت میں خمیر ہوگئی تھی۔ آپ اپنے خلقی استقلال و اطمینان سے پھر ملک کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ شکر ہے وہ دن بہت جلد آیا کہ آپ کے گم گشتہ مخالفین اپنی حرف گیریوں پر نادم و متاسف ہوئے۔

ابھی اخبار نویسوں کا غصہ دھیما نہ ہوا تھا کہ بمبئی میں پلیگ نے ہنگامۂ قیامت

برپا کیا۔ لوگ گھر بار، لڑکے بالے چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ اس کی سخت ضرورت محسوس ہوئی کہ پرجوش ہمدردان قوم مریضوں کے معالجہ و عیادت کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈالیں۔ اس پر خطر وادی میں سب سے پہلے جس نے قدم رکھا وہ آپ ہی تھے۔ جس خود فراموشی، کسر نفسی، محویت و سرگرمی سے آپ نے افسران پلیگ کا ہاتھ بٹایا وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ سارا ملک آپ کی تعریف سے گونجنے لگا۔ لارڈ سیڈ ہرسٹ نے بھی جنھوں نے پہلے بارہا آپ کو طعن و تشنیع کا آماجگاہ بنایا تھا اس وقت آپ کی خوش قومی و خالص دردمندی کے قائل ہوگئے اور اجلاس کونسل میں آپ کا شکریہ ادا کرکے اپنا افتخار بڑھایا۔

آپ کی بہبود خلائق کی ان تھک کوششوں کے ملک کو پھر آپ کا معتقد بنالیا۔ اصحاب دکن نے ایک زبان ہوکر بمبئی کاؤنسل کی ممبری پر آپ کو سرفراز کیا۔ یہاں آپ نے ملک کی خدمت ایسی یکجہتی اور خلوص سے کی کہ دلوں میں آپ کی عظمت قائم ہوگئی۔ بمبئی ''لینڈر رونیوبل'' کے متعلق جو سرگرم مباحثے ہوئے ان میں آپ نے نمایاں حصہ لیا۔ اور بمبئی گورنمنٹ کو یقین دلایا کہ غیر ملازم ممبران گورنمنٹ کی نکتہ چینی مخالفت کی نیت سے نہیں کرتے بلکہ ہمدردانہ اتفاق کی نیت سے۔ غیر قومی گورنمنٹوں میں ہمیشہ یہ نقص رہتا ہے کہ اس کی ہر تجویز میں دو پہلو ہوا کرتے ہیں ۔ گورنمنٹ اپنے پہلو کے فوائد و نقصانات پر غور کرلیتی ہے مگر غریب رعایا کے پہلو کو بالکل نظر انداز کر جاتی ہے۔ آپ نے ہمیشہ اس کی صدق دلی سے کوشش کی کہ گورنمنٹ کے روبرو ہر تجویز اور مسئلے پر رعایا کے پہلو سے نظر ڈالیں اور گورنمنٹ کو اس کے لازمی نتائج سوجھائیں تاکہ وہ رعایا کے خیالات اور ضروریات سے آگاہ ہوکر ان کی بہبودی کی فکر میں رہیں۔

مسٹر گوکھلے کی ان قابل وقعت خدمات نے مداحوں اور قدردانوں کا حلقہ اور بھی وسیع کردیا اور آپ بمبئی کی غیر سرکاری جماعت کی طرف سے وائسرائے کی کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ ہر باخبر شخص جانتا ہے کہ یہاں پر آپ نے اپنے فرائض کیسی صادق الطبعی، جانفشانی و کاوش سے ادا کیے۔ آپ کی بجٹ کی تقریریں وسعت تحقیقات، جامعیت، زور بیان اور دلیرانہ لہجہ کے لحاظ سے اپنی نظر نہیں رکھتیں۔ آپ کے وہ

نعرے جو آپ نے یونیورسٹی بل اور آفیشل سیکرٹ بل کے خلاف بلند کیے ابھی تک ہمارے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اور یقین ہے کہ ہمیشہ اپنے رنگ کا بہترین نمونہ سمجھے جائیں گے۔ آپ کی گرج سے لارڈ کرزن جیسے شیر کی آواز بند ہوجاتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ وائسرائے کی کونسل میں آپ ہی ایک ایسے مرد جری تھے جس سے لارڈ موصوف آنکھیں بچاتے پھرتے تھے۔ آپ کی نکتہ چینیاں بسا اوقات مخالفت پر بھی محمول کی گئی ہیں مگر اس کا سبب صرف یہ ہی کہ لارڈ کرزن جیسا خود پسند اور خود سر شخص اپنے طرز عمل کی قلعی کھلتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اور آپ کی نیتوں میں خامی دکھا کر اپنے دل کا بخار نکالتا تھا۔ آپ جیسا عالم فاضل اور باخبر شخص یہ جانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ غیر قومی گورنمنٹیں ہمیشہ غلط فہمیوں اور ناہمدردیوں کا نشانہ بنی رہتی ہیں۔ ان کو ایک ایک قدم خوب نشیب و فراز دیکھ کر دھرنا ہوتا ہے۔ اسی لحاظ سے آپ نے کبھی گورنمنٹ کو عام نگاہ میں حقیر یا خطاوار بنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ جب کبھی موقع ملا ہے آپ نے بڑے فخر سے ان عطیات عظمیٰ کا ذکر کیا ہے جو انگریزی گورنمنٹ کی بدولت ہم کو حاصل ہیں۔ آپ انگریزوں کی دیانت، راست معاملگی اور نیک نیتی کے ہمیشہ سے مداح تھے۔ مگر اس کے ساتھ ہی آپ ان عیوب و کمزوریوں سے بے خبر نہیں تھے جو انگریزی گورنمنٹ میں موجود ہیں۔ اور جنھوں نے اس کو بدنام کر رکھا ہے۔ آپ کو یقین تھا کہ یہ نقائص بدنیتی کے باعث سے نہیں ہیں۔ بلکہ غلط اور بے موقع اصولوں کی پابندی کی وجہ سے اور ان کے دفعیہ کی تدبیر اگر ہے تو یہی ہے کہ اہل ہند کو ترقی تعلیم و تہذیب کے ساتھ ساتھ ملکی معاملات میں زیادہ دخل دیا جائے، ان کی آوازیں زیادہ ہمدردی سے سنی جائیں۔ ان کے کسب و کمال کی داد زیادہ فیاضی سے دی جائے اور بتدریج ان کو اپنی پاسبانی آپ کرنے کی تعلیم دی جائے۔ بلاشک آپ کا معیار بہت بالا ہے مگر یہی معیار ہمیشہ نہ صرف اولو العزم ہندوستان کا رہا ہے بلکہ ان عالمی مشق۔ حق پسند انگریزوں کا بھی جو زمانہ گزشتہ ہندوستان کی قسمتوں کے مالک تھے۔ جان برائٹ، بریڈلا، میکالے اور فاسٹ جیسے جیسے انسانی دوست۔ دریا دل بزرگوں کے پیش نظر یہی معیار تھا۔ لارڈ نارتھ بردک، کارڈ نبٹنک اور لارڈ رپن جیسے جیسے باکمانوں نے اسی معیار پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ اور راجہ رام موہن رائے جسٹس راناڈے اور

دادا بھائی نوروجی جیسے پیغمبران قوم پکار پکار کر اسی معیار کی تائید کرتے گئے۔ مسٹر گوکھلے بھی اسی معیار کے پرجوش حامیوں میں تھے اور تاوقتیکہ وہ مبارک دن نہ آئے جبکہ گورنمنٹ اس معیار پر عمل کرے ہر اولو العزم ہمدرد قوم کا فرض اولین ہوگا کہ وہ اسی معیار کو عملی صورت میں لانے کی کوشش میں سرگرم کار رہے۔

مسٹر گوکھلے کو قوم کی نگاہوں میں جو ہر دلعزیزی اور قوم کے سرغناؤں میں جو ممتاز درجہ حاصل تھا اس پر ہر فرد بشر کو ناز ہوسکتا ہے۔ آپ نے اپنے کو قوم پر نثار کردیا تھا۔ اگر آپ کو کوئی دنیاوی خواہش تھی تو یہ کہ ہندوستان دنیا کے سر برآوردہ اقوام میں اعزاز و وقار حاصل کرے اور قعر افلاس سے نکل کر سرسبزی کے مینار پر اپنا نشان نصب کرے۔ آپ شب و روز فلاح قوم کی تجاویز سوچنے میں محو رہتے تھے۔ فی الواقع آپ قوم کے نام پر بک گئے تھے اور گورنمنٹ نے آپ کی خدمات شائستہ بے غرض ہمدردی قوم فلاح عامہ کی سچی خواہش اور منصفانہ طرز خیال کی قدر افزائی کی اور آپ کو ستارۂ ہند کا معزز و محترم لقب دیا۔ مگر آپ اس حد تک متواضع و منکسر مزاج تھے کہ ان قدر دانیوں کو اپنے سے بالا تصور فرماتے تھے۔ بہبود قوم کے سچے جوش میں آپ کو اعزاز و امتیاز حاصل کرنے کا ذرا بھی شوق نہیں تھا۔ آپ مسٹر دادا بھائی نوروجی کے گرم دل عقیدت کیشوں میں ہیں۔ بمبئی میں جب مسٹرممدوح کی سالگرہ کا جلسہ ہوا تھا اس میں آپ نے ایک نہایت پر جوش مدحیہ تقریر فرمائی جس کے یہ آخری الفاظ آب زر سے لکھے جانے اور گوشۂ دل میں جگہ پانے کے قابل ہیں۔

''میرے نوجوان دوستو! خیال کرو کہ مسٹر دادا بھائی کی زندگی کیا شاندار نمونہ ہے جو خدا نے تمھارے لیے مہیا کیے ہے اور جوش و خروش جس سے تم نے اس نام کی تعظیم کی ہے نہایت دل خوش کن ہے مگر ہم اس جلسہ کو ہرگز کامیاب نہ سمجھیں گے اگر تمھارے ابھرے ہوئے جوش اتنے ہی سے آسودہ ہوجائیں گے۔ تمھارا فرض ہے کہ اس زندگی سے سبق لو اور اپنا ظاہر و باطن اسی نمونہ پر سنوارنے کی کوشش کرو تاکہ کسی دن یہ خصائل تمھارے عناصر میں شامل ہوجاویں۔

حضرات! خدائے عظیم و بصیر ہر ملک کو وقتاً فوقتاً اس کی ضروریات کے موافق ایسے ارواح عالی عطا فرماتا رہتا ہے جو گم گشتگان طریقت کے لیے رہنماؤں کا کام

دیں اور جن کے نقش قدم پر چل کر ہم بھولے بھٹکے مسافر اپنے منزل مقصود کو پہنچیں۔ بلاشک دادا بھائی اس تیرہ خاک دان ہند کے چشم و چراغ ہیں۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے تو میں ضرور کہوں گا کہ آپ جیسا عالی خیال محب وطن دنیا کے کسی ملک میں مشکل سے پیدا ہوگا۔ ہم میں سے غالباً کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو اس بلندی تک پہنچ سکے۔ ایسے بہت کم ہوں گے جن میں ایسی مستقل مزاجی اور ایسی عالی دماغی کا جوہر موجود ہو لیکن ہم سب آپ کی طرح بلالحاظ ملت و مذہب اپنے ملک کو پیار کرسکتے ہیں۔ ہم سب اس مقصد اعلیٰ کے لیے جس پر آپ نے اپنی حیات نثار کردی ہے کچھ نہ کچھ کوشش کرسکتے ہیں۔ آپ کی زندگی کا سب سے اہم سبق یہی ہے کہ ملک و قوم کی خدمت کرو۔ اگر ہمارے نوجوان بھائی اس سبق سے تھوڑا بہت فائدہ بھی اٹھائیں گے تو زمانہ آئندہ ضرور باامید نظر آئے گا۔ چاہے کبھی کبھی آسمان تاریک ہی کیوں نہ ہوجاوے۔"

مسٹر گوکھلے کے دل سے لگی تھی کہ جناب دادا بھائی نے جس مفید کام کی اپنے مدت العمر کی کوشش میں محض ابتداء کی تھی وہ ان کے ہم وطنوں کی غفلت و پست ہمتی سے ضائع نہ ہوجائے۔ اس کے لیے آپ نے بہترین تدبیر یہی سوچی کہ جناب موصوف کے طرز عمل کی پیروی کریں اگرچہ اتنے دنوں کے تجربہ کے بعد اب اہل ہند کو معلوم ہوگیا ہے کہ اپنی تکالیف کی داستان اہل انگلستان کو سنانا عبث ہے اور ہماری نجات اپنی ہی ہمت اور اصلاح پر مبنی ہے مگر آپ کو یقین تھا کہ انگریز رعایا کو ہندوستانی معاملات سے جو یہ ناہمدردی ہے وہ محض ان کی جہالت کی وجہ سے ہے۔ بالذاتہ ان میں انصاف پسندی کا یہ جوہر معدوم نہیں ہے۔ آپ کو توقع کامل تھی کہ جب ان کو ہندوستانی معاملات سے آگاہی ہوگی تو وہ ضرور بالضرور ان کی طرف توجہ کریں گے۔

ہماری رہنمایان قوم کا ہمیشہ یہی خیال رہا ہے۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً کانگریس ڈیلی گیٹوں کو ولالت بھیجنے کی تحریکیں بھی ہوا کی ہیں۔ پہلی بار جو ڈیلی گیٹ گئے تھے ان میں سریندر ناتھ بنرجی اور مسٹر من موہن گھوش مرحوم جیسے جیسے قادران فن فصاحت تھے۔ ان کی سرگرمیاں بہت کچھ نتیجہ خیز ثابت ہوئی تھیں۔ ۱۹۰۶ء میں سال بھر ایسی ہی تحریک ہوئی اور یہ قصد مصمم کیا گیا کہ ہر صوبہ سے ایک ایک ڈیلی گیٹ انگلستان کو بھیجا

جائے۔ اس اہم خدمت کے لیے سارے صوبہ بمبئی کی التجا آمیز نگاہیں مسٹر گوکھلے کی طرف اٹھیں اور آپ کی مشکل پسند طبیعت نے اس مہتم بالشان کام کو بڑی مستعدی سے ہاتھوں میں لیا جس کے انجام دینے کے لیے آپ سے زیادہ موزوں دوسرا مل نہیں سکتا تھا۔ ستمبر کے مہینے میں آپ دوبارہ ولایت تشریف لے چلے۔

انگلستان میں آپ کا استقبال باخبر حلقوں میں بڑی گرم جوشی اور اخلاص سے کیا گیا۔ مگر چونکہ اسی اثنا میں تقسیم بنگال اور سدیشی تحریک کے چرچے ہونے لگے تھے اہل ہند کو خدشہ تھا کہ مبادا مین چسٹر اور لینکا شائر کے باشندگان جو سدیشی تحریک سے بدظن ہو رہے ہیں آپ سے سرد مہری اور تغافل جتائیں۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ان مقامات پر جاتے ہوئے آپ خود بھی ہچکیں گے۔ مگر آپ کی تعمق نظری نے بھانپ لیا کہ ان سے محترز رہنا اور بھی بیگانگی کا باعث ہوگا۔ جب دوا کی امید ان سے ہے تو درد بھی انھیں سے کہنا چاہیے۔ چنانچہ آپ نے ان شہروں میں جاکر ایسی پرمغز، وزنی اور پرجوش تقریریں فرمائیں کہ سامعین کے خیالات پلٹ دیئے۔ آپ نے سدیشی تحریک کی خوب حمایت کی جو آپ کی اخلاقی جرأت کا زبردست ثبوت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ بنگالہ میں انگریزی اشیا کی ناقدری کا باعث یہ نہیں ہے کہ بنگالی خدانخواستہ باغیانہ خیالات رکھتے ہیں۔ تاریخ و تجربہ شاہد ہے کہ مطیع و فرماں بردار قوم جیسی ہندوستانیوں کی ہے ایسی دنیا کی کوئی دوسری قوم نہیں ہوسکتی جو قوم ڈیڑھ سو برس سے ذرا بھی گردن نہ اٹھاوے اس کا یکایک برافروختہ ہوجانا غیر ممکن ہے تاوقتیکہ اس کے دل کو کوئی جانگداز و ناقابل برداشت صدمہ نہ پہنچے۔ اس میں کلام نہیں کہ لارڈ کرزن کی حرکات اور بالخصوص ان کے آخری فعل نے بنگالیوں کو شکستہ جہاز بنا دیا ہے تاہم ابھی تک کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جو کسی مہذب گورنمنٹ کی مداخلت یا مزاحمت کا باعث کہا جاسکے۔ امن و امان میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ انھیں صورتوں میں دنیا کی کوئی دوسری مہذب قوم خدا معلوم کیا کیا شور و شر فتنہ و فساد مچاتی۔ کوئی غیر متعصب شخص اہل بنگال کے ضبط واستقلال کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ خیال کرنا غلط فہمی ہے کہ سدیشی تحریک پر اس لیے زور دیا جا رہا ہے کہ ان کو انگریزوں سے دشمنی ہے۔ بہت سے اینگلو انڈین اخبارات لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں جو اس غلط فہمی کا شکار ہوگیا ہے۔ اس پر ظاہر ہو کہ یہ طریقہ

محض اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ اہل بنگال اپنی چیخ پکار، گریہ و زاری کی آوازیں اہل انگلستان کے کانوں تک پہنچائیں اور ان کو اپنی ہمدری و دل سوزی پر آمادہ کریں، جو اس طریقے سے بدظن ہو وہ بتلائے کہ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں دوسری کون سی تدبیر ہے۔ کیا سکریٹری انڈیا کے دروازے پر گداگری کرنے سے کام چلے گا؟ یا پارلیمنٹ میں دو ایک سوال پوچھنے سے مطلب حاصل ہوگا؟ اب انگریزوں کی منصف مزاجی کا اقتضا یہ ہے کہ وہ سکریٹری سے ملتجی ہوں۔ غریب ہندوستان پر جھلانا جو خود ہی ذلیل و پامال ہو رہا ہے مردمی سے بعید ہے۔

آپ نے ہر موقع پر ایسی ہی پرزور تقریریں فرمائیں۔ ناگوار و نامرغوب صداقتوں کے بیان کرنے میں آپ کو ہرگز پس و پیش نہیں ہوتا تھا اور اہل انگلستان کی بھی عالی ہمتی ہے کہ اپنے ہی قوم کے جور و جبر کی کہانی سننے کے لیے ہزاروں کی تعداد سے جمع ہوتے تھے۔ گو ان برہنہ سچائیوں سے ان کی تفاخر قومی کو ضرور چوٹ لگتی تھی تاہم آپ کے پاس مختلف انجمنوں اور سوسائٹیوں سے کچھ ارشاد فرمانے کے لیے اتنی دعوتیں آتی تھیں کہ آپ باوجود ریاضت شاقہ کے عادی ہونے کے سب دعوتیں منظور نہ کرسکتے تھے۔ اور اثنائے تقریر میں ایسے جوش سے تحسین و مرحبا کے نعرے بلند ہوتے تھے اور اول سے آخر تک ایسی غم خواری اور دردمندی کا اظہار ہوتا تھا کہ آپ کو اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ صداقت پسندی کا جوہر ابھی تک انگریزوں میں ماند نہیں پڑا۔ آپ نے ڈیڑھ مہینے کی قلیل مدت میں کل انگلستان کا دورہ کیا اور متعدد تقریریں کیں مگر جس قوم نے صدیوں سے ہندوستان کو اپنی ملکیت سمجھ رکھی ہو اس پر ایسی تقریروں کا کیا دیرپا اثر پڑسکتا تھا۔ معزز اور نیک دل انگریز اصحاب نے اظہار ہمدردی کیا اور بس نظام حکومت اسی پرانی رفتار سے چلتا رہا۔

مادر ہند! وہ لوگ بے انصافی کرتے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہندو قوم بے جان، مردہ، فسردہ ہوگئی ہے۔ جب تک تیری گود میں دادا بھائی، رانا ڈے اور گوکھلے جیسے جیسے بچے کھیلیں گے ہندو قوم کبھی مردہ نہیں کہی جاسکتی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اگر ان صاحب کمالوں کا جنم کسی آزاد ملک میں ہوا ہوتا تو وہ گلیڈسٹن یا بسمارک یا لابٹ یا روزولٹ نہ ہوتے۔

''زمانہ'' نومبر ۱۹۰۵ء

ڈرامہ جنگ روس و جاپان

معاصر تاریخی واقعات پر ڈراما لکھنے کا رواج ابھی اردو زبان میں بہت کم ہے۔البرٹ بل پر ایک ڈراما شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اب دکن ریویو کے قابل ایڈیٹر مولوی ظفرعلی خاں بی۔اے نے جنگ روس و جاپان پر ایک ڈراما لکھاہے جس میں جنگ کے اسباب جاپانی سپاہیوں اور سپہ سالاروں کی حب الوطنی، روسی فوجی کے باہمی عناد و فساد اور اس کے نتائج بد بڑے پر لطف پیرائے میں دکھائے گئے ہیں۔ کہیں کہیں حسن وعشق کی چاشنی بھی دی گئی ہے جس سے کتاب کی دلچسپی بہت بڑھ جاتی ہے۔ مگر ڈراما کا اعلیٰ ترین وصف یہ ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرہ جوش دل سے گرم ہو اور سننے والے کے دل میں کبھی گدگدی ، کبھی سوزوگداز، کبھی جوش و خروش اور کبھی غم وغصہ پیدا کرے۔ اس لحاظ سے ہم اس کتاب کو بجائے ڈراما کے ناول سے زیادہ مشابہ سمجھتے ہیں۔ علاوہ بریں ایک اور نقص فن یہ ہے کہ ساری کتاب پڑھ جایئے مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ کون ہیرو ہے اور کون ہیروئن۔ عموماً ڈراما میں ہیرو سے ایسے اہم پلاٹ ادا کرائے جاتے ہیں اور کل واقعات میں اس کا حصہ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اس کو دوسرے معمولی کیرکٹروں سے تمیز کرلینا بہت آسان ہوتا ہے۔ مگر اس ڈراما میں غور کرنے سے بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کو ہیرو قرار دیں اور کس کو ہیروئن۔ یہ بھی واضح رہے کہ جلد جلد سین تبدیل کرنا معیوب ہے۔ بلالحاظ اس کے کہ واقعات کو تبدیلی کی ضرورت ہے یا نہیں۔اس ڈراما میں چند ہی صفحوں میں ٹوکیو، کابل، سینٹ سینٹ پیٹرس برگ، ماسکو، پورٹ آرتھر، قازان، میدان جنگ اور کئی دیگر مقامات کا نقشہ دکھایا گیا ہے، اسی وجہ سے کسی مقام پر پڑھنے والے کی توجہ کافی طور پر جمنے نہیں پاتی۔

کیرکٹروں کے سنبھالنے میں مصنف کو ایک حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ ایمی، کلیو پٹرا، او کیو وغیرہ نوع انسانی کے بہترین نمونے ہیں۔ مکاڈو کی مستقل مزاجی اور زار کی ضعیف القلبی بھی خوب دکھائی گئی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی بعض اوقات موقع محل کا لحاظ نہ کرکے کیرکٹروں سے ایسے پارٹ ادا کرائے گئے ہیں، جو کسی طرح نیچرل نہیں معلوم ہوتے۔ بلکہ ایک حد تک مہذب مذاق کو صدمہ پہنچاتے ہیں۔ مثلاً

کی ڈگڈگی سے پہلے قلندر نے منادی پھر اٹھ کے رسن خرس کی بندر کو تھمادی
بھالو نے جو بنکار کے بندر کو صدا دی بندر نے بھی دم اپنی حقارت سے اٹھا دی
اور خرس کو دکھلا دیے دو سرخ رتالو

یہ اشعار اگر کسی مسخرے کی زبان سے ادا کرائے جاتے تو ذرا بھی بے موقع یا ناگوار نہ معلوم ہوتے۔ مگر ایک ایسی مجلس میں جو شیخ الاسلام قاضی محمد بن یحییٰ کے گھر پر ہوئی ہے اور وہاں بھی ایک مہذب مولوی کی زبان سے ایسے پوچ اشعار کا نکلنا نہایت غیر مستحسن معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح ملا محمد سعید کی زبان سے ذیل کی گفتگو ادا کرائی گئی ہے:

''یورپ کے عیسائی کیا انگریز اور کیا روسی لاتوں کے بھوت ہیں۔ باتوں سے نہیں مانتے۔ جو ڈنڈا سنبھال کر ان کے گرد ہوجائے اس کے یہ دوست اور جو ذرا دبا اس کا انھوں نے ٹیٹوا دبا دیا۔''

یہ گفتگو امیر کابل جیسے ذی خرد، عالی دماغ فرماں روا کے ایک معتمد مشیر کی ہے مگر کسی بازاری شخص کی زبان سے نکلتی تو زیادہ موزوں معلوم ہوتی۔ علاوہ بریں ایسی رکیک تقریر سے امیر کابل کے دربار کی وقعت اور ان کا رعب و جلال پڑھنے والے کے دل سے دور ہوجاتا ہے۔

سب سے بڑی غلطی کیرکٹروں کے دکھانے میں مصنف صاحب سے یہ ہوئی ہے کہ آپ نے مسٹر اور میڈم روزولٹ کو بالکل ملیامیٹ کردیا ہے۔آپ کی میڈم روزولٹ کسی پرانی دقیانوسی ہندی قصے کی رانی ہوں تو ہوں مگر امریکہ کے روشن خیال، عالی دماغ پریسڈنٹ کی بیوی نہیں ہوسکتیں۔ ان دونوں کیرکٹروں میں جو گفتگو ہوئی ہے وہ ان کے رتبہ، تہذیب وشرافت کے لحاظ سے بغایت رکیک ہے۔ مثلاً مسٹر روزولٹ اپنی بیوی

سے کہتے ہیں:

''یہ خبط کیا تمھیں سوجھا ہے اے مری پیاری
مگر دماغ تمھارا ہے عقل سے عاری''

ہم نہیں سمجھتے کہ اگرمسٹر روزولٹ یا ان کی بیوی کی نظروں سے یہ شعر گزرے تو وہ ہندوستانیوں کی تہذیب کا اپنے دل میں کیا اندازہ لگائیں۔ موجودہ تہذیب کی خصوصیت عورتوں کے ساتھ اعلیٰ درجے کا اخلاق برتنا ہے۔ اگران کو ضرورتاً برا بھلا بھی کہیں تو نہایت متین، معذرت آمیز لہجے میں کہیں گے نہ کہ اس طرح دوبدو گالی گلوج!

مگر اسی پر خاتمہ نہیں ہوا ہے۔ سارا زمانہ متفق ہے کہ مسٹر روزولٹ ایک اعلیٰ درجے کے آشتی پسند، آزاد منش شخص اور صلح کل کے پرزور حامی ہیں۔ مگر اس ڈراما میں انشاپردازی کے جوش میں ان کی زبانی نہایت پوچ اور گندہ خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ مثلاً:

''دو تین لاکھ اور روسی مارے گئے تو میری جوتی سے۔ اور جاپان کی فوجی آبادی بہ قدر لاکھ ڈیڑھ لاکھ کے کم ہوگئی تو میری بلا سے۔''

افسوس ہمارے ڈرامیٹسٹ نے ایک عالی نفس بزرگ کو نگاہ عامہ میں گرا دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ڈرامیٹسٹ ہمیشہ کسی قدر مبالغہ سے کام لیا کرتا ہے۔ مگر نیک کو بدبنا دینا مبالغہ نہیں ہے۔ البتہ معمولی نیک کو ولی اور بد کو شیطان بنا دینا اکثر ڈراما نویسوں کا شعار رہا ہے۔افسوس ہے کہ اس کتاب میں ایسی باتوں کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ساری کتاب میں کہیں بھی جذبات دلی جوش میں نہیں آتے۔

زبان اس کتاب کی شستہ اور صاف ہے۔ ہاں کہیں کہیں ادق اور غیر مانوس الفاظ کااستعمال کانوں کو کھٹکتا ہے۔ تقریریں بعض اوقات بہت طول طویل ہیں جن سے طبیعت اکتا جاتی ہے۔ ڈراما کے لیے الفاظ کی بے تکلفی اور برجستگی نہایت ضروری شے ہے۔ شوکت الفاظ جس پر ضرورت سے زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے علمی اور تاریخی مضامین کے لیے موزوں ہوتو ہو مگر ڈراما کے لیے موزوں نہیں۔

کتاب کی طرف سے نظر ہٹا کر جب اس کی تمہید کو دیکھیے تو فوراً ایسا خیال ہوتا

ہے گویا بازار کی خاک چھان کر ایک بذلہ سنجوں کی محفل میں آ گئے۔ مولوی عبدالحق صاحب انشا پردازی کے استاد ہیں۔ آپ نے اس مرض متعدی کا جس کو ''جوع الارض'' کہتے ہیں اور جس میں یورپ کی کل سلطنتیں مبتلا ہیں نہایت فرحت بخش لہجہ میں تذکرہ کیا ہے۔ آپ کا انداز بیان ظرافت آمیز اور نہایت دل نشیں ہے۔ ایک ایسے خشک پولیٹکل مسئلہ کو ایسے لطیف پیرایہ میں نباہنا آپ ہی کا حصہ ہے۔

''زمانہ'' فروری ۱۹۰۶

حال کی بعض کتابیں

ہر ایک زبان کی ذہنی اور علمی ترقیوں کے اندازہ لگانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کی تصنیف و تالیف پر نظر ڈالی جائے۔ اس لحاظ سے اگر اردو کی حال کی بعض کتابوں پر نگاہ ڈالیے تو کسی قدر مایوسی ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کتابیں بہ افراط شائع ہوئیں مگر ان کا معیار کچھ ایسا گرا ہوا ہے کہ اردو زبان کی وقعت ان کے اضافہ سے بہت زیادہ نہیں ہوتی۔ ''آب حیات'' یا ''حیات جاوید'' کے معیار کی تصانیف اب روز بروز نادر ہوتی جاتی ہیں اور ''تمدن عرب'' کے رتبے کے ترجمے تو گویا خواب و خیال ہوگئے اور ممالک کی زبانوں کو دیکھیے تو علم و سائنس کے ہر صیغہ میں متعدد کتابیں لکھی جا رہی ہیں جو تازہ تحقیقات سے مملو ہوتی ہیں، اور جن کو پڑھ کر یہ اطمینان ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی معلومات میں کچھ اضافہ کیا۔ ہماری اردو زبان میں علمی اور تاریخی کتابوں کا تو کیا ذکر کچھ عرصہ سے اعلیٰ پایہ کے فسانے بھی نظر سے نہیں گزرے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس علمی کساد بازاری کا باعث اردو داں اصحاب کی بدشوقی و ناقدری ہے۔ ہم اس رائے سے کلی طور پر متفق نہیں ہیں۔ ممکن نہیں کہ بازار علم میں کوئی نادر چیز آئے اور ہاتھوں ہاتھ بک نہ جائے۔ خاص سبب اس سرد بازاری کا یہ ہے کہ عموماً مصنّفین نہ کوئی اعلیٰ معیار پیش نظر رکھتے ہیں اور نہ کافی طور پر سعی و جانفشانی کرتے ہیں۔ اگر باقاعدہ طور پر ایسی کوششیں کی جائیں تو پبلک بہت جلد ان کی قدر کرنے لگے۔ اور اردو کا بازار علم سرسبز و کامیاب ہوجائے۔ تاہم ناظرین کی یہ بدشوقی اور مصنّفین کی یہ بے دلی دیکھتے ہوئے ہم ان کتابوں کو بھی غنیمت جانتے ہیں جو گذشتہ چند مہینوں میں شائع ہوئی ہیں اور ان پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہیں۔

مولوی محمد حسن خاں صاحب کے نام نامی سے اردو داں پبلک غیر متعارف نہیں ہے۔ آپ کی دو کتابیں ''تزک عبدالرحمانی'' اور ''ہاجرہ'' اس کے قبل مقبولیت کا زیور پہن چکی ہیں۔ یہ تیسری کتاب ایک انگریزی تصنیف ''دی ڈائری آف اے ٹرک'' کا ترجمہ ہے۔ خالد جو اس کتاب کا مصنف ہے ایک ترکی نوجوان ہے جو ملکی ناچاقیوں کے باعث وطن سے بھاگ کر انگلستان میں پناہ گزیں ہوا ہے۔ اور وہیں یہ کتاب لکھی ہے۔اس کے پڑھنے سے ترکی کے گذشتہ پچاس ساٹھ برسوں کے تمدنی حالات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ گو مصنف خود ایک ترک ہے مگر اس نے ترکی معاملات پر ایک باخبر انگریز کی نگاہ ڈالی ہے اور اکثر بڑی سنجیدگی سے ان پر رائے زنی بھی کی ہے۔ ہندوستان کی طرح ترکی بھی موجودہ رفتار زمانہ کے اثر سے متاثر ہو رہا ہے۔ یہاں کی طرح وہاں بھی پولیٹکل آزادی اور حقوق کے طلب گاروں کی تعداد روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ خالد اسی زمرہ کا ایک پرجوش نوجوان ہے۔اور گو وہ ترکی کی داخلی حکومت سے آسودہ نہیں ہے مگر حسب موقع اس نے ترکی کو ان غلط فہمیوں سے بچانے کی کوشش کی ہے جو یورپ میں بے انصافی اور متعصب اخباروں اور سیاحوں کی بدولت پھیلی ہوئی ہیں۔ خصوصاً جس باب میں اس نے آرمینیوں کی مفسدانہ و باغیانہ سازش اور ترکی گورنمنٹ کی عاجزی اور بے بسی کا تذکرہ کیا ہے اس کے پڑھنے سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ یورپی سلطنتیں ترکی کی بیخ کنی میں خواہ وہ کیسے ہی ناجائز ذریعے سے کیوں نہ ہو، پہلو تہی نہیں کر رہی ہیں۔ علاوہ اس کے مصنف نے ترکی رسم و رواج اور طرز معاشرت کا بھی تھوڑا بہت تذکرہ کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کی طرح وہاں بھی نئی اور پرانی تہذیب میں جنگ وجدل مچی ہوئی ہے۔ صنعت و حرفت کی کساد بازاری کا وہاں بھی یہی حال ہے اور وہاں بھی تعلیم یافتہ فرقہ اسی طرح سرکاری ملازمت کا دلدادہ ہے۔ ترجمہ کے لحاظ سے یہ کتاب قریب قریب بے عیب ہے مگر ایک چیز جو طبیعت کو پریشان کرنے والی ہے وہ اس کا طولانی دیباچہ ہے۔ شملہ بمقدار علم ہونا چاہئے۔ عموماً دیباچے میں اصل تصنیف کے اغراض و مقاصد بیان کیے جاتے ہیں مگر مولوی محمد حسن خاں نے اپنے دیباچے کو جو اصل کتاب سے دو ہی چار صفحہ کم ہے تمدنی مسائل کے مباحث کا جولا نگاہ بنایا ہے۔ آپ ہندکی اسلامی ترقی کی

رفتار سے نالاں و بیزار ہیں۔ اور ضرورت سے زیادہ سخت الفاظ میں آزادی کے ان معزز دلدادگان سے مخالفت کا اظہار کرتے ہیں جس میں جسٹس طیب جی، جسٹس امیر علی، سر آغاز خان جیسے ہادیان قوم شامل ہیں۔ تفصیل بحث وہی ہے جس پر بارہا اخباروں اور رسالوں میں خامہ فرسائی کی جاچکی ہے۔ ہاں اس موقع پر کل اعتراضات و جوابات باقاعدہ طور یکجا مرتب کردیے گئے ہیں۔ ہم کو اس سے بحث نہیں کہ آپ نے ایسے خیالات کا جو موجودہ زمانے سے متناقص ہیں کیوں اظہار کیا۔ ہر شخص اپنے خیالات کے ظاہر کرنے کا مجاز ہے۔ مگر اس کام کے لیے جداگانہ تصنیف کی ضرورت تھی۔ کاغذ، چھپائی اور لکھائی کے لحاظ سے یہ کتاب بہت ممتاز ہے۔ ان اوصاف کے دیکھتے اس کی قیمت زیادہ نہیں ہے۔

انجمن ترقی اردو اور انجمن علوم قدیمہ کچھ عرصے سے قائم ہیں اور مختلف علوم کی چند کتابیں بھی شائع کرچکی ہیں۔ مگر ہماری دانست میں اب تک ان کی طرف سے کوئی ایسی کتاب نہیں شائع ہوئی جو تاریخی وقعت کے لحاظ سے اس سلسلہ رقعات کا ہمسر ہوسکے جس کا پہلا نمبر ''رقعات بدر'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ مولوی حکیم سید محمد علی صاحب عرش ملیح آبادی نے جو اس کے مولف ہیں واقعی ملک اور زبان پر احسان کیا ہے۔ نواب واجد علی شاہ جب اپنی عیش پرستوں کی بدولت مورد ادبار ہوئے تو ان کی متعدد محلات اور بیگمات پر حسرت ناک کس مپرسی کی حالت طاری ہوگئی۔ کتنی ہی بیگموں نے تو سرکاری وثیقہ پر قناعت کی اور شہر کو چھوڑ کر دربدر خاک بسر پھرنے لگیں۔ اور کتنی ہی مکروہات دنیوی کا شکار ہوگئیں۔ مگر چند عصمت مآب بیویوں نے ننگ و ناموس کو برقرار رکھا اور جب تک زندہ رہیں ''پیارے جان عالم'' کے نام پر مرتی رہیں۔ بدر عالم صاحبہ انھیں بیگمات سے تھیں۔ اور یہ کتاب جو ''رقعات بدر'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ ان رقعات کا مجموعہ ہے جو بدر عالم صاحب نے ''پیارے اختر'' کے نام لکھے تھے۔ کیونکر ممکن تھا کہ وہ طبیعتیں جو نازونعمت کی گود میں پلی تھیں جنھوں نے الم و یاس کو خواب میں بھی نہ دیکھا تھا اور جو عیش پرستی میں ہمہ تن ڈوبی ہوئی تھیں یکایک اپنی عادتوں کو تبدیل کرلیتیں! گو جان عالم مٹیا برج کی چہار دیواری میں بند تھے، تاج و افسر، جاہ وحشم کا خاتمہ ہوگیا تھا، گو بدر عالم کرایہ کے مکان میں رہتی، مہاجنوں کے

تقاضے سہتی اور ''جھاڑی زمین پر'' بیٹھتی تھیں مگر رقعے سب کے سب عاشقانہ شکوہ و شکایات، معشوقانہ رمز و کنائے اور اختلاط ولگاوٹ بازی کے جملوں سے پر ہیں۔ زبان کی نمکینی کا کیا پوچھنا ! لکھنؤ کی ایک اعلیٰ درجے کی تعلیم یافتہ بیگم کی زبان میں جس قدر نزاکت، پاکیزگی اور شستگی ہوسکتی ہے وہ سب ان رقعات میں موجود ہے۔ ہاں چونکہ وہ زمانہ سرور کے رنگ کا تھا اس لیے اکثر القاب و آداب طویل ہیں اور بیشتر اوقات نفس مطلب بھی، مقفیٰ عبارت میں ادا کیا گیا ہے۔ بدر عالم صاحبہ شاعرہ بھی تھیں اور منظوم رقعات کو دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ طبیعت موزوں تھی۔ افسوس کیا سرد مہری روزگار ہے۔ ان شہزادوں کو جو زمین پر پاؤں بھی نہ دھرتی تھیں زمانہ کے صدمے اٹھانے اور گردشِ روزگار کے ظلم سہنا پڑے۔ ان رقعات میں ایک بات جو سب سے زیادہ دل پر اثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ بدر عالم بیگم صاحبہ کا ہمیشہ یہی خیال رہا کہ جان عالم سے بہت جلد لکھنؤ میں بغل گیر ہوں گی۔ کاش اس مجموعہ رقعات کے ساتھ ایک دیباچہ بھی ہوتا تو کتاب اور بھی زیادہ دلچسپ ہوجاتی۔

تعلیم نسواں کے مسئلہ سے آج کل بڑی دلچسپی ظاہر کی جا رہی ہے ۔ گورنمنٹ اور پبلک دونوں ہی نے اس کی اہمیت اور ضرورت کو تسلیم کرلیا ہے اور اس کو عملی صورت میں لانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ ایسے وقت میں منشی احمد علی خاں صاحب کی تالیف ''اتالیق نسواں'' ایک مسلم ضرورت کو پورا کرے گی۔ یہ کتاب پانچ مختصر جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ مولف نے تعلیم نسواں کا جو معیار پیش نظر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ ''لڑکیاں دو چار حرف زبان اردو میں اپنے رشتہ کنبہ داروں کو اپنی ضرورت کے متعلق لکھ پڑھ سکیں۔ گھر کا روز مرہ خرچ لکھ لیں۔ بچوں کو معمولی کتابیں پڑھا سکیں۔ اپنی اور گھروالوں کی صحت کو درست رکھیں اور بچوں کی عام بیماریوں کا علاج حکیم نہ ملنے کی صورت میں کرلیں۔ ان کو تربیت دیں۔ مزیدار اور مقوی غذائیں پکائیں، سینے پرونے اور کچھ کشیدے کاڑھنے سے آگاہ ہوں۔ اور واقفیت عامہ سے ان کا سینہ لبریز ہو'' ہم اس معیار کے کامل طور پر حامی ہیں۔ ہم کو خوشی ہے کہ مصنف نے اس پر عمل کرنے میں ایک بڑی حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔اور ''اتالیق نسواں'' کی پانچوں جلدوں میں کہیں یہ معیار نظروں سے نہیں گرنے دیا ہے۔ ہاں ترتیب مضامین سے ہم کو کلی

اتفاق نہیں ہے۔ مثلاً حصہ اول میں حساب کی تعلیم دی گئی ہے۔ ہماری دانست میں بچوں کے لیے سب سے پہلے معمولی اشیا پر زبانی سبق دینے کی ضرورت ہے۔ ان کو حساب سے ابتداءً بہت کم دلچسپی ہوتی ہے۔ حساب کا تذکرہ فطرتاً انتظام خانہ داری سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کا ذکر پانچویں جلد میں آیا ہے۔ کھانا پکانے، سینے پرونے کاڑھنے اور رنگنے پر زمانۂ حال کی تحقیقات اور ایجادوں کو مدنظر رکھ کر بہت مفید اور تجربہ کی ہدایتیں کی گئی ہیں۔ انشا پردازی اور خطوط نویسی کے سبقوں کی ترتیب بالکل انگریزی کتابوں کے طرز پر کی ہے۔ جس سے امید ہے کہ یہ مشکل کام بہت آسان ہوجائے گی۔

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی کے علمی مشاغل کی 'زمانہ' کے صفحوں میں کئی بار داد دی جاچکی ہے۔ گذشتہ چند ماہ میں اس سوسائٹی کی طرف سے کئی مفید اور کارآمد کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں مضمون کی نوعیت کے لحاظ سے ''حیات[1] شمع'' خاص طور پر ذکر کرنے کے قابل ہے۔ تقطیع اس کتاب کی چھوٹی ہے اور حجم بھی ساٹھ صفحوں سے زیادہ نہیں۔ مگر انھیں مولف نے وہ تمام ضروری باتیں بھردی ہیں جو ایک سائنس کے مبتدی کو جاننا چاہئیں۔ مثلاً شمع کے لیے ہوا چلنے کی کیوں ضرورت ہے۔ شمع کے جلنے سے کون کون اشیاء پیدا ہوتی ہیں۔ کوئلہ کی گیس کیا ہے اور کیونکر بنتی ہے وغیرہ اکثر مطالب کی تشریح میں تصاویر سے مدد لی گئی ہے۔ زبان سادی اور عام فہم ہے۔ اس کتاب کے علاوہ اسی شکل و شباہت اور قد و قامت کی کئی اور کتابیں سوسائٹی نے چھاپی ہیں۔ ''پھولوں کی کہانی''، ''تاریخ مصر'' اور ''ترجمہ رابنسن کروزو'' وغیرہ۔ اول الذکر علم نباتات کی ایک پرائمر ہے، اس میں پھولوں کی ساخت، ان کے اعضاو افعال، ان کی درجہ بندی، ان کی شادی بیاہ، ان کی تولیدوغیرہ کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔ پھولوں کے اجزاء تصویروں کی مدد سے دکھائے گئے ہیں۔ ایسی حالت میں جبکہ اردو زبان میں علم نباتات پر بہت کم مبسوط کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ہم اس پرائمر کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ ایسی کتابوں کے لکھنے میں ایک بڑی وقت یہ ہے کہ موقع موقع پر الفاظ کی کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اور مؤلف کو مجبوراً دوسری زبان کے الفاظ جیوں کے تیوں رکھ دینے پڑتے ہیں۔ مگر اس کتاب میں اکثر انگریزی اصطلاحوں کے

مترادف فارسی الفاظ ڈھونڈ نکالے گئے۔

دوسری کتاب ''تاریخ مصر'' ایک ہسٹری کی پرائمر ہے جس میں قدیم زمانہ کے مصریوں کے رسم و رواج، طرز معاشرت، عادت و خصائل، نظام سلطنت، مذہبی عقائد، عروج و زوال کے اسباب وغیرہ کا مختصر تذکرہ کیا گیا ہے۔ مصر کی قدیم تاریخ انجیل کے مطابق طوفان نوح کے بعد ہی سے شروع ہوتی ہے۔ اس کتاب میں مؤلف نے بلاجدید تاریخی تحقیقاتوں کا لحاظ کیے ہوئے بائبل کے بیان کی تائید کردی ہے۔ مگر مصر کے مذہبی عقائد و رسم ورواج کا حال پڑھ کر یہ خیال راسخ ہوجاتا ہے کہ مصریوں کی تہذیب آریوں کی تہذیب کی نقل تھی۔ مثلاً اہل مصر تناسخ کے قائل اور ذات پات کے پابند تھے جو آریہ تہذیب کی خصوصیات ہیں۔ یہ کتاب اگرچہ بہت ہی مختصر ہے مگر محض بادشاہوں کی معرکہ آرائیوں کے ذکر کرنے پر قناعت نہیں کرتی۔ تمدنی حالات پر بھی کسی قدر روشنی ڈالتی ہے جس کو فن تاریخ نویسی کی علت غائی کہنا چاہئے۔

تیسری کتاب ''سرگزشت رابنسن کروزو'' ہے۔ یہ ایک نہایت مشہور و معروف انگریزی فسانہ کا ترجمہ ہے جس میں ایک انگریزی ملاح کے شکستہ جہاز ہونے اور سنسان ویران جنگلوں میں مدت دراز تک رہنے کے بعد وطن کو واپس آنے کا قصہ ایسے سلیس اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ کتاب ہمیشہ اولو العزم نوجوانوں میں بہت مقبول رہی ہے۔ شاید ہی کوئی انگریزی بچہ ایسا ہوگا جو رابنسن کروزو کے نام سے اسی طرح مانوس نہ ہو جتنا کسی معمولی دوست کے نام سے۔ ڈانیل ڈی فوجو اس کا مصنف ہے۔ ملکہ این کے زمانے کا ایک گراں مایہ مصنف گزرا ہے جس نے مدت تک مسائل وقت پر کتابیں لکھنے کے بعد یہ فسانہ لکھا اور حق یہ ہے کہ اپنی لازوال شہرت کی بنیاد ڈال گیا۔ ہماری زبان میں دیکھیے تو رینالڈز کے ناولوں کے ترجمے بھرے پڑے ہیں۔ مگر اب تک اس حوصلہ خیز اور امنگ پیدا کرنے والی کتاب کی کسی نے بات بھی نہ پوچھی تھی۔ کچھ عرصہ ہوا ہندی میں اس کا ترجمہ شائع ہوا تھا۔ اب اس سوسائٹی کے حسن سعی کے بدولت اردو میں بھی شائع ہوگیا۔ ترجمہ سلیس اور سادہ زبان میں ہے۔ مگر بلاتصویر کے یہ کتاب کسی قدر پھیکی معلوم ہوتی ہے۔

''تاج و نشان'' اور ''گنج شائگان'' کے مصنف محمد رفیع رضوی عالی نے اسی سلسلہ

میں ایک اور کتاب شائع کی ہے جس میں مختلف ممالک و اقوام کی دستار و کلاہ کی تصویریں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایسے مجموعوں کی وقعت صرف اس وجہ سے ہے کہ ان سے تاریخ تمدن کی تشریح میں مدد ملتی ہے۔ مگر ان سے یہ فائدہ اٹھانے کے لیے جس حسن ترتیب کی ضرورت ہے وہ اس میں مفقود نظر آتی ہے۔ اگر مولف نے انگریزی ٹوپیوں کی ترتیب یوں دی ہوتی کہ پہلے ان کی کیا وضع تھی۔ پھر کیا کیا تغیر ہوا، اور اب ان کی کیا ہیئت ہے تو دیکھنے والے کو خاص دلچسپی ہوتی۔ علاوہ بریں ایسی کتابیں کسی مصرف کی نہیں ہوتیں تاوقتیکہ تصویریں صاف اور اصل سے بعینہ مشابہ نہ ہوں۔ افسوس ہے کہ اس حیثیت سے یہ کتاب بہت کم وقعت رکھتی ہے ۔ تصویریں بیشتر غلط ہیں جن کو دیکھ کر اصل شے کی تصویر ذہن میں نہیں آتی۔ تصاویر رنگین ہوسکتیں تب بھی غنیمت ہوتا۔

ایسے مبارک وقت میں جبکہ ہندوستان میں حضور شہزادہ اور شہزادی ویلس کی تشریف آوری سے رشک جنت ہو رہا ہے اس تذکرہ کا شائع ہونا نہایت باموقع اور موزوں ہے۔ قاضی عزیز الدین احمد صاحب نے جو اس کتاب کے مولف ہیں اور جن کے نام سے اردو لٹریچر کو بارہا تعارف ہوچکا ہے۔ شہزادہ صاحب کے تمام و کمال حالات مختلف ذرائع سے مجتمع کرکے اکٹھا کردیے ہیں۔ مگر مولف نے محض تالیف و ترتیب کی تکلیف نہیں گوارا کی ہے بلکہ کتاب کی عبارت و طرز تحریر سے اس عقیدت مندی اور خلوص و وفاداری کا اظہار ہوتا ہے جو ہندوستانیوں کو اپنے شاہی مہمانوں سے ہے۔ خاص کر وہ ابواب جن میں شہزادۂ نیک نہاد کے ذاتی و صفاتی محاسن کا تذکرہ کیا گیا ہے بہت خوبی سے لکھے گئے ہیں۔ اور موقع موقع پر ایسی روایتیں نقل کی گئی ہیں جو شہزادۂ فرخ ذات کی غربا پروری، نیک نفسی اور فراخ دلی کی شہادت دیتی ہیں۔ ○○

''زمانہ'' فروری ۱۹۰۶

شررؔ و سرشارؔ

حکیم برہمؔ صاحب گورکھپوری نے اگست و ستمبر کے ''اردوئے معلیٰ'' میں حیرت انگیز قابلیت و نکتہ سنجی سے شررؔ و سرشارؔ کا موازنہ نہ کیا ہے جس میں آپ نے حضرت شررؔ کو ایسا آسمان پر چڑھایا ہے کہ بیچارے سرشارؔ کا نام تک ان کے مقابل میں لیا جانا روا نہیں رکھتے۔ ان کے مضمون کا لب لباب یہ ہے کہ سرشارؔ کا اردو لٹریچر کی گردن پر کوئی احسان نہیں ہے۔ بہتر ہوتا کہ ایسا مضمون لکھنے کے قبل حکیم صاحب نے یہ بھی دیکھ لیا ہوتا کہ ان سے زیادہ قابل نقادوں نے جن میں شیخ عبدالقادر بی۔اے۔ بھی ہیں زبان اردو میں سرشار کا کیا درجہ قائم کیا ہے۔ یہ واضح رہے کہ اردو شعرا یا ان کی شاعری پر ہر صحیح المذاق اردو داں رائے زنی کرسکتا ہے۔ مگر اردو ناول پر کچھ لکھنے کی جواب دہی وہی شخص لے سکتا ہے جو کم از کم انگریزی زبان کے مشہور ناولسٹوں کی تصانیف سے حظ وافی رکھتا ہو۔ اس لحاظ سے شیخ صاحب کی تنقید حکیم صاحب کے مقابلہ میں کہیں زیادہ وقیع ہے...

مسٹر چکبستؔ کا مضمون تنقیدی تھا۔ اس میں سرشارؔ کے محاسن کے ساتھ ساتھ ان کے معائب پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی۔ مگر حکیم صاحب نے سرشارؔ کی خامیاں تو سب کی سب دکھادیں۔ گو فرضی ہی سہی، مگر شرر کو مرفوع القلم سمجھا۔ حالانکہ عوام پر ظاہر ہے کہ آج تک کوئی شخص ایسا نہیں گزرا جس میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ برائیاں نہ پائی جائیں۔

ہم حکیم صاحب کے کہنے سے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت شررؔ عربی کے فاضل علامہ فارسی کے عالم اجل اور ہمہ دانی میں یگانۂ روزگار ہیں، ان کو متعدد السنہ یورپ پر بھی عبور حاصل ہے۔ ڈکشنری کی مدد سے ترجمے کرسکتے ہیں اور اردو نثر

میں تو ایک نئے رنگ کے موجد اور موجودہ لٹریچر کے بانی ہیں۔ برعکس اس کے غریب سرشار فارسی میں کچا اور عربی میں امی محض ہے، تاریخ جغرافیہ میں اس کو مطلق مس نہیں۔ السنہ یورپ کا کیا ذکر اردو میں بھی کافی دستگاہ نہیں رکھتا۔ مگر ہم کو اس وقت ان بزرگوں کے ذاتی کمالات سے بحث نہیں۔ ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ فسانۂ نگاری کے میدان میں کس کا قلم طرارے بھرتا ہے اور اس فن سے (کا) کون زیادہ ماہر ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ ناول نویسی اور بات ہے اور فاضل ہونا دوسری بات۔ بعینہٖ اسی طرح جیسے شاعری کا حال ہے۔ گولڈ اسمتھ، شیلی، بائرن، کے سے نامی گرامی شعرا اپنے کالج کے راندۂ درگاہوں میں سے تھے۔ اسی طرح تھیکرے اور ڈکنس علمیت و جامعیت کے لحاظ سے اپنے وقت کے اور علماء سے کہیں کمتر تھے۔ مگر فسانہ کے آسمان پر یہی دونوں نام تارے ہوکر چمکے۔

الفاظ ''فسانہ'' و ''ناول'' ہم کو اس انوکھے امتیاز کی یاد دلاتے ہیں جو حکیم صاحب نے ان کے مابین رکھا ہے۔[1] حکیم صاحب کو معلوم ہوگا کہ ناول انگریزی لفظ ہے اور اگر اس کا ترجمہ ہوسکتا ہے تو وہ فسانہ ہے۔ لفظی حیثیت سے دونوں میں کچھ فرق نہیں۔ مگر مفہوم کے لحاظ سے البتہ نمایاں فرق ہے۔ ناول اس فسانہ کو کہتے ہیں جو زمانہ کا جس کا وہ تذکرہ کر رہا ہوصاف صاف چربہ اتارے اور اس کے رسم و رواج، مراسم آداب، طرز معاشرت وغیرہ پر روشنی ڈالے۔ اور مافوق العادت واقعات کو دخل نہ دے۔ یا اگر دے تو ان کی تاویل بھی اسی خوبی سے کرے کہ عوام ان کو واقعہ سمجھنے لگیں۔ اسی کا نام ہے ناول یا فسانہ بہ طرز جدید۔ فسانہ عجائب یا گل بکاولی یا قصہ ممتاز، یا طلسم ہوشربا یا بوستان خیال، سب پرانے ڈھنگ کے قصے ہیں۔ جن میں جدید فسانہ کی خوبیوں کا شائبہ تک نہیں ۔ ہاں میرامن دہلوی کی مقبول عام کتاب 'باغ و بہار' یا 'داستان الف لیلیٰ' ایک حد غیر محسوس تک مرقومہ بالا خوبیاں رکھتی ہیں۔ یعنی اپنے

---

[1] حکیم برہم نے اپنے مضمون میں لکھا تھا:

''فسانہ آزاد میں نہ کوئی پلاٹ ہے، نہ کوئی نتیجہ ہے، نہ کوئی مبحث ہے، لہٰذا یہ ناول کے لقب سے یاد کیے جانے کے قابل نہیں۔ اور اگر فضول و بے نتیجہ پریشان خیالی ہی کا نام 'ناول' ہے تو پھر ایجاد و اختراع کا نام لینا ہی بے محل ہے۔'' (اردوئے معلی، اگست و ستمبر ۱۹۰۵ء) مرتب

زمانہ کی تہذیب پر ایک دھندلی روشنی ڈالتی ہیں۔

اس معیار کو پیش نظر رکھ کر اگر سرشار کے فسانوں کو دیکھیے تو ایسی کون سی خوبی ہے جو ان میں بدرجۂ اتم موجود نہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ان کی سب کتابیں اپنے زمانہ کی سچی تصاویر ہیں۔ اگر آج سے سو برس بعد کوئی شخص فسانۂ آزاد کا مطالعہ کرے تو اس کو آج سے پچیس برس پہلے کی تہذیب و روشن خیالات و مذاق عامہ کی جھلکیاں صاف نظر آئیں گی جو تاریخ کے مطالعہ سے خواہ وہ کیسا ہی وسیع اور دقیع کیوں نہ ہو ہرگز نظر نہیں آسکتیں۔ طرز تمدن کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس پر سرشار کی زبان نے اپنے نرالے انداز سے گل فشانی نہ کی ہو۔ حتیٰ کہ مداریوں کے شعبدے، بھانڈوں کی نقلیں، ساقن کے غمزے اور ایسی ہی بے شمار باتوں کی تفصیل میں بھی کمال مصوری دکھایا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ''تصور بر زمانہ'' جتنے جزئیات پر حاوی ہے ان سب پر سرشار کے طلسمی قلم نے جادو طرازی کی ہے۔

برعکس اس کے حضرت شرر کے جو ناول مشہور ہیں وہ کوئی تو صلیبی لڑائیوں کے زمانہ کا ہے۔ کوئی محمود غزنوی کے حملہ کے زمانے کا کوئی روم و روس کی لڑائی کے وقت کا، کوئی اس زمانہ کا جب مسلمانوں کے قدم اسپین سے اکھڑ چکے تھے۔ الغرض سبھی ناظر کو دس پانچ صدیاں پیچھے لے جاتے ہیں۔ اور چونکہ حضرت شرر کو ان باتوں کا ذاتی تجربہ نہیں ہے اس لیے وہ اس وقت کے واقعات کی ایسی تصویر ہرگز نہیں کھینچ سکتے جو اصل سے مطابقت رکھے۔ان کی معلومات کا سب سے زرخیز ذریعہ تاریخ ہے اور تاریخی معلومات چاہے کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہوں ذاتی و عینی مشاہدے سے لگا نہیں کھاسکتیں۔ الفرڈ لائل جو ایک مستند انگریزی نقاد ہے لکھتا ہے کہ آج تک کسی ناول نویس کو تاریخی ناول لکھنے میں کامیابی نہیں حاصل ہوئی۔ اور نہ اس کا حاصل ہونا ممکنات سے ہے۔ ایک ایسے زمانہ کے خیالات و واقعات کا فوٹو اتارنا جس کو گزرے ہوئے صدیاں گزر گئیں سراسر قیاسی امر ہے۔ ہم یہی اندازہ کرسکتے ہیں کہ ایسی حالتوں میں ایسا ہوا ہوگا۔ یقینی طور پر یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ ایسا ہوا۔ جارج الیٹ نے اپنی ساری عمر میں صرف ایک ہی تاریخی ناول لکھا جس میں اٹلی کا ایک تاریخی واقعہ بیان کیا اور گو کئی ماہ تک انھوں نے وہاں کی طرز معاشرت کا مطالعہ کیا اور جتنی مستند تاریخیں وہاں کے کتب

خانوں میں دستیاب ہوسکیں، ان کو غور سے پڑھا۔ تاہم رمولا کے نسبت لوگوں (انگریزوں) کا خیال ہے کہ وہ واقعات کے مطابق نہیں۔ سر والٹر اسکاٹ جس کی حضرت شرر نے تقلید کی ہے، تاریخی ناولسٹوں کا سرتاج خیال کیا جاتا ہے۔ مگر باوجودیکہ اس کا تخیل بہت روشن تھا اور قوت بیانیہ نہایت پرزور تاہم اس کے تاریخی ناول انگریزی مبصروں کی نگاہ میں نہیں جچے۔ اس کے رچرڈ یا سلطان صلاح الدین بالکل نقلی معلوم ہوتے ہیں ... جب اسکاٹ اور جارج الیٹ کے سے جادو نگار بھی تاریخی ناول کامیابی سے نہیں لکھ سکتے۔ تو حضرت شرر غیر مکمل تاریخوں کی مدد سے جس حد تک ایسے ناولوں کے لکھنے میں سرخرو ہوسکتے ہیں اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ خیال کبھی مشاہدے کاہم وزن نہیں ہوسکتا۔ سرشآر نے پہلے ہی سے ان دقتوں کا اندازہ کرلیا اور جس ترغیب میں پڑ کر اوروں نے اپنی محنت رائیگاں کی اس سے محترز رہا۔ حضرت شرّر اسکاٹ کی تقلید کی جوش میں بالکل بھول گئے اور وہی غلطی کر بیٹھے۔

مگر جب حضرت شرر کے ان ناولوں کو دیکھیے جن میں انھوں نے موجودہ سوسائٹی کے مرقعے کھینچنے کی کوشش کی ہے تو خیال آتا ہے کہ بہتر ہوا انھوں نے تاریخی ناول ہی کو ذریعہ شہرت قرار دیا۔ کیونکہ خدا نے ان کو وہ تصویر نگاری کی قابلیتیں عطا نہیں فرمائیں جن کے بغیر مشاہدات کی سچی تصویر کھینچنی امر محال ہے اور تاریخی ناولوں نے ان کی اس خلقی کمزوری پر پردہ ڈال دیا۔

حیرت ہوتی ہے کہ حکیم برہؔم سا شخص یہ لکھنے کی کیونکر جرأت کرسکا کہ سرشار کے ''فسانۂ آزاد'' یا اور ناولوں میں کوئی پلاٹ یا کوئی نتیجہ نہیں ہے اور نہ ان کا کوئی مبحث ہے اور نہ ان میں کوئی غرض رکھی گئی ہے۔ جن کو خدا نے انصاف پسند آنکھیں عطا فرمائی ہیں وہ دیکھ سکتے ہیں کہ سرشآر کا کوئی ناول نتیجہ یا غرض سے خالی نہیں۔ ''فسانۂ آزاد'' ہی کو لے لیجیے کیا اس میں کوئی پلاٹ نہیں۔ آزاد کا محققانہ نگاہیں لے کر گلیوں بازاروں کی خاک چھاننا، نواب کے دربار میں ملازمت کرنا، بٹیر کی تلاش میں جانا اور بی بھٹیاری کی ترچھی چتونوں کا شکار بننا۔ پھر حسن آرا کے عشق میں گرفتار ہونا، انتہا درجہ کی علو ہمتی کو کام میں لاکر روم کو جانا وہاں شجاعت کے جوہر دکھانا، پولینڈ کی

شہزادی کے دام میں پھنسنا، پھر مظفر و منصور ہندوستان کو واپس ہونا، حسن آرا کو عقد میں لانا، یہ پلاٹ نہیں ہے تو کیا ہے۔ معترض کہے گا کہ پلاٹ ہے تو ضرور لیکن بالکل معمولی۔ ہاں بہت درست، پلاٹ بالکل معمولی ہے اوروہ بھی سراسرظاہری۔ باطنی پلاٹ سے ذرا بھی کام نہیں لیا گیا۔ مگرواضح رہے کہ ناول نویسی کے فن کی معراج یہی ہے کہ سادہ اور معمولی بندشوں میں رنگینی اور جادو نگاری کی جائے۔ جارج الیٹ کا قاعدہ تھا کہ وہ اپنے ناولوں کے پلات کبھی بیان نہیں کیا کرتی تھی۔ اس موقع پر عرض کرنا اور بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی ناول کے لیے ہر دوقسم کے پلاٹ کی اشد ضرورت ہے۔ بلا اس کے قصہ چل ہی نہیں سکتا۔ مگر ایسے ناولوں کے لیے جن میں سوسائٹی کے مرقعے دکھائے جاویں۔ اکثر اوقات پلاٹ اشخاص قصہ کو اس گھر سے اس گھر اور اس شہر سے اس شہر تک لے جانے ہی پر ختم ہوجاتا ہے تاکہ مصنف کو سوسائٹی کے ہر ایک پہلو پر قلم زنی کاموقع ملے۔ چارلس ڈکنس کی مشہور تصنیف ''پک وک'' پڑھیے اور اس پر کلام کیجیے ایسے ناولوں کے پلاٹ عموماً ظاہری ہوا کرتے ہیں، اس پر سرشار نے یہ کمال کیا ہے کہ آزاد کے قصہ کے ساتھ ساتھ شہزادہ ہمایوں فر اور بی اللہ رکھی کا قصہ بھی لکھا ہے تاکہ ناظر کا دل ایک ہی قصہ پڑھتے پڑھتے گھبرا نہ جائے۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً سوسائٹی کے عیوب دلکش پیرایہ میں دکھاتا گیا ہے۔ جن کا سلسلہ قصہ سے نہیں ملتا اور نہ مصنف کی یہ نیت تھی۔

ناظرین جانتے ہیں کہ ''فسانۂ آزاد'' اخبار کی صورت میں شائع ہواکرتا تھا اور اس سرخی سے کبھی کبھی ایسے مضامین بھی نکلا کرتے تھے جن کا تعلق قصہ سے نہیں ملتا۔ اور گو اس کتاب کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں مگر پروپرائٹروں نے کبھی اتنی تکلیف گوارانہ کی کہ ان مضامین کو''فسانۂ آزاد'' سے علاحدہ کردیں تاکہ قصہ مسلسل ہوجائے۔ اور اس کی روانی میں کوئی امر حارج نہ ہو۔ علاوہ ''فسانۂ آزاد'' کے سرشار کے تین ناول اور ہیں جو مقبولیت کا زیور پہن چکے ہیں یعنی ''کامنی'' ''سیر کہسار'' اور ''جام سرشار''۔ ان تینوں کتابوں میں پلاٹ کا تو وہی رنگ اور طرز ہے جو''فسانۂ آزاد'' کا۔ مگر کسی قدر زیادہ سلجھا ہوا، روز مرہ کے واقعات اسی ظریفانہ نفاست کے ساتھ لکھے گئے ہیں کہ ناظر صفحے کے صفحے پڑھتا جاتا ہے مگر سیر نہیں ہوتا۔ کوئی دوسرا شخص جس

نے وہی دماغ اور وہی دل نہ پایا ہو ایسے خشک معمولی واقعات میں ایسی دلچسپی اور رنگینی نہیں پیدا کرسکتا۔ جس طرح نظم میں سہل ممتنع کہنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ اسی طرح فسانہ نگاری میں بھی روکھے پھیکے مضامین میں حلاوت پیدا کرنا بعضوں ہی کا حصہ ہوتا ہے۔

حکیم برہم صاحب نے فرمایا ہے کہ سرشار کے ناولوں میں نہ کوئی غرض ہے نہ مبحث۔ جتنا ہی اس پر غور کرتے ہیں اتنا ہی پس و پیش ہوتا ہے کہ آیا اس پر ہنسیں یا سنجیدگی سے جواب دیں۔ سرشار نے ان معاشرتی امراض کے معالجے کا بیڑا اٹھایا تھا جن کے نتیجے میں پھنس کر سوسائٹی جاں بلب ہو رہی تھی۔ اور دیگر تجربہ کار اطبا کی طرح اس نے بھی تلخ، بدمزہ دوائیں قندو مصری میں گھول کر پلائیں۔ اہل بصیرت پر روشن ہے کہ قبائح کے انسداد کا کوئی آلہ ایسا کارگر اور باا‌ثر نہیں ہے جتنا کہ تضحیک کا تازیانہ اور سرشار نے بڑی بے رحمی سے ایسے تازیانے لگائے ہیں۔ مثلاً روسینو ایجنٹ اور سلار بخش جو تودۂ ظرافت بنائے گئے ہیں اس سے صرف وکلاء کی کثرت اور ان کی بے وقعتی کا خاکہ اڑانا مقصود ہے اور اس واقعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کور باطن حضرات بھولی بھالی عورتوں کو کیسی کیسی ظاہر داریوں سے دام فریب میں لایا کرتے ہیں۔ ڈکنس نے بھی سرجنٹ بزفز کے پردہ میں وکلاء کی خوب خبر لی ہے۔ مگر سرشار کی بیباک ظرافت ڈکنس کے متین طنز سے زیادہ موثر ہے۔

علیٰ ہٰذا بی اللہ رکھی کا اپنے کھوسٹ شوہر کے نام خطوط لکھوانا، ان خرنفس بو الہوس بوڑھوں پر حملہ ہے جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں مگر کم سن عورتوں سے شادی کرنے کے مشتاق۔ اسی طرح نواب کے دربار، گھر بار کا جو خاکہ کھینچا ہے اس سے وثیقہ خواروں کی سادہ لوحی اور ان کے مصاحبوں کی عیاری دکھانی مدّنظر ہے اور ''جام سرشار'' تو اوّل سے آخر تک شراب خوری کے نتائج بد سے غیرت دلانے پر وقف کر دیا گیاہے۔ ''کامنی'' ایک حیا پرور، وفادار، شوہر پرست بیوی کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ اور حسن آرا کا قومی جوش جو نفسانیت پر غالب آ گیا ہے۔ مس نائٹ انگیل کے لیے بھی باعث فخر ہوسکتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ سرشار کے جتنے ناول ہیں وہ انسان کے خیالات و حرکات نیک و بد وجذبات اعلیٰ و ادنیٰ کی سچی تصویریں ہیں جن پر ظرافت کا شوخ

رنگ نہایت خوش نما و نظر فریب معلوم ہوتا ہے۔ ایسا کوئی واقعہ نہیں جس کو سرشآر نے اپنی کتابوں میں بلاضرورت جگہ دی ہو۔ یہاں پر یہ کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات کسی واقعہ کا بیان کرنا بجائے خود ایک نتیجہ ہوتا ہے۔

مگر غالبًا حکیم صاحب ایسے نتیجوں کو نتیجہ نہ خیال فرمائیں گے۔ ان کے نزدیک اس ناول کے شیشے میں نتیجے، غرض اور مبحث بھرے ہوتے ہیں جس کے لیبل پر اس قسم کی کوئی عبارت لکھی ہوتی ہے:

''اس ناول میں پردے کے نتائج بد دکھائے گئے ہیں۔'' یا

''ناول میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نارضامندی کی شادیاں ہمیشہ برے انجام کو پہنچتی ہیں۔''یا

اس ناول میں صلیبی لڑائیوں کا جوش و خروش اور باہمی تنازع مذہبی کے خوفناک نتیجے بڑے خوبی سے دکھائے گئے ہیں۔'' وغیرہ وغیرہ

حضرت شرّر اور ان کے مقلدین عاشق حسین صاحب لکھنوی مرحوم اور مولوی محمد علی صاحب کے کل ناولوں کے ٹائٹل پیج پر اس قسم کی کوئی نہ کوئی عبارت ضرور ملتی ہے۔گویا ناول نہ ہوئے کوئی فلسفہ کی کتاب ہوئی جس میں کسی نہ کسی تھیوری کو قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس طرح نتیجہ نکالنا چاہیے۔ الیسپ کے قصوں کے لیے جائز قرار دیا جاسکے مگر اعلیٰ درجہ کے ناولوں کے لیے ہرگز شایاں نہیں ہے۔ لطف تو جب ہے کہ نتیجہ سربرآمد ہو اور ایک بے ساختہ پن کے ساتھ ناظرین کے دلوں میں کھپ جائے۔ کسی قصہ کے سر نامہ پر اس کا مقصد لکھا ہوا دیکھ کر ہم کو اس کے پڑھنے کی خواہش باقی نہیں رہ جاتی۔ انگریزی میں شاید ہی کوئی ناول ایسا ہوگا جس میں ایسے مذموم طریقہ سے نتیجے دکھائے گئے ہوں بلکہ آسکر براوننگ نے تو علانیہ کہہ دیا ہے کہ :

ادنیٰ ترین ناول وہ ہیں جن میں کوئی خاص مبحث رکھا جائے۔ اور اس نے بہت درست کہا ہے۔ کیفیات و جذبات انسانی و مناظر قدرت و دنیا کے کرشموں کی تصویر کھینچنا، بجائے خود ایک نتیجہ ہے۔ سائنس یا فلسفہ کے نکتے حل کرنے کے لیے ناول نویس بنایا ہی نہیں گیا ہے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ فلسفی کبھی ناول لکھ ہی نہیں سکتا۔

پلاٹ سے گزر کر جب ان کیرکٹروں کو لیجیے جو ناول کے اسٹیج پر ایکٹ کرتے

ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ اعلیٰ درجہ کے ناولوں میں خاص خاص کیرکٹروں کے عادات، اطوار و روش خیال میں ایک نہ ایک خصوصیت پائی جاتی ہے اور وہی خصوصیات مختلف موقعوں پر اور مختلف حالتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے ادنیٰ درجہ کے ناولوں میں یا تو کیرکٹر معمولی سیدھے سادے انسان ہوتے ہیں یا ان کی خصوصیات قومیت، سکونت، پیشہ یا چند فرسودہ اصولوں پر مبنی ہوتی ہیں۔ اور ایسے ہی ناول اردو میں کثرت سے نظر آتے ہیں۔

بنگالی جب آئے گا اپنے بودے پن کا ثبوت دے گا۔ مارواڑی ہمیشہ بخل اور خست کا پتلا بنایا جاتا ہے، لالہ صاحب بے چارے ہمیشہ اپنی خانہ ساز فارسی بولتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ راجپوت ہمیشہ اکھڑ اور تند مزاج ہوتا ہے۔ نند بھاوج میں آٹھوں پہر دانتا کلکل ہوا کرتی ہے۔ مولوی صاحب ہمیشہ اپنی جمعراتی کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں۔

مگر یہ ہرگز نہ خیال کرنا چاہیے کہ مستند ناولسٹ اس قسم کے کیرکٹروں سے کام نہیں لیا کرتے بلکہ واقعی اچھے ناولوں میں ہر دوقسم کے کیرکٹر موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً ڈکنس کے ''پک وک'' کو لے لیجیے۔ اس میں پک وک ونکل، سناڈ اگراس، ٹپ مین، وارڈ اور ویلر میں جو خصوصیات ہیں وہ سراسر امتزاجی ہیں۔ اور پرکر، برخز، ڈادسن اور اسٹگنس وغیرہ میں جو تفریق کی گئی ہے وہ کسی خاص پیشہ کی تضحیک کے لیے۔ علیٰ ہٰذا اور مثالیں بھی دی جاسکتی ہیں۔

چارلس ڈکنس کی طرح حضرت سرشارؔ نے بھی اعلیٰ اور ادنیٰ ہر دوقسم کے کیرکٹروں سے مدد لی۔ یہ بہت صحیح ہے کہ سب کیرکٹر لکھنوی ہیں۔ مگر جب اس نے سارے قصے لکھنؤ ہی کے لکھے تو کیرکٹر کیا لندن سے لاتا؟ ہاں یہ دیکھنا چاہیے کہ ان میں لکھنؤ کے بے فکروں کی امتزاجی خصوصیات کس نفاست سے دکھائی ہیں۔ مرزا ہمایوں فر بھی لکھنوی ہے اور آزاد بھی لکھنوی۔ مگر دونوں کے عادات میں بین فرق رکھا گیا ہے۔ اگر آزاد کی جگہ پر ہمایوں فر کو رکھ دیجیے، تو قصہ بالکل پلٹ جائے گا۔ نواب صاحب بھی لکھنوی ہیں، مگر ہمایوں فر سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ مرزا عسکری بھی لکھنوی ہیں مگر ہمایوں فر یا آزاد سے ان کو ملایئے تو مطلق میل نہیں کھاتے۔ اسی طرح حسن آرا، جہاں آرا،

سپہر آرا، گیتی آرا، بہار النسا سب لکھنو کی شریف زادیاں ہیں۔ مگر سبھوں کے مزاجوں میں نازک و دقیق خصوصیات موجود ہیں۔ بہار النساء کو بھول کر بھی حسن آرا کا قائم مقام نہیں سمجھ سکتے۔ اور نہ سپہر آرا کو حسن آرا سے ملا سکتے ہیں۔ اسی کو فن ناول کا کمال کہتے ہیں۔

ادنیٰ درجہ کے کیرکٹر بھی کثرت سے موجود ہیں، مولوی صاحب نے جنٹلمین و بی اللہ رکھی و بی عباسی، حکیم صاحب اور ریوینیو ایجنٹ وغیرہ وغیرہ ہزاروں اشخاص ہیں جو کسی فرقہ یا خاص پیشہ کا مضحکہ اڑانے کے لیے لائے گئے ہیں۔

مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی خیال رہے کہ سرشاؔر جب کبھی اپنے کیرکٹروں کو لکھنؤ سے باہر دور دراز کے مقامات پر لے گیا ہے تو وہاں ان کو غیر لکھنوی بنانے کا خوب لحاظ رکھا ہے۔ مس میڈا یا مس روز یا پولینڈ کی شہزادی لکھنو کی شریف زادیاں نہیں کہی جاسکتیں۔ علیقو پاشا یا قسطنطنیہ کے ہوٹل کا سوداگر لکھنؤ کے آوارہ مشرب اور بازاری بے فکرے نہیں ہیں ...... حکیم صاحب نے جو کمزوریاں سرشاؔر میں دکھائی تھیں وہ سب کی سب شرؔر کے کیرکٹروں میں پائی جاتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے کیرکٹروں کا انتخاب بڑی خوبی سے کیا۔ کسی کو روم سے بلایا، کسی کو عرب سے، کسی کو مصر سے، کسی کو فارس سے مگر نہ تو ان کی قومی خاصیتوں کو اور نہ امتزاجی خصوصیات کو کامیابی سے دکھا سکے۔ ان کے جتنے ہیرو ہیں وہ سب منچلے، غیور، خوشرو، بلند بالا اور مہذب ہیں۔ بس اگر حسن کی جگہ ملک العزیز چلا آوے تو وہ بھی اپنا حصہ اسی خوبی سے ادا کرے گا۔ اسی طرح ان کے اناث میں بھی یہی نقص موجود ہے۔ عذرا، ورجنا، انجلنا، فلورنڈا، سب کی سب باستثناء اس کے کہ غیر قوموں کی عورتیں بتائی گئی ہیں۔ اور ہر حالت میں بالکل ایک سی ہیں۔ ہم ایک کودوسری سے تمیز نہیں کرسکتے، اگر عذرا کا حصہ انجلنا کو دے دیا جائے تو بھی نفس قصہ پر کچھ اثر نہ ہوگا۔ یہ خامی شرؔر کے سب ناولوں میں پائی جاتی ہے۔ اور جیسا کہ ہم پہلے عرض کرچکے ہیں جس ناول میں ایسے معمولی کیرکٹر پائے جاتے ہیں اس کا شمار ادنیٰ درجہ کے ناولوں میں ہوتا ہے۔

سرشاؔر پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ اس کے سب کیرکٹر لکھنو ہی کے مرد و عورت ہیں۔ پھر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ ایک شہر تو کیا ایک محلّہ اور ایک کنبہ میں مختلف

عادات و اطوار کے اشخاص ہوسکتے ہیں اور ایک واقعی پرفن افسانہ نگار ان ہی کے روز مرّہ کے حالات میں طلسم کی سی تاثیر پیدا کرسکتا ہے۔ علاوہ بریں ایک خاص مقام کے مناظر طرز تمدن کا تفصیلی مرقع دکھانا بجائے اس کے کہ سارے زمانہ کے جغرافی نقشے دکھائے جاویں کہیں بہتر ہے۔

گر اس کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے کہ ناول نگاری کا کمال یہی نہیں ہے کہ کیرکٹروں میں صرف خصوصیات پیدا کردیے جائیں۔ یہ تو کچھ ایسامشکل کام نہیں، سچی صناعی تو اس میں ہے کہ کیرکٹروں میں جان ڈال دی جاوے ۔ ان کی زبان سے جو الفاظ نکلیں وہ خود بخود نکلیں۔ نکالے نہ جاویں، جو کام وہ کریں خود کریں، ان کے ہاتھ پاؤں مروڑ کر زبردستی ان سے کوئی کام نہ کرایا جاوے۔ اس معیار پر سرشار کے کیرکٹروں کو آزمایئے تو وہ عموماً کھرے نکلیں گے، ان میں وہی چلت پھرت ہے جو جیتے جاگتے آدمیوں میں ہوا کرتی ہے۔ ان میں وہ چھیڑ چھاڑ وہی ہنسی مذاق، وہی رمز و کنایے، وہی غل غپاڑے ہوتے ہیں جو ہم اپنی بے تکلفی کی مجلسوں میں کیا کرتے ہیں۔ ان کی ایک ایک بات سے ہم کو ہمدردی ہوجاتی ہے۔ وہ ہم کو ہنساتے ہیں، رلاتے ہیں، چڑھاتے ہیں، ستاتے ہیں، ان کے قہقہے کی آوازیں ہمارے کان میں آتی ہیں، ہمارے دل میں گدگدی پیدا ہوتی ہے اور ہم خود بخود کھلکھلا پڑتے ہیں۔ ان کے گریے کی دل ہلا دینے والی صدائیں ہم سنتے ہیں اور ہماری آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آتے ہیں۔ کون ایسا سنجیدہ مزاج شخص ہے جو بوا زعفران اور خواجہ بدیع کی لگاوٹ بازیوں پر ہنس نہ پڑے۔ ایسا کون سنگ دل ہوگا جو شہزادہ ہمایوں فر کے قتل کے وقت متاثر نہ ہوجائے، یا کامنی کو رنڈاپے کا بلاپ کرتے دیکھ کر رونے نہ لگے اور کیرکٹروں کو جانے دیجیے سرشار کا خوجی ہی ایک ایسا غیر فانی مخلوق ہے جو دنیا کی کسی زبان میں اس کے کمال شہرت کا سکہ بٹھانے کے لیے کافی ہے۔ ماشاء اللہ کیسا ہنستا بولتا آدمی ہے۔ صبح ہوئی، آپ اٹھے، افیون گھولی، حقہ کا دم لگایا، ریش پھٹکاری اور اپنے ڈنڈبل کو دیکھتے، اکڑتے، اپنے زعم میں مست چلے جا رہے ہیں، جوں ہی راستہ میں کسی ماہ پارہ نازنین کو خراماں خراماں آتے دیکھا وہیں آپ کی باچھیں کھل گئیں۔ ذرا اور اکڑ گئے اس نے جوکہیں آپ کی وضع قطع پر مسکرا دیا تو آپ ریشہ خطمی ہوگئے۔ گمان

ہوا، مجھ پر عاشق ہوگئیں۔ فوراً مونچھوں پر تاؤ دیا اور مسکرا کر تیکھی بانکی چتونوں سے آس پاس کے آدمیوں کو دیکھنے لگے کہ پاؤں میں ٹھوکر لگی اور چاروں شانے چت، یاروں نے قہقہہ لگایا، مگر کیا مجال کہ حضرت کے چہرہ پر ذرا بھی میل آنے پائے۔۔ گرد جھاڑی اٹھ کھڑے ہوئے اور بس ''اوگیدی'' کا نعرہ بلند کیا۔ قرولی میان سے نکل پڑی اور چاروں طرف ستھراؤ ہوگیا۔ سردھڑوں سے الگ نظر آنے لگے اور لاشیں پھڑکنے لگیں۔ شاباش ! خوجی تجھ کو خدا ہمیشہ زندہ سلامت رکھے۔ تیرے احسانوں سے ایک دنیا کا سرگراں بار ہے۔ تیری قرولی ایسے میٹھے زخم لگاتی ہے کہ کسی کا تیر نیم کش بھی ایسی پیاری خلش نہیں پیدا کرسکتا۔ اور تیرے تیور بدلنے میں وہ مزہ آتا ہے جو کسی معشوق طرحدار کے روٹھنے میں بھی نہیں آسکتا۔ بیشک تو ظرافت کا پتلا اور لطافت کی جان ہے۔

حضرت شؔرر نے بھی متعدد کیرکٹر ایجاد کیے اور ان کے ناول مقبول بھی ہوئے۔ مگر ان کے فرزندان معنوی میں سے کسی نے بھی ایسی شہرت حاصل نہ کی کہ اس کا نام ہر شخص کی زبان پر ہو؟ حق تو یہ ہے کہ ان کی طبیعت میں وہ زور و جدت جو غیر فانی کیرکٹروں کی خلاقی کے لیے درکار ہے موجود ہی نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب وہ کسی نئے کیرکٹر کی دعوت کرتے ہیں تو پہلے اس کا استقبال بڑی گرما گرمی سے کرتے ہیں اور ناظرین سے اس کا تعارف کراتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ حضرت ایسے ہیں اور ویسے ہیں ، آپ کی ذات بابرکات صوری ومعنوی محاسن کی کان ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر محض ان کی تمہیدوں سے کیرکٹر میں جاں نہیں پڑتی، کیونکہ وہ بولتے ہیں تو شؔرر کی زبان سے اور ان کی ایک ایک حرکت ان کی ایک ایک ادا، ان کی ایک ایک بات ثابت کرتی ہے کہ مصنف پردہ کی آڑ میں بیٹھا ہوا کیرکٹر کا پارٹ ادا کر رہا ہے، ہمارے دل میں خود بخود یہ خیال نہیں پیدا ہوتا کہ ہم چند بے تکلف دوستوں کی صحبت کا مزہ لے رہے ہیں۔ وہ روئیں ہم کو پروا نہیں۔ وہ ہنسیں ہم کو خبر نہیں ، ہم جانتے ہیں کہ وہ خیالی ہیں۔

شؔرر نے عرب، عجم، فارس، ترکستان، روس، روم، علی گڑھ، لکھنؤ اور خدا جانے کتنے مقامات کے سین دکھائے۔ مگر ان کے کسی ناول سے وہاں کے عوام کی طرز معاشرت و

طرز خیالات کا پتہ نہیں چلتا۔

سرشاؔر کے جادو کار قلم نے ہم کو گلی کوچوں، میلوں، ٹھیلوں اور باغ بغیچوں کی سیر ایسی خوبی سے کرادی کہ شاید ہم وہاں جاکر خود ان کو دیکھتے تو اتنا حظ نہ اٹھا سکتے۔ ہم کو قدم قدم پر لکھنؤ کے امیر، فقیر، گنوار، عیار، بھانڈ، ظریف، مسخرے، ترچھے، بانکے، شریف، وضیع، مہذب، غیر مہذب، بوڑھے، جوان، غرض ہر رنگ و ہر انداز کے آدمی نظر آتے ہیں۔ وہ ہنستے بولتے ہیں، دل لگی مذاق کرتے ہیں، ناچتے ہیں گاتے ہیں، مگر نہ اس لیے کہ ہم دیکھ رہے ہیں بلکہ یہ ان کا روز مرہ کا وطیرہ ہے۔ ہمارا جی چاہے تو ہم بھی دیکھ لیں۔

آسکر براؤننگ نے لکھا ہے کہ ناول نویس میں ان چار دماغی اوصاف کا موجود ہونا ناول کے لیے بمنزلۂ اربعہ عناصر ہے۔ (۱) پرزور قوت بیان، (۲) ظرافت یا بذلہ سنجی (۳) فلسفہ (۴) ڈرامہ یا کسی واقعے میں بے ساختگی سے تاثیر پیدا کردینا۔ اب سرشار کو دیکھیے تو وہ بجز فلسفہ کے اور تینوں اوصاف سے حصہ وافی و کافی رکھتا ہے اور حضرت شرؔر گر ان اوصاف میں سے کوئی رکھتے ہیں تو وہ ایک حد تک فلسفہ ہے۔ مگر وہ فلسفہ جو مذہب اور قوم سے تعلق رکھتا ہے اور دلوں میں تعصب پیدا کردینا جس کا خاص الخاص کام ہے۔

یہاں پر ایک ایسے امر کا تذکرہ کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو بعض اصحاب کو شاید ناگوار گزرے۔ سرشاؔر نے جتنی کتابیں لکھیں ان میں ایک بھی ایسی نہیں کہ جس کو مسلمان یا عیسائی یکساں دلچسپی سے نہ پڑھے۔ وہ سب مذہبی تعصبات سے بری ہیں۔ برعکس اس کے حضرت شرؔر کے ہیرو تو ہر حالت میں مسلمان ہوتے ہیں مگر ہیروئن کبھی ہندو ہوتی ہے اور کبھی عیسائی۔ حضرت شرر تو فلاسفر ہیں ان کے ذہن کو کم از کم اتنی رسائی ضرور ہونی چاہیے کہ وہ اس اشتعال کا اندازہ کرلے جو ہندو اور عیسائیوں کے دل میں ان کے بے عنوانی سے پیدا ہوتا ہے۔ کیا مسلمانوں میں اتنی حسین پر عصمت مستورات نہیں ہیں جن کو ہیروئن بننے کا فخر حاصل ہوسکے۔ غالبًا کوئی صاحب فرمائیں گے کہ بعض ہندو اصحاب نے بھی ہندو ہیرو سے مسلمان ہیروئن کا جوڑ ملایا ہے۔ مگر کیا ضرورت ہے کہ حضرت شرؔر بھی اسی غلطی کے مرتکب ہوں۔ ہم نے خود دیکھا ہے کہ

اکثر ہندو اصحاب منصور اور موہنا کو نفرت اور کراہت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اسی طرح جیسے کہ بعض مسلمان اصحاب درگیش نندنی کو دیکھتے ہیں۔ عشق و محبت کا یہ رویہ بغایت مذموم ہے۔ کمزور دماغ والے چاہے ان تعصبات کا شکار ہوجائیں۔ مگرایک مستند شخص کی ذات سے ان کا ظہور میں آنا نامناسب ہے۔ ہندوستان میں یہ عام رواج ہے کہ لڑکی کے ہم قوموں یا رشتہ داروں اور بھائی بندوں کی وقعت لڑکے والوں کے رشتہ داروں سے کم ہوا کرتی ہے اور عوام میں بھونڈے مذاق والے دوسروں کو اپنا خسرزادہ بنا کر خوش ہوتے ہیں۔ گویا شوہر کا طرفدار ہونا بیوی کے طرفداروں پر غالب ہونا ہے ...اکثر اوقات یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ لغو بکنے والے شہدے اپنی مست رنگی محبت کا بڑے فخر سے تذکرہ کیا کرتے ہیں۔ حضرت شرؔر انھیں ادنیٰ ترین جذبات کا شکار ہوگئے۔ بہت کم ایسے ہندو ہوں گے جو ان کے مداح ہوں حالانکہ سرشاؔر کے سامنے سرِتعظیم خم کرنے والوں میں اکثر مسلمان اصحاب ہیں۔ یہاں ان لوگوں کا ذکر نہیں ہے جو قومی اتحاد کی آڑ میں نفاق کا بیج بوتے ہیں۔

ناول نویس کے لیے رسیلی، رنگین، چلبلی، شوقین طبیعت کا ہونا ضروری ہے۔ بجائے اس کے حضرت شرؔر کو مجتہدوں کا جوش اور ملاؤں کا دل ملا ہے جو اس کام کے لیے موزوں نہیں۔ کسی آدمی کی قابلیت کی ایک یہ دلیل بھی ہے کہ وہ سمجھ جائے کہ میں کون ساکام بہترین طور پر کرسکتا ہوں سرشاؔر نے اپنے مافی الضمیر کو جانا، حضرت شرؔر نہ جان سکے۔

مگر سب سے بڑا ظلم جو حکیم برہم نے سرشاؔر پر کیا ہے وہ اس کے طرز تحریر پر ہے۔ ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اس موقع پر بڑی بے رحمی سے انصاف کا گلا گھونٹا گیا ہے۔ اب آج اس ذی کمال کے ان حقوق کو جھٹلانا جو زبان اردو پر قیامت تک رہیں گے سراسر تعصب و کوتاہ نظری کی دلیل ہے۔ کوئی کتنی ہی زبان درازیاں کرے مگر اس امر کو نہیں مٹا سکتا کہ سرشاؔر ہی وہ پہلا طباع ہے جس نے انگریزی طرز جدید کے فسانے اردو میں لکھنا شروع کیے۔ اس کے ساتھ ہی تقلید کے جوش میں یہاں تک نہیں بڑھا کہ اردو زبان اور اس کے انداز تحریر کو مسخ کردے۔ صرف طرز انگریزی لے لیا۔ یا یوں کہو کہ خاکہ انگریزی لیا اس پر ہندوستانی رنگ چڑھائے۔ انگریزی ناول کی کوئی خوبی ایسی نہیں جو سرشار کی تصانیف میں نہ پائی جائے۔

برہم صاحب کہتے ہیں کہ ''فسانہ آزاد'' اور'' فسانۂ عجائب'' کی عبارتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہم کو یقین نہیں آتا کہ حکیم صاحب کے قلم سے یہ ریمارک نکلا۔ جام سرشارؔ سے جو دو اقتباسات لیے گئے ہیں، وہ خود اس دعوے کی تردید کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کہیں کہیں پنڈت جی نے سرورؔ کے رنگ میں لکھا ہے مگر یہ ان کا رنگ خاص نہیں ہے بلکہ جہاں کہیں ترچھے بانکے چھیلوں کی گفتگو لکھی ہے وہاں عبارت کی رنگینی و قافیہ بندی پر زیادہ زور دیا ہے اور اس کی ان کو داد دینی چاہئے کہ بے فکروں سے متانت آمیز سنجیدہ گفتگو نہیں کرائی جو بالکل بے گانہ معلوم ہوتی۔ یہ بھی خیال رہے کہ گو ناول نویس کا خاص رنگ ایک ہی ہوتا ہے مگر چونکہ وہ ہر قماش و فیشن کے آدمیوں کو بناتا بگاڑتا رہتا ہے اس لیے اس کی زبان بھی ہر موقع پر رنگ بدلتی رہتی ہے۔ ''فسانہ آزاد'' میں جب کبھی حکیم صاحب تشریف لاتے ہیں تو پشتو میں باتیں کیا کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی ان کی زبان کو سرشار کی زبان بتلائے تو اس کا جواب بجز خموشی کے اور کیا ہوسکتا۔ حکیم صاحب نے جدت کے معنی سمجھنے میں غلطی کی۔ جدت اس کا نام نہیں کہ انگریزی کی غیرمانوس ترکیبوں، بندشوں، تشبیہوں اور استعاروں کے بے جوڑ، روکھے، غیر فصیح ترجمے کردئے جاویں جیسا کہ حضرت شررؔ نے کیا ہے۔ اسی کا نام تو نقالی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ بیچارے سرشارؔ پر نقالی کا الزام اس لیے لگایا ہے کہ وہ اپنے کیرکٹروں سے حسب حال باتیں کرواتا ہے۔ حکیم صاحب پر روشن ہو کہ اردو فسانہ نگاری میں اسی کو جدت کہتے ہیں۔

حضرت شررؔ جب کسی ناول کی ابتدا کرتے ہیں تو پہلے سینری کا بیان بڑی طوالت کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور بعد ازاں ہر باب کے ابتدا میں ایسے ہی بیانات ہوتے ہیں جو قصے کی روانی میں ہارج ہوتے ہیں اور عام پڑھنے والا گھبرا کر ان کو چھوڑ دیتا ہے۔ حکیم برہم صاحب نے بھی حال ہی میں ایک ناول لکھا ، اس میں شررؔ کی تقلید اس حد تک کی کہ نوے صفحے کے ناول میں پچیس صفحوں سے زائد محض سینریوں ہی پر وقف کردئے تھے۔ یہی نقص فن ہے۔ یہاں پر اتنا عرض کرنا اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ہیروئن کی تصویر جو حکیم صاحب نے ہمارے سامنے بڑے فخر سے پیش کی ہے، کانٹ چھانٹ کر چند لفظوں میں بیان کی جاسکتی ہے۔ یہ امر تسلیم کرلیا گیا ہے کہ مصنف

کسی کیرکٹر کے خط و خال، چہرہ مہرہ کا بیان کیسی ہی خوبی سے کیوں نہ کرے۔ مگر ناظرین کے سامنے جیسی تصویر کھینچنا چاہتا ہے ہرگز نہیں کھینچ سکتا۔ جتنے جدید انگریزی ناول ہیں ان میں جسمانی کمالات کا بیان چند لفظوں میں ختم ہوجاتا ہے اور دماغی اوصاف کا پہلے سے ظاہر کرنا تو اپنے آپ کو ناول نویسی کے اصولوں سے بے گانہ ثابت کرنا ہے۔

یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ حضرت سرشارؔ کے رنگ میں لکھنے کی بہتوں نے کوشش کی مگر کسی کو کامیابی نہ ہوئی جیسے آزادؔ کی تقلید محال ہے، اسی طرح سرشار کے بھی رنگ میں لکھنا مشکل ہے۔ حالانکہ بعض ناول نگاروں نے شررؔ سے پالا مار لیا ہے، چنانچہ ان کے ناولوں کی جتنی قدر ملک نے کی ہے، اس کی آدھی بھی شرر کے ناول کی نہیں ہوئی۔

''اردوئے معلیٰ''

۱۹۰۶ء

حال کی بعض کتابیں

آثار[1] اکبری۔ حال کی بعض کتابوں میں مولوی سعید احمد صاحب مارہروی کی تازہ تصنیف ''آثار اکبری'' یعنی تاریخ فتح پور سیکری سبھوں پر کمال آسانی سے فوقیت لے جاتی ہے۔ یہ ایسی بے بہا تصنیف ہے جیسی بہت عرصے سے اردو زبان میں دیکھنے میں نہیں آئی۔ جسے ایک، دو، تین بار، پڑھیے مگر پھر بھی پڑھنے کی ہوس باقی رہ جاتی ہے۔ کیا بہ لحاظ تحقیقات جامع، کیا بہ لحاظ دلچسپی و اہمیت واقعات اور کیا بہ لحاظ خوبی زبان یہ کتاب اردو کے بہترین تصانیف کے پہلو بہ پہلو رکھے جانے کے قابل ہے۔

مصنف نے اس کتاب کو نو ابواب میں منقسم کیا ہے۔ پہلے باب میں فتح پور سیکری کی آبادی، ترقی اور تنزل کی مجمل تاریخ لکھی گئی ہے۔ خاندان مغلیہ کے ساتھ اس کی بھی بنیاد پڑی۔ اس کے عروج کے ساتھ اس کا بھی عروج ہوا اور اس کے زوال کے ساتھ اس کی بھی تباہی آ گئی۔ وجہ بنیاد غالباً ناظرین کو معلوم ہوگی۔ جہانگیر نے اپنے تزک میں اس کا تذکرہ یوں لکھا ہے:

> ''جن دنوں والد بزرگوار کو فرزند کی بڑی آرزو تھی ایک پہاڑ میں سیکری علاقہ آگرہ کے پاس شیخ سلیم چشتی نام ایک فقیر صاحب حالت رہتے تھے کہ عمر کی بہت منزلیں طے کی ہوئی تھیں۔ ادھر کے لوگوں کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ میرے والد کہ فقرا کے نیا زمند تھے ان کے پاس گئے ایک دن اثناء توجہ اور بیخودی کے عالم میں ان سے پوچھا حضرت میرے کے فرزند ہوں گے؟ فرمایا کہ تمھیں خدا تین فرزند دے گا۔ والد نے کہا میں نے منت مانی کہ پہلے فرزند کو آپ کے دامن تربیت و توجہ میں ڈالوں گا۔

---

[1] آثار اکبری یعنی تاریخ فتح پور سیکری

شیخ کی زبان سے نکلا کہ مبارک باشد! میں بھی اسے ہم نام بناؤں گا۔"
تھوڑے ہی دنوں میں شیخ کی پیشین گوئی صادق آئی۔ شہزادہ جہانگیر سیکری ہی میں پیدا ہوئے۔ بادشاہ خود وہاں گئے۔ شیخ کے واسطے عالی شان خانقاہ بنوانی شروع کی اور اپنے بود وباش کے واسطے بھی رنگ محل کے تعمیر ہونے کا حکم دیا۔ پھر کیا تھا، جسے پی چاہے وہی سہاگن، شہر کی رونق روز افزوں بڑھنے لگی۔ اراکین دربار نے اپنے اپنے محلات بنوانے شروع کیے۔ ابو الفضل اور فیضی، بیربر، مان سنگھ، حکیم ہمام اور دیگر رؤسا نے مکانات تعمیر کرائے۔ ہر سال یہاں جشن نوروزی ہونے لگا جس کا تذکرہ مصنف نے بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ دیوان عام و خاص کے گردا گرد ۲۰ ایوان بن گئے۔ اس قصبہ کی رونق اور آبادی تھوڑے ہی دنوں میں یہاں تک بڑھی کہ شرقاً و غرباً ۷رمیل تک پھیل گیا اور آگرہ سے نکلتے ہی اس کے محلے نظر آنے لگے۔ دونوں شہروں کا درمیانی فاصلہ بالکل آباد ہوگیا۔ یہ رونق اور گہما گہمی شاہجہاں کے عہد تک کم و بیش قائم رہی۔ مگر جب خاندان مغلیہ کا ستارہ زوال میں آیا۔ سلطنت میں ضعف پیدا ہوا اور شاہان مغلیہ کے تخت کے لالے پڑگئے تو فتح پور کی خبر کون لیتا۔ چورامن اور سورج مل جاٹ کی لوٹ کھسوٹ شروع ہوئی۔ محلے کے محلے، کوچے کے کوچے ویران ہوگئے۔ اکثر عمارتیں دفینہ کی تلاش میں کھود ڈالی گئیں۔ قیمتی پتھر دیگ، کھمبھیر اور بھرت پور پہنچا دیئے گئے۔ آخر جو کچھ رہی سہی آبادی تھی اس کا بھی بڑا حصہ ۵۷ء کے خوفناک غدر میں تباہ ہوگیا۔"

اس کی موجودہ حالت کا مصنف نے جو نقشہ کھینچا ہے نہایت عبرتناک ہے۔
اب یہ حال ہے کہ آگرہ دروازہ میں گھستے ہی کھنڈر نظر آنا شروع ہوتے ہیں۔ کسی قصر کے دیواروں کے آثار باقی ہیں۔ کسی کا صرف دروازہ ہی کھڑا رہ گیا، کسی جگہ پتھرا اور چونے کا انبار لگا ہوا ہے، کسی مکان کا حمام باقی رہ گیا ہے، غرضکہ جس کا جو کچھ حصہ باقی رہ گیا ہے وہ ایک عبرت کدہ ہے کہ رستہ چلنے والے مسافروں اور آثار قدیمہ کے عاشقوں کو آٹھ

آٹھ آنسو رلاتا ہے اور سرائے فانی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔فصیل کے اندر اور باہر جدھر دیکھو کھنڈر ہی کھنڈر نظر آتے ہیں بڑی بڑی پرفضا بارہ دری اور عالی شان محلوں میں انسان کے بجائے زاغ و زغن کا بسیرا اور بوم کا پہرا ہے۔''

باقی آٹھ ابواب میں جنوب، شمال، مشرق، مغرب عمارات ملحقہ بالائے کوہ اور گرد ونواح کی عمارات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کے پڑھنے سے واضح ہوتا ہے کہ جس وقت یہ شہر اپنی پوری رونق پر ہوگا اس وقت واقعی فردوس بریں کا نمونہ ہوگا۔ خوشنما باغات، پرفضا میدانوں اور خوبصورت باولیوں، تالابوں اور نہروں کے بار بار تذکرے آتے ہیں جس سے اس زمانہ کے مذاق کی درستی اور صفائی کا ثبوت ملتا ہے۔ہر عمارت کا طول و عرض رفعت نقاشی گلکاری اور دیگر محاسن کا بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ بلکہ بعض اوقات ان کے تعمیر کی تاریخ، کاریگروں کے نام اور صرفہ تعمیر بھی لکھ دیا گیا ہے۔ گو یہ خوبی باالالتزام نہیں پائی جاتی۔

اردو لٹریچر میں ''آثار الصنادید'' کے بعد کوئی ایسی کتاب نہیں شائع ہوئی جس میں تعمیرات کے مختلف حصوں کے ذکر اس تشریح اور خوبی سے کئے گئے ہوں جیسے کہ تصنیف زیر تنقید میں۔ عمارتوں کے متعلق ہماری بے علمی اور کم توجہی یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہوں جو بلا تکلف عمارت کی مختلف حصوں کے نام بھی بتلاسکیں۔ مصنف نے یہ تذکرے بے مزہ اور روکھی پھیکی زبان میں نہیں کیے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات زبان ایسی پرلطف ہے کہ مزہ لے لے کر پڑھنے کے قابل ہے۔ درگاہ شریف کے بلند درازہ کی یوں تعریف کی گئی ہے۔

''بلند درازے کی بلندی ۱۲۹ فٹ ہے۔ ناظرین خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ پہاڑ کی بلند چوٹی پر اتنا بلند دروازہ کیسا شاندار عجیب و غریب اور خوشنما منظر پیدا کرتا ہوگا باہر سے دیکھتے تو اس کے پیش طاق اور ارد گرد کے دروں کی ساخت ان کے درمیان کی نفیس سنگ مرمری پچی کاری، خوب صورت بیلین، طرح طرح کے نقش و نگار، خوشنما منارے، گلدستے، کتبے کے بڑے بڑے حروف، درمیان کی ہوادار سہ نشین، اوپر کی پیاری پیاری

برجیاں محو حیرت کرتی ہیں۔ اندر کی جانب سے ملاحظہ کیجیے تو ہر منزل کے برج و برجیاں، کنگورے منارے، گلدستے ایک دوسرے سے ملے ہوئے خوبصورتی اور زیبائی کا عجیب و غریب منظر پیدا کر کے نقش دیوار بناتے ہیں اوپر کا ہوا دار پرفضا مقام جہاں سے نہ صرف کل شہر بلکہ کوسوں تک کا منظر بخوبی نظر آتا ہے۔ ایسا دلکش اور دلچسپ ہے کہ اس کی اصلی حالت کا لفظوں میں فوٹو اتارنا ناممکن ہے۔''

علیٰ ہٰذا خواب گاہ خاص کے بالا خانہ کی جو کیفیت دکھائی ہے بے نظیر ہے۔:

''محل خاص کی جنوبی عمارت کی چھت پر وہ چھوٹا سا خوبصورت اور طلسماتی کمرہ واقع ہے جو خواب گاہ کے نام سے موسوم ہے۔ چونکہ یہ خاص پادشاہ کی خواب گاہ کے واسطے بنایا گیا تھا اس وجہ سے باکمال صناعوں اور عالی دماغ مصوروں نے اس کے خوشنما بنانے میں کوئی ایسی تدبیر نہیں اٹھا رکھی تھی جو انسان کے دست قدرت سے باہر نہ ہو۔ رنگ سازی کے اعلیٰ درجے کے کاریگروں نے اندر، باہر، نیچے، اوپر تمام در و دیوار کو رنگا رنگ کی شگوفہ کاری اور طرح طرح کی گل کاری سے مزین کر کے نمونہ بہشت بریں بنا دیا تھا۔ مصوروں نے اپنے کمالات مصوری کا کمال دکھا کر طرح طرح کی تصویروں اور مختلف منظروں کے نقشوں سے تمام کمرہ کو نگار خانہ چین بنا کر عالم طلسمات کو مات کیا تھا۔ جواہر رقم اور مرصع قلم کتبہ نویسوں نے مختلف گلکاریوں کے بیچ میں اس نزاکت اور صفائی سے کتبوں کو لکھا تھا کہ جن کے نظارہ سے آنکھوں میں نور پیدا ہوا تھا۔ غرضکہ اس مقام پر ہر قسم کے صناعان باکمال نے اپنی اپنی صناعیوں کو درجہ کمال پر پہنچا دیا تھا۔ مگر افسوس اور سخت افسوس ہے کہ یہ بے نظیر کمرہ اس زیب و زینت اور آرائش و زیبائش کے بجائے اب مرقعۂ عبرت اور مقام حسرت بن رہا ہے۔ اس کے تمام طلائی نقش و نگار اور گلکاریاں نہ معلوم کن ظالم ہاتھوں سے محو ہوگئیں۔ یہاں تک کہ کوئی زر پرست دروازوں کے کیواڑ تک اتار لے گیا۔ افسوس!''

گو کسی قدر مبالغہ آمیز تذکرہ ہے۔ مگر کیسا چست اور پاکیزہ ! افسوس کہ ان باکمال مصوروں کے اب مطلق حالات نہیں ملتے۔ ان کی صناعی کے نمونے بھی جو ان کے تازہ یادگار ہوتے رفتہ رفتہ دست برو روزگار سے پامال ہوئے جاتے ہیں۔ ہاں پرانے تذکروں میں ان کے نام البتہ ملتے ہیں۔ جن میں خاص خاص یہ ہیں۔ میر سید علی تبریزی، خواجہ عبدالصمد شیریں رقم، وسونتھ کہار، بساون، کیشو، لال، مکند، مسکین، فرخ، مادھو، جگن، مہیش، کھیم کرن، نارا، سانولا، ہرپنس، ان سب کا سردار استاد بہزاد تھا۔ جو پہلے اسماعیل شاہ صفوی والی ایران کے دربار کا مصور تھا۔ پھر اکبری دربار میں حاضر ہوکر منصب اعلیٰ پر پہنچا۔

مریم کے زنانہ باغ کا جو تذکرہ کیا گیا ہے وہ کتاب کے بہترین حصوں میں ہے:

''اکبری عہد میں اس باغ کے اندر گلزار ارم کا جلوہ نظر آتا تھا۔ پختہ سنگین رو شوپنر ہفت رنگ کے پھول عطر پاشی کرتے تھے۔ خیابانوں میں ہر قسم کے نایاب، نفیس اور لذیذ میوے شاخوں میں جھوما کرتے تھے۔ ہمیشہ صاف و شفاف پانی مودبانہ خرام سے خوشنما نالیوں میں گلگشت کرتا رہتا تھا۔ جس وقت موسم بہار میں خاتونان عفت مآب اپنے اپنے عشرت کدہ سے نکل کر باغ کی روشوں پر خراماں خراماں سیر کرتی پھرتی ہوں گی اس وقت قسم قسم کے پھولوں کی مہک سنبل کا بال بکھیرنا، ریحان کا چشم دلفریب سے تکنا، معطر ہوا کا چلنا، مچھلی تال میں رنگ رنگ کی مچھلیوں کا تیرنا، طائران خوش الحان کا نغمہ سرائی کرنا، فرش زمرد یں کا لہلہانا، کیسا عجیب و غریب اور دلچسپ منظر پیدا کرتا ہوگا۔''

ایسے موتی اس کتاب میں بڑی فیاضی سے لٹائے گئے ہیں مگر راجہ بیربر کے محل پر مصنف نے پھول برسائے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''جس طرح نورتن اکبری میں قربت اور مصاحبت کی حیثیت سے کوئی عالی جاہ امیر اور جلیل القدر سردار بیربل کے رتبے کو نہیں پہنچا اسی طرح قرب مکانی بدیع المثال صناعی، اور خوبصورتی میں کسی امیر کا قصر عالی اس بے

نظیر مکان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔" فرگسن صاحب اپنی "عمارات مشرق" میں فرماتے ہیں کہ "بیربل اور ترکی سلطانہ کا مکان سب سے زیادہ بیش قیمت اور سب سے خوبصورت اور تیر اکبر کی تمام عمارتوں میں زیادہ صنعت والی عمارتیں ہیں۔ یہ اگرچہ مختصر ضرور ہیں لیکن کہیں ایسے عمدہ نقش و نگار اور تصاویر دیکھنا ناممکن ہے کہ جہاں کوئی جگہ ایسی نہیں کہ جہاں کچھ نقش و نگار موجود نہ ہوں۔یا بھدے طور سے کھینچے ہوں۔"

ایک خاص صفت اس کتاب میں یہ ہے کہ امراء کے مکانات کے ساتھ ان کے سوانحی حالات کا بھی التزام رکھا گیاہے۔ شیخ فیضی، ابوالفضل، بیربر، ٹوڈرمل، حکیم شیرازی اور دیگر بزرگوں کے مختلف حالات قلم بند کئے گئے ہیں جن کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ "دربار اکبری" کا چربہ اتارا ہے۔

ان تذکروں میں کہیں کہیں پرلطف چھیڑ چھاڑ کی چاشنی بھی دی گئی ہے۔جودھا بائی کے تذکرے میں فرماتے ہیں:

"ایک رات جبکہ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی نور جہاں بیگم لباس سفید زیب تن کئے ہوئے جہانگیر کے پاس بیٹھی تھیں۔ عطر جہانگیری کی خوشبودار لپٹوں سے جو تمام درودیوار اور کپڑوں پر چھڑکا ہوا تھا بادشاہ اور بیگم دونوں کا دماغ معطر ہو رہا تھا۔ بادشاہ نے اس حالت میں جودھ بائی کو بھی یاد فرمایا۔ پرستاریں دوڑیں۔ اور تھوڑی ہی دیر میں یہ بھی سرخ لباس زیب بدن کرکے آموجود ہوئیں۔ اور بادشاہ کے برابر بیٹھ گئیں۔ بادشاہ ان کی طرف متوجہ ہوئے، نورجہاں بیگم کو رشک پیدا ہوا، بادشاہ کی طرف دیکھ کر بولیں کہ آخر کو جودھ بائی زمیندار کی بیٹی ہے۔ اس وقت کہ فوارہ نور کشادہ ہیں اور فرش نسرین و نسترن بچھا ہوا ہے اور جلوہ مہتاب ہویدا ہے۔ ایسے عالم میں لباس سرخ کیا مناسبت رکھتا ہے۔ جودھ بائی نے فوراً جواب دیا کہ میرا سہاگ قائم ہے اس وجہ سے میں نے سرخ لباس پہنا ہے۔ تمھارا سہاگ اٹھ چکا ہے اس سوگ میں تم نے سفید لباس پہنا ہے، اور یہ دوہا پڑھا۔

جاروں نارتاس کا ہیا
ایک چھوڑ جن دوجا کیا

الغرض یہ کتاب فضائل اور محاسن سے پڑھے۔ ہم اس سے اور زیادہ اقتباس کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ شائقین خود منگائیں۔ منصف کے عرق ریزیوں کی داد دیں اور دوسرے تصانیف کے لیے حوصلہ بڑھائیں۔ کسی شائق علم کا کتب خانہ اس کتاب سے خالی نہ رہنا چاہیے۔ افسوس ہے کہ اردو داں پبلک کی ناقدریوں نے مصنف کو یہ ہمت نہیں دلائی کہ وہ اس کتاب کو عمارات کی عکسی تصاویر سے مزین کرسکتے۔ جس سے اس کی وقعت اور بھی دوبالا ہوجاتی۔ اس نفیس لکھائی اور چھپائی کے ساتھ قلمی نقشوں کا جوڑ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

سگھڑ بیٹی

جب سے تعلیم نسواں کا مسئلہ چھڑ گیا ہے اور گورنمنٹ نے اس سے عملی ہمدردی کا اظہار کرنا شروع کیا ہے لڑکیوں کی تعلیمی ضروریات رفع کرنے کے لیے خوب کوششیں کی جا رہی ہیں۔ آخری بار جدید کتب پر ریویو کرتے ہوئے ''تعلیم نسواں'' کا ذکر کیا گیا تھا جو پانچ جلدوں میں ختم ہوئی تھی۔ وہ تصنیف کنواری اور بیاہی سب کے لیے یکساں مفید تھی۔ مگر ''سگھڑ بیٹی'' جو محمدی بیگم صاحبہ کی دلچسپ تصنیف ہے صرف کمسن لڑکیوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس میں مصنفہ نے سلیس اور سادی زبان میں لڑکیوں کو مختلف امور پر نصیحتیں کی ہیں۔ کفایت شعاری کا تذکرہ کرتے ہوئے ''کوڑیوں سے گھر چلایا'' نام کی جو کہانی لکھی ہے وہ کم عمر لڑکیوں کے لیے بہت دلچسپ ثابت ہوگی۔ اس کے علاوہ کپڑے لتے ان کے استعمال، چٹھی پتر، کھیل کود، پڑھنے لکھنے کے متعلق سبق آموز باتیں لکھی ہیں یہ ایسی تصنیف ہے جو کسی لڑکی کے ہاتھ میں شوق سے رکھی جاسکتی ہے۔ اور چونکہ محمدی بیگم صاحبہ بہت سی کتابیں اس قسم کی لکھ چکی ہیں ان کی نصیحت کا پیرایہ بہت موزوں اور سادہ ہے۔

کتاب نسواں

اگر ''سگھڑ بیٹی'' کمسن لڑکیوں کے لیے لکھی گئی ہے تو مولوی غیاث الدین کی تازہ تصنیف ''کتاب نسواں'' خاص طور پر جوان اور بیاہی عورتوں کے لیے مقصود ہے۔ مصنف

نے اس کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں اخلاقی امور پر نصیحت آمیز باتیں لکھی ہیں جو سب لڑکیوں کے لیے یکساں مفید ہیں۔ مگر ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جھوٹ سچ، پردہ، انتظام خورد و نوش وغیرہ جیسے مضامین کے ساتھ کتاب کے ابتدائی حصہ میں ''گورنمنٹ کے حقوق'' یا ''ہمارے حقوق'' جیسے مسائل پر وعظ کہنے کی ضرورت کیوں لاحق آئی۔ یہ مسئلے نہ اخلاقی ہیں نہ ادبی۔ ایسے مختلف مضامین کو یکجا کردینا کچکول میں جائز ہوتو ہو مگر ایسی تعلیمی تصنیف میں ہرگز جائز نہیں۔ ایسی باتیں علم جغرافیہ کا جزو ہیں اور ان کے لکھنے کی جگہ آخری باب ہے جہاں دنیا کے براعظموں پر مصنف نے بڑی تیزی سے سفر کیا ہے۔ مگر اس میں بھی بجائے اس کے کہ گورنمنٹ اور رعایا، ان کے باہمی تعلقات، ان کے باہمی ضروریات وغیرہ مسائل پر عام بحث کی جائے مصنف نے سرکار انگریزی کے ان احسانات کی بڑائی گائی ہے جس سے ہندوستانیوں کا سرگراں بار ہے۔ اسی حصے میں اعداد و حساب، امور خانہ داری، کھانا پکانے کی ترکیب اور مختلف باتیں درج ہیں۔ حصہ دوم میں مصنف نے عورتوں کو وہ باتیں بتائی ہیں جن کی ان کو حفظ صحت کے لیے سخت ضرورت ہوتی ہے۔ ان میں سے بیشتر مفید ہیں۔ مگر نامہذب الفاظ اس کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں کہ کوئی سطر ان سے خالی نہیں۔ بہترہوتا اگر کتاب کے کئی حصے ہوتے۔ یا کم از کم جو باتیں بالخصوص عورتوں کے جاننے کی ہوتیں وہ علاحدہ کتاب میں بتلائی جاتیں اس حیثیت میں یہ کتاب ہرگز اس قابل نہیں کہ کسی کنواری لڑکی کے ہاتھ میں رکھی جائے۔

نوجوانوں کا رہنما

جس قدر نوجوان مستورات کو نیک صلاح و مشورہ کی ضرورت ہے شایدنوجوان مردوں کے لیے اس سے بھی زیادہ رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کے تخریب اخلاق کے موقعے بدرجہا زیادہ ہیں۔ اس ضرورت کو رفع کرنے کے لیے پنجاب، رلیجس بک سوسائٹی نے اس نام کا ایک عمدہ ترجمہ شائع کیا ہے۔ اصل کتاب امریکہ کے ایک مشہور ڈاکٹر کی تصنیف ہے۔ مسٹر ہر سرن نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ ترجمہ میں اصل کامزہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ غیر مانوس محاورات اور جملے بہت کم ہیں۔ اور نفس مطلب اول سے آخر تک دلچسپیوں سے مامور ہے۔ کون نہیں جانتا کہ

ہماری قوم کے ہزارہا نوجوان اپنی ناتجربہ کاریوں کا خمیازہ اٹھا رہے ہیں۔ اور کتنے ہی نفس پرستی کے غار میں ایسے اوندھے منہ گرے ہیں کہ اس زندگی میں ابھرنا محال ہے۔ عوام ملک کی پست ہمتی کو تہ قدمی اور جسمانی قویٰ کا ضعف انھیں بے اعتدالیوں کا نتیجہ ہے جس کے لوگ اپنی ناتجربہ کاری سے مرتکب ہوتے ہیں۔ مصنف نے بڑی شرح و بسط کے ساتھ ان بیماریوں ان کی علامتوں ان کے مہلک نتیجوں کا تذکرہ کیا ہے جن کا نام لینا مذاق متین کے خلاف ہے۔ ان سے بچنے کے لیے مصنف نے قابل عمل ہدایتیں کی ہیں۔ اگر نوجوان طبقہ جس کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے اس کو پڑھے گا اور اس کی ہدایتوں پر عمل کرے گا تو بیشک بہت سی برائیوں سے محفوظ رہے گا ''بیوی کا انتخاب''نکاح اور غرض نکاح'' وغیرہ مسائل پر مصنف نے بہت تجربہ کی باتیں سکھائی ہیں۔ کتاب کے آخری حصے میں تہذیب عام اور درستی مذاق کے متعلق بھی سبق آموز نصیحتیں کی گئی ہیں مگر ہم کو مصنف کے اس امر سے اتفاق نہیں ہے کہ ناولوں کا پڑھنا سراسر مضر ہے۔ناولوں میں اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ اچھے ناول پڑھنے کی ممانعت کرنا گویا انسان کو ایک بڑی نعمت زندگی سے محروم کرنا ہے۔ ہاں برے اور مخرب اخلاق ناول ہرگز نہ پڑھنے چاہیے۔ اور ناول ہی پر کیا موقوف ہے ۔نظم، تاریخ، تذکرے، سفر نامے، اخبارات سبھی مخرب اخلاق ہو سکتے ہیں اگر ان میں ادنیٰ جذبات کے مشتعل کرنے والی باتیں لکھی جائیں۔ ایسی کتابوں سے نوجوان کو ضرور محترز رہنا چاہیے۔ بعض رؤسا اپنی خواب گاہوں مین ننگی تصویریں لٹکایا کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر مذاق کو گندہ کرنے والی اور طبیعت کو بگاڑنے والی شاید کوئی دوسری بات نہ ہوگی۔

بچوں کی تربیت

ایک ایسے وقت میں جبکہ تعلیم کا مسئلہ اہم ترین مسائل زندگی ہو رہا ہے۔ اس کتاب کا شائع ہونا مغتنمات سے ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ اس کے مصنف لالہ گوکل چند ایم۔اے۔ جیسے تجربہ کار پختہ معزز شخص ہیں۔ بچوں کی تعلیم ہر مہذب ملک میں مفت دی جاتی ہے۔ اور اس کا انصرام و انتظام ملک کے بہترین اذہان کی کوششوں کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ تو چھڑا اور گورنمنٹ نے اس سے سچی ہمدردی جتائی مگر تعلیم اطفال کا مسئلہ ہنوز معرض غفلت میں پڑا ہوا ہے۔ ابھی تک

بجز اس کے کہ دیہاتی مدرسوں کے لیے سب ڈپٹی انسپکٹروں کی تعداد بڑھادی گئی ہے۔ اس معاملہ میں اور زیادہ سرگرمی نہیں نظر آتی۔ اور حق تو یہ ہے کہ گورنمنٹ کی کوششیں تنہا کبھی اس کار عظیم کو پورا کر ہی نہیں سکتیں۔ تاوقتیکہ والدین اس میں سرگرمی، مستعدی اور باخبری سے کام نہ لیں۔ ہم کو یقین ہے کہ یہ چھوٹی سی کتاب اس کام میں والدین کا ہاتھ بٹا سکتی ہے بشرطیکہ وہ اس سے مدد لینا چاہیں مگر رونا تو اس کا ہے کہ لوگ آرائش اور تکلفات کی باتوں میں تو تجربہ کار، مشاق اور پرفن لوگوں کی تلاش کرتے ہیں مگر بچوں کی تربیت جیسے اہم معاملے میں ایسی غفلت سے کام لیتے ہیں جس کو گناہ سے موسوم کرسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پرورش اور پرداخت کے بابت بہت سے غلط خیال پھیل گئے ہیں۔ مثلاً جب بچہ ذرا بھی رونے لگتا ہے تو ماں اس کو گود میں لے کرزور زور سے لوریاں سنانے لگتی ہے۔ مصنف صاحب کی صلاح ہے کہ جس کمرہ میں بچہ لیٹا ہو وہاں بالکل شور نہ ہو۔ خاص کہ جب وہ سوتا ہو تو اس وقت بالکل خموشی چاہیے۔ بعض والدین فرط محبت سے اپنے سوتے بچوں سے باتیں کرتے رہتے ہیں یہ مضر ہے۔ اس سے بچہ کی قوت سامعہ پر برا اثر پڑتا ہے۔

ایک عام خرابی جولڑکوں کی تربیت میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم ان کو اپنی ہی غلطی سے نافرماں برداری اور ضد سکھاتے ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ بچہ سے جو بات کہی جائے وہ زور دے کر ان سے کہی جائے کیونکہ ”قدرت نے بچوں کو ایسی طاقت دی ہے کہ وہ فوراً تاڑ جاتے ہیں کہ جو بات ان سے کہی گئی ہے یوں ہی کہی گئی ہے یا سنجیدگی یا متانت سے۔ اگر ماں بچہ کو کوئی شرارت کرتے ہوئے دیکھ کر نظر ادھر کرلیتی ہے یا مسکرا پڑتی ہے تو بچہ سمجھ جاتا ہے کہ مسخری ہے“ علی ہذا بچوں کو بھوت، کاٹو وغیرہ چیزوں سے ڈرانے سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں مصنف نے ان کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ بعض اوقات بچے روٹھ جاتے ہیں۔ اس وقت مار پیٹ گھُڑکی دھمکی بالکل بیکار ہوتی ہے۔ مصنف کی صلاح ہے کہ ایسی حالتوں میں بچہ کی طرف توجہ نہ کرنا چاہئے۔ اس کی طبیعت ایسی نرم ہوتی ہے کہ ذر اسی بے توجہی پر ہنسنے کھیلنے لگتا ہے۔ مگر بڑے ہوشیار لڑکوں کے ساتھ یہ برتاؤ کرنا مضر ہے کیوں کہ عدم توجہی سے ان کو اور غصہ آنے کا ڈر ہے۔

ہمارے یہاں بچوں کی تربیت میں حواس لطیفہ کی تربیت کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا لازم ہے کہ بچوں کے سامنے اعلیٰ اعلیٰ تصویریں پیش کرکے انھیں خوش مذاقی کی بنیاد ڈالنی چاہیے۔ علی ہٰذ القیاس اس کے سامنے بھدی آواز میں گانا غیر مناسب ہے۔

ہمارے یہاں ہر شخص اپنے لڑکے کو یونیوسٹی تعلیم دلوانا چاہتا ہے۔ اس کی قدرتی مناسبت کے تحقیق کرنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی جاتی۔ جس کا نتیجہ مضر یہ ہے کہ بہت سے لڑکے جو دوسرے صیغہ تعلیم میں ترقی کرتے وہ اپنی طبیعت کے خلاف کتابیں رٹنے پر مجبور کیے جاتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ رجحانات طبعی کا اندازہ کیوں کر کیا جائے۔ بچپن میں قویٰ بہت ضعیف ہوتے ہیں اور کسی خاص میلان کا اظہار نہیں ہوتا۔ لہٰذا ۱۳ برس کے سن تک لازم ہے کہ بچہ کو اسکول کی معمولی تعلیم دی جائے۔ اس کے بعد جس طرف اس کی توجہ دیکھیں اسی ڈھرے پر لگادیں۔ اگر مصنف نے چند لفظوں میں کنڈر گارٹن طریقہ تعلیم کا تذکرہ دیا ہوتا تو کتاب اور بھی مفید ہوجاتی۔ قدیم اسپارٹا، یا قدیم ہندوستان کے طرز تربیت کا تذکرہ کرنے سے جواب بالکل متروک اور گئی گذری باتیں ہوگئی ہیں۔ کنڈر گارٹن کا تذکرہ بدرجہا زیادہ فائدہ بخش ہوتا۔

مسئلہ تعلیم پر چند خیالات

ہمارے قابل فخر ہم قوم لالہ لاجپت رائے صاحب کی تعلیمی معاملات سے دلچسپی کا بارہا اظہار ہوچکا ہے۔ حال میں آپ نے اس نام سے ایک پمفلٹ شائع کیا ہے۔ جس میں ہماری موجودہ تعلیمی مسائل پر بڑی تحقیق اور خوبی سے بحث کی گئی ہے۔ اور دعوت دی گئی ہے کہ جو دوسرے اصحاب اس مسئلے سے ہمدردی رکھتے ہوں وہ بھی اس مباحثہ میں شریک ہوں اور اپنے تجربات و خیالات کا اظہار کریں تاکہ تبادلہ خیالات سے سیدھے طریق پر پہنچ جائیں۔ لالہ صاحب نے دوران مضمون میں ہندوستانی طرز تعلیم کا یورپی طریقہ تعلیم سے موازنہ کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم کشاکش زندگی کے دوڑ میں دوسروں سے کس قدر پیچھے ہیں۔ ہمارے یہاں کی تعلیم ابھی تک غیر عملی ہے اور اس کی تہذیب آموز پہلو پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں تعلیم کا معیار بالکل بدل گیا ہے، وہاں تعلیم ''ایک سرمایہ ہے جس کے ذریعے سے تعلیم پایا ہوا لڑکایا لڑکی قوم اور ملک کی دولت بڑھاتے ہیں'' یعنی ہماری تعلیم ذہنی ہے

اور ان کی ماڈی۔

ہندوستان میں جبری تعلیم کا تو کیا ذکر ہر چار گاؤں میں ایک گاؤں مشکل سے کوئی مدرسہ رکھتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں نہ صرف تعلیم جبری ہے بلکہ اندھوں، لولوں، لنگڑوں اور پیشہ وروں کے لیے جداجدا مدرسے قائم ہیں۔ لڑکوں کی صحت قائم رکھنے اور ان کو مضبوط اور تندرست بنانے کے لیے بڑی کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً: ہر اسکول میں طبی امتحان کا خاص و وافر انتظام ہے، لڑکوں کی آنکھ، کان، کمر، چھاتی، ہاتھ، پیر، سر وغیرہ جملہ قویٰ کا وقتاً فوقتاً امتحان کیا جاتا ہے۔ اور جو لڑکے ان قویٰ میں کسی کمزوری یا کمی کے باعث معمولی جماعتوں کے ساتھ کافی ترقی نہیں کرسکتے ان کے واسطے خاص جماعتیں کھلی ہوئی ہیں۔'' ہمارے یہاں ابھی تک پرائمری تعلیم بھی مفت نہیں ہوئی۔ لڑکا مشکل سے ابتدائی منزل تک پہنچتا ہے کہ والدین پر اخراجات تعلیم کا بار پڑنے لگتا ہے۔ یورپی ممالک اور امریکہ میں ابتدائی اور سکنڈری تعلیم ہائی اسکول کے درجے تک بلافیس، مفت اور بلا کسی قسم کے خرچ کے دی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ کاغذ، قلم، دوات وغیرہ کا خرچہ بھی ریاست کی جانب سے دیا جاتا ہے۔

ہمارے یہاں اب تک یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ یورپ میں اعلیٰ تعلیم بہت گراں ہے لالہ صاحب اس کی تردید کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''اگر اس ملک کی اوسط آمدنی کا دیگر یورپین ممالک کی اوسط آمدنی سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے ملک میں جملہ قسم کی تعلیم گراں ہے۔ ہمارے ملک میں سرکاری حساب کے بموجب اوسط آمدنی فی کس ۳۰؍ روپے سالانہ ہے۔ غیر سرکاری حساب سے صرف اٹھارہ روپے سالانہ ہے۔ انگلینڈ میں اوسط آمدنی فی کس ۶۷۵؍ روپے سالانہ ہے۔ جس حساب سے اہل انگلستان کی اوسط آمدنی اہل ہندوستان کی اوسط آمدنی سے ۲۰ گنے سے زیادہ ہے کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ہمارے ملک میں جو فیس گورنمنٹ کالجوں میں سرکار لیتی ہے یا جس فیس کے لینے پر امدادی کالجوں کو مجبور کرتی ہے اس کو انگلستان کے کالجوں کی فیس سے وہی نسبت ہے جو ہماری اوسط آمدنی کو انگلستان کی اوسط آمدنی سے ہے۔ گورنمنٹ

کالج لاہور میں بی اے کلاس میں دس روپے فیس محض تعلیم کی ہے۔ کیا کوئی شخص ہم کو بتا سکتا ہے کہ آکسفورڈ یا کیمبرج کے کسی کالج میں محض تعلیم کی فیس ۲۲۵ روپے ماہوار تک پہنچتی ہے۔ ہرگز نہیں، حالانکہ دونوں مقامات کی تعلیم میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔'' یہی باعث ہے کہ ان ممالک میں ۱۳۵/ روپے اوسطاً فی طالب علم خرچہ پڑتا ہے اور سلطنت کا کل آمدنی کا ایک تہائی حصہ محض تعلیم کی مد میں خرچ کردیتے ہیں دریغ نہیں ہوتا۔

گھاس چارہ[1]

منشی دیوی دیال صاحب نے اس سے قبل ''پھول''، ''درخت'' وغیرہ پر مختصر اور مفید کتابیں لکھ کر زبان کی خدمت کی ہے۔ حال میں انھوں نے ''گھاس چارہ'' اور ''دودھ'' اور ''شہد'' تین اور کتابیں تالیف کی ہیں ۔ ''گھاس چارہ'' میں مختلف گھاسوں کے نام اور چند لفظوں میں ان کے فوائد اور استعمال درج کردیے گئے ہیں۔ یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ کون سی گھاس مویشیوں کی خوراک کے واسطے زیادہ مفید ہے اور کون مضر اس کتاب میں ان لوگوں کے لیے جو گھوڑے وغیرہ کثرت سے رکھتے ہیں بہت سی کارآمد صلاحیں مل سکتی ہیں۔

''زمانہ''

اکتوبر ۱۹۰۶

---

[1] امپریل بک ڈپو پریس، دہلی

رانا پرتاپ

راجستھان کی تاریخ کا ایک ایک صفحہ دلیرانہ جانبازیوں اور مردانہ جاں نثاریوں کے کارناموں سے مزین ہے۔ بپار اوّل، رانا سنگا، جگمل اور رانا پرتاب ایسے ایسے ممتاز نام ہیں جو باوجود اس کے کہ زمانہ نے انھیں حرف غلط کی طرح مٹا دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ابھی تک زندہ ہیں اور اسی طرح ہمیشہ زندہ اور روشن رہیں گے۔ ان میں سے کسی نے سلطنتوں کی بنیادیں نہیں ڈالیں۔ فتوحات نہیں حاصل کیے۔ نئ قومیں نہیں بنائیں، مگر ان بزرگوں کے سینے میں وہ شعلہ دہک رہا ہے جسے حب قوم کہتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ کوئی غیر شخص آئے اور ہمارے ملک میں ہمارا ہمسر ہوکر رہے۔ انھوں نے مصائب زندگی جھیلے، اپنی جانیں گنوائیں مگر اپنے ملک پر قبضہ کرنے والوں کے قدم اکھاڑنے کی فکر میں ہمیشہ پیچ و تاب کھاتے رہے۔ وہ میانہ روی کے حامی نہ تھے کہ میں بھی رہوں اور تو بھی رہ۔ ان کے دعوے زیادہ مردانیت و شجاعت کا پہلو لیے ہوئے تھے کہ رہیں تو ہم رہیں یا ہمارے ہم قوم۔ مگرغیر قوم ہرگز قدم نہ جمانے پائے، ان کے کارنامے اس قابل ہیں کہ ہماری مذہبی تصانیف کا حصہ بنیں۔ اس وقت ہم صرف رانا پرتاب کے سوانح زندگی ہدیہ ناظرین کرتے ہیں جو اقبال اکبری کا جب تک زندہ رہا سامنا کرتا رہا۔ اس وقت جبکہ کوٹا، جیسلمیر، آمبر، ماڑواڑ سبھی دیسوں کے فرماں روا یا تو دربار اکبری کے دعا گو یا سرکار اکبری کے وظیفہ خوار بن چکے تھے۔ یہ بیشۂ شجاعت کا شیر، یہ دریائے استقلال کا نہنگ اور راہ ثبات کا رہرو یکہ و تنہا ان کی مجموعی قوت کا مقابلہ کرتا رہا۔ پہاڑ کے دروں اور درختوں کے شگافوں میں چھپ چھپ کر اس انمول ہیرے کو دشمن کے دست تصرف سے بچاتا رہا جسے قومی آزادی کہتے ہیں۔ اور جب مرا تو اس کے پاس بجز اپنی برق دم تلوار اور چند رفیقان

جان نثار کے اور کوئی سامان شان و شکوہ نہ تھا۔ جتنے اور یار و مددگار تھے یا تو حق رفاقت ادا کر چکے تھے یا اقبال اکبری کا دم بھرنے لگے تھے۔ مگر یہ گمنامی اور بے سروسامانی کی موت اس تخت زرین پر اور ان ہوا خواہوں کے جمگھٹ میں مرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے جو قوم کی آزادی ، روح کی غلامی اور ملک کی ذلت کے صلے میں ملے ہوں۔

پرتاب اودے سنگھ کا سپوت بیٹا اور شیر دل دادا کا پوتا تھا۔ رانا سنگا اور بابر کی صف آرائیاں اور جنگ آزمائیاں تاریخ کے صفحوں پر ثبت ہیں۔ گو رانا نے شکست کھائی مگر اپنے ملک کی محافظت میں اپنا خون بہا کر ہمیشہ کے لیے سرخ رو ہوگیا۔ اس کے بیٹے اودے سنگھ میں باپ کے مردانہ اوصاف متوارث نہ ہوئے تھے وہ کچھ دنوں تک تو چتور کو مغلوں کی دست برد سے بچاتا رہا مگر جوں ہی اکبر کے تیور بدلے دیکھے شہر جگمل کو سپرد کر کے خود اراولی کی پہاڑیوں میں جا چھپا اور وہاں ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی جو آج اس کے نام سے اودے پور مشہور ہے۔ جگمل نے جس دلاوری سے حریف کا مقابلہ کیا۔ باشندگان چتور جس مردانگی سے سر بکف ہوکر دشمن کو ہٹانے کے لیے آمادہ ہوئے اور نازنینان چتور نے جس استقلال سے اپنے حفظ ناموس کے لیے آگ میں جل جانے کو ترجیح دی یہ سب باتیں ہر زبان پر ہیں اور مورخوں کے قلم ان کے تذکروں پر ہمیشہ وجد کرتے رہیں گے۔ ادھر بھگوڑا اودے سنگھ اپنے کوہستانی قلعہ میں اپنے رفیقوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا رہا۔ رانا پرتاب نے انھیں پہاڑیوں میں مناظر فطرت سے تعلیم پائی۔ شیروں سے مردانگی تو پہاڑوں سے اٹل رہنے کے سبق پڑھے۔ باپ کی وفات تک اسے بجز سیر و شکار کے اور کوئی شغل نہ تھا۔ ہاں اپنی سلطنت کی پامالی، اپنے ہم عصر ہندو راجوں مہاراجوں کی پست ہمتی، مغل بادشاہوں کے تحکم اور خاندان میواڑ کے دلیرانہ کارناموں نے اس کے غیور، باحمیت اور پرجوش دل کو ٹھوکے دے دے کر ابھار رکھا تھا۔

باپ کے انتقال کے بعد جب وہ مسند فرماں روائی پر متمکن ہوا تو میواڑ کی شاندار سلطنت کا صرف برائے نام وجود باقی رہ گیا تھا۔ نہ کوئی دارالخلافت تھا، نہ خزانہ، نہ فوج، معاونین متواتر زکوں اور زیر باریوں کے مارے ہمت ہارے بیٹھے تھے۔ پرتاب

نے آتے ہی ان کے دبے ہوئے حوصلوں کو ابھارا، سلگتی آگ کو دہکایا اور انھیں چتوڑ کی تباہی اور خونریزی کا انتقام لینے کے لیے آمادہ کیا۔ اس کا غیرت مند دل اس کی کب تاب لاسکتا تھا کہ وہ مقام جو اس کے نامور آباواجداد کا مسکن رہا ہو۔ جس کے درو دیوار ان کے لہو سے رنگے ہوں اور جس کی محافظت کے لیے اس کی قوم نے اپنی جانیں دے دی ہوں حریف کے قبضے میں رہے، اور ان کے بے ادب پیروں سے پامال ہو۔ اس نے اپنے رفیقوں سرداروں اور آنے والی نسلوں کو قسم دلائی کہ جب تک تمھارا چتوڑ پر قبضہ نہ ہوجائے تم عیش و تکلفات سے محترز رہو۔ تم کیا منہ لے کر طلائی و نقرئی برتنوں میں کھاؤگے اور مخملی گدوں پر سوؤگے جبکہ تمھارے باپ دادا کا ملک تمھارے دشمنوں کی دست درازیوں سے نالاں رہے گا۔ تم کیا منہ لے کر اپنی فوج کے آگے نقارے بجاتے اوراپنی قوم کا نشان بلند کیے نکلوگے جبکہ وہ مقام جہاں تمھارے باپ دادا کی نالیں گڑی ہیں اور جو ان کے کارناموں کی زندہ یادگار ہے۔ دشمنوں کے قدموں سے روندا جائے گا۔ تم چھتری ہو! تمھارے خون میں جوش ہے۔ تم قسم کھاؤ کہ جب تک چتوڑ پر قبضہ نہ کرلوگے سبز پتوں میں کھاؤگے۔ بوریے پر سوؤگے اور فوج کے عقب میں نقارہ رکھوگے۔ کیونکہ تم ماتم کر رہے ہو اور یہ باتیں تم کو ہمیشہ یاد دلاتی رہیں گی کہ تمھیں ابھی ایک زبردست قومی فرض ادا کرنا ہے۔ رانا جب تک زندہ رہا ان قیود کو نباہتا رہا۔ اس کے بعد اس کے جانشین بھی اس کی پابندی کرتے آئے اور ابھی تک یہی رسم چلی آتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلے اس رسم کے کچھ معنی تھے، اب وہ بالکل مہمل ہوگئی ہے۔ عیش پسندیوں نے نکاس کی صورتیں نکال لی ہیں۔ تاہم جب طلائی برتنوں میں کھاتے ہیں تو عہد کی یادگار میں چند پتے اوپر سے رکھ لیتے ہیں۔ مخملی گدوں پر سوتے ہیں تو اِدھر اُدھر پیال کے ٹکڑے پھیلا دیتے ہیں۔

رانا نے اتنے ہی پر اکتفا نہ کی۔ اس نے اودے پور کو چھوڑا اور کوملمیر کو پایۂ تخت قرار دیا۔ غیر ضروری اور بیجا مصارف جن سے صرف نام و نمود مقصود تھا بند کردیے۔ جاگیریں ازسرنو نئے شرائط پر تقسیم کیں اور میواڑ کا وہ تمام خطہ جہاں کسی دشمن کے گزر ہونے کا احتمال ہوسکتا تھا، جو کوہستانی دیواروں سے باہر میدان میں واقع تھا کف دست میدان بنا دیا گیا۔ کنوئیں تک پٹو دیے گئے اور بالکل آبادی پہاڑوں

کے اندر بسادی گئی۔ سیکڑوں میل تک ویرانی اور تباہی کا ڈنکا بجنے لگا اور یہ سب اس لیے کہ اگر اکبر ادھر رخ کرے تو اسے دشت کربلا کا سامنا ہو۔ اس زرخیز میدان میں بجائے غلہ کے لمبی لمبی گھاس لہرانے لگی۔ ببول کے کانٹوں سے راستے بند ہوگئے اور جنگل کے بسنے والے جانوروں نے اسے اپنا مسکن بنا لیا۔ مگر اکبر بھی فن کشور کشائی کا استاد کامل تھا، اس نے راجپوتوں کی تلوار کی کاٹ دیکھی تھی اور خوب جانتا تھا کہ جب یہ اپنی جانیں بیچتے ہیں تو سستی نہیں بیچتے۔ اس شیر کو چھیڑنے سے پہلے اس نے ماڑواڑ کے راجہ مالدیو کو ملایا، آمبر کا راجہ بھگوان داس اور اس کا بہادر بیٹا مان سنگھ دونوں پہلے ہی اکبر کے حلقہ بگوشوں کے زمرہ میں آگئے تھے۔ جب دوسرے راجوں نے دیکھا کہ ایسے ایسے زبردست پرتاپی راجے اپنی اپنی جانوں کی خیر منا رہے ہیں تو وہ بھی ایک ایک کرکے ہوا خواہانِ اکبری میں شامل ہوگئے۔ ان میں کوئی تو رانا کا ماموں تھا کوئی پھوپھا حتیٰ کہ اس کا عم زاد بھائی ساگر جی بھی اس سے منحرف ہوکر اکبر سے آملا تھا۔ پس کیا تعجب ہے کہ جب رانا نے اپنے مقابل بجائے مغلوں کی فوج اپنی ہی قوم کے سورماؤں اور شہسواروں کو آراستہ دیکھا ہو۔ اپنے ہی بھائیوں، اپنے ہی عزیزوں اور رشتہ داروں کو اپنے مقابل شمشیر بکف پایا ہو تو اس کی تلوار ایک دم کے لیے رک گئی ہو۔ ذرا دیر کے لیے، ذرا دیر کے لیے وہ خود ٹھٹک گیا ہو اور مہاراجہ جدہشٹر کی طرح پکار اٹھا ہو۔'' کیا میں اپنے ہی بھائی بندوں سے لڑنے کے لیے آیا ہوں۔'' اس میں شک نہیں کہ ان بھائی بندوں سے وہ بارہا لڑ چکا تھا۔ راجستھان کی تاریخ ایسی خانہ جنگیوں سے بھری پڑی ہے۔ مگر یہ لڑائیاں انھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کرتی تھیں۔ دن بھر ایک دوسرے کے خون میں نیزے تر کرنے کے بعد شام کو وہ پھر مل بیٹھتے۔ اور آپس میں بغل گیر ہوجاتے تھے مگر آج رانا کو ایسا معلوم ہوا کہ یہ بھائی بند مجھ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے ہیں۔ کیونکہ وہ سچے راجپوت نہیں رہ گئے۔ ان کی بیٹیاں اور بہنیں حرم سرائے اکبری میں داخل ہوگئی ہیں۔ افسوس! ان راجپوتوں کا خون حمیت ایسا سرد ہوگیا ہے۔ کیا ان میں غیرت قومی نام کو بھی نہیں باقی رہ گئی۔ کیا حفظ ناموس و ننگ کا خیال ان کے دلوں سے بالکل اٹھ گیا۔ حیف کہ انھیں عصمت مآب راجپوتنیوں کی بہنیں جو محاصرۂ چتوڑ میں جل کر خاکستر ہوگئی تھیں آج اکبر کے پہلو میں

بیٹھی ہیں اور خوش و خرم ہیں! ان کی میان سے تیغ کیوں نہیں نکل پڑتا۔ ان کے کلیجے کیوں نہیں پھٹ جاتے۔ ان کی آنکھوں سے خون کیوں نہیں ٹپک پڑتا۔ افسوس! اکشواک کے بنس اور پرتھی راج کے کل کی یہ دردشا ہو رہی ہے!

پرتاب نے ان راجوں سے جنھوں نے اس کی دانست میں راجپوتوں کو اس حد تک ذلیل کیا تھا قطع تعلق کرلیا۔ ان کے ساتھ شادی بیاہ تو درکنار، کھانا پینا تک جائزہ نہ رکھا۔ اور جب تک مغل فرماں روا تخت پر رہا، خاندان اودے پور نے نہ صرف خاندان شاہی سے ایسے تعلقات نہیں پیدا کیے بلکہ آمبر اور مارواڑ کو بھی برادری سے خارج سمجھا کیے۔ اودے پور اگرچہ پاس وضع کی بدولت زوال اور تباہی میں پڑا رہا۔ اور دوسرے خاندان وضع کو ہاتھ سے دے دینے کی بدولت باغ عروج کی سیر کرتے رہے مگر سارے راجستھان میں ایسا کوئی خاندان نہ تھا جس پر اودے پور کا اخلاقی رعب نہ حاوی ہو یا جو اس کی فضیلت خاندانی کو نہ تسلیم کرتا ہو حتیٰ کہ جب راجہ جے سنگھ اور راجہ بخت سنگھ جیسے جیسے زبردست راجاؤں نے بڑے منکسرانہ الفاظ میں اودے پور سے پوتر بنائے جانے کی درخواست کی اور ان کی درخواست منظور ہوئی تو یہ شرط لگادی گئی کہ خاندان اودے پور کی لڑکی چاہے کسی خاندان میں بیاہی جائے مگر ہمیشہ اسی کی اولاد تخت نشیں ہوگی۔

کاش رانا اس نفرت کو اپنے دل ہی تک محدود رکھتا اور زبان تک نہ آنے دیتا تو اس کو بہت سی مصیبتوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ مگر اس کا جری دل دبنا جانتا ہی نہ تھا۔ مان سنگھ شعلہ پور کی مہم مارے چلا آرہا تھا کہ رانا کی ملاقات کو کوملمیر چلا آیا۔ رانا خود اس کے استقبال کو گیا اور بڑے تزک و احتشام سے اس کی دعوت کی۔ مگر جب کھانے کا وقت آیا تو رانا نے کہلا بھیجا مجھے درد سر ہے۔ مان سنگھ تاڑ گیا کہ ان کو میرے ساتھ بیٹھ کر کھانے سے عار ہے۔ جھلاکر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا اگر میں نے تمھارا گھمنڈ نہ ڈھا دیا ہوتو نام مان سنگھ نہیں۔ اس وقت تک رانا بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ بولا، تمھارا جب جی چاہے چلے آنا، مجھے ہر دم تیار پاؤگے۔ مان سنگھ نے آکر اکبر کو ابھارا، بارود پر فتیلہ پہنچ گیا۔ فوراً رانا پر حملہ کرنے کے لیے فوج کی تیاری کا حکم ہوا۔ شہزادہ سلیم کے نام سپہ سالاری ہوئی۔ مان سنگھ اور مہابت خان مشورہ کار قرار پائے۔

رانا بھی اپنے بائیس ہزار سورما، جانباز راجپوتوں کے ساتھ ہلدی گھاٹ کے میدان میں پرا جمائے کھڑا تھا۔ جوں ہی دونوں فوجیں مقابل ہوئیں کہ شور قیامت برپا ہوگیا۔ مان سنگھ کے رفیقوں کو یہ کد تھی کہ اپنے سردار کی تحقیر کا انتقام لیں، رانا کے رفیقوں کو یہ دکھانا منظور تھا کہ ہم اپنی آزادی کو جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ رانا نے ہر چند چاہا کہ مان سنگھ سے مڈبھیڑ ہوجائے تو ذرا دل کے حوصلے نکل جائیں مگر اس کوشش میں کامیابی نہ ہوئی۔ ہاں اس کا گھوڑا اتفاق سے شہزادہ سلیم کے ہاتھی کے روبرو آ گیا۔ پھر کیا تھا! رانا نے چٹ رکاب پر قدم رکھ کر نیزہ چلایا، جس نے مہاوت کا کام تمام کردیا۔ چاہتا تھا کہ دوسرا تلا ہوا ہاتھ چلا کر اکبر کا چراغ گل کردے کہ ہاتھی بھاگا۔ شہزادہ کوخطرے میں دیکھ کر اس کے سپاہی لپکے اور رانا کو گھیر لیا۔ رانا کے راجپوتوں نے دیکھا کہ سردار گھر گیا تو انھوں نے بھی جان توڑ کر ہلا کیا اور اسے نرغے سے صاف نکال لائے۔ پھر تو وہ گھمسان کا رن پڑا کہ خون کی ندیاں بہ گئیں۔ رانا زخموں سے چور ہورہا تھا۔ بدن سے خون کے فوارے جاری تھے۔ مگر تیغ ہاتھوں میں لیے بپھرے ہوئے شیر کی طرح میدان میں ڈٹا کھڑا تھا۔ غنیم اس کے چھتر کو دیکھ دیکھ کر اپنی پوری طاقت سے اسی مقام پر دھاوے کرتے۔ مگر رانا نے سوائے قدم آگے بڑھانے کے پیچھے ہٹنے کا نام بھی نہ لیا۔ یہاں تک کہ تین بار وہ دشمنوں کی زد میں آتے آتے بچ گیا۔ مگر اس وقت تک لڑائی کا رخ پلٹنے لگا۔ دل کی دلیری اور ہمت کے جوش کا توپ و تفنگ، گولہ و بارود سے کب تک مقابلہ ہوسکتا تھا، سردار جھالا نے جب لڑائی کا یہ رنگ دیکھا تو چٹ چھتر بردار کے ہاتھ سے چھتر چھین لیا اور اسے ہاتھ میں لیے ایک پیچیدہ مقام پر چلا گیا۔ حریف سمجھا کہ رانا جا رہا ہے، اس کے پیچھے لپکے، ادھر رانا کے رفیقوں نے موقع پایا تو اسے میدان سے زندہ و سلامت بچالے گئے۔ مگر سردار جھالا اپنے ڈیڑھ سو جاں باز سپاہیوں کے ساتھ مارا گیا۔ اور جان نثاری و رفاقت کا جو کچھ حق ہے وہ ادا کرگیا۔ چودہ ہزار بہادر راجپوت ہلدی گھاٹ کے میدان کو اپنے خون سے سیراب کر گئے۔ جن میں پانچ سو سے زائد خاندان شاہی کے راج کمار تھے۔

میواڑ میں جب اس شکست کی خبر پہنچی تو گھر گھر کہرام مچ گیا۔ ایسا کوئی خاندان

نہ تھا جس کا ایک نہ ایک سپوت نذر اجل نہ ہوا۔ ہلدی گھاٹ کے نام پر میواڑ کا بچہ بچہ آج تک فخر کرتا ہے۔ بھاٹ اور کبیشر گلیوں اور سڑکوں پر ہلدی گھاٹ کا واقعہ سنا سنا کر لوگوں کو رلاتے ہیں۔ اور جب تک میواڑ میں کوئی کبیشر زندہ رہے گا اور اس کے دل آویز کبت کی قدر کرنے والے باقی رہیں گے اس وقت تک ہلدی گھاٹ کی یادگار ہمیشہ تازہ رہے گی۔

ادھر رانا اپنے وفادار گھوڑے چیتک پر سوار یکہ و تنہا چل نکلا، دو مغل سرداروں نے اسے پہچان لیا۔ اور چٹ اس کے پیچھے گھوڑے ڈال دیے۔ اب آگے آگے زخمی رانا بڑھا جا رہا ہے کہ اس کے پیچھے دونوں سردار گھوڑے دبائے بڑھے آتے ہیں۔ چیتک اپنے آقا کی طرح زخموں سے چور ہے۔ وہ ہر چند زور مارتا۔ ہر چند جی توڑ کر قدم اٹھاتا ہے۔مگر پیچھا کرنے والے نزدیک آتے جاتے ہیں اب ان کے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اب وہ پہنچ گئے، رانا تیغ سوت لیتا ہے کہ یکایک اسے پیچھے سے کوئی للکارتا ہے ”او نیلی گھوڑے کے سوار! او نیلی گھوڑے کے سوار۔“ زبان اور لہجہ بالکل میواڑی ہے رانا بھوچکا ہوکر پیچھے دیکھتا ہے تو اس کا عم زاد بھائی سکٹ چلا آرہا ہے۔

سکٹ پرتاب سے ناراض ہوکر اکبر کے ہوا خواہوں میں جا ملا تھا اور اس وقت شہزادہ سلیم کے ہمراہیوں میں تھا۔ مگر جب اس نے نیلے گھوڑے کے سوار کو یکہ و تنہا زخموں سے چور میدان سے جاتے دیکھا تو خون برادرانہ جوش میں آ گیا۔ پرانی شکایتیں اور کدورتیں دل سے یک لخت محو ہوگئیں۔ فوراً تعقب کرنے والوں میں جاملا اور آخر ان کو اپنے نیزے سے خاک پر سلاتا ہوا رانا تک پہنچ گیا۔ اس وقت اپنی زندگی میں پہلی بار دونوں بھائی سچے برادرانہ جوش و یگانگت سے بغل گیر ہوئے۔ یہاں وفادار چیتک نے دم توڑ دیا۔ سکٹ نے اپنا گھوڑا بھائی کے نذر کیا جب رانا نے چیتک کی پشت سے زین اتار کر اس نئے گھوڑے پر رکھا ہے تو وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ اسے اپنے کسی عزیز کے مر جانے کا ایسا صدمہ نہ ہوا تھا کیا سکندر کا گھوڑا بسفالا چیتک سے زیادہ وفادار تھا اس نے صرف آنسو بہانے پر قناعت کی آج اس مقام پر ایک ٹوٹا پھوٹا چبوترہ نظر آتا ہے جو چیتک کی جان نثاری کا شاہد ہے۔

شہزادہ سلیم فتح کے شادیانے بجاتا پہاڑیوں سے نکلا، اس وقت تک برسات کا

موسم شروع ہوگیا تھا، اور چونکہ یہ زمانہ ان پہاڑیوں میں آب و ہوا کے لحاظ سے ناقابل برداشت ہوجاتا ہے۔ رانا کو تین چار مہینہ اطمینان رہا، مگر موسم بہار کے شروع ہوتے ہی غنیم نے پھر دھاوا کیا۔ مہابت خان اودے پور پر حکمراں تھا ہی کہ شہباز خان نے کوملمیر کا محاصرہ کیا۔ رانا اور اس کے رفیقوں نے یہاں بھی خوب دادِ شجاعت دی۔ مگر کسی گھر کے بھیدی نے جو اکبر سے ملا ہوا تھا قلعہ کے اندر کنوئیں میں زہر ملا دیا۔ اور رانا کو بجز وہاں سے نکل جانے کے اور چارہ نظر نہ آیا۔ تاہم اس کے ایک سردار نے جس کا نام بھان تھا مرتے دم تک قلعہ کو دشمنوں سے بچائے رکھا۔ اس کے مارے جانے پر یہ قلعہ بھی غنیم کے فتوحات میں شامل ہوگیا۔

کوملمیر پر قبضہ کرلینے کے بعد راجہ مان سنگھ نے دھرمیتی اور گوگنڈا کے قلعوں کا محاصرہ کیا۔ ایک اور سردار عبداللہ نامی جنوب سے بڑھا۔ فرید خان نے چھپن پر حملہ کیا۔ اس طرح ہر چہار طرف سے گھر کر پرتاب کے لیے بجز اطاعت اختیار کرنے کے اور کوئی صورت نہ باقی رہی۔ مگر وہ شیر دل راجپوت اسی دم خم اسی جوش شجاعت اور اسی مستقل مزاجی سے حریف کا اب تک سامنا کرتا رہا۔ کبھی دن دہاڑے، کبھی شب تار میں جبکہ فوج شاہی بے خبر سوتی ہوتی وہ یکایک اپنے کمین گاہ سے نکل پڑتا۔ اشاروں سے اپنے رفیقوں کو یکجا کرلیتا۔ اور جو شاہی فوج قریب ہوتی اسی پر چڑھ دوڑتا۔ فرید خاں کو جورانا کو گرفتار کرنے کے لیے زنجیر بنوائے بیٹھے تھے اس نے ایسی ہوشیاری سے ایک دشوار گزار گھاٹی میں گھیرا کہ اس کا ایک آدمی زندہ و سلامت نہ گیا۔ آخر فوج شاہی بھی اس ڈھنگ کی لڑائی سے تنگ آ گئی۔ میدانوں کے لڑنے والے مغل پہاڑ میں لڑنا کیا جانیں اس پر سے جب بارش شروع ہوجاتی تو چوطرفہ وبا اور امراض مہلک پھیل جاتے۔ یہ بارش کے دن پرتاب کے لیے ذرا دم لینے کے دن تھے۔ اسی طرح کئی برس بیت گئے۔ پرتاب کے رفیق کچھ تو لڑکر مرے، کچھ نذر اجل ہوئے۔ کچھ جو ذرا بودے تھے ادھر ادھر دبک رہے رسداور خوراک کے لالے پڑگئے۔ پرتاب کو ہمیشہ یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں میرے لڑکے بالے دشمنوں کے پنجے میں نہ پھنس جائیں۔ ایک بار وہاں کے وفادار بھیلوں نے ان کو فوج شاہی سے بچایا اور انھیں ایک ٹوکرے میں رکھ کر جاورہ کے کانوں میں چھپا دیا۔جہاں وہ ان کی ہر طرح حفاظت اور نگرانی

کرتے رہے۔ ابھی تک وہ بلے اور وہ زنجیریں موجود ہیں جن میں یہ ٹوکرے لٹکا دیے جاتے تھے تاکہ لڑکے درندوں سے محفوظ رہ سکیں۔ ایسی ایسی سختیاں جھیلنے پر بھی پرتاب کے استقلال میں ذرا بھی لغزش نہ آئی۔ وہ اب بھی کسی شگاف کوہ میں اپنے چند جان نثار، آزمودہ کار رفیقوں کے ساتھ اسی شان و تجمل سے بیٹھتا جیسے تخت شاہی پر بیٹھتا تھا۔ ان سے اسی شاہانہ رعب و داب سے پیش آتا۔ جیونار کے وقت خاص خاص آدمیوں کو دونے عنایت کرتا اور اگرچہ یہ دونے محض جنگلی پھلوں کے ہوتے تھے مگر بڑے ادب اور تعظیم سے لیے جاتے۔ ماتھے پر چڑھائے جاتے اور تبرک کے طور پر کھائے جاتے۔ اس آہنی استقلال نے رانا کو راجستھان کے تمام راجاؤں کی نگاہوں میں ہیرو بنا دیا۔ جو لوگ دربار اکبری کے مسند نشیں ہوگئے تھے وہ بھی اب رانا کے نام پر فخر کرنے لگے۔ اکبر خود جو دریا قدرت سے دلیری اور جوانمردی لے کر آیا تھا اور بہادر دشمن کی قدر کرنا جانتا تھا۔ اپنے سرداروں سے پرتاب کی ہمت اور حوصلہ کی تعریفیں کرتا۔ شعرائے دربار اس کی شان میں مدحیہ اشعار کہنے لگے اور عبدالرحیم خاں خانخاناں نے جو ہندی بھاشا کا نہایت خوش گو نازک خیال شاعر تھا۔ میواڑی زبان میں اس کی دادِ شجاعت دی۔ سبحان اللہ! کیسے قدر شناس دریا دل لوگ تھے کہ دشمن کی بہادری کو سراہ کر اس کا دل بڑھاتے اور حوصلے ابھارتے تھے۔

لیکن کبھی کبھی ایسے بھی موقعے آجاتے کہ اپنے یگانوں، پیارے بچوں کی مصیبتیں اس سے نہ دیکھی جاتیں۔ اس وقت اس کے حوصلے پست ہوجاتے اور آپ اپنے سینے میں چھری مار لینے کو جی چاہتا۔ فوج شاہی اس کی گھات میں ایسی لگی رہتی تھی کہ پکا ہوا کھانا کھانے کی نوبت نہ آتی۔ کھانا کھانے کے لیے ہاتھ منہ دھو رہے ہیں کہ جاسوس نے خبردی فوج شاہی آ گئی۔ اور اسی وقت سب چھوڑ چھاڑ کر بھاگے۔ ایک دن وہ ایک پہاڑ کے درہ میں لیٹا ہوا تھا۔ رانی اور اس کی بہو کند مول کی روٹیاں پکا رہی تھیں۔ بچے کھانا پانے کی خوشی میں ادھر ادھر کلیلین کرتے پھرتے تھے۔ آج پانچ فاقے گزر چکے تھے۔ رانا نہ معلوم کن خیالات میں غرق بچوں کی حرکتوں کو حسرت آلود نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ افسوس! یہ وہ بچے ہیں جن کو مخملی گدوں پر نیند نہ آتی تھی۔ جو زمانہ کی نعمتوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ جن کو اپنے بیگانے گود کے بجائے

سر اور آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ آج ان کی یہ حالت ہے کہ کوئی بات بھی نہیں پوچھتا۔ نہ کپڑے ہیں نہ لتے۔ اور کندمول کی روٹیوں کی امید پرخوش ہو رہے ہیں اور اچھل کود رہے ہیں۔ وہ انھیں افسردہ کن خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ یکایک اپنی پیاری بیٹی کی زور کی چیخ نے اسے چونکا دیا۔ دیکھتا ہے تو ایک جنگلی بلی اس کے ہاتھ سے روٹی چھینے لیے جاتی ہے اور وہ بیچاری بڑی درد ناک آواز میں رو رہی ہے۔ ہائے! غریب کیوں نہ روئے، آج پانچ فاقوں کے بعد آدھی روٹی ملی تھی۔ پھر نہیں معلوم کے کڑاکے گزریں گے۔ یہ دیکھ کر رانا کی آنکھوں میں آنسو اٹد آئے۔ اس نے اپنے جوان جوان بیٹوں کو میدان جنگ میں اپنی آنکھوں سے دم توڑتے دیکھا تھا مگر کبھی اس کے دل پر رقت طاری نہ ہوتی تھی۔ کبھی آنکھیں اشک آلود نہ ہوئی تھیں۔ مرنا مارنا تو راجپوتوں کا دھرم ہے۔ اس پر کوئی راجپوت کیوں آنسو بہائے مگر آج اس لڑکی کے رونے نے اسے بے بس کردیا۔ آج ایک دم کے لیے اس کا پائے ثبات ڈگ گیا۔ آج ذرا دیر کے لیے فطرت انسانی جوہر ذاتی پر غالب آ گئی۔ جو لوگ دل کے جتنے ہی دلیر و جری ہوتے ہیں اتنے ہی رقیق القلب بھی ہوتے ہیں۔ نپولین بونا پارٹ نے ہزاروں آدمیوں کو مرتے دیکھا تھا۔ اور ہزاروں کو اپنے ہی ہاتھوں سے خاک پرسلا دیا تھا۔ مگر ایک بھوکے، لاغر و نحیف کتے کو اپنے آقا کی لاش بے جان کے ادھر ادھر منڈلاتے دیکھ کر اس کی آنکھیں سیلاب اشک کو نہ روک سکی تھیں۔ رانا نے لڑکی کو گود میں لے لیا اور بولا ”تف ہے مجھ پر کہ محض نام کی بادشاہت کے لیے اپنے پیارے بچوں کو ایسی تکلیفیں دے رہا ہوں۔“ اسی وقت اکبر کے پاس نوشتہ بھیجا کہ اب مصیبتیں برداشت نہیں کی جاتیں۔ کچھ میرے حال زار پر نظر کرم کیجیے۔

اکبر کے پاس جب یہ پیغام پہنچا تو گویا کوئی نعمت غیر مترقبہ ہاتھ آ گئی۔ فرط مسرت سے جامہ میں پھولا نہ سمایا۔ رانا کا خط اہل دربار کو فخریہ دکھانے لگا مگر بہت کم لوگ دربار میں ایسے ناقدر شناس ہوں گے جنھوں نے رانا کی اطاعت کی خبر مسرت سے سنی ہو۔ راجے مہاراجے اگرچہ اکبر کی دربار داری کرتے تھے مگر یہ قومی ہمدردی کا تقاضا تھا کہ رانا کی عظمت سب کے دلوں میں جاگزیں تھی۔ ان کو اس بات کا فخر تھا کہ ہم اگرچہ اطاعت پذیر ہوگئے ہیں مگر ہمارا ایک بھائی ابھی تک کوس فرماں روائی بجا

رہا ہے اور کیا تعجب ہے کہ کبھی کبھی ان کے دلوں میں ایسی آسانی سے اطاعت اختیار کرلینے پر ندامت بھی ہوتی ہے۔ ان میں مہاراجہ بیکانیر کا چھوٹا بھائی پرتھی سنگھ بھی تھا۔ جو بڑا جیالا، تلوار کا دھنی اور شیر دل تھا۔ اسے رانا سے غائبانہ سچی عقیدت ہوگئی تھی۔ اس نے جو یہ خبر سنی تو یقین نہ آیا، مگر رانا کی تحریر دیکھی تو سخت صدمہ ہوا۔ خانخاناں کی طرح وہ بھی نہ صرف شمشیر کا مالک تھا بلکہ نہایت خوش مذاق شاعر بھی تھا اور مردانہ جذبات سے بھرے اشعار کہا کرتا تھا۔ اس نے اکبر سے رانا کی خدمت میں ایک خط بھیجنے کی اجازت لے لی۔ اس بہانے سے کہ میں اس کی اطاعت کی خبر کی تصدیق کروں گا مگر اس خط میں اس نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا۔ ایسے ایسے مردانہ، پرزور اور حوصلہ افزا اشعار کہے کہ وہ رانا کے دل پر رجز کا کام کرگئے۔ اس کے دبے ہوئے حوصلوں نے پھر سر ابھارا، جوش آزادی نے پھر شورش مچائی اور اطاعت کا خیال کافور ہوگیا۔

مگر اب کی بار اس کے ارادوں نے کچھ اور ہی پہلو اختیار کیا۔ متواتر زکوں اور ناکامیوں نے اب اس پر ثابت کردیا کہ اقبال اکبری کی موج کو گنے گنائے رفیقوں اور زنگ آلود تیغوں سے روکنا مشکل ہی نہیں بلکہ غیر ممکن ہے۔ لہٰذا کیوں نہ اس ملک کو جہاں سے آزادی ہمیشہ کے لئے چلی گئی ۔خیر باد کہوں ،اور ایسے مقام پر سسودیہ خاندان کا قرمزی جھنڈا نصب کروں جہاں اس کے سرنگوں ہونے کا کوئی کھٹکا نہ ہو۔ بہت ردّوقدح کے بعد یہ صلاح طے پائی کہ دریائے اندلس کے کنارے جہاں پہنچنے کے لیے غنیم کو ایک ریگستان طے کرنا پڑے گا۔ نیا راج قائم کیا جائے ۔ کیساوسیع دل اور کیسی ہمت عالی تھی کہ اتنی شکستوں پر بھی ایسے بلند ارادے دل میں پیدا ہوتے تھے۔ یہ مصمم ارادہ کرکے وہ اپنے عیال و اطفال اور بچے کھچے رفیقوں کے ساتھ اس نئی مہم پر چل کھڑا ہوا۔ اور اراولی کے مغربی دامن کو طے کرتا ہوا ساحل ریگستان تک جا پہنچا۔ مگر اسی اثنا میں ایک ایسا مبارک واقعہ ہوگیا جس نے اس کے ارادے پلٹ دیے۔ اور اسے اپنے عزیز وطن کو لوٹ آنے کی تحریک کی۔ راجستھان کی تاریخ نہ صرف سرفروشی و جانبازی کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے بلکہ اس میں آقا پرستی عقیدت مندی اور وفاداری کی قابل یادگار و قابل فخر مثالیں بھی اسی کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔ بھاما

شاہ نے جس کے آباو اجداد چتوڑ کے وزیر رہے تھے جب اپنے آقا کو جلاوطن ہوتے دیکھا تو نمک خواری کا جوش امنڈ آیا۔ ہاتھ باندھ کر رانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا مہاراج! میں پشتہا پشت سے آپ کا نمک خوار ہوں۔ میری جمع جتھا جو کچھ ہے آپ کی دی ہوئی ہے۔ میرا جسم بھی آپ کا پروردہ ہے۔ کیا میرے جیتے جی آپ اپنے پیارے دیس کو ہمیشہ کے لیے تیاگ دیں گے؟ یہ کہہ کر اس بندۂ وفا نے اپنے خزانے کی کنجی رانا کے قدموں پر رکھ دی۔ کہتے ہیں اس خزانے میں اتنی دولت تھی کہ اس کے صرفہ سے ۲۵ر ہزار آدمی بارہ سال تک فراغت سے بسر کرسکتے تھے۔ لازم ہے کہ آج جہاں رانا پرتاب کے نام پر عزت کے سہرے چڑھائے جائیں وہاں بھاماشاہ کے نام پر بھی چند پھول بکھیر دیے جائیں۔

کچھ تو اس زر کثیر کے ملنے اور کچھ پرتھی سنگھ کے مردانہ اشعار نے رانا کے ڈگمگاتے ہوئے استقلال کو پھر جمایا۔ اس نے اپنے رفیقوں کو جو ادھر ادھر منتشر ہوگئے تھے جھٹ پٹ جمع کرلیا۔ حریف تو بے غم بیٹھے تھے کہ اب یہ بلا اراولی کے اس پار ریگستانوں سے سرمار رہی ہوگی کہ رانا اپنی جمعیت کے ساتھ شیر کی طرح ٹوٹ پڑا۔ اور کوکہ شہباز خاں کو جو دویر کے مقام پر فوج لیے غافل پڑا تھا جاگھیرا، دم کے دم میں ساری فوج فرش خاک پرسلادی گئی۔ ابھی غنیم کامل طور پر چوکنا نہ ہونے پایا تھا کہ کوملمیر پر جا ڈپٹا۔ اور عبداللہ اور اس کی فوج کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ جب تک دربار شاہی تک خبر پہنچے کہ رانا کا قرمزی جھنڈا ۳۲ر قلعوں پر لہرا رہا تھا۔ سال بھر بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ اس نے اپنے ہاتھ سے گئی ہوئی سلطنت واپس لے لی۔ صرف چتوڑ، اجمیر اور منڈل گڑھ پر قبضہ نہ ہوسکا۔ اسی یلغار میں اس نے راجہ مان سنگھ کو بھی ایک خفیف سی سرزنش کردی۔ آمیر پر چڑھ دوڑا اور وہاں کی مشہور منڈی مال پورہ کو لوٹ لیا۔

اب خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اکبر نے رانا کو کیوں اطمینان سے بیٹھنے دیا۔ اس کی طاقت پہلے کے مقابلے میں اب بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ اس کی سلطنت کے حدود روز بروز وسیع ہوتے جاتے تھے۔ جس طرف رُخ کرتا ادھر فتح مندی ہاتھ باندھ کر حاضر ہوتی۔ امرا میں ایک سے ایک آزمودہ کارفن جنگ سے ماہر لوگ موجود تھے۔ ایسی

حالت میں وہ رانا کی ان زیادتیوں کو کیوں خموشی سے دیکھتا رہا؟ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ وہ ان دنوں دوسرے ملکوں کے فتح کرنے میں الجھا ہوا تھا۔ یا یہ کہ اپنے دربار کو رانا کا ہمدرد پاکر اس نے اسے پھر چھیڑنے کی جرأت نہ کی ہو۔ بہرحال اس نے طے کرلیا کہ رانا کو ان پہاڑیوں میں خاموش رہنے دیا جائے مگر اس کے ساتھ ہی نگاہ رکھی جائے کہ وہ میدان کی طرف نہ بڑھ سکے۔ اگر رانا کے بجائے کوئی دوسرا شخص ہوتا تو شاید اس آرام و سکون کو ہزار غنیمت سمجھتا اور اتنی تکلیفیں جھیلنے کے بعد اس آسائش کو تائید غیبی خیال کرتا۔

مگر اولو العزم رانا کو چین کہاں؟ جب تک وہ اکبر سے برسر کارزار تھا، جب تک اکبر کی فوج اس کی تلاش میں کوہ و بیابان سے سر ٹکراتی پھری، اس وقت تک رانا کے دل کو تسکین تھی۔ جب تک اکبر کو یہ فکر سوہان روح ہو رہی تھی اس وقت تک رانا آسودہ تھا۔ وہ سچا راجپوت تھا۔ وہ غنیم کا غصہ، قہر، نفرت، حتیٰ کہ حقارت کو بھی برداشت کرسکتا تھا۔ مگر اس کا دل کبھی اس کو گوارانہ کرسکتا تھا کہ کوئی اسے رحم سے دیکھے یا اس پر ترس کھائے۔ اس کا مغرور دل کبھی اس خیال کی تاب نہ لاسکتا تھا۔

جو دل اپنی قوم کی آزادی پر بکا ہوا ہو اسے ایک پہاڑی میں بند رہ کر حکومت کرنے سے کیا تسکین ہوسکتی تھی۔ وہ کبھی کبھی پہاڑیوں سے باہر نکل کر اودے پور اور چتور کی طرف خواہش مند، عاشقانہ نگاہوں سے دیکھتا کہ افسوس! اب یہ پھر میرے قبضہ میں نہ آئیں گے۔ کیا یہ پہاڑیاں میری امیدوں کی انتہا ہیں؟ اکثر وہ تنہا، پاپیادہ پہاڑ کے درّوں میں بیٹھ کر گھنٹوں غور کیا کرتا۔ اس کے دل میں اس وقت آزادی کا بحر ذخار جوش مارنے لگتا۔ آنکھیں سرخ ہوجاتیں رگیں پھڑکنے لگتیں۔ وہ اپنے خیال کی آنکھوں سے غنیم کو آتے دیکھتا۔ پھر خود اپنا تیغ سنبھال کر آمادۂ جنگ ہوجاتا۔ ہاں! میں بپاراول کے خاندان سے ہوں رانا سنگا میرا دادا تھا۔ میں اس کا پوتا ہوں ۔ بیر جگمل میرا ایک سردار تھا دیکھو تو میں یہ سرخ نشان کہاں کہاں نصب کرتا ہوں۔ اگر پرتھی راج کے تخت پر یہ جھنڈا نہ گاڑلوں تو میرے لیے جینا اکارت ہے۔

یہ خیالات، یہ منصوبے، یہ جوش آزادی، یہ سوزش اندرونی ہمیشہ اس کی روح کو گھلاتی رہی اورآخرش اسی آتش نہانی نے اسے قبل از وقت بستر مرگ پر سلا دیا۔ اس

کے گینڈے کے سے مضبوط اعضاء اور شیر کا سا بے خوف دل بھی اس آگ کی جلن کو عرصہ تک نہ برداشت کرسکے۔ آخری وقت تک ملک کی آزادی اور قوم کی حرّیت کا خیال اسے بندھا رہا۔ دمِ واپسیں کے وقت اس کے سردار جنھوں نے اس کے ساتھ بہت سے اچھے برے دن دیکھے تھے اس کی چارپائی کے ادھر ادھر غمناک اشک آلود کھڑے تھے۔ رانا کی ٹکٹکی دیوار کی طرف لگی ہوئی تھی۔ اور کوئی خیال اسے بے چین کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا ایک سردار نے کہا مہاراج رام نام لیجیے۔ رانا نے جان کندنی کے درد سے کراہ کر کہا ''میری آتما کو تب چین ہوگا کہ تم لوگ اپنی اپنی تلواریں ہاتھ میں لے کر قسم کھاؤ کہ ہمارا یہ پیارا ملک ترکوں کے قبضے میں نہ جائے گا۔ تمھاری رگوں میں جب تک ایک قطرہ خون بھی باقی رہے گا تم اسے ترکوں سے بچاتے رہوگے۔ اور بیٹا اَمر سنگھ! تم سے خاص طور پر التجا ہے کہ اپنے باپ دادوں کے نام پر داغ مت لگانا اور اپنی آزادی کو ہمیشہ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتے رہنا۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں عیش پرستی اور آرام طلبی تمھارے دلوں پر غالب نہ آجائے اور تم میواڑ کی اس آزادی کو ہاتھ سے دے دو جس کے لیے میواڑ کے بیروں نے اپنے خون بہائے ہیں۔'' جمیع حاضرین نے ہم آواز ہوکر قسم کھائی کہ جب تک ہمارے دم میں دم ہے ہم میواڑ کی آزادی کو نگاہ بد سے بچاتے رہیں گے۔ پرتاب کو اطمینان ہوگیا اور سرداران کوروتا بلکتا چھوڑ، روح قالب عنصری سے پرواز کرگئی۔ گویا موت نے اسے اپنے سرداروں سے یہ قسم لینے کی مہلت دے رکھی تھی۔

اس طرح اس شیر دل راجپوت کی زندگی کا خاتمہ ہوا جس کے فتوحات کے کارنامے، جس کی مصیبت کی داستانیں میواڑ کے بچے بچے کی زبانوں پر ہیں اور جو اس قابل ہے کہ اس کے نام کے مندر اور شوالے گاؤں گاؤں اور قصبوں قصبوں میں رکھے جائیں۔ اور ان میں آزادی کی دیوی کی پرستش کی جائے۔ لوگ جب ان مندروں میں جائیں تو آزادی کا نام لیتے ہوئے جائیں اور وہاں اس راجپوت کے سوانح زندگی سے سچی آزادی کا سبق سیکھیں۔

''زمانہ'' نومبر ۱۹۰۶ء

فن تصویر

شاعری کی طرح مصوّری بھی انسان کے نازک احساسات کا نتیجہ ہے جو کام شاعر کرتا ہے وہی مصور کرتا ہے۔ شاعر زبان سے مصور پنسل یا قلم سے۔ سچی شاعری کی تعریف یہ ہے کہ تصویر کھینچ دے۔ علیٰ ہذا سچی تصویر کی صفت یہ ہے کہ اس میں شاعری کا مزہ آئے۔ شاعر کانوں کے ذریعے سے روح کو مسرت پہنچاتا ہے اور مصور آنکھوں کے ذریعے سے۔ اور چونکہ قوت باصرہ بہ نسبت سامعہ کے زیادہ نازک اور ذکی الحس ہے اس لیے جو بات مصور ایک نشان، ایک خط یا ذرا سے رنگ سے ادا کردے گا وہ شاعر کے صدہا اشعار سے ادا ہوسکے گی۔ شاعر جب اپنے اشعار پڑھنے لگتا ہے تو محض زبان کو اظہار خیال کے لیے کافی نہ سمجھ کر آنکھ، ابرو اور انگلیوں سے ایسے اشارے کنائے کرتا ہے جن سے اس کے اشعار کا لطف دو بالا ہوجائے۔گویا اسے اپنامطلب ادا کرنے کے لیے تصویر نگاری کی ضرورت ہوتی ہے مگر مصور کی تصویر ہی اس کا خیال اد اکرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔

مگر جس فن کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ اس سچی تصویر نگاری کی نقل ہے چونکہ شاعر کا تعلق زبان سے ہے اس لیے اس کے دل میں بات پیدا ہوئی اور اس نے زبان سے ادا کی۔ مصوّری کے لیے نگاہ کی درستی، ہاتھ کی صفائی اورنگ آمیزی کا علم ازبس ضروری ہے اس لیے مصور ایسی آسانی سے اظہار خیال نہیں کرسکتا جیسے کہ شاعر ہر ملک کی تاریخ میں شاعری کے بہت دنوں بعد فن تصویر کو عروج ہوتا ہے۔ اطالیہ میں شاعری سن عیسوی سے قبل درجہ کمال پر پہنچ گئی تھی۔ مگر مصوری کا عروج چودہویں صدی میں ہوا، علیٰ ہذا۔ انگلستان میں ملٹن اور شیکسپیئر کے عنقریب دو صدی بعد مصوری نے زور پکڑا۔

ہندوستان میں اور فنون کی طرح مصوری بھی کمال کے درجے پر پہنچی ہوئی تھی۔

اگرچہ آج کل اس زمانہ کی تصویریں نہیں ملتیں مگر جن ہاتھوں نے ایلورا اور اجانتا کے مندروں میں جادو طرازیاں کیں ان کے کمال مصوری میں کوئی شک نہیں ہوسکتا۔ پرانے ملکوں میں مصوری کا اندازہ کرنے کے لیے لازم ہے کہ اس کی قدیم عمارتیں دیکھی جائیں۔ کیونکہ تصویریں بہت عرصہ تک اصلی آب وتاب پر قائم نہیں رہ سکتیں بلکہ مدت دراز گزر جانے پر وہ آپ ہی آپ تلف ہوجاتی ہیں۔

دورِ اکبری یا اس کے مابعد کی ہندوستانی تصاویر سے بھی یہاں کی کمال مصوری کا کسی قدر اندازہ ہوسکتا ہے ۔ گو وہ زمانہ ہندوستان کے عروج کا نہ تھا تاہم اس وقت کی تصویریں بہت ہی نادر ہیں۔ بلاشک آئین اکبری شبیہ نگاری میں انھیں کمال حاصل تھا۔ ہاں دوسرے اصناف مصوری میں انھیں بہت دسترس نہ تھا۔ اور مسافت عینی کے قواعد سے بھی وہ بہت مانوس نہ تھے۔ آئین اکبری کی تصاویر میں اگرچہ چلت پھرت، زندہ دلی، تناسب سب کچھ موجود ہے مگر مسافت عینی کا بالکل لحاظ نہیں کیا گیا۔ دروازہ کے مقابل صحن میں جس قدوقامت کی شکلیں نظر آتی ہیں اتنی ہی بڑی محل سرائے کے اندر بھی دکھائی دیتی ہیں۔ اور یہ موجودہ فن تصویر کے لحاظ سے بہت بڑا نقص ہے۔ علاوہ بریں دھوپ چھاؤں کے لحاظ سے بھی ان تصاویر میں اکثر نقائص نظر آتے ہیں۔ صحن اور محل سرائے کے اندر ایک ہی انداز اور وزن کی روشنی پائی جاتی ہے۔ یہ نقائص غالبًا اس وجہ سے پیدا ہوئے کہ ہندوستان میں فن تصویر معماری کی طرح پیشہ وروں ہاتھوں میں تھا اور وہ علمی تحقیقات سے نابلد ہونے کے باعث اپنے فن کی تکمیل میں علوم نظری کی امداد نہیں لے سکتے تھے۔ اس لیے جہاں تک ہاتھ کی صفائی کا تعلق ہے ان تصویروں میں کوئی عیب نہیں مگر سائنس کے لحاظ سے ان میں بیشتر نقائص موجود ہیں۔

اگرچہ تصویر نگاری گذشتہ کئی صدیوں سے ہمارے نصاب تعلیم کا کوئی قابل قدر جزو نہیں رہی ہے۔ مگراس میں کوئی شک نہیں کہ زمانہ عروج میں یہ فن یہاں ضرور رائج تھا۔ یورپ نے اگر تصویروں سے مذہبی عمارتوں اور کلیساؤں کو آراستہ کیا تو ہندوستان نے انھیں مراسم تمدنی میں داخل کردیا۔ شادی بیاہوں میں عورتیں اپنے ہاتھوں سے کہبر میں نقش و نگار بناتی ہیں۔ کیسا ہی غریب شخص کیوں نہ ہو مگر جب وہ اپنے بیٹے یا بیٹی کا بیاہ کرتا ہے تو اپنے دروازے پر ہاتھی گھوڑے، اونٹ، پیادوں کی تصویریں ضرور

بنواتا ہے۔ یہ تصویریں ایک روئی لپٹے ہوئے تنکے سے بنائی جاتی اور گیر و کھریا یا چانول پیس کر رنگی جاتی ہیں اور اگر چہ نہایت بیڈول، بھدی اور بدقطع ہوتی ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کسی رسم قدیم کی بگڑی ہوئی یادگاریں ہیں۔ اسی طرح ہندوؤں میں کئی ایسے تہوار ہیں جن موقعوں پر عورتیں گھروں میں دیواروں پر تصویریں بناتی ہیں اور یہ تصویریں محض جانوروں یا پھول پتوں کی نہیں ہوتی بلکہ ایک طولانی کہانی انھیں نشانات سے ادا کی جاتی ہے۔ ان میں نہ تناسب ہوتا ہے نہ دھوپ چھاؤں، نہ مسافت عینی کا کچھ لحاظ ہوتا ہے، نہ رنگ آمیزی کا۔ ہاں ان سے یہ بات یقینی طور پر ثابت ہوجاتی ہے کہ زمانہ قدیم میں اس فن کے سبھی اصناف ہمارے نسوانی نصاب تعلیم میں داخل تھے۔

یورپ میں فن تصویر کا آغاز تیرہویں صدی کے قریب ہوا، اور پندرہویں صدی تک وہاں نہ صرف نادر تصویروں کا خزانہ آباد ہوگیا بلکہ اس فن پر متعدد علمی تصانیف تیار ہوگئیں۔ جن میں لیونارڈ و ونسی کی کتاب ابھی تک باخبر حلقوں میں بہت اعزاز سے دیکھی جاتی ہے۔ اطالیہ وہ مقدس سرزمین تھی جہاں یورپی فن تصویر کا آفتاب طلوع ہوا۔ اور جہاں سے اس کی شعاعیں تین صدی تک دیگر ممالک کو منور کرتی رہیں۔ یہیں اس فن کے خدا پیدا ہوئے، ریفلی، میکائیل انجیلو، جولیو رومینو اور کریجیو جیسے جیسے نامورانِ فن اسی خاک سے اٹھے جن کی تصاویر اساتذہ حال دیکھتے ہیں اور دانتوں تلے انگلی دباتے ہیں۔ اس فن میں ان کا وہی رتبہ تھا اور وہ اسی طرح تقلید سے بالاتر ہیں جیسے ہومر، ورجل، کالی داس یا شیکسپیئر۔ ان کی تصویروں کے مقابل جاتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کسی تروتازہ باغ میں آپہنچے۔ ہاں یہ مزہ حاصل کرنے کے لیے ایک خاص تربیت حسنہ کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر اچھی تصویر سے حظ نہیں حاصل ہوسکتا۔ بعینہٖ اسی طرح جیسے بغیر شاعرانہ تربیت کے شعر کی خوبیوں کا لطف اٹھانا غیر ممکن ہے۔

اٹلی صرف شبیہ نگاری میں قانع نہیں ہوئی بلکہ اس نے فن تصویر کے ہر صنف میں رتبہ کمال حاصل کیا۔ مناظر فطرت، روایات دینی، مضامین شاعرانہ وغیرہ اصناف اس نے پیدا کیے اور انھیں پالا پوسا۔ ان میں کی بعض تصویریں ایسی مقبول ہوگئی ہیں کہ دنیا کا کوئی کونہ ان سے خالی نہیں ہے۔ ریفلی کی بے نظیر تصویر ''ابن مریم'' ہندوستان کے

ہر شہر میں، شرفا کے کمروں میں اور تمبولیوں کی دوکانوں پر یکساں زیب دیتی ہے۔ اس کی رنگت کی سادگی اور خیالات کی پاکیزگی ایسی پرلطف ہے کہ بدمذاق شخص بھی اسے دیکھ کر کچھ نہ کچھ روحانی مزہ اٹھا لیتا ہے. یہ تصویریں ایسی احتیاط سے رکھی ہوئی ہیں اور ان پر روغن ایسے پختہ اور دیرپا دیے ہوئے ہیں کہ باوجود تین صدیاں گزر جانے کے ابھی تک ان کی تازگی اور آب و تاب میں فرق نہیں آیا۔ ہاں بعض تصویریں جن کی کافی احتیاط نہ ہوسکی البتہ کسی قدر خراب ہوگئی ہیں۔ رینالڈ کہا کرتا تھا کہ وہ جن استادوں کی بنائی ہوئی ہیں وہ انسان نہیں بلکہ فرشتے تھے۔ اٹلی کا وقار سارے یورپ پر ابھی تک ایسا مسلط ہے کہ کسی ملک کا شخص اپنے فن کا استاد نہیں مانا جاتا تاوقتیکہ وہ دوچار بار اٹلی کے تصویر خانوں کا باقاعدہ مشاہدہ نہ کرلے۔ بالخصوص روم کا نگار خانہ ویٹکن تو ہمیشہ شاہدان فن کا زیارت گاہ رہا ہے۔ اس کی بنیاد پوپ لیو کے عہد مبارک میں پڑی تھی۔ اور اسی وقت سے اساتذہ باکمال اس کے محرابوں اور طاقوں کو اپنی معجزہ نگاریوں سے مزین کرنے لگے۔ دنیا میں کوئی دوسرا نگار خانہ ایسا نہیں جو وقعت و عظمت میں اس کی ہمسری کا دم بھر سکے۔ حتیٰ کہ اس کی سیر کرنے ہی سے زمانہ حال کے تصاویر پر محاکمہ کرنے کا تمغہ مل جاتا ہے۔ یورپ میں کتنے ہی ایسے قدردان پڑے ہوئے ہیں جو ان میں کی ایک ایک تصویر کے لیے دس دس لاکھ پونڈ تک دینے کو تیار ہیں۔ یہاں اساتذہ اجل نے حسن وشباب، شجاعت و مردانگی ، تقدس اور عبادت، فقر و ریاضت، عشق و محبت کے اعلیٰ ترین نمونے اپنے جادو طرز قلم سے بنا کر رکھ دیے ہیں جو مصور قدرت کی بہترین صناعیوں سے ٹکر کھاتے ہیں۔

سب فنون کا قاعدہ ہے کہ جب وہ ابتدائی مدارج طے کرکے کمال کے رتبہ کو پہنچتے ہیں تو ان میں مختلف رنگ پیدا ہوجاتے ہیں۔ ہندوستان میں فلسفہ اور دینیات کے سات رنگ موجود ہیں۔ علیٰ ہذا اردو شاعری میں دہلی اور لکھنو کے طرز جدا جدا ہیں۔ اسی طرح اٹلی میں فن تصویر کے جدا جدا رنگ ہوگئے، جن میں روم، وینس، فلورینس، اورملن بہت معروف ہیں۔ ہر رنگ کو اپنی خصوصیات پر ناز ہے، کوئی شبیہ نگاری کا دلدادہ ہے کوئی مناظر قطرت کا، کوئی مضامین شاعرانہ کا۔ ان کے تفصیل فن میں بھی اختلافات موجود ہیں اور ہر رنگ کے ساتھ اساتذہ فن کے نام وابستہ ہیں۔

روم سے فرانس، اسپین اور ڈنمارک نے سبق سیکھا اور انھیں تینوں ممالک کے چند اہل کمال نے انگلستان میں اس فن کو پھیلایا۔ اٹلی کے بعد مصوری میں فرانس کا درجہ ہے اور وہاں کا نگار خانہ ''لوور'' بھی وٹیکن ثانی ہے۔

جو فوائد بنی نوع انسان کو نظم سے حاصل ہوتے ہیں وہی فوائد تصویر سے بھی حاصل ہوتے ہیں۔ شعر ایک محبوب بالذات شے ہے۔ تصویر کی بھی یہی صفت ہے۔ شاعر کی آنکھ حسن پر لوٹ پوٹ ہوجاتی ہے، مصور تڑپنے لگتا ہے، اعلیٰ شاعری جذبات انسانی کو دکھاتی اور ہمارے دل کی نازک کیفیات بیان کرتی ہے۔ دلوں کو ابھارتی اور ہمارے خیالات کو پستی سے نکال کر بلندی پر پہنچاتی ہے۔ یعنی شاعری کا اعلیٰ ترین فرض انسان کو بہتر بنانا ہے۔ اعلیٰ مصوری بھی ہمارے سامنے معاشرت انسانی کے بہترین پہلو دکھاتی اور اچھے اچھے کاموں کے نمونے پیش کرتی ہے۔ یعنی شاعری کی طرح اس کا فرض بھی آدمی کو انسان بنانا ہے۔ بعض اوقات شاعری کی طرح مصوری بھی زمانہ کی بدکاریوں پر تازیانے لگاتی ہے مگر دونوں فنون گلدستے سجانے والے باغبان ہیں نہ کہ گھاس پات اکھاڑنے والے مالی۔

شاعری کی طرح مصوّری بھی افراد کو قومیت کی طرف لے جاتی ہے، بلکہ اس وقت ہندوستان کو شاعری سے زیادہ مصوری کی ضرورت ہے۔ ایسے ملک میں جہاں صدہا مختلف زبانیں رائج ہیں۔ اگر کوئی عام زبان رائج ہوسکتی ہے تو وہ تصویر ہے۔ یہی زبان کشمیر سے راس کماری تک ہر فرد بشر کی سمجھ میں یکساں آسکتی ہے۔ راجہ روی ورما مرحوم اگر تلنگ زبان کی شاعری کرتے تو ان کے نام سے یہ خطہ آج آشنا بھی نہ ہوتا۔ اور نہ اس سے عام قوم کا کچھ بھلا ہوتا۔ مگر ان کی تصویروں نے سارے ملک میں ایک قربت،ایک اپنائیت کا احساس پیدا کردیا ہے۔ بنگالی بھی شکنتلا کی تصویر سے اسی قدر خوش ہوتا ہے جس قدر پنجابی یا مرہٹہ ہوسکتا ہے۔ کیونکہ سب ہندو فرقوں میں کالی داس اور اس کی ہیروئن کا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ اسی طرح بے شمار ایسے مذہبی اور تمدنی مضامین ہیں جو سب ہندوستانیوں کے دلوں میں ایک ہی خیال، ایک ہی جوش، ایک ہی احساس پیدا کرسکتے ہیں اور جو تصویر ایسے پاکیزہ مضامین میں ادا کرتی ہے وہ ملک میں سچی قومیت پھیلاتی ہے۔ کیونکہ ایک ہی خیال سے موثر ہوجانے کا نام قومیت

ہے۔ کون ایسا ہندو ہوگا جو راجہ رام چندر کے بن باس پر آنسو نہ بہائے۔ سری کرشن کی بانسری کی دلکش صدا سے کسے وجد نہ آئے گا۔ دمینتی کی عصمت کی کون ہندوستانی قسم نہ کھائے گا۔ یہ تو خیر مذہبی باتیں ہیں محض ایک ہندوستانی گھرانے کی تصویر۔ ایک ہندی شوہر کا اپنی پیاری بیوی سے رخصت ہونا، ایک ہندو عورت کا اپنے پردیس جانے والے بالم کی آمد کے لیے آنچل اٹھا کر سورج سے دعا مانگنا، محض ایک ہندو لڑکے کا اپنی ماں کی گود میں کھیلنا، ایسے مضامین ہیں جو ایک جادو طراز مصور کے ہاتھوں میں سچی قومیت کے نشان بن سکتے ہیں۔

مصوری سے ہمارا منشا فوٹو گرافی ہرگز نہیں ہے۔ فوٹو گرافی سیکھنا دنوں کا کام ہے۔ مصوری برسوں کا، بلکہ مدتوں کا۔ اگرچہ آج کل فوٹوگرافی کو اس کی ارزانی کی وجہ سے بمقابلہ مصوری کے بہت فروغ ہے۔ لیکن نقادان فن فوٹو گرافی کو فن کے زمرہ میں لاتے ہی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ فوٹو گرافر بہت تھوڑے سے وقت میں اصل شے کی نقل اتار لیتا ہے۔ مگر یہ نقل بے جان، مردہ اور بے رنگ ہوتی ہے۔ فطرت کی بوقلمونی اور رنگارنگی اظہر من الشمس ہے۔ ایسی کوئی قدرتی شے نہیں جو کوئی نہ کوئی رنگ نہ رکھتی ہو۔ فوٹو گرافر اس نکتہ کو بالکل نظر انداز کر جاتا ہے۔ مثلاً اگر وہ کسی کوہستانی منظر کی تصویر اتارے تو پہاڑ کا دامن، اس کی چوٹی، اس پر کے ہرے بھرے درخت، اس کے درے اور غار اور اس کے مقابل کا وسیع اور دلکش منظر سب ایک ہی رنگ کے ہوں گے۔ آسمان بجائے نیلگوں کے زردی مائل ہوگا۔ اگر اس پہاڑ میں کوئی آبشار ہوگا تو فوٹو میں ایک سفید لکیر نظر آئے گا جس میں حرکت، تیزی اور کف نام کو نہ ہوگی۔ اس کو دیکھ کر ہم یہ نہ پہچان سکیں گے کہ یہ کس منظر کی تصویر ہے۔ خواہ وہ نظارہ ہماری نظروں میں کیسا ہی مانوس کیوں نہ ہو۔ برعکس اس کے مصور اگر اسی منظر کا سماں صبح کے وقت دکھائے گا تو پہاڑ کی چوٹیوں پر دھندلی سنہری کرنیں ہوں گی۔ دامن بالائی حصے سے کسی قدر زیادہ سیاہی مائل ہوگا۔ درخت ہرے بھرے اور زر نگار، آسمان پر شفق کی سرخی پھولی ہوئی۔ آبشار کا پانی حرکت کرتا اور لہراتا ہوا، پہاڑ کے مقابل کا میدان زردی مائل، شبنمی رنگ کا نظر آئے گا۔ اگر ہم نے کبھی اس منظر کو دیکھا ہے تو تصویر کے دیکھتے ہی فوراً پہچان جائیں گے۔ بلاشک فوٹو گرافر واقعیت میں مصور سے بڑھا

رہتا ہے۔ مگر فن وہ ہے جو فطرت کی خوبصورتیوں میں اضافہ کرے۔ حسین کو حسین تر بنائے نہ کہ حسن فطری کو اور گھٹا کر اور اسے قدرتی زیوروں سے معرا کر کے ہمارے سامنے پیش کرے۔ مصور اگر کوئی منظر دکھاتا ہے تو محض واقعیت پر قانع نہیں رہتا بلکہ وہ اپنی جدت اور قوت تمیز سے کام لیتا ہے۔ اگر کوئی بھدی چیز سامنے آ گئی ہے تو وہ اسے نظر انداز کر جاتا ہے اور کسی دوسرے منظر کی خوبصورت چیزیں ایسی خوش مذاقی سے لاکر ملا دیتا ہے کہ تصویر کی خوبی دو بالا ہوجاتی ہے۔ وہ فطرت کی نقل نہیں کرتا بلکہ فطرت کو سنوارتا اور سدھا رتا ہے۔ بے چارہ فوٹو گرافر اپنے فن کی قیود سے مجبور ہے۔ وہ نقل کرتا ہے اور نقل بھی ایسی جسے اصل سے کوئی نسبت نہیں ہوتی۔

شاعر کی طرح مصور میں بھی آمد ہوا کرتی ہے۔ مگر شاعر تو ہوش سنبھالتے ہی موزونی طبع دکھانے لگتا ہے اور بے چارہ مصور ایک مدت تک مناظر فطرت خصائل انسانی و عادات حیوانی کامطالعہ و مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ اس کے لیے ان نکات کو بہ نظر غور دیکھنے کی نسبت شاعر کے بدرجہا زیادہ ضرورت ہے۔ مصوری وہ فن ہے جس کے لیے بہت وقت، بہت فرصت، بڑی تیز نگاہ، بڑا وسیع اور روشن تخیل، بڑا درد مند اور نازک دل ہونا چاہیئے۔ان خوبیوں کے ہونے پر بھی انسان شب و روز مشق کرنے، رنگوں کے اسرار و نکات سمجھنے، اساتذہ فن کی تصویروں کو دیکھنے، اور ان کے محاسن کو سمجھنے کے بغیر اس فن میں مہارت نہیں حاصل کرسکتا۔ اس کے ایک ایک صنف بلکہ ایک ایک صنف کی ایک ایک شاخ میں کمال حاصل کرنے کے لیے ایک زندگی درکار ہے۔ کوئی مصور پھولوں کا عاشق ہوتا ہے اور وہ انھیں کے محاسن دکھانے میں اپنی زندگی صرف کردیتا ہے۔ کوئی زندگی بھر کتوں ہی کی تصویریں کھینچتا ہے۔ کسی نے بچوں کی تصویریں کھینچنا اپنی زندگی کا مشغلہ قرار دے لیا ہے اور کوئی مناظر بحری پر فریفتہ ہے۔ یہ میدان ایسا وسیع ہے کہ اس پر احاطہ کرلینا ایک آدمی کی قابلیت سے باہر ہے۔ اس کے ایک چھوٹے سے خطے کو لے لیجیے اور اسی پر اپنی عمارتیں بنائیے اور تب وہ عمارت ایسی ہوگی کہ دیکھنے والے اس کی تعریف کریں گے اور وہ عرصہ تک قائم رہ سکے گی۔

یورپ کے متعدد رسالے بالالتزام فن تصویر پر مضامین شائع کیا کرتے ہیں۔ خاص انگلستان میں ایسے کئی رسالے ہیں۔ ان مضامین کی عوام کے دلوں میں کیا وقعت ہے

وہ اس سے ظاہر ہے کہ ایسے مضامین ہمیشہ ترتیب میں ممتاز جگہ پاتے ہیں۔ وہاں کوئی اچھی تصویر نکل جاتی ہے تو چاروں طرف اس کا چرچا ہونے لگتا ہے۔ رسالے اس کی نقلیں چھاپتے ہیں۔ اس پر نکتہ چینیاں کی جاتی ہیں۔ اس کے محاسن و معائب پر مباحثے ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں اس فن کی ترقی کی یہ منزل کوسوں دور ہے۔ دیکھا چاہیے ہم وہاں کب تک پہنچتے ہیں۔

''زمانہ''

مارچ ۱۹۰۷

اردو زبان اور ناول

ابھی بہت زمانہ نہیں گزرا کہ اردو زبان میں ناول نویسی اور ناول خوانی کی دھوم تھی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولوی عبدالحلیم شرر، منشی عاشق حسین اور حکیم محمد علی یہ اسمائے گرامی انھیں دنوں کی یادگار ہیں۔ مگر ان صاحبوں میں سے بجز مولوی محمد علی کے اور کسی کو مالی فروغ نہیں حاصل ہوا۔ اور ہندوستان کے سوا دنیا کے کسی دوسرے ملک میں ان کی آمدنی بڑے بڑے راجاؤں کی آمدنی سے ٹکر کھاتی۔ تاہم ان کی کتابوں کے پڑھنے والے اور ان کی قدر کرنے والے کم نہ تھے۔ یہ لوگ اس صنف ادب میں پیش روکا کام کر گئے اردو دنیا کے لیے ناول ایک اچھوتی چیز ہے۔زبان میں ایک ایسی چیز کا رواج ہو رہا تھا جو معمولی افسانوں سے زیادہ دلآویز اور معمولی مثنویوں سے زیادہ پرلطف تھی۔ اس لیے پبلک نے حسب حیثیت ناولوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور برائے چندے ناولوں کی خوب گرم بازاری رہی۔ متذکرہ بالا مصنّفین کے سوا اور کتنے ہی درجہ دویم و سویم کے ناول نویس بھی میدان میں آئے اور اپنی یادگاریں چھوڑ گئے۔ یہاں تک کہ رینالڈس کا کوئی ناول ترجمہ ہونے سے نہ بچا۔ یہ ترجمے بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے اور ہاتھوں ہاتھ بکتے تھے۔ شاید عام اردو خواں حضرات کو انگریزی مصنّفین میں بجز رینالڈس کے اور کسی دوسرے مصنف سے مطلق دلچسپی نہ ہوگی۔ دربار لندن کے اسرار، روز البرٹ، طلسمی فانوس، حرم سرا، ایلن پری یہ کتابیں مجنونانہ جوش سے پڑھی جاتی تھیں۔ اور عبرت کو تو لوگ فسانہ نگاری کی معراج سمجھتے تھے۔ راقم کو بھی ان دنوں ناول لکھنے کی دھند سوار تھی۔ شاعری کی طرح ناول نویسی بھی بیکاری کا مشغلہ ہو رہا تھا۔ ناول کے چند صفحے لے کر ایک مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا جو اپنے تئیں شاعری کرتے تھے۔ اور نثر میں بھی دعویٰ کمال رکھتے تھے۔ نو مشق مصنفوں کو داد کلام

لینے کا خبط ہوتا ہے۔ راقم کو بھی یہی ہوس ان کی خدمت میں لے گئی۔ مگر سوال جو انھوں نے مجھ سے کیا وہ یہ تھا کہ آپ نے عبرت کا مطالعہ کیا ہے۔ راقم نے معذرتاً کہا کہ وہ کتاب ابھی نظر سے نہیں گزری۔ مولوی صاحب نے فوراً منہ پھیر لیا اور بولے پہلے اسے خوب غور سے پڑھ جایئے اور تب ناول لکھنے کے لیے قلم اٹھایئے۔ گویا عبرت ناول نہیں بلکہ ناول گر تھا اس تیز روی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہرکس و ناکس نے ناول لکھنا شروع کیا۔ اسکول اور کالج کے طلبا اور معمولی لیاقت کے لوگ جنھیں سو پچاس شعر یاد ہوگئے، قلم لے کر بیٹھ گئے، اور سامان باندھنا شروع کردیا۔ کئی کئی صفحہ تک بے سر پیر کی بکواس کے بعد بازاری حسن وعشق کا (بیقراری)قصہ چھیڑ دیا۔ موقع موقع سے اشعار چسپاں کردئے، عاشق کی بے قراری، اور معشوق کی بے نیازی دکھائی، کچھ دنوں تک جدائی کی تکلیفیں رہیں، میاں عاشق پر جنون سوار ہوگیا تب دوستوں کی ہمدردیوں نے پوشیدہ ملاقاتیں کرائیں اور عاشق و معشوق کا وصال ہوگیا۔ قصہ تمام ہوا شرؔر اور سرشاؔر کے سوا قریب قریب سبھوں نے یہی طرز اختیار کیا اسی خاکے پر ہر ایک مصنف اپنی لیاقت اور مذاق کے موافق رنگ بھر لیا کرتا تھا۔ آخر ناولوں کی ایسی افراط ہوگئی کہ پڑھنے والے تنگ آ گئے۔ من و سلویٰ بھی اگر افراط سے ملے تو اس سے طبیعت سیر ہوجاتی ہے یہ خاصہ انسانی ہے۔ سنجیدہ مذاق کے لوگوں میں رفتہ رفتہ ناول خوانی کا شوق کم ہونے لگا۔ دیکھتے دیکھتے ناولوں کا بازار سرد ہوگیا۔ حضرت شرؔر نے قصے لکھنا ترک کردیا اور جنید ومجنوں کے حالات کی تفتیش کرنے لگے۔ محمد علی صاحب نے فسانہ نگاری کو خیر باد کہہ دیا اور آج کوئی مصنف ایسا نہیں ہے جسے ہم خصوصیت سے ناولسٹ کہہ سکیں۔

اس امر کی تنقیح کہ اردو ناولوں کی بے قدری کے کون کون اسباب محرک ہوئے آسان نہیں۔ ملک کا افلاس اور ناولوں کی کثرت ایسے عام وجوہ ہیں جو ہندوستان کی ہر ایک زبان پر یکساں جاری ہیں۔بنگالی اور گجراتی پبلک اردو خواں پبلک سے زیادہ مالدار نہیں اور نہ ان خطوں میں ناول نویسوں کی تعداد اردو ناول نویسوں سے کم کہی جاسکتی ہے۔ جس زبان کے نام لیوا کڑوروں کی تعداد میں ہوں اس پر آدھے درجن ناولسٹوں کا بار ناقابل برداشت نہیں ہوسکتا مگر گجرات اور بنگال میں ناولوں کی قدر روز بروز

زیادہ ہوتی جاتی ہے اور اردو کی کیفیت بالکل برعکس ہے۔ آج شررؔ کے ناول بہت کم پڑھے جاتے ہیں اور عبرت کی طرف بہت کم کسی کی نگاہ عبرت پڑتی ہے۔ فسانہ آزاد کی بھی آج اتنی قدر نہیں ہے جتنی آج سے کئی سال پہلے تھی۔ رینالڈس کے ترجمے بھی کم وبیش ناقدری کی زد میں آگئے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سرد بازاری کے خارجی اسباب سے قطع نظر کرکے معنوی اسباب ڈھونڈھنے کی کوشش کی جائے۔

اردو ناولوں کے حسن و قبح پر اس کے قبل بعض ادبی اخبارات میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ افسانہ خواں طبقے کی تعداد دو بڑے حصوں میں منقسم کی جاسکتی ہے۔ ایک عامیانہ مذاق والے اور دوسرے سنجیدہ مذاق والے، اردو ناول ان دونوں کو مایوس کردیتا ہے۔ نہ الجھی ہوئی سین بندیوں، اور پیچیدہ ترکیبوں کا لطف عامیانہ مذاق کو آتا ہے۔ اور نہ سطحی خیالات و جذبات، اور بسا اوقات اخلاق سے گرے ہوئے کیرکٹر سنجیدہ مذاق کو پسند آتے ہیں۔ عامیانہ مذاق چاہے موزوں اشعار پر لوٹ بھی جائے مگر مذاق متین کی ضیافت کا سامان بہت کم کسی ناول میں نظر آتا ہے۔اردو کا چارلس ڈکنس موجود ہے، مگر اردو کا ٹھیکری، چارلس ریڈ، میری کارلی، جارج الیٹ ابھی وجود میں نہیں آئے۔ اس بے قدری کی ایک اور وجہ ہے، اردو ناول نویس اب تک بجز سرشار کے تقریباً سب مسلمان تھے۔ اور انھوں نے اپنی کتابوں میں اس ہندوجذبہ کی مطلق پروا نہیں کی جو مسلمان ہیرو اور ہندو ہیروئن کے تعشق سے پیدا ہوتا ہے۔ کچھ دن ہوئے ''ہندوستان ریویو'' میں ایک مسلمان نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ اکثر بنگالی ناولوں میں ہندو ہیرو اور مسلمان ہیروئن کا جوڑ ملایا گیا ہے جسے پڑھ کر مسلمانوں کے خون میں جوش آجاتا ہے۔ اردو کے کئی مشہور ناولوں میں اس لغویت کی بالکل پرواہ نہیں کی گئی۔علاوہ بریں اب ناول میں یہ ثابت کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ عالم شباب میں شادی نہ کرنے سے کیا کیا اخلاقی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔یا پردہ کرنے سے کیا کیا نقصان ظہور میں آتے ہیں یا صغر سنی کی شادی کہاں تک مضر ہے۔ یہ مسائل اب بحث و مباحثہ کی منزلیں طے کرچکے اور امر مسلمہ کے درجہ تک پہنچ گئے۔ صفت تو یہ ہے کہ ہمارے فسانہ نگاروں کو ایسے مسائل پر ناول لکھنے کی جرات کیوں ہوئی اگر ایک ناول نویس یہ دکھا سکتا ہے کہ پردہ کرنے سے نقصانات پیدا ہوتے ہیں تو دوسرا اس منطق

سے اس کی ضد پایہ ثبوت کو پہنچا سکتا ہے ۔ اب وہ زمانہ گیا جب ان مباحث کو لوگ ناولوں میں ڈھونڈا کرتے تھے۔ ایسے اخلاقی مسائل کا تصفیہ افسانہ گو کی اخلاقیوں سے نہیں ہوا کرتا لیکن ناولوں کی اس کشادہ بازاری کا خیر مقدم کرنے کے لیے ہم تیار ہوجاتے اگر اس کا اثر ہماری ناول نویسی کا معیار اونچا کردیتا۔ اگر افسانہ نگار طبائع انسانی کے سچے نمونے پیش کرنے لگتے۔ بدقسمتی سے اس کا اثر ناولوں کو ملک عدم کی طرف لے جا رہا ہے۔ ۱۹۰۹ ء کے اردو مطبوعات کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صوبہ میں صرف دو ناول شائع ہوئے۔ یہ صوبہ اردو زبان کا مرزبوم ہے۔ جب یہاں یہ کیفیت ہے تو اور مقامات کا کیا ذکر۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان کے شیدائی، اور معاونین اس خیال کو دور کرنے کی کوشش کریں کہ ناول پڑھنا لغو محض اور تضیع اوقات ہے۔ جس طرح ہر ایک صنف کلام میں اعلیٰ ادنیٰ کی قید لگی ہوئی ہے اس طرح ناولوں کی کیفیت سمجھنا چاہیے۔ اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ ادبی دنیا میں قصہ کا وہی رتبہ ہے جو کسی محفل میں صدر مجلس کا۔ کسی زبان کا ادب لے لیجئے۔ افسانہ کا رنگ غالب نظر آئے گا۔ قصہ کا رنگ مذہب، اخلاق، سیاست غرض جمیع مشاغل زندگی پر حاوی نظر آتا ہے۔ قصوں کے ذریعے سے اخلاق کی تزئین، معرفت کے رموز، تاریخ کے انقلابات زمانہ قدیم سے ظاہر ہوتے چلے آئے ہیں۔ عربی ادب کا نام ایک قصہ الف لیلیٰ سے روشن ہے۔ عربی ادب کا نام ایک قصہ الف لیلہ سے روشن ہے۔ ہارون رشید کے زمانہ کے طرز تمدن، طرز سیاست، طرز تعلیم، اخلاق و آداب کی اس سے بہتر تاریخ نہیں مل سکتی۔ عربی ادب کے شعرا، فلسفہ نگار، مورخین کسی کے نام سے دنیا آشنا نہیں ہے۔ مگر الف لیلہ کی داستان شاید ہی کسی بدقسمت شخص کی نظر سے نہ گزری ہو۔ اردو میں بنگلہ ادب سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے مگر بنکم بابو کا نام ہر شخص جانتا ہے۔ گوبندرام ترپاٹھی کا جو گجراتی زبان کے مشہور و معروف ناول نویس تھے۔ پچھلے سال جب انتقال ہوا تو ایک گجراتی رسالے نے ایک کارٹون کے ذریعہ سے دکھایا تھا کہ گجراتی ادب کا آفتاب غروب ہوگیا۔

جس طرح بنکم بابو بنگلہ ادب کے بادشاہ تھے اسی طرح گوبند رام گجراتی ادب کے تاجدار تھے۔ علیٰ ہذا اور مثالیں بھی دی جاسکتی ہیں جن سے معلوم ہوجائے گا کہ

ناول نویس کا رتبہ ادبی دنیا میں کیا ہوتا ہے۔ انگریزی زبان کو لے لیں، ڈکنس اور ٹھیکری، اسکاٹ اور الیٹ کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ شیکسپیئر کو بھی نصیب نہیں۔ سر جان لیک نے اپنی ایک کتاب میں دنیا کے بہترین سو کتابوں کی فہرست دی ہے۔ اسکاٹ کے سب قصے اس میں موجود ہیں، لارڈ بیکنفیلڈ جو ملکہ وکٹوریہ کے زمانہ میں کئی بار وزیر اعظم رہے لارڈ لٹن جو ہندوستان کے وائسرائے رہ چکے ہیں انگریزی ادب کے رکن سمجھے جاتے ہیں۔ اور یہ دونوں اعلیٰ پایہ کے ناولسٹ ہیں۔ آپ کی کانگریس کی پریسیڈنشل تقریر میں آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی نے رومیش چندر دت مرحوم کے وفات پر اظہار ماتم کرتے ہوئے ان کی ادبی خدمات کو ان کے ملکی اور سیاسی خدمات پر ترجیح دی تھی۔ کسی صوبہ کا کمشنر ہونا، کسی ریاست کا دیوان بن جانا ہر ایک شخص کے حیطہ اقتدار میں ہے مگر ''فاتح بنگال'' اور ''سنسار'' لکھ لینا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ بنگلہ ادب کے موجودہ صدر نشین بابو ربندر ناتھ ٹھاکر ہیں اور وہ اعلیٰ پایہ کے ناولسٹ ہیں۔ گیٹے جرمن زبان کا سب سے مشہور مصنف ہے اور وہ ناولسٹ ہے۔ کاؤنٹ ٹالسٹائی روس کے موجودہ ادب کے بادشاہ ہیں اور وہ ناولسٹ ہیں۔ ان مثالوں سے یہ کافی طور پر واضح ہوگیا ہوگا کہ ناول نویس کا رتبہ ہر ایک زبان کے ادب میں سب سے زیادہ ممتاز ہوتا ہے۔اور ادبی دنیا اس کے احسانات و خدمات کے بوجھ سے سبکدوش نہیں ہوسکتی۔ ایسی حالت میں کیا یہ افسوس اور عبرت کا مقام نہیں ہے کہ اردو زبان میں ناول اور ناول نویسی کی یہ بے قدری ہو رہی ہے۔ اس میں زیادہ قیل و قال کی گنجائش نہیں ہے کہ ہندوستان کی دیگر زبانوں کی طرح اردو میں بھی قدیم طرز کے افسانوں کا نعم البدل ناول ہی رہے گا گویا ناول ادب کا وہ اہم ترین حصہ ہے جسے افسانے کہتے ہیں۔ کیا حامیان اردو اپنے ادب کا اس بے دردی سے گلا گھونٹیں گے کہ دنیا تخیل میں مشرق ہمیشہ سے مغربی اقوام کا محسود رہا ہے۔ وہ بلند پردازیاں،وہ وسعت خیال، وہ بندش کی رنگا رنگی جو مشرقی افسانوں میں نظر آتی ہے مغربی قصوں میں عنقا کا حکم رکھتی ہے۔ یورپ باوجود اس قدر ادبی مزاولت کے آج تک الف لیلہ کا ثانی نہ پیدا کرسکا، قصہ حاتم طائی ایک عام کتاب ہے مگر مغرب میںشاید ہی کسی نے ایسا دلآویز قصہ لکھا ہو۔ باغ و بہار بھی اپنے طرز کی بے نظیر کتاب ہے۔ کیا دلدادگان اردو افسانہ نگاری کی

بے قدری کرکے ایسے ادبی معجزات کے لیے میدان باقی نہ رکھیں گے۔

یہاں پر اس خیال کے تردید کرنے کی بھی ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ قصہ خوانی ایک فضول عادت ہے۔ بعض اصحاب فرماتے ہیں کہ ناول خوانی سے مذاق بگڑتا ہے اور طبیعت میں کسی ادق مسئلہ پر غور کرنے کی قابلیت نہیں باقی رہتی۔ ان اصحاب سے ہم صرف یہ عرض کریں گے کہ آپ فطرت کے قواعد کلیہ کونظر انداز نہ کریں۔ اچھی سے اچھی چیز کا بے جا استعمال بھی مضر ہوتا ہے۔ لقمہ لطیف بھی اعتدال سے زائد ہوجائے تو معدہ کو سنگین کردیتا ہے۔ اگر کسی شخص کو خدا نے نظر تمیز نہیں عطا کی تو اس میں جنس کا کیا قصور ہے۔ اچھے برے کی تمیز ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہئے۔ ناول ہی پر کیا فرض ہے۔ ادنیٰ قسم کی شاعری اونی مذاق کا فلسفہ، تعصب سے بھری ہوئی تاریخ سبھی اپنے اپنے دائرہ میں نقصان دہ ہوجاتے ہیں مگر اس خیال سے شاعری فلسفہ یا تاریخ کو عضو بیکار نہیں سمجھا جاتا پھر ناول نے کیا گناہ کیا ہے کہ اس میں اچھے برے کی قید ہی نہ رکھی جائے۔اعلا مذاق کا ناول انسان کی عادت پر بدر جہا زیادہ اخلاقی اثر پیدا کرتا ہے جتنا کہ کوئی فلسفیانہ، مورخانہ یا شاعرانہ تصنیف کرسکتی ہے۔ دنیا کی تاریخ تمدن میں بعض اوقات ناول نے ایسے ایسے معرکے کے مسئلے طے کردئے ہیں جن پر ملی مدبر فلاسفر اور مورخ مدتوں تک سر کھپایا کیے۔ غلامی کی قبیح رسم کا انسدادایک ناول ہی کی بدولت ہوا۔ ابھی حال ہی میں ہیگ میں پیس کانفرنس کا جلسہ ہوا جس کا مدعا یہ تھا کہ دول یورپ میں باہمی صلح و آشتی کی کوشش کی جائے اس کوشش میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے کانفرنس کو سب سے زیادہ مفید یہی تجویز معلوم ہوئی کہ صلح پر ایک پرزور ناول لکھا جائے۔ اس کے لیے پانچ ہزار پونڈ صلہ قرار پایا۔ یہ ناول ہالینڈ کی ایک مصنفہ نے آرمس ڈاؤن کے نام سے لکھ کر گراں بہا عطیہ حاصل کیا۔ ان دو انگریزی الفاظ کے معنی ہیں تیغ در نیام۔ اس کانفرنس میں دنیا کے سربرآوردہ اقوام کے وکیل شامل تھے۔ ان کے ذرائع لامحدود تھے۔ وہ اس موضوع پر فلسفیانہ شاعرانہ، مورخانہ، غرض ہر ایک صنف کی تصنیف لکھوا سکتے تھے مگر انھیں ناول ہی سب سے زیادہ کارگر معلوم ہوا جو لوگ سب ناولوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں وہ غالبًا یہ فراموش کرجاتے ہیں کہ تاریخ یا پالیٹکس یا فلسفہ کا مطالعہ ہر خاص و عام کے لیے ممکن نہیں۔

دنیا میں زندگی کی زبردست کشمکش ہو رہی ہے انسانی آبادی کا بیشتر حصہ کسب معاش کی فکر میں پریشان رہتا ہے۔ سارے دن اور کچھ رات گئے تک ہمارے دل و دماغ کا عطر سا نکلتا رہتا ہے۔ ایسی حالت میں فلسفہ پالیٹکس یا تاریخ کا مطالعہ بجائے دلچسپی کے خود ایک ریاضت شاقہ ہوجائے گا۔ جنھیں فرصت ہے جنھیں ہوا دار کمروں میں آرام کرسیوں پر لیٹے لیٹے یادن بھر میں دو چار گھنٹوں کی سیر سپاٹے کے بعد لقمہ لطیف کھانے کو مل جاتا ہے ان کے لیے تاریخ، فلسفہ، جغرافیہ، ریاضی، منطق، سب کچھ زیبا ہے، مگر ایسے لوگ کتنے فیصدی ہیں آبادی کا بہت بڑا حصہ وہی ہے جسے چوبیس گھنٹوں میں بارہ گھنٹے فکر معاش کی نذر کرنا پڑتے ہیں۔ یہ غریب یا تو ناول پڑھ سکتے ہیں یا کچھ نہیں پڑھ سکتے۔ یہی سبب ہے کہ آج یورپین زبانوں میں سائنس، فلسفہ اور تاریخ کے اکثر موضوع پر ناول لکھے جاتے ہیں تاکہ انسانی آبادی کا یہ مصروف حصہ ان مسائل سے بالکل غیر مانوس نہ ہوجائے اور علم کے خشک مسئلے اقل درجہ کی دماغی کاوش سے اس کے ذہین نشین ہوجائیں ۔ اہل یورپ نے ناول کو ادب کا سب سے ضروری صیغہ تسلیم کرلیا ہے اور ناول نویسی کو سائنس کا رتبہ دے دیا ہے۔ افسوس ہے کہ اردو پبلک یورپین علم ادب کی رفتار سے بے خبر ہے۔

ناول نویسوں کو بھی خیال رکھنا چاہیے کہ اردو ناول کا مستقبل ان کے ہاتھ میں ہے انھیں استادان فن کی تصانیف کا غور سے مطالعہ کرنا چاہئے۔ ان کا فرض ہے کہ طبائع انسان کا نظر غائر سے مشاہدہ کریں اور سچے جذبات کے نمونے پیش کریں۔ پبلک کا ادبی معیار روز بروز اونچا ہوتا جاتا ہے اور انگریزی تعلیم یافتہ لوگ اپنی زبان میں بھی وہی خوبیاں دیکھنے کے متمنی ہیں جن کی ان کی نگاہیں عادی ہو رہی ہیں۔ بندشوں میں جدت، خیالات میں تازگی، جذبات میں عمق یہ اچھے ناول کے ضروری لوازم ہیں۔ بنگلہ زبان کے ناولوں کا مطالعہ ان کے لیے بہت سبق آموز ثابت ہوگا۔ ناول لکھنا آسان کام نہیں ہے۔ شاید کسی صنف ادب میں اس قدر جذب خیال، اس قدر دماغی انہماک اور اس قدر زور تخیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انھیں راتیں خیال میں ڈوب کر کاٹنی ہوں گی۔ انھیں صبح و شام تنہا پر فضا مقامات کی سیر کرنی ہوگی انھیں اساتذہ قدیم کے کلام کی خوشہ چینی کرنی ہوگی۔ تب کہیں ان کے قلم سے پرزور ناول نکلے گا۔ اب

وہ زمانہ نہیں رہا جب پبلک بے دلانہ کوششوں سے آسودہ ہوجاتی تھی۔ پبلک کی نقادانہ نگاہ اب پختہ ہوتی جاتی ہے۔ ہمارے ناول نویس اگر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انھیں زمانہ کے ساتھ ساتھ قدم بڑھانا چاہتے۔

''ادیب'' اگست ۱۹۱۰ء

گیری بالڈی

جوزف گیری بالڈی کی طرح غلامی سے آزاد کیا تاریخ کے ان چند ناموروں میں مل جاتی تھیں۔ اور اولوالعزمانہ حب وطن کے لیے دنیا کے محسنون وقت میں اپنی مادر مہربان کا سچا شیدائی تھا۔ اور جب تک زندہ رہا نہ صرف اپنی قوم اور ملک کوعروج کے اعلیٰ مدارج پر پہنچانے کی کوشش کرتا رہا بلکہ دیگر پامال اقوام کو بھی غار پستی سے نکالنے میں منہمک رہا۔ گیری بالڈی کا سا فراخ دل اور انسانی ہمدری سے معمور شخص تاریخ میں بہت شاذ نظر آتا ہے جو جھونپڑے میں پیدا ہوا جس کی صداقت اور جوش نے اسے ساری قوم کا منظور نظر بنا دیا۔ اور جس کی تعریف و توصیف میں ساری مہذب دنیا یکساں ہم آواز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی ذات میں کمزوریاں بھی تھیں ایسا کون سا انسان ہے جو کمزوریوں سے پاک ہو مگر ان کمزوریوں سے اس کی شہرت اور نیک نامی میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں آتا۔ اس کے ارادوں کی صفائی اور بے غرضی پر کبھی کسی کو شبہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اگر وہ چاہتا تو اس مقبولیت عام کی بدولت جو اسے حاصل تھی نہ صرف دولت و ثروت کے اعلیٰ ترین منازل پر پہنچ جاتا بلکہ صاحب علم اور بالک پیم بن جاتا۔ مگر اس کی ذات ایسی خود غرضیوں سے پاک تھی۔ جب اس کی کوششیں بارآور ہوگئیں جب خستہ حال اورپامال اٹلی نے طوقِ غلامی کو نکال پھینکا تو وہ خاموشی سے اپنے وطن لوٹ آیا، اور گنج عافیت میں بیٹھ کر بقیہ زندگی پیشہ زراعت میں کاٹ دی۔ ایسی مثالیں کم ہیں جن میں اس کی سی جرأت اور بسالت موجود ہے۔ مگر وہ صفت جس نے اسے قوم اطالیہ کے لازوال شکریہ کا مستحق بنا دیا ہے وہ اس کی بے داغ نیک نیتی اور بے لوث پاکیزگی ہے۔

گیری بالڈی ۲۲رجولائی ۱۸۷۰ء میں بمقام نائس پیدا ہوا، اس کا باپ ایک ادنیٰ

درجہ کا جہازران تھا، جو نامساعدت روزگار کے باعث عسرت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ ہاں اس کی ماں بڑی نیک ذات اور خوش خصال بیوی تھی۔ عسرت وہ بلائے بد ہے کہ انسان کے بہت سے ذاتی محاسن پر پردہ ڈال دیتی ہے مگر اس تنگ حالی میں بھی یہ عورت بڑی قناعت اور اطمینان سے گزران کرتی تھی۔ اچھی ماؤں سے ہمیشہ اچھے بیٹے پیدا ہوا کیے ہیں۔ ناموروں میں بیشتر ایسے ہیں جن کے دلوں میں ان کی ماؤں ہی کی خوبیوں اور اوصاف حسنہ نے نیک ارادوں اور بلند حوصلوں کے بیج بوئے۔ گیری بالڈی بھی اپنی ماں کے محاسن ذاتی سے بہت متاثر ہوا۔ وہ خود لکھتا ہے۔

''وہ محبت خالص جو مجھے اپنے ملک کے ساتھ ہے اور جس نے مجھے اپنے بدقسمت ہم وطنوں کا ہمدر بنا دیا ہے اس کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب میں اپنی غریب ماں کو غرباء کے ساتھ ہمدردی اور خستہ حالوں پر رحم کرتے ہوئے دیکھتا تھا۔ میں باطل پرست نہیں ہوں لیکن میں اقرار کرتا ہوں کہ سخت سے سخت مصیبت کے وقت جبکہ سمندر میرے جہاز کو غرقاب کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اور اسے کاغذکی ناؤ کی طرح تلے اوپر اچھالتا تھا۔ یا جب ہوا کی سنسناہٹ کی طرح بندوق کی گولیاں میرے کان کے پاس سے سنساتی ہوئی نکل جاتی تھیں اور اولے کی طرح میرے سر پر گولے برس رہے تھے، اس وقت میں اپنی مادر مہربان کو ہمیشہ اپنے بیٹے کے لیے درگاہ خدا میں سر بسجود اور دست بدعا دیکھتا۔ میری وہ جرأت اور دلیری جس پر اکثر لوگوں کو حیرت ہوتی ہے اس مضبوط عقیدہ کے باعث ہے کہ میرے اوپر کوئی بلا نہیں نازل ہوسکتی جب تک ایسی پاکباز اور فرشتہ خصال عورت میرے لیے دعا کرتی ہے۔''

بچپنے ہی سے گیری بالڈی کی خلقی بے خوفی اور آزاد روی اور حاجت مندوں کے ساتھ درد مندی اور رحم کا اظہار ہونے لگا۔ آٹھ سال کابھی نہ ہونے پایا تھا کہ ایک عورت کو ڈوبتے دیکھ کر مردانہ وار دریامیں کود پڑا اور اسے دہن اجل سے صاف نکال لایا۔ اس کے چند سال بعد ایک بار جبکہ اس کے چند احباب سیرو تفریح کے لیے کشتی پر گئے ہوئے تھے سخت طوفان آیا اور کشتی کے چادر آب میں ڈھک جانے کا اندیشہ

ہوا۔ گیری بالڈی کنارے سے یہ کیفیت دیکھ رہا تھا، فوراً کمر ہمت باندھ کر پانی میں کود پڑا، اور کشتی کو صحیح و سالم ساحل تک لایا، اس کی جرأت اور انسانیت کی صدہا روایتیں زبان زد خاص و عام ہیں۔ یہی اوصاف تھے جنھوں نے بعد کو اسے قوم کا ناخدا اور مایۂ ناز بنا دیا۔

والدین گو غریب تھے، مگر بیٹے کی ذہانت و ذکاوت دیکھ کر اسے اچھی تعلیم دلوائی اور ان کی خواہش تھی کہ وہ وکالت کا پیشہ اختیار کرے۔ مگر ایک ایسے نوجوان کو جسے جہاز رانی اور سپہ گری کی دھن سوار تھی مقدموں کے ثبوت ڈھونڈھنے اور پرانی کرم خوردہ نظیریں تلاش کرنے میں دلچسپی نہ ہوسکتی تھی۔ اس لیے اس نے سارڈینیا کی بحری فوج میں ملازمت کرلی۔ اور کئی برس تک یہاں اس مستقل مزاجی اور جفا کشی کے سبق سیکھتا رہا جس نے آگے چل کر اس کے قومی آرزوؤں کے پورے ہونے میں بڑی مدد دی۔

اس زمانہ میں ملک اٹلی کی حالت بہت ابتر ہو رہی تھی۔ شمال آسٹریا کے مظالم سے نالاں تھا، جنوب میں نیپلز کے بدعتوں کی دھوم تھی۔ وسط میں پوپ نے اندھیر مچا رکھا تھا اور مغرب میں پیڈ مانٹ کے جور و جفا کا علم بلند تھا۔ مگر چوطرفہ قومی بیداری کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ اور نوجوانوں کے دلوں میں اپنے قوم کو ان مظالم سے آزاد کرانے، اٹلی کو ایک قومی گورنمنٹ بنانے اور اسے سربرآوردہ اقوام کے زمرہ میں لانے کی تحریک شروع ہو رہی تھی۔ یہ جوش محض تعلیم یافتہ طبقہ تک محدود نہ تھا بلکہ جمہور میں بھی اس آزادی کا جوش جس نے فرانس کے شاہی حکومت کا شیرازہ بکھیر ڈالا تھا پیدا ہو چلا تھا۔ ہمدردان قوم نے ''ینگ اٹلی'' نام کی ایک انجمن قائم کر رکھی تھی جس کی روح رواں میزینی جیسا سچا محبِ وطن تھا۔ چنانچہ کامیابی کے لیے بہت سے وسائل اور ذرائع سوچنے کے بعد ۱۸۳۲ء میں اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ملک میں گورنمنٹوں کے خلاف شورش برپا کردی جائے اور اس کا آغاز پیڈ مانٹ سے ہو۔ گیری بالڈی کو یہ خبر سن کر کب ضبط ہوسکتا تھا۔ فوراً ملازمت سے مستعفی ہوکر میزینی کی اعانت کے لیے جا پہنچا مگر غالباً مصالحہ پکا نہ تھا بھنڈا پھوٹ گیا اور جماعت منتشر کردی گئی۔ میزینی تو گرفتار ہوگیا گیری بالڈی کسی طرح بچ نکلا مگر اس کی بے چین طبیعت کو چین کہاں؟ ہمیشہ درپردہ رسل و رسائل کے ذریعہ آگ بھڑکاتا رہتا تھا۔ دو برس بعد پھر ایک

جماعت تیار کی مگر اب کی خود گرفتار ہوگیا۔ حاکم وقت نے سزائے موت کا مستوجب ٹھہرایا۔ قریب تھا کہ اسے اپنے نیک ارادوں کے لیے شہید ہونا پڑے کہ جان براری کی صورتیں نکل آئیں۔ بھاگ کر فرانس آیا، اور طونس ہوتا ہوا جنوبی امریکہ میں داخل ہوگیا۔ یہاں ان دنوں کئی قومیں اپنی حکمراں طاقتوں سے آزادی کے لیے آمادۂ جنگ و پیکار تھیں۔ گیری بالڈی نے باری باری سے ان کی اعانت کی۔ چھوٹی چھوٹی فوجیں لے کر برسوں تک کوہ و بیابان میں لڑتا رہا۔ اس کی عصمت مآب اور وفادار بیوی انتیا ان تمام مصائب سفر وحضر میں اس کے ساتھ رہی۔ اس ایام میں اسے جنگی امور میں اس درجہ مصروفیت رہتی تھی کہ چار برس تک ایک روز بھی آرام سے بستر پر لیٹنا نہ نصیب ہوا۔ جب نیند کا غلبہ ہوتا گھوڑے کی پشت پر سر نیچا کر لیتا۔ زیادہ مہلت ہوئی تو زمین پر دراز ہوجاتا۔ اس سے زیادہ قابل تعریف انتیا کا استقلال ہے جو شوہر کی خاطر یہ تمام مصیبتیں اور صعوبتیں جھیلتی تھی اور حرف شکایت زبان پر نہ لاتی تھی۔

اگرچہ ''ینگ اٹلی'' اور اس کے زیادہ تر شرکاء جن میں میزینی بھی شامل تھا جلاوطنی کے مصائب جھیل رہے تھے مگر ان کے خیالات خفیہ تحریروں کے ذریعہ سے عوام میں آزادی کی روح پھونکتے جاتے تھے۔ کئی بار کے ضعیف اظہاروں کے بعد آخر ۱۸۴۸ء میں جوش بھڑک اٹھا۔ کئی شہروں میں رعایا نے آزادی کے علم بلند کردیے۔ اور میلان اور جنیوا میں آسٹریا کی فوجوں کو شکست بھی ہوگئی۔ پیڈمانٹ کے حکمراں شاہ البرٹ نے پہلے تو آسٹریا کے خلاف اس باغیانہ جوش کو بہت سختی سے زیر کرنے کی کوشش کی۔ مگر جب ان کوششوں میں کامیاب نہ ہوا اور رعایا کا جوش بڑھتا ہی گیا تو اس خوف سے کہ مبادا اس کی رعایا بھی شرو فساد پر آمادہ ہوجائے خفیہ طور پر باغیوں کی مدد کرنے لگا۔ پوپ نے بھی مصلحت وقت یہی دیکھا کہ رعایا کی مخالفت نہ کی جائے۔ جب ان شورشوں کی حوصلہ بخش خبریں سمندر کو پار کرکے امریکہ پہنچیں تو اس غربت زدہ جان نثار قوم کے دل میں پھر جوش حب وطن موجزن ہونے لگا اس کے ساتھ اس وقت تراسی آدمیوں سے زائد نہ تھے۔ اسی قلیل جماعت کے ساتھ وہ شیرانہ وار اپنی مہم پر چل کھڑا ہوا۔ روانگی کے وقت ان آدمیوں میں سے کتنوں ہی کے حوصلے پست ہوگئے کہ کجا ہم اور کجا آسٹریا اور دیگر دول یورپ کے متفقہ فوجیں۔ صرف ۵۶ آدمی بچ رہے۔ مگر

گیری بالڈی کا حوصلہ دبنا جانتا ہی نہ تھا۔ اس کے استقلال نے ذرا بھی جنبش نہ کھائی۔ انھیں ۵٦ آدمیوں اور چند بندوقوں کے ساتھ وہ ایک جہاز پر عازم اٹلی ہوا۔ یہاں جس جوش و خروش سے اس کا خیر مقدم کیا گیا وہ اس بات کا ثبوت تھا کہ قوم میں جانداری اور روحانی آزادی کا سچا جوش نفوذ کرگیا ہے۔

گیری بالڈی نے پہلے پوپ کے دربار میں ملازمت کی استدعا کی اس نے پوپ کے متعلق جو افواہیں سنی تھیں ان سے اس کو یقین تھا کہ وہ ضرور میری خدمات قبول کرے گا۔ اور مجھے آسٹریا والوں کی سرکوبی کا اچھا موقع ہاتھ آئے گا۔ مگر پوپ کے نیک ارادوں کی قلعی بہت جلد کھل گئی۔ اس نے نہ صرف گیری بالڈی کی خدمات نہ قبول کیں بلکہ چند ایسی حرکتیں کیں جن سے ظاہر ہوگیا کہ وہ سگ زر وبرادر شغال سے کم نہ تھا۔ ادھر سے مایوس ہوکر گیری بالڈی نے پیڈ مانٹ کے بادشاہ کی خدمت میں اپنا تیغہ پیش کیا۔ یہ وہی حضرت تھے جنھوں نے پہلے گیری بالڈی کو باغیانہ سازش کی پاداش میں سزائے جلاوطنی دی تھی۔ اب عام جوش کی مخالفت میں اپنی سلامتی نہ دیکھ کر آسٹریا سے علانیہ مخالفت کرنی شروع کی تھی۔ مگر غالبًا یہ زیادہ تر رعایا کو دھوکہ میں ڈالنے کے لیے تھا۔ گیری بالڈی کو یہاں سے بھی صاف جواب ملا۔ اسی اثنا میں شورش عام سے خائف ہوکر پوپ نے راہبانہ لباس اتار پھینکا اور روم سے بھاگ نکلا۔

پوپ کے مفرور ہونے کی خبر جوں ہی مشہور ہوئی کہ جلاوطن ہمدردان قوم اپنے اپنے پوشیدہ مقامات سے نکل کر روم کی طرف دوڑے۔ اور وہاں ایک پارلیمنٹ قائم ہوئی جو چند روزہ ہونے کے باعث عارضی گورنمنٹ کہلاتی ہے۔ یہ دن اٹلی کی تاریخ میں مبارک تھا۔ رعایا فرط مسرت سے پھولے نہ سماتی تھی۔ اس گورنمنٹ نے گیری بالڈی کی خدمات بہت خوشی سے قبول کیں اور وہ والنٹیروں کی ایک جماعت لے کر سیدھا شمال کی طرف چلا۔ یہاں متعدد مواقع پر اس نے سپاہیانہ جاں فروشی سے جو کام کیے ان پر بہادر سے بہادر سپاہی کو ناز ہوسکتا ہے۔ متواتر کامیابیوں سے اس کی شہرت روز افزوں ہوتی گئی اور قوم کے دلوں میں وقار جمتا گیا۔ اس کی عادت غنیم کی افواج کا اندازہ کرنے کی نہ تھی اور اپنے جاں نثاروں کی جمعیت کا بھی وہ کچھ خیال نہ کرتا۔ اس کا طریق عمل یہ تھا کہ جہاں دشمن کو سامنے دیکھا اور ٹوٹ پڑا۔ اس میں وہ ذرا

بھی پس و پیش نہ کرتا۔ اور اس کے یلغاروں میں کچھ ایسا زور ہوتا تھا کہ قریب قریب کل موقعوں پر اس کی یہ حکمت کارگر ہوتی رہی۔ اپنے سے دس گنی افواج کو جو سامان جنگ سے لیس ہوتی تھیں اس نے بارہا اپنے خام کار، نو آموز رنگروزوں سے ہرا دیا۔ اس کا باعث یہ تھا کہ اس کی جماعت کا ایک ایک متنفس نشۂ قومیت سے مخمور ہوتا تھا۔میلان کے باشندوں نے آسٹریا کی بہت پرزور مخالفت کی تھی۔ اس لیے آسٹریا کے غصہ کا آماجگاہ بھی وہی بنا ہوا تھا۔ گیری بالڈی اس کی محافظت میں سرگرم تھا کہ روم سے خوفناک خبریں آئیں۔ میزینی بھی سوئٹزر لینڈ سے وطن کو آرہا تھا۔ میلان میں دونوں ہمدردان قوم مدت دراز کی مفارقت کے بعد پھر بغل گیر ہوئے اور ساتھ ساتھ روم کی طرف چلے کہ وہاں پارلیمنٹ کے آئین و قوانین منضبط کریں اور ملک کو بے امنی و طوائف الملوکی کی مصیبتوں سے بچائیں۔

روم اس وقت ہر چہار طرف سے باد حوادث کا شکار ہو رہا تھا۔ قومی گورنمنٹ جو قائم کی گئی تھی ابھی مستقل طور پر جمنے نہ پائی تھی کہ ایک طرف سے نیپلز کا بادشاہ اور دوسری طرف سے بونا پارٹ کی فوجیں اس کا گلا گھونٹنے کے لیے آ پہنچیں۔ اس کے علاوہ پوپ کے گویندوں اور پادریوں نے عوام کی ضعیف الاعتقادیوں کو کام میں لاکر قومی گورنمنٹ کی طرف سے انھیں بدظن کرنا شروع کیا۔ گیری بالڈی ان تمام مخالف طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ پہلے والی نیپلز سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی۔ اس کے ساتھ پندرہ ہزار آزمودہ کار سپاہی تھے مگر اس جماعت کثیر کو اس نے دم زدن میں منتشر کردیا اور بہت دور تک ان کا تعاقب کیا۔ اس کا قصد تھا کہ نیپلز پر چڑھ دوڑے کہ فرانسیسیوں کے آ پہنچنے کی خبر سن کر لوٹ پڑا۔ فرانسیسی سپاہی جو افریقہ کے میدانوں سے تازہ تازہ لوٹے تھے بڑی پامردی سے لڑے اور قریب تھا کہ شہر میں گھس پڑیں کہ اتنے میں گیری بالڈی اپنے ایک ہزار والنٹیروں کے ساتھ آ پہنچا اور آٹھ ہزار آزمودہ کار فرانسیسیوں کو ایک نہایت سخت مقابلہ کے بعد پسپا کردیا۔ فرانسیسی جنرل ایسا گھبرایا کہ مصالحت کی درخواست کی۔ گیری بالڈی اس کے خلاف تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ غنیم محض کمک کا انتظار کرنے کے لیے مہلت چاہتا ہے۔ مگر میزینی نے صلح کرنا ہی زیادہ مناسب سمجھا۔ آخر اس ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسیوں نے دھوکا دے کر

روم پر قبضہ کرلیا اور گیری بالڈی کو بڑی بے سروسامانی سے یہاں سے بھاگنا پڑا۔

اس طرح زک پاکر گیری بالڈی اپنے وفادار اور رفیقوں کے ساتھ جو ڈیڑھ ہزار کے قریب تھے توکل بخدا چل کھڑا ہوا۔ اس کی باعصمت بیوی یہاں بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ بہت دنوں تک سرگرداں پریشان پھرتا رہا۔ رفیقوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی تھی۔ نہ رسد کا کوئی سامان تھا نہ اسلحہ کا کوئی انتظام۔ مخالفین اس کے ایک ایک حرکت کی جانچ پڑتال کیا کرتے تھے اور اسے اتنی مہلت نہ دیتے تھے کہ رعیت میں کچھ شورش برپا کرسکے۔ آج یہاں ہے، کل وہاں ہے، نت دن غنیموں کے دھاوے ہوتے ہیں۔ اس کے ان بادیہ پیمایوں کا تذکرہ ایک نہایت دلچسپ فسانہ ہے۔ سچ ہے قوم کی خدمت آسان کام نہیں اس کے لیے بلند حوصلہ، آہنی استقلال، شبانہ روز کی جفاکشی، اورسربکف ہونے کی ضرورت ہے۔ جب تک یہ اوصاف اپنی ذات میں سرایت نہ کرجائیں قومی خدمت کا بیڑا اٹھانا زبانی ڈھکوسلا ہے۔ آخر ایک موقع پر آسٹریا کی افواج نے ایسا اسے گھیر لیا کہ کہیں سے نکل بھاگنے کا راستہ نظر نہ آتا تھا۔ اس کے رفیقوں نے جان براری کی کوئی صورت نہ دیکھ کرحوصلے ہار دیے اور تقریباً نو سو آدمیوں نے ہتھیار رکھ کر غنیم سے امان مانگی مگر آسٹریا کی سپاہ ایسی بددل ہو رہی تھی کہ اسے ان بدقسمتوں کی حالت پر ذرا بھی ترس نہ آیا اور بجائے اس رعایت کے جو قواعد جنگ کے مطابق امان مانگنے والوں کے ساتھ کی جانی چاہیے انھوں نے ان لوگوں کو مقید کرکے جلا وطن کردیا۔ اور کتنوں ہی کے تازیانے لگوئے۔ گیری بالڈی کے ساتھ تین سو آدمیوں سے زائد نہ تھے۔ امتحان کا وقت برا ہوتا ہے، مگر اس کے استقلال میں ذرا بھی فرق نہ آیا ذرا بھی خائف و ہراساں نہ ہوا، اس قلیل جماعت کے ساتھ غنیم کے نرغہ سے مردانہ وار نکل پڑا اور ان کی صفوں کو چیرتا پھاڑتا سمندر کے کنارے آ پہنچا، یہاں پندرہ کشتیاں تیار تھیں ان میں بیٹھ کر وینس کی طرف رخ کیا، تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ آسٹریا کی دُخانی کشتیاں تعاقب میں آتی ہوئی دکھائی دیں اور دیکھتے دیکھتے اس کے ساتھ کی تیرہ کشتیاں گرفتار بلا ہوگئیں۔ صرف درجن میں گیری بالڈی، اس کی بیوی اور چند اور رفیق تھے ایک جزیرہ کے کنارے آلگیں۔ یہاں گیری بالڈی کی زندگی کا نہایت درد ناک سانحہ وقوع میں آیا، غریب انتہا حاملہ تھی اور مصائب سفر جھیلتے جھیلتے

تنگ آ گئی تھی۔ تکان اور غلبہ بیماری نے اسے چلنے پھرنے سے معذور کر رکھا تھا۔ گیری بالڈی نے کوئی چارہ نہ دیکھ کر اپنے رفیقوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور اپنی بیوی کو گود میں لے کر چلا تین دن کے بعد اس نے ایک کسان کا دروازہ کھٹکھٹایا اور پانی مانگا۔ انتہا کو شدت کی پیاس لگی ہوئی تھی، مگر وہ موت کی تشنگی تھی جو شربت مرگ کے چکھنے ہی سے بجھی۔ گیری بالڈی اس کے منہ میں پانی کے قطرے ٹپکا رہا تھا کہ اس کی روح پرواز کرگئی۔ اس صدمہ کا گیری بالڈی پر جو اثر ہوا وہ مدت العمر قائم رہا۔ یہاں تک کہ دم مرگ بھی اپنی پیاری بیوی ہی کا نام اس کے ورد زبان تھا۔ بہت رویا پیٹا، مگر وہاں رونے کی بھی فرصت نہ تھی۔ دشمن قریب آ پہنچا تھا۔ مجبوراً وہاں سے بھاگ کر وینس میں جا داخل ہوا۔ وہاں سے جنیوا کی طرف چلا۔ مگر کہیں مقصد برابری کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ جنیوا سے طونس ہوتا ہوا جبرالٹر پہنچا مگر یہاں بھی اسے چین نہ نصیب ہوا۔ حکومتیں اس کے نام سے گھبراتی تھیں حتیٰ کہ جبرالٹر میں بھی جو انگریزی عمل داری ہے اسے رہنے کی اجازت نہ ملی۔ مجبوراً یہاں سے لورپول آیا اور لورپول سے ممالک متحدہ امریکہ کی راہ لی۔ یہاں کوئی اور مشغلہ نہ پاکر اس نے ایک انگریزی صابن کے کارخانہ میں ملازمت کرلی۔ تعجب ہے کہ ایسے نفس عالی اور حوصلہ بلندکو ایسے ذلیل پیشہ کی طرف کیونکر رجحان ہوا! غالباً کسب معاش کی ضرورتوں نے مجبور کررکھا ہوگا۔ کیونکہ اس کی مالی حالت بالکل قابل اطمیان نہ تھی۔ کچھ دنوں یہاں دفع الوقتی کرنے کے بعد اس نے ایک جہاز کی ملازمت کرلی۔ اور چین، آسٹریلیا وغیرہ مقامات میں عرصہ تک جہاز رانی کرتا رہا، ان بادیہ گردیوں کے کئی سال بعد وہ ایک بار نیوکیسل آیا۔ رعایا نے اس کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور اسے ایک تلوار اور ایک دور بین تحفہ دی۔ اس موقع پر جو تقریر کی گئی اس کے جواب میں گیری بالڈی نے کہا۔

''اگر تمھارے وطن برطانیہ عظمیٰ کو کبھی کسی مددگار کی ضرورت ہوتو ایسا کون بدقسمت اٹالین ہے جو میرے ساتھ اس کی مدد پر آمادہ نہ ہوگا۔ تمھارے ملک نے آسٹریا والوں کو وہ تازیانہ لگایا ہے جسے وہ کبھی فراموش نہ کرسکیں گے۔ اگر انگلینڈ کو کبھی کسی جائز معاملہ میں میرے اسلحہ کی ضرورت پڑے تو میں اس نادر تیغہ کو جو تم نے مجھے تحفتاً دیا ہے بڑے فخر سے نیام سے

باہر کروں گا۔"

چونکہ اب سلطنت پیڈمانٹ میں امن ہوگیا تھا گیری بالڈی نے کپریا نامی جزیرہ خرید لیا اور اسے آباد کرکے زراعت کا پیشہ کرنے لگا۔ زراعتی پیداواروں کو نواح کے بازاروں میں فروخت کیا کرتا تھا۔ وہ تو یہاں بیٹھا ہوا زراعت و تجارت میں منہمک تھا، ادھر اٹلی کے ملکی معاملات میں بڑی سرعت سے تغیر و تبدل ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ آسٹریا کے مظالم سے جان بہ تنگ آکر پیڈمانٹ گورنمنٹ نے فرانس کی مدد سے آسٹریا سے جنگ کا اعلان کیا۔ اب گیری بالڈی کی ضرورت محسوس ہوئی اور وزیر اعظم کیور نے ماہ اپریل ۱۸۵۹ء میں اسے حمایت قوم کی دعوت دی۔ گیری بالڈی فی الفور گوشہ عافیت سے نکل کھڑا ہوا۔ اس کی ہر خاص و عام کے دلوں میں اتنی جگہ تھی اور وہ اپنے ارادوں کا ایسا سچا اور نیک تھا کہ دیگر عہدیداران فوج جوان شورشوں سے کچھ ذاتی مفاد کی صورتیں نکالنا چاہتے تھے اس سے بدظن ہونے لگے۔ لیکن نئے نوجوان بادشاہ وکٹر ایمنیوئیل نے جو اس کے خصائص سے بخوبی آگاہ تھا فرمایا "آپ جہاں چاہیں جائیں، آپ جو چاہیں کریں، مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ میں آپ کے پہلو بہ پہلو چل کر شرط وفا نہیں ادا کرسکتا۔"

اس طرح بادشاہ سے آزادی افعال کی سند پاکر گیری بالڈی نے اسٹریاکے خلاف ان چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کا سلسلہ شروع کیا جو تاریخ میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ اس کے ساتھ سترہ ہزار آدمی تھے اور یہ سب قریب قریب وہ نوجوان والنٹیر تھے جنھوں نے بہبود قوم پر اپنی جانوں کے نثار کرنے کا تہیہ کرلیا تھا۔ ان سے اس نے متعدد لڑائیاں ماریں۔ کومو اور برگو چھین لیا اور آخرش حریف کو شمالی اٹلی سے باہر نکال دیا۔ ادھر پیڈمانٹ اور فرانس کی متحدہ افواج نے بھی آسٹریا والوں کو متعدد زکیں دیں اور ان سے لمبارڈی چھن لیا مگر فتوحات کا یہ سلسلہ عرصہ تک قائم نہ رہنے پایا۔ شہنشاہ نپولین نے پڈمانٹ کو زیادہ طاقتور ہوتے دیکھ کر لڑائی کے بند کرنے کا حکم دیا۔ آسٹریا نے بھی موقع غنیمت جانا اور برائے چندے دم لینا مناسب سمجھا۔گیری بالڈی شروع سے کہتا آتا تھا کہ خارجی قوتوں کی مدد سے قوم کبھی نہیں آزاد ہوسکتی۔ وہ شاہ فرانس کی امداد قبول کرنے کے بالکل مخالف تھا۔ مگر پڈمانٹ گورنمنٹ نے اس کے مشورہ کے خلاف

کاروائی کی تھی اور اب انھیں اپنی ناعاقبت اندیشی کا خمیازہ اٹھانا پڑا۔ اگر اس وقت تھوڑے ہی دنوں تک لڑائی اور جاری رہتی تو اٹلی میں آسٹریا کا قلع قمع ہوجاتا۔ مگر لڑائی کے بند ہوجانے سے اسے پھر اپنی طاقت کے مجتمع کرنے کا موقع ملے گا۔ آخر گیری بالڈی نے ناراض ہوکر استعفا دے دیا لیکن شاہ ایمنوئیل نے ایسے نازک وقت میں اس کا استعفا منظور کرنا مناسب نہ سمجھا۔لہٰذا گیری بالڈی نے اپنے ہی والنیٹروں سے آزادانہ طور پر لڑائی جاری رکھنے کا ذمہ لیا۔ مگر بالواسطہ اور بلاواسطہ اس پر چوطرفہ سے ایسے دباؤ پڑنے لگے کہ آخر کار مایوس ہوکر اس نے پھر استعفا دیا۔ اور اب کی بار یہ منظور کرلیا گیا۔ حالانکہ قوم نے اس منظوری کو نہایت مخالفانہ نگاہوں سے دیکھا مگر اس آزادی کے دلدادہ اور قوم کے عاشق زار سے خاموش کب بیٹھا جاتا۔ تھا وہ تحریر و تقریر سے قوم کو حصول آزادی کے لیے ابھارتا رہتا تھا۔ خفیہ رسالوں اور پوشیدہ مضامین کے ذریعہ سے ان کے قومی جذبات مشتعل کیے جاتے تھے۔ متواتر اعلان شائع کیے جاتے تھے جن میں مقصد براری کے وسائل اور ذرائع پر پرزور الفاظ میں بحث کی جاتی تھی۔ اس کا قول تھا کہ جب تک ملک میں دس لاکھ بندوقیں اور دس لاکھ نشانہ چلانے والے نہ ہو جائیں گے قوم کو آزادی کبھی نہ ملے گی۔ آخر ان اعلانوں کا یہ اثر ہوا کہ اہل امریکہ نے مدد کے طور پر چوبیس ہزار بندوقین ایک جہاز میں لدواکر گیری بالڈی کے پاس بھیجیں ۔کئی ہزار نوجوان اپنے کو قوم پر قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوگئے اور گیری بالڈی دو ہزار آدمیوں کو لے کر سسلی کی طرف چلا یہاں نیپلز کے بادشاہ نے رعایا کو ستا ستا کر بغاوت پر آمادہ کر رکھا تھا۔ ان مظلوموں نے جوں ہی سنا کہ گیری بالڈی ان کی مدد کو آرہا ہے تو اپنی اپنی تیاریوں میں مصروف ہوئے اور بڑی گرمجوشی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ مصالحہ پختہ تھا ہی، گیری بالڈی نے آتے ہی آتے پلرموپر ایسا پرزور دھاوا کیا کہ شاہی فوج قلعہ بند ہوگئی اور امان مانگی۔ رعایا کو اس پر ایسا اعتقاد تھا کہ اس نے اسے اپنا آزاد کنندہ تسلیم کرکے ’’سسلی کا ڈکٹیٹر‘‘ کا خطاب دیا۔ شاہ ایمنوئیل اس مہم کے پہلے ہی سے مخالف تھے۔ اس خوف سے مبادا کہ شاہ نیپلز اسٹریا سے صلح کرکے ہمارے ملک پر حملہ کر بیٹھے۔ جب اس فتح کی خبر پائی تو گیری بالڈی سے استدعا کی کہ اب آپ نیپلز کی گورنمنٹ کو اور زیادہ دق نہ کریں کہ

وہ متحدہ اٹلی کا ایک جزو بن سکے مگر گیری بالڈی اپنی رائے پر قائم رہا۔ پہلے تو اس نے شاہی افواج کو سسلی سے نکالا بعد ازاں اٹلی کے جنوبی ساحل پر اتر پڑا۔ اس کی خبر پاتے ہی چو طرفہ سے رعایا اس کی جماعت میں شریک ہونے کے لیے ٹوٹنے لگی۔ گویا اسی کی منتظر تھی۔ بیشتر مقامات میں جدید عارضی گورنمنٹیں قائم ہوگئیں۔ اور ۳۱/اگست کو رعایا نے باقاعدہ طور پر "ہر دوسسلی کا ڈکٹیٹر" کا لقب جو شاہ نیپلز کو حاصل تھا گیری بالڈی کو دے دیا۔ فرانس کے ہوش اڑے۔ گیری بالڈی کے خلاف اعلان جنگ دیا مگر تین لڑائیوں میں ایک کا بھی نتیجہ اس کے حق میں اچھا نہ ہوا۔ ۸/ستمبر کو گیری بالڈی نیپلز داخل ہوا اس کے دوسرے دن وکٹر ایمنیوئیل وہاں کا بادشاہ مشتہر کیا گیا اور کل سلطنت کی رعایا کے اتفاق رائے سے سسلی اور نیپلز دونوں پیڈمانٹ کے ممالک میں ملحق کردئے گئے۔

اس اہم قومی خدمت کو انجام دے کر جو اس کا نصف ثمرہ زندگانی کہا جاسکتا ہے اس نے اپنی فوج برخاست کردی اور اپنے جزیرہ کو لوٹ آیا۔ اب صرف روم اور وینس وہ مقام رہے جو ابھی تک پوپ اور آسٹریا کے پنجہ بیداد میں پھنسے ہوئے تھے۔دو سال تک اپنے کنج تنہائی میں بیٹھا ہوا گیری بالڈی ان مظلوموں میں آزادی کی روح پھونکتا رہا۔ آخر اس کے سرگرمیوں کا جادو چل گیا اور وینس والوں نے بھی آزاد ہونے کے لیے آمادگی ظاہر کی۔ اب کیا دیر تھی گیری بالڈی فی الفور اپنے ساتھ چنے آدمیوں کی ایک جمعیت لے کر چل کھڑا ہوا مگر وکٹر ایمنیوئیل کو اس کی یہ جسارت ناگوارگزری۔وزیر اعظم کیور کے مرجانے سے اب اس کے مشیروں میں کوئی جری اور ذی حوصلہ آدمی باقی نہ رہا تھا سب کے سب ڈر گئے کہ کہیں آسٹریا والے ہمارے درپے نہ ہوجائیں۔ اس لیے گیری بالڈی کو روکنے کے لیے فوج روانہ کی۔ وہ اپنے ہم وطنوں سے لڑنا نہ چاہتا تھا۔ حتی الوسع بچتا رہا، مگر آخر گھر گیا،اور نوبت بہ جنگ پہنچی، ممکن تھا کہ وہ یہاں سے بھی صاف نکل جاتا۔ مگر اس کے کئی زخم ایسے کاری لگے تھے کہ مجبوراً وطن کو لوٹ آیا اور کئی ماہ تک قیدی بستر بنا رہا۔

۱۸۶۴ء میں گیری بالڈی انگلستان کی سیر کو آیا۔ یہاں جس تزک و احتشام سے اس کا استقبال کیا گیا اور جس شان و شکوہ سے اس کی سواری نکلی وہ تاجداروں کی

تشریف آوری کے مواقع پر بھی مشکل سے نظر آسکتا ہے جو اژدہام گلی کوچوں اور خاص خاص مقامات پر اس کے دیدار کے لیے ہوا ویسا انبوہ کثیر کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہاں وہ دس دن تک مقیم رہا۔ صدہا جماعتوں نے اسے ایڈریس دیے۔ کتنے ہی شہروں نے تیغے اور اعزازی خطابات اس کے نذر کیے۔ ۲۲/اپریل کو وہ پھر اپنے جزیرہ کو لوٹ گیا۔

اسی اثنا میں آسٹریا اور پروشیا میں جنگ چھڑ گئی۔ گیری بالڈی نے مخالفین کو ادھر مصروف دیکھ کر اپنی مقصد برآریوں کی صورتیں سوچ لیں۔ چنانچہ ۱۱/جون ۱۸۶۶ء کو وہ یکا یک جنیوا میں آ پہنچا اور آسٹریا کے خلاف شورش برپا کردی مگر پہلی ہی لڑائی میں اس کی ران میں ایسا زخم لگا کہ اس کے جانبازوں کو پسپا ہونا پڑا۔ زخم سے صحت پانے پر اس نے کوشش کی کہ فرانس کی عمل داری میں چلا جائے اور ادھر سے غنیم پر حملہ آور ہو مگر آسٹریا کی فوجوں نے یہاں اسے پھر روکا اور ایک بڑی خونریز لڑائی ہوئی جس میں مخالفین کو شکست فاش ملی۔ چونکہ آسٹریا کے لیے پروشیا ہی کا مقابلہ کرنا آسان نہ تھا اس لیے جنوبی لڑائیوں کے مقابلہ میں اس نے شمال کی طرف رجوع ہونا زیادہ مناسب سمجھا۔ چنانچہ مصالحت کی کوشش ہونے لگی۔ اور جنگ کا خاتمہ بالخیر ہوا۔ بعد مدت کے وینس والوں کی آرزوئیں برآئیں اور وہ بھی متحدہ اٹلی کا ایک صوبہ قرار دیا گیا۔

۱۸۶۷ء میں گیری بالڈی نے روم پر پھر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کیں۔ ہر چند کہ اٹالین گورنمنٹ نے اس کے راستہ میں رکاوٹیں ڈالیں اور اسے قید بھی کردیا مگر وہ یہ سب مراحل طے کرتا ہوا آخر فلورنس میں آ پہنچا۔ صرف پوپ کا علاقہ ہی اٹلی میں اب ایسا خطہ رہ گیا تھا جہاں قومی حکومت نہ ہو اور گیری بالڈی کی روح کو اس وقت تک چین نہیں ہوسکتا تھا جب تک کہ وہ اٹلی کی ایک ایک انگل زمین کو غیر قومی حکومت سے باہر نہ نکال لے۔ حالانکہ اس نے دوبار روم کو پوپ کے مظالم سے آزاد کرانے کی سخت کوشش کی تھی مگر دونوں بار ناکام رہا تھا۔ جون ہی اس کے فلورنس میں آ پہنچنے کی خبر مشہور ہوئی۔ رعایا میں جوش پھیل گیا۔ اور چند ہی دنوں میں اس کے ساتھ والنٹیروں کی ایک خاص فوج تیار ہوگئی۔ پوپ کی فوجیں بھی آمادہ تھیں۔ لڑائی شروع ہوگئی اور گو پہلی فتح گیری بالڈی کے ہاتھ رہی، مگر دوسری لڑائی میں فرانس اور پوپ کی

متحدہ فوجوں نے اسے شکست دی۔ بہت سے آدمی کام آئے کتنے ہی قید کرلیے گئے۔ گیری بالڈی بچ گیا۔ غالبًا پوپ نے اس کا چلا جانا ہی زیادہ مناسب سمجھا کیونکہ اسے قید کرلینے سے ملک میں ایک زبردست ہنگامہ مچ جانے کا اندیشہ تھا مگر جب وہ ناکام اور دل شکستہ اپنے وطن کی طرف لوٹا جا رہا تھا پیڈمانٹ کے فوجی افسروں نے اسے گرفتار کرلیا اور قید کرنے کی نیت کی۔ اس خبر کے پھیلتے ہی کئی مقامات پر رعایا بگڑ گئی اور ایک عام بغاوت کا احتمال ہوا ۔ ناچار حاکموں نے اسے آزاد کردیا۔ جب قوم اور سرغنہ قوم میں ایسے مضبوط رشتے ہوتے ہیں تب جاکر قومیں آزاد ہوتی ہیں۔ حالانکہ اس وقت علاقہ پوپ میں اس کی کوششیں سرسبز نہ ہوئیں۔ مگر اس کے تین ہی برس بعد جب فرانس اور پروشا میں جنگ چھڑ گئی تو یہ خطہ بہت آسانی سے شاہ اٹلی کے ہاتھ میں آ گیا۔ اور سارے ملک میں جنوب سے شمال تک ایک ہی رنگ کا جھنڈا لہرانے لگا۔

اس طرح گیری بالڈی کی زندگی کا مشن پورا ہوا۔ اس نے اٹلی کو متحد کرنے اور اس میں ایک قومی حکومت قائم کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا اور اس کی کوشش اس کے دوران زندگی ہی میں بارآور ہوگئی اس کی دلی آزرو تھی کہ ایک قوم ہوجائے اور اس کی یہ دلی آرزو برآئی۔اس میں شک نہیں کہ اس آرزو کے برآنے میں بہت سی ذاتی قربانیاں کرنی پڑیں۔ ہزارہا بندگان خدا کی جانیں گئیں۔ کتنی ہی عورتیں بیوہ اور کتنے ہی بچے یتیم ہوگئے مگر آج ان باتوں میں سے ایک بھی یاد نہیں اور مشکل سے ایسا کوئی اٹالین ہوگا جوان آزادی کے شہیدوں پر حزن و ملال کے آنسو بہاتا ہو۔ ہاں ان قربانیوں کا جو مبارک نتیجہ برآمد ہوا وہ آج ساری دنیا کے پیش نظر ہے۔

مگر گیری بالڈی اپنی ہی قوم کو آزاد کرکے آسودہ نہیں ہوا ہے۔ گو وہ بوڑھا ہوگیا ہے اس کے قویٰ ضعیف ہوگئے ہیں مگر اس کے حوصلے وہی ہیں اور نسل انسانی سے اس کی ہمدردیاں ویسی ہی مضبوط۔ پروشیا کو فرانس کی تذلیل و تحقیر پر آمادہ دیکھ کر اس کے دل میں پھر امنگ پیدا ہوجاتی ہے۔ ہر چند کہ فرانس اس کا دشمن قدیم ہے اور ابھی پوپ ہی کی امداد میں اس کی قوم کے صدہا نوجوانوں کے خون بہا چکا ہے۔ مگر یہ ناہمدردانہ خیالات اس کے دل میں جگہ نہیں پاتے۔ وہ اپنے کنج عافیت سے نکل کھڑا

ہوتا ہے اور اس عالم ضعیفی میں فرانس کی خاطر توپ و تفنگ کا سامنا کرتا ہے اور اسے پروشیا کے پنجۂ تصرف میں پڑ جانے سے بچا لیتا ہے۔

فرانس اور پروشیا میں صلح ہوجانے کے بعد گیری بالڈی اپنے وطن کو واپس آیا اور اب چونکہ قوم کو اس کی سپاہیانہ قابلیتوں کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اپنے کنبے کے ساتھ اطمینان سے بڑھاپے کے دن بسر کرنے لگا مگر اس حالت میں بھی قوم کی طرف سے بے خبر نہ رہتا تھا بلکہ اس کی صنعت و حرفت کی ترقی کی تجاویز اور ذرائع سوچنے میں مصروف رہتا تھا۔ ۱۸۷۵ء میں وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ روم کی زیارت کے لیے روانہ ہوا۔ یہاں اس کا جیسا شاندار استقبال ہوا وہ دنیائے تاریخ میں بے نظیر ہے۔ جب وہ یہاں سے واپس چلا تو بیس ہزار آدمی پاپیادہ قومی گیت گاتے بجاتے اسے رخصت کرنے آئے۔ اس کی ساری زندگی کی قربانیوں کے صلہ میں یہی ایک نظارہ کافی تھا۔

گیری بالڈی کی بقیہ زندگی کپریرا میں صرف ہوئی۔ یہاں وہ اپنے عیال و اطفال کے ساتھ اطمینان سے گزران کرتا رہا۔ اس کے قویٰ سب مضمحل ہوگئے تھے۔ تندرستی بھی رخصت ہوچلی تھی مگر محنت و مشقت سے ایسی خلقی الفت تھی کہ دم آخر تک کوئی نہ کوئی شغل کرتا رہا۔ جب اور سب قوی جواب دے چکے تو بیٹھا ناول لکھوایا کرتا۔ آخر ۱۸۸۴ء میں چند دن بیمار رہ کر اس دارِ فانی سے رحلت کی۔ اور ایک ایسے شخص کی یادگار چھوڑی جو ملک کا شیدائی اور سچا فنا فی القوم اور نہ صرف اٹلی بلکہ سارے بنی نوع انسانی کا ہمدرد اور دوست تھا۔

آج اس کا نام اٹالین قوم کے ایک ایک بچہ کے ورد زبان ہے اور اس کی جرأت، فیاضی، اولوالعزمی اور شرافت کی صدہا مثالیں زبان زد خاص و عام ہیں۔ ایسا مشکل سے کوئی شہر ہوگا جہاں کے باشندوں نے اس کا سنگی بت نصب کرکے اپنے شکریہ کا حق نہ ادا کیا ہو۔ مگر اس کے کارناموں کی بہترین اور زندہ یادگار وہ وسیع سلطنت ہے جو کوہ آلپس سے لے کر سسلی تک پھیلی ہوئی ہے اور وہ قوم جو آج اٹالین کے نام سے مشہور ہے۔

''زمانہ'' جولائی ۱۹۰۷ء

ٹامس گِنیس برو

فن تصویر کے مختلف اصناف میں قدرت نگاری کو سب سے ادق اور مشکل قرار دیا گیا ہے اور چہرہ کشی کو سب سے آسان۔ اگر رینالڈ جو انگریزی فن تصویر کا خدا سمجھا جاتا ہے شبیہ نگاری کو انتہائے عروج پر لے گیا تو گِنیس برو نے قدرت نگاری کو کمال کے رتبہ تک پہنچایا۔ رینالڈ کے قبل انگلستان میں وینڈائنگ اور روبنس جیسے جیسے اہل کمال شبیہ نگاری کا رواج ڈال چکے تھے اور عام مذاق بھی اسی صنف کی جانب مائل تھا۔ گِنیس برو کے قبل انگلستان میں منظر نگاری کی کسی نے جرأت نہ کی تھی اور اس لحاظ سے وہ اپنے ملک میں اس صنف کا بانی اور موجد کہا جاسکتا ہے۔

ٹامس گِنیس برو ۱۷۲۷ء میں صوبہ سفک کے ایک مقام میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ بزاز تھا۔ اور اپنی دیانت، خوش معاملگی اور جفاکشی کے لیے اطراف میں مشہور تھا۔ اس کی ماں عام ماؤں کی طرح محبتی، سنجیدہ مزاج اور اپنے لڑکوں پر نازاں تھی۔ یہ خاندان وہاں بہت اعزاز سے دیکھا جاتا تھا۔ ٹامس اپنے تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا لیکن ذہانت اور مزاج کی تیزی میں سب سے بڑھ کر تھا۔ فن تصویر کا شوق وہ ماں کے پیٹ سے لے کر آیا تھا۔ اسے اس سے فطری مناسبت تھی۔ اس کے مکان کے قریب ایک نہایت خوبصورت چار میل کے وسعت کی جھیل تھی۔ اس کے کنارے کنارے بڑے بڑے پرانے چھتنار سایہ دار درخت لگے ہوئے تھے۔ جھیل کے پیچیدہ نالے بڑی دلربایانہ ادا سے خوش خرامی کیا کرتے تھے۔ ٹامس اسکول جاتا تو انھیں دلفریب مقاموں کے سیر سپاٹے کیا کرتا۔ اور اس پر بہار چشم فریب منظر کو دیکھتے دیکھتے اسے مناظر قدرت سے عشق سا ہوگیا۔ اور آخرش وہ منظر نگاری میں کمال کو پہنچا۔ اب بھی وہ گوشے، وہ درخت موجود ہیں جہاں بیٹھ کر وہ پھولوں، پتوں، درختوں اور دلفریب

منظروں کی تصویریں کھینچا کرتا تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ ان میں آئندہ زمانے کے کمال کے آثار موجود ہیں۔ صرف مشق کی کمی ہے۔ دس ہی برس کی عمر میں اس کے ہاتھوں کی تیزی اور آنکھوں کی صفائی کے جوہر کھلنے لگے اور بارہ برس کی عمر میں تو وہ مصور پرفن بن گیا۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ اس کی علمی تحصیلات برائے نام ہوں گی۔ مگر جو لوگ قدرت سے طباع پیدا ہوتے ہیں وہ اپنی کتابی معلومات کی کمی کو اپنے ذاتی تجربہ اور عینی مشاہدات سے بہت جلد پورا کرلیا کرتے ہیں۔

کچھ عرصے تک تو ٹامس اپنے مشغلات کو والدین سے چھپاتا رہا۔ مگر کب تک چھپاتا۔ ایک روز اس کے جی میں آئی کہ جھیل کے کنارے بیٹھ کر خوب سیر قدرت کیجیے۔ مگر اسکول بند نہ تھا۔ آخر اپنے والد کی طرف سے ماسٹر کے پاس ایک خط لکھا کہ ٹامس کو آج کی چھٹی دے دیجیے۔ اس وقت تو چکما چل گیا۔ مگربعد کو جب راز کھلا اور ماسٹر نے ٹامس کے باپ کے پاس وہ خط اس لیے بھیجا کہ بیٹے کی تنبیہ کی جائے تو باپ نے بڑی حسرت سے کہا یہ چھوکرا تو ایک ہی شاطر نکلا۔ یہ کبھی نہ کبھی ضرور پھانسی پر چڑھے گا۔ مگر جب گاؤں والوں نے کہا کہ اس دن تو ٹامس جھیل کے کنارے بیٹھ کر تصویر بنا رہا تھا اور باپ نے ان تصویروں کو دیکھا تو حسرت کی جگہ دلی مسرت پیدا ہوئی۔ بول اٹھا ''ٹامس تم تو مصور ہوگئے۔'' ایک بار وہ اپنے باپ کے باغیچہ میں بیٹھا ہوا ایک پرانے ٹھونٹھے لیکن نظر فریب درخت کی تصویر اتار رہا تھا کہ اس نے گاؤں کے ایک آدمی کو چہار دیواری کے اوپر سے چند سرخ پکے ہوئے شفتالوؤں کی طرف للچائی نگاہوں سے تاکتے دیکھا۔ آفتاب کی آڑی کرنیں اس کے خواہشمند چہرے پر کچھ اس طرح پڑ رہی تھیں کہ اس پر دھوپ چھاؤں کی نہایت دلفریب کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ ٹامس نے اسی وقت اس کا چہرہ بھی اتار لیا۔ بعد ازاں جب اس کے باپ نے یہ تصویر دیکھی تو بہت خوش ہوا۔ اور کسان کو بلا کر کہا ذرا اپنی صورت دیکھو۔ بے چارہ کسان بہت نادم ہوا، یہ تصویر ٹامس کو خود ایسی بھلی معلوم ہوتی تھی کہ اس نے بہت عرصہ کے بعد اسے رنگ و روغن سے آراستہ کیا اور اہل فن نے اس کی بڑی تعریف کی۔ ایسی عجلت کے ساتھ اس نے جو تصویریں بنائی ہیں ان میں آزادی اور بے تکلفی ایسی ہے کہ وہ اس کی بہترین تصاویریں ہیں۔

اس کے زمانہ طفولیت کے خاکوں میں اب کوئی باقی نہیں مگر کسی وقت وہ سیکڑوں کی تعداد میں تھے۔ چرتی ہوئی گائیں، شاخوں پر چہچہاتی ہوئی چڑیاں، پانی پیتی ہوئی بھیڑیں، بانسری بجاتا ہوا کسان، گائے کو دانہ کھلاتی ہوئی اہیرن، دریا کے کنارے کی فضا، خوشنما گھاٹیاں کوئی ایسی نہ تھیں کہ جو اس کی پنسل کے زیر مشق نہ ہوئی ہوں، وہ ان کے خاکے کھینچ کھینچ رکھتا جاتا کہ آگے چل کر ان کی تصویریں بناؤں گا، مگر جب اسے اس فن میں کمال ہوا تو یہ خاکے نگاہ میں نہ جچے۔ انھیں یار دوستوں میں تقسیم کردیا۔ ایک نقادفن نے ان خاکوں میں سے ایک دیکھا تھا۔ جس میں ایک درخت کا کنج بنا ہوا تھا۔ اس کی رائے تھی کہ وہ اپنی قسم میں بے نظیر تھا۔

گِنیس برو جب چودہ برس کا ہوگیا اور فن تصویر کی طرف اس کے رجحان کی کافی سے زیادہ شہادت مل چکی تو لوگوں کی صلاح ہوئی کہ اسے اس فن سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کے لیے کسی مصور کی خدمت میں بھیجا جائے۔ ہوگارتھ کے احباب میں ایک شخص ہیمین نامی تھا۔ اس کی اتالیقی میں ٹامس سپرد کیا گیا۔ اس کی ذہانت، جدت، اس کی منکسر مزاجی اور چابک دستی نے اسے احباب کی نگاہوں میں بڑا وقار دے رکھا تھا۔ مگر ابھی تک نہ اس کو نہ اس کے کسی جوہر شناس کو یہ خیال ہوا تھا کہ وہ اس فن کے اعلیٰ ترین مدارج پر پہنچ سکے گا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کسی چھوٹے موٹے شہر میں وہ اس پیشہ سے اپنے گزارے بھر کو کمالے گا۔ ٹامس کو شروع ہی سے چہرہ نگاری سے رغبت نہ تھی۔ اور تاریخی تصاویر میں دماغ ریزی بہت اور نفع قلیل تھا۔ غالباً وہ ان دونوں اصناف میں طبع آزمائی کرنے کے لیے بنایا ہی نہیں گیا تھا۔ منظر نگاری سے اسے فطری مناسبت تھی۔ اور اسی صنف کو چمکانے اور اسی کی بدولت خود چمکنے کا اس نے تہیہ کرلیا تھا۔ انگریزی مصوری کے میدان میں اب تک اس کرتب کا جاننے والا کوئی نہیں نکلا تھا۔ بلاشک ولسن کی طبیعت اس جانب بہت مائل اور موزوں تھی مگر وہ کسب معاش کی ضرورتوں سے مجبور ہوکر چہرہ نگاری کرنے لگا تھا۔ ٹامس چار برس تک لندن میں رہا اور روغن آمیزی ورنگ سازی کے فن سے ماہر ہوکر اپنے وطن کو لوٹ آیا۔

وہ اب اپنے اٹھارہویں سال میں تھا۔ اس کی شہرت اب احباب کے حلقہ سے نکل کر اور اطراف میں پھیلنے لگی تھی۔ اس کی خوش مزاجی، اس کی مردانہ وجاہت اور

اس کی بذلہ سنجی ایسی سندیں تھیں جو اسے ہر ایک حلقہ میں ممتاز جگہ دلا سکتی تھیں۔ ایک روزوہ شام کو سیر کر رہا تھا کہ حسن اتفاق سے ایک درخت کی خوبصورتی نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ اس کے نیچے بھیڑیں خاموش آرام کر رہی تھیں اور اوپر فاختے اور کبوتر بسیرا لے رہے تھے۔ وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا اور اس منظر کا خاکہ اتارنے لگا کہ ایک نوجوان حسینہ بھی گھومتی ہوئی آ پہنچی۔ نوجوان مصور نے اسی وقت اس کو اس تصویر میں اور نیز اپنے دل میں جگہ دے دی۔ تھوڑے دنوں کے بعد دونوں کی شادی ہوگئی اور وہ دونوں اسپیوک کے مقام پر ایک چھوٹا سا مکان چھ پونڈ سالانہ کے کرایہ پر لے کر بسر کرنے لگے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کے شیدا تھے اور گو ابھی پیشہ سے بہت قلیل آمدنی ہوتی تھی مگر یہ کفایت شعار، سلیقہ مند عورت دلوں مین بدمزگیاں نہیں پیدا ہونی دیتی تھی۔

یہاں ٹامس کی ملاقات مسٹر فلپ سے ہوئی جو ایک قلعہ کے گورنر تھے۔ مسٹر فلپ طبیعت کے رئیس تھے اور صحبت و مجلس کے شیدا۔ وہاں بیہڑ مقام میں صحبت آرائیوں کا کوئی موقع نہ تھا اور نہ ایسے لوگ تھے جو صحبت کو گرما سکیں ایسے لوگوں کو تو کچھ شہروں ہی سے خصوصیت ہے۔ اس نے جب ٹامس کو ایسا خلیق، ظریف طبع اور پرفن پایا تو اس سے راہ و رسم پیدا کی۔ ٹامس بھی اس دیار میں ابھی تک گمنام تھا اور اس کی ضرورت تھی کہ رؤسا کے حلقہ میں اس کی رسائی ہو۔ لوگ اس کو جانیں۔ چنانچہ اس گورنر کی سرپرستی اس نے قبول کرلی۔ فلپ اگرچہ نیک مزاج تھا مگر اس کے مزاج میں رعونت بہت زیادہ تھی۔ جس کی قدر کرتا اس سے زیادہ کہتا۔ وہ ایسا آدمی نہ تھا کہ کسی کے ساتھ احسان کرے اور بھول جائے، بلکہ ایک مرتبہ بھی کسی کے ساتھ کوئی سلوک کرلیتا تو بار بار کہا کرتا۔ یہ بات ٹامس جیسے خود دار آدمی کو کیوں کر پسند آ سکتی تھی۔ تاہم وہ بہت عرصہ تک محض اس خیال سے کہ کہیں میں احسان فراموشی کا خطاوار نہ ٹھہروں گورنر صاحب کی ان رعونت آمیز باتوں کا متحمل ہوا تھا۔ مگر جب اس کی شہرت پھیلی اور ادھر دلوں میں بھی گانٹھ پڑی تو فلپ ٹامس کا کینہ جو دشمن ہوگیا۔ دنیا میں ایسے آدمی بہت ملیں گے جو آپ کے ساتھ اس وقت تک ہر طرح سے سلوک کرتے رہیں گے جب تک آپ ان کو اپنا دیوتا، اپنا بزرگ اور محترم تسلیم کرتے رہیں۔ مگر

جوں ہی وہ آپ کے طور و طریق میں آزادی کی ذرا بھی بو پائیں گے یوں ہی آپ کے دشمن ہوجائیں گے۔ کیونکہ ایسے لوگوں کی نگاہ میں احسان فراموش کا اس سے بڑھ کر اور کوئی اظہار نہیں ہوسکتا۔

فلپ نے ٹامس سے فرمائش کی کہ میرے قلعہ اور اس کے اطراف و جوانب کے منظر کھینچو۔ معاوضہ تیس پونڈ ٹھہرا۔ ٹامس نے اس تصویر میں کمال صرف کیا۔ ایک نامی نقاش نے اسے لوح پر کھودا اور تھوڑے ہی دنوں میں اس تصویر کی بہت سی کاپیاں فروخت ہوگئیں۔ اصلی تصویر اب زمانہ کے ہاتھ تباہ ہوگئی۔ اس تصویر کے علاوہ ٹامس نے اسپوک کے تمام دلفریب نظاروں کی تصویریں لیں۔ اور اس محدود حلقہ میں اس کی شہرت قائم ہوگئی اور ضرورت ہوئی کہ وہ اب اس مقام سے نقل مکان کرکے کسی زیادہ آباد اور بارونق مقام پر قیام اختیار کرے۔

باتھ انگلستان کا شملہ یا نینی تال ہے۔ یہاں پچاس پونڈ سالانہ کا مکان کرایہ کرکے اٹھ آیا۔ گورنر فلپ اس مقام کے فیشنبل حلقوں میں بہت مشہور تھا۔ پس اس نے ٹامس گِنیس برو سے اپنی تصویر کھینچنے کی فرمائش کی تاکہ اس کی تصویر دیکھ کر دوسرے رؤسا کی توجہ بھی اس کے اوپر مبذول ہو۔ مگر ٹامس اس وقت تک اس خود پسند شخص کی ناز برداری کرتے کرتے جان سے تنگ آ گیا تھا۔ اس نے اس کی تصویر شروع تو کی مگر پوری نہ کرسکا اور یہی گویا گورنر صاحب کے برانگیختہ ہونے کا پہلا سبب تھا۔

مگر ٹامس کو گورنر صاحب کی برانگیختگی کی کیا پروا تھی۔ وہ اپنا وقت منظر نگاری شبیہ نگاری اور ترنم پردازی میں صرف کرتا تھا۔ پہلے اس کی ایک شبیہ کی اجرت پانچ پونڈ تھی۔ پھر آٹھ پونڈ ہوئی اور جوں جوں شہرت بڑھتی گئی معاوضہ بھی بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ اسے نصف قد کی تصویر کے چالیس اور پورے قد کی تصویر کے سو پونڈ ملنے لگے۔ اب چوطرفہ سے دولت برسنے لگی۔ اس کے ہاتھ میں تیزی اور طبیعت مشقت پسند تھی۔ اب اس کو ان مشاغل میں روپیہ صرف کرنے کا موقع ملا جو اب تک تنگ دستی کی وجہ سے نہ کرسکتا تھا۔ کتابوں سے اس کو رغبت نہ تھی اور نہ اسے مصنفین سے عقیدت تھی بلکہ ابناء شہر اس کی صحبت کے جتنے خواہشمند تھے ٹامس ان سے اتنا ہی گھبراتا تھا۔ وہ کہا کرتا کہ میں نے کتاب قدرت کا مطالعہ کیا ہے اور میری ضروریات

کے لیے یہی کافی ہے۔ ہاں اسے موسیقی جاننے والوں سے کمال عقیدت تھی۔ ان کی صحبت میں بیٹھنے سے اس کی روح کو حظ حاصل ہوتا تھا وہ ایک اچھے گویے کو نہایت معزز اور ایک اچھے آلہ موسیقی کو زمانہ کی بہترین ایجاد خیال کرتا تھا۔ تصویر کھینچنے سے جو وقت اسے فاضل بچتا وہ تحصیل موسیقی موصوف کرتا تھا۔ ایک سوانح نگار کہتا ہے کہ اگرچہ ٹامس گینس برو کا پیشہ مصوری تھا۔ اور موسیقی ایک مشغلہ بیکاری تھا مگر اس فن میں وہ جس قدر ریاضت کرتا تھا اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ موسیقی کو کسب معاش کا ذریعہ اور مصوری کو تفنن طبع خیال کرتا تھا۔

گانے سے اسے کس قدر شوق تھا وہ اس حکایت سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ اس نے وینڈائک کی کسی تصویر میں ایک بانسری کی تصویر دیکھی اور اس سے سمجھا کہ بانسری کوئی بہت اچھا آلہ ہوگا۔ پھر اسے یاد آیا کہ میں نے ایک جرمنی کے پروفیسر کو بانسری بجاتے دیکھا ہے۔ اس کے پاس پہنچا۔ پروفیسر صاحب میز پر بیٹھے ہوئے بھنے سیب چکھ رہے تھے اور بانسری بغل میں رکھی ہوئی تھی۔ ٹامس نے علیک سلیک کے بعد کہا ''جناب من میں آپ کی بانسری خریدنے آیا ہوں، دام کہیے، اور یہ نقد حاضر ہے۔'' پروفیسر نے کہا ''جناب من میں اپنی بانسری نہیں بیچتا۔''

ٹامس ''دام پرمت آیئے، جس قدر کہیے حاضر ہے۔''

پروفیسر ''اس کا دام بہت ہے، آپ کے دیے نہ دیا جائے گا۔ دس پونڈ۔''

ٹامس ۔ ''وولئس! یہ دس پونڈ لیجیے اس کو آپ بہت کہتے تھے۔''

یہ کہہ کر بانسری لے لی روپے گنے، تھوڑی دور چلا تھا کہ پھر لوٹا۔

ٹامس ''جناب میں ادھورا کام کرکے چلاجاتا تھا۔ یہ بانسری میرے کس کام کی ہے جب تک آپ کی کتاب بھی نہ ہو۔

پروفیسر ''کیسی کتاب؟''

ٹامس: '' جی وہی جو آپ نے اس بانسری کے بجانے کے لیے بنائی ہے۔''

پروفیسر: ''وہ کتاب میں نہیں بیچ سکتا۔''

ٹامس: ''لایئے لایئے دل لگی نہ کیجیے، آپ جب چاہیں ایسی کتاب بنا سکتے ہیں لیجیے دس پونڈ۔ آداب عرض۔''

چند قدم چلا تھا کہ پھر لوٹا۔

ٹامس: ''آپ نے مجھے اچھا پھانسا، بھلا یہ خالی خولی کتاب لے کر میں کیا کروں گا۔ اسے سمجھائے گا کون اور بانسری کیسے بجے گی۔ اٹھیے تشریف لے چلیے اور مجھے سکھا دیجیے۔''

پروفیسر: ''آپ چلیے میں کل آؤں گا۔''

ٹامس: ''نہیں آپ کو ابھی چلنا ہوگا۔''

پروفیسر: ''ذرا کپڑے تو پہن لوں۔''

ٹامس: ''کپڑے پہن کر کیا کیجیے گا۔ آپ یوں ہی ہزاروں میں ایک ہیں۔''

پروفیسر: ''ذرا خط تو صاف کرلوں۔''

ٹامس: واہ! تب تو آپ کا نقشہ ہی بگڑ جائے گا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں وینڈائنک آپ کی تصویر کھینچتا تو داڑھی صفا چٹ کرنے دیتا۔''

الغرض اتنی سر مغزن کے بعد وہ پروفیسر صاحب کو کھینچ کھانچ کر اپنے گھر لے گیا۔ اسے اس فن سے ایسا عشق تھا کہ اس کا مکان گانے کے بیسیوں ہی آلوں سے بھرا رہتا تھا۔ اور اس کے میز و دسترخوان پر ہمیشہ موسیقی کے پروفیسر بیٹھے نظر آتے تھے۔ وہ اٹھتے بیٹھتے گانے ہی کا چرچا کیا کرتا۔ تصویر بناتے وقت بھی یہی چرچا رہتا اور جوں ہی فرصت ملتی ایک نہ ایک باجے پر گانے لگتا۔

باتھ میں ایک گاڑی والا رہتا تھا جو سرکاری ڈاک کا مہتمم تھا۔ اس سے اور ٹامس سے دوستی ہوگئی۔ گاڑی والے کے پاس ایک اچھا گھوڑا تھا۔ ٹامس نے دو تین دن کے لیے اسے عاریتاً مانگا تاکہ اس کو ایک تصویر میں لائے۔ گاڑی والا مصوری کی قدر کرتا تھا۔ اس نے گھوڑے کو ساز و سامان سے درست کرکے ٹامس کی نذر کردیا۔ ٹامس نے بھی اس دریا دلی کا جواب دیا۔ اس کے گھوڑے اور گاڑی کی تصویر اتاری اور اس کے کنبہ کو مع اپنے اس گاڑی میں بٹھا دیا۔ کہتے ہیں کہ یہ تصویر اس کے بہترین تصاویر میں سے ہے۔

اب گنیس برو کی آمدنی، شہرت اور عزت اتنی ہوگئی کہ اسے باتھ سے لندن میں آکر مقیم ہونے کی جرأت ہوئی۔ یہاں وہ گورنر فلپ کی ناز برداری سے آزاد ہوگیا۔

اور شبیہ سازی اور منظر نگاری میں روز افزوں ترقی دکھانے لگا۔ اس کا مکان بہت وسیع اور اس کا نگارخانہ بہت خوبی و مذاق سے آراستہ تھا۔ اور چونکہ اس نے اس کے پہلے بہت سی شبیہیں بنائی تھیں اسے لندن میں زیادہ دنوں بیکار نہ بیٹھنا پڑا۔ اس میں شک نہیں کہ ان دنوں رینالڈ کی خوب گرم بازاری تھی۔ مگر شائقین کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ تنہا سب کی فرمائشیں پوری نہ کرسکتا تھا اور ایک ایسے شخص کے لیے کافی گنجائش تھی جو زور، آزادی اور مزاج نگاری میں بعض اوقات وینڈائنک سے ٹکر کھاتا تھا۔

خاندان شاہی نے بھی قدردانی فرمائی۔ بادشاہ، ملکہ اور شہزادیوں نے چھوٹے چھوٹے پیمانے پر اس سے تصویریں بنوائیں۔ اس میں شک نہیں کہ اگر اس کے مزاج میں ذرا زیادہ تحمل، ذرا زیادہ صبر اور ذرا زیادہ اخلاق ہوتا تو وہ رینالڈ سے بھی بازی لے جاتا۔ اس کے رنگوں میں قائم رہنے والی شوخی تھی اور جس چیز پر وہ پنسل اٹھاتا اس میں جان اور تازگی ڈال دیتا تھا۔

اس کی شہرت نے جن شائقین کو اس تک پہنچایا ان میں ڈیوں شائر کی بیگم بھی تھی۔ وہ حسن و رعنائی کے لحاظ سے اپنے زمانہ کے کل حسینان روزگار کا تاج سمجھی جاتی تھی۔ مگر جب ٹامس تصویر لینے بیٹھا تو اس کے زاہد فریب حسن اور اس کی دلفریب گفتگو کا اس کے دل پر اتنا اثر ہوا کہ اس کے ہاتھوں سے شوخی، آزادی اور بے تکلفی جاتی رہی۔ اس نے کئی بار کوشش کی، اپنا انتہائی کمال صرف کردیا۔ مگر بیگم کے حسن کا جو معیار اس کے ذہن میں قائم ہوگیا تھا وہ ادا نہ کرسکا۔ آخر کئی بار ناکام کوشش کرنے کے بعد اس نے یہ کہہ کر ''کہ یہ شکل میری قابلیت سے بالاتر ہے'' اسے چھوڑ دیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس تصویر کے دو تین مسودے ملے جو بہت ہی خوبصورت تھے۔

اسی طرح ایک رئیس اس کے یہاں تصویر کھنچوانے آئے، کپڑے بالکل نئے اور بھڑکیلے تھے۔ طرز نشست بھی ایسا تھا جس سے رتبہ وحکومت کا اظہار ہوتا تھا جب گنیس برو نے ہاتھ میں پنسل لی تو آپ نے فرمایا ''جناب من، میرے ٹھڈی پر ایک گڑھا ہے اسے بھول نہ جایئے گا۔'' ٹامس آپ کی وضع و قطع دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ خوشامد سے اس کی طبیعت کو کامل عار تھا۔ نہ زبان سے نہ پنسل سے وہ کسی کی خوشامد کرنا پسند کرتا تھا۔ بول اٹھا ''جناب آپ تشریف لے جایئے۔ میں آپ کی تصویر کھینچنے

سے باز آیا۔"

ایک مرتبہ مشہور ایکٹر ڈیوڈ گیرک ٹامس کے یہاں تصویر کھنچوانے آیا مگر جب جب مصور نے اس کے چہرہ پر نگاہ ڈالی اس نے ایک نئے انداز اور انوکھی قطع کا چہرہ بنایا۔ کبھی آنکھیں چھوٹی کردیں ،کبھی ہونٹ موٹے کردیئے۔ آخر گنیس بروان شرارتوں سے گھبرا گیا۔ گیرک خوش ہوتے ہوئے لوٹے اور رینالڈ سے اپنی اس شرارت کو فخریہ بیان کیا ، اس حلقہ میں اس پر خوب قہقے رہے۔

لیکن بہت کم ایسے لوگ ہیں جو کسی فن کے ہر صنف میں کمال رکھنے کا دعویٰ کرسکتے ہوں۔ شبیہ نگاری میں ٹامس ضرور مشاق تھا۔ مگر رینالڈ اس سے بڑھا ہوا تھا۔ اس کو مناسبت طبعی قدرت نگاری سے تھی اور اس صنف میں وہ لاثانی اور بے نظیر تھا۔ نیچر کی اس نے بے شار دلچسپ صورتوں میں تصویر کھینچی۔ اور اس کی پنسل نے بے نظیر بے تکلفی سے نیچر کے نازک ترین جذبات قلم بند کیے۔ کبھی ایک ناور درخت کی تصویر، کبھی بیلوں سے لپٹی ہوئی جھاڑی، کبھی اپنی ہنسیا تیز کرتا ہوا گھسیارہ کبھی سیٹی بجاتا ہوا ہلواہا، کبھی بانسری بجاتا ہوا چرواہا یہ تمام مناظر قدرت اس نے ایسی صفائی خوبی اور نزاکت سے دکھا دیے ہیں کہ کوئی دوسرا نہیں دکھا سکتا۔

ٹامس کو شعرا اور مصنفین سے بہت ارتباط نہ تھا۔ تاہم لیڈ منڈیوک، شیریڈن مشہور مقرر اور ڈراما نویس وغیرہ جیسے علم دوست بزرگوں سے اسے خاص عقیدت تھی۔ سر جارج بومائٹ اس زمانہ کے شوقین مزاج رئیس تھے۔ اکثر شعراء اور اہل فن اس کے خوان کرم سے بہرہ یاب ہوا کرتے تھے۔ برک شیریڈن گنیس برو کے یہاں تفریح طبع کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ جارج بومائٹ اپنی ایک روایت میں بیان کرتے ہیں کہ "ایک بار گنیس برو کی میں نے دعوت کی۔ برک وغیرہ بھی شامل تھے۔ اس روز ٹامس نے خوب بذلہ سنجی کی۔ خوب حاضر جوابی دکھائی کہ ہم سب اس کی تیز دماغی کے قائل ہوگئے اور دس بجے رات تک خوب چہل پہل رہی۔ آخر چلتے وقت یہ وعدہ ہوا کہ دوسرے دن پھر لوگ جمع ہوں اس دن پھر لوگ آئے مگر ٹامس کی حاضر جوابی رخصت ہوگئی تھی۔ وہ خاموش ایک طرف بیٹھا رہا۔ لوگوں نے بہت چاہا کہ اس کی طبیعت کو گرمائیں۔ مگر ناکام رہے۔ آخر اس نے شیریڈن کا ہاتھ پکڑ لیا اور تخلیہ میں لے جاکر

بڑی متانت سے بولا۔ ''اب میرے مرنے کے دن قریب آ گئے ہیں۔ میں دیکھنے میں گو جوان نظر آتا ہوں مگر میری موت کے دن دور نہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ کم سے کم اپنے ایک دوست کو ہمدردی کے لیے اپنے ساتھ لے چلوں۔ تم چلوگے یا نہیں؟ صاف بولو ہاں یا نہیں۔'' شیریڈن نے ہنس کر کہا ''ضرور چلوں گا۔'' اتنا سنتے ہی ٹامس کی بذلہ سنجی پھر واپس آ گئی۔ وہ پھر بلبل کی طرح چہکنے لگا اور باقی وقت عیش و طرب میں کٹا۔

اہل کمال میں اور اوصاف کے ساتھ حسد کا مادہ بھی بالعموم زیادہ ہوتا ہے۔ ایک شخص دوسرے کے کمال کو ناچیز سمجھتا ہے اور اپنے تئیں اس سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ رینالڈ اور گنیس برو میں برابر چشمکیں رہا کرتی تھیں۔ رینالڈ شبیہ نگار تھا، اورشبیہ نگاری کی اس زمانہ میں جتنی قدر تھی اتنی قدرت نگاری کی نہیں ہوسکتی تھی۔ اسی وجہ سے اس سے سب مصور خار کھاتے تھے۔ گنیس برو کھلم کھلا برملا اس کی غیبت کیا کرتا تھا۔ ایک بار باہمی مصالحت کا زور یہاں تک ہوا تھا کہ دونوں شخص ایک دوسرے کی تصویر کھینچنے کے لیے آمادہ ہوگئے تھے۔ مگر پھر بگاڑ ہوگیا اور پھر دونوں آدمی الگ ہوگئے۔ گنیس برو نے بستر مرگ پر اپنے رقیب کو یاد کیا۔ رینالڈ کی صاف دلی دیکھیے کہ اسی وقت حاضر ہوگیا۔دونوں اصحاب فن بغلگیر ہوئے اوردلوں میں جو دونوں کے حسد کے کانٹے چبھے ہوئے تھے وہ اسی وقت نکل گئے ۔ چشمکیں اور عداوتیں اسی وقت تک رہتی ہیں جب تک ان سے طبیعت کو کوئی حظ حاصل ہوتا ہے۔ جب دنیا کی طرف سے دل فسردہ اور برگشتہ ہوجاتے ہیں تو فطرتی طور پر افسوس ہوتا ہے کہ ہم کیوں اتنے دنوں تک ایک دوسرے کے بدگوئی اور ضرر رسانی کے ساعی و داعی رہے۔

گینس برو اپنے تصاویر پر دستخط یا تاریخ نہیں دیا کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کسی تصویر کی وقعت اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ کس مصور کی بنائی ہوئی ہے بلکہ اس لیے کہ اس میں خود کیا اوصاف ہیں۔ اس کو یقین تھا کہ میری تصاویر میں ایسے محاسن موجود ہیں جو میرے خصوصیات ہیں اور ان خصوصیات کی بدولت ہمیشہ میری تصویریں ممتاز رہیں گی۔ اپنی تصویروں میں ''لکڑ ہارا اور اس کا کتا آندھی ہیں'' اسے بہت مقبول تھا۔ لکڑ ہارے کی نگاہوں میں جو آسمان کی طرف اٹھی ہوئی ہیں گویا خدا سے التجا کر رہی

ہیں کہ مجھے اس آندھی بجلی پانی سے نجات دے۔ دہقانی جذبہ کی بے نظیر تصویر کھینچ گئی ہے، اسی طرح "گڑریے کا لڑکا اور برکھا۔" بھی دہقانی زندگی کی ایک بڑے دلچسپ پہلو کی تصویر ہے۔ دونوں تصویروں کے بھیگنے والوں کے چہرہ سے ایسی حسرت اور بے بسی ٹپک رہی ہے جس کا اظہار کسی طرح نہیں کیا جاسکتا۔ پہلی تصویر ضائع ہوگئی ہے، لیکن اس کا خاکہ ابھی تک موجود ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ تصویر نہایت اعلیٰ پایہ کی ہوگی۔ ٹامس اس کی قیمت ایک سو گنی خیال کرتا تھا۔ مگر اس کی حسین حیات میں ایسا کوئی قدردان نہ ملا جو سو پونڈ بھی اس کے معاوضہ میں دے سکے۔ اس کے مرنے کے بعد مسز گنیس برو نے وہی تصویر پانچ سو پونڈ پر فروخت کی۔ ٹامس کی اور مقبول تصویروں میں "گھڑا لیے پن بھری اور اس کا کتا" ہے۔ ہمارے ملک میں ابھی تک کسی نے ان روز مرہ کے واقعات کی تصویر کھینچنے کی کوشش نہیں کی۔ راجاروی ورما مرحوم شاعرانہ اور خیالی مضامین کی طرف جھک گئے۔ کبھی کبھی انگریزی سیاحوں کے فوٹو البتہ نظر آجاتے ہیں مگر فوٹو کی تصاویر کبھی ایسی موثر، خوشنما، اور نظر فریب نہیں ہوسکتیں جیسے کہ دستی تصاویر۔

رینالڈ کی طرح گنیس برو بھی کھڑے کھڑے رنگ آمیزی کیا کرتا تھا۔ اور جو پنسلیں وہ استعمال کرتا تھا ان میں لمبے لمبے نیزے لگے ہوتے تھے جو بعض اوقات دو گز سے بھی لمبے ہوتے تھے۔ وہ اپنے نمونہ تصویر سے اس فاصلہ پر کھڑا ہوتا تھا جتنا کہ تصویر زیر نظر رہے تاکہ دونوں کے رنگوں میں نگاہ کے پھیر سے کوئی تفاوت نہ پیدا ہوجائے۔ وہ بہت سویرے اٹھتا اور سویرے ہی سے کام میں لگ جاتا تھا، بارہ ایک بجے تک کام کرنے کے بعد وہ تفریح طبع کے مشاغل میں لگ جاتا تھا۔ اسے شام کے وقت اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھ کر متفرق خاکے کھینچنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ خاکے کھینچ کھینچ کر وہ میز کے نیچے پھینکتا جاتا تھا۔ اس میں سے جو طبیعت کے موافق ہوجاتے ان پر زیادہ توجہ کرکے تصویر کی صورت میں لایا کرتا تھا۔ گرمی میں وہ دیہات کے ہرے میدانوں اور صاف ہوا میں گھوما کرتا تھا اور جاڑے میں جب کام کرکے تھک جاتا تو اپنی کھڑکی سے سر نکال کر دھوپ کھایا کرتا۔

اس مصور میں کسی قدر مجذوبیت کا مادّہ موجود تھا۔ ایک سوانح نگار لکھتا ہے کہ

ٹامس کو بین بجانے کا بہت شوق تھا۔ ایک روز ایک شخص کرنل ہملٹن نامی نے اس کے روبرو بین بجانا شروع کیا۔ ٹامس پر اس لطف کا ایسا سرور ہوا کہ اس نے کرنل سے کہا ''گائے جاؤ، میں تمھیں 'لڑکا چھپر پر ہے' والی تصویر دوں گا۔ جس کے خریدنے کی تم کئی بار درخواست کر چکے ہو۔'' کرنل نے خوب دل لگا کر گایا اور ٹامس ہمہ تن گوش بناحظ اٹھاتا رہا۔خوشی کے آنسو آنکھوں سے جاری تھے اور سچا حظ نفس چہرے سے جھلک رہا تھا۔ کرنل ہملٹن نے اسی وقت گاڑی کرایہ کی اور اس تصویر کو گھر لے گیا۔

جس دعوت کا سرجارج بومائٹ نے تذکرہ کیا ہے اسے مشکل سے ایک سال گزرا ہوگا کہ گینیس برو کے نام واقعی موت کا پیغام آ گیا۔ وارن ہسٹنگیز اس زمانہ میں ہندوستان سے تازہ تازہ واپس گئے تھے۔ اور ان بے عنوانیوں کے پاداش میں جو یہاں انھوں نے دیسی ریاستوں پر کی تھیں ان کی سرزنش ہو رہی تھی۔ ایڈ منڈ برک اپنی قوت تقریر کی لاثانی مثالیں دے رہے تھے۔ ہر روز ہاؤس آف کامنس کے سامنے ہجوم لگا رہتا تھا۔ گینیس برو بھی شیریڈن کے ساتھ برک کی تقریر سننے گیا اور ایک کھڑکی کے سامنے پشت کر کے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد یکا یک اسے ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے میری گردن پر برف رکھ دی۔ پھر رگیں تن گئیں اور درد ہونے لگا۔ مکان پر آ کر اس نے فلالین وغیرہ باندھا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر جراحوں اور ڈاکٹروں کو دکھایا سب نے کہا یہ معمولی سردی ہے۔ کوئی خطرہ کی بات نہیں۔ مگر گینیس برو کے دل میں کوئی بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا کہ تمھارا انجام قریب ہے۔ آخر انجام ہی آ گیا۔ دوسری اگست ۱۷۸۸ء کو اکسٹھویں سال میں اس کی روح جسم فانی سے پرواز کر گئی۔ مرنے کے پہلے اس نے رینالڈ کو یاد کیا تھا اور دونوں آدمیوں میں میل ہوگیا تھا۔ رینالڈ اور شیریڈن لاش کے ہمراہ دروازۂ قبر تک گئے۔

گینیس برو کے انتقال کے بعد اس کی بیوہ نے تمام تصاویر فروخت کے لیے پیش کیں جن میں ۵٦ تصویریں اور سو سے زائد خاکے تھے۔ بہت اس موقع پر فروخت ہوگئیں۔ کچھ نیلام کردی گئیں۔ ان میں کی دو تصویریں دست برد روزگار سے بچتے بچتے بچ رہی ہیں۔ ایک کا نام ہے ''نیلا لڑکا'' اور دوسرے کا ''جھونپڑے کا دروزہ'' ۔ پہلی تصویر رینالڈ کے ضد میں کھینچی گئی تھی۔ رینالڈ نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ نیلا

رنگ لباس وغیرہ کے لیے ناموزوں ہیں۔ گینس برو نے ''نیلا لڑکا'' بنا کر اس دعوے کی تردید کی۔ بہت سے نکتہ چینیوں کا قول ہے کہ انگریزی مصوری میں کسی لڑکے کی تصویر ایسی اعلیٰ پایہ کی نہیں۔ نیلے رنگ کا استعمال بہت مشکل ہے اور اسی لحاظ سے ٹامس وینڈآئیک سے بہت ملتا تھا جو اس خوبی کے لیے مشہور روزگار ہے۔ اس لڑکے کے چہرہ سے ایسا قدرتی حسن ظاہر ہوتا ہے اور اس کا انداز ایسی بے تکلفی سے معمور ہے کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے۔ دوسری تصویر میں ایک خوبصورت سا جھونپڑا ہے جس کے دروازہ پر ایک عورت ایک بچہ کو گود میں لیے بیٹھی ہے اور اس کے ادھر ادھر کئی بچے کھیل کود رہے ہیں۔ یہ جھونپڑا بہت گنجان درختوں کے سایہ میں بنایا گیا ہے اور درختوں کی آڑ سے چشموں اور سبز لہلہاتے ہوئے میدانوں کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ اس کے رنگ نہایت شوخ ہیں اس میں ایک قسم کا بھورا سنہرا پن پایا جاتا ہے۔ جو اس مصور کے خصوصیات میں ہے۔ عورت خود ایک تندرست، گدرائی ہوئی دہقانی عورت کی بہترین مثال ہے۔ جس کے چہرہ کا حسن اور ملاحت اس کی آنکھوں کی سادگی اور ہونٹوں کی مسکراہٹ سے اور بھی دوبالا ہوجاتا ہے۔

شکل و شباہت میں گینس برو بہت وجیہہ کہا جاتا ہے۔ اس نے بھی ہوگارتھ کی طرح یونیورسٹی تعلیم نہ پائی تھی مگر اس کے خطوط جو دستیاب ہوئے ہیں ان میں جو ظرافت اور سلاست ہے وہ بہت کم انگریزی مصنفوں کی تحریر میں پائی جاتی ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ وہ ذرا مسخرا شخص تھا اور اس وجہ سے اپنی تحریر میں بھی وہ متانت نہیں برت سکتا تھا جو کسی فلاسفر کی تحریر میں ہونی چاہئے۔ اس کے ارادے بہت مضبوط ہوا کرتے تھے جس بات سے ایک مرتبہ جی ہٹ گیا پھر نہیں جمتا تھا۔ ۱۷۸۴ء میں اس نے جب ایک تصویر رائل اکادمی میں نمائش کے لیے بھیجی تو یہ تاکید کردی کہ جس قدر ہوسکے اسے نیچا لٹکایا جائے مگر اکادمی میں کوئی شرط اس کے خلاف تھی۔ لوگوں نے اختلاف کیا۔ گینس برو نے تصویر واپس لے لی اور پھر کبھی نہ بھیجی۔

اس کے خاکے متعدد ہیں اور کوئی ایسا نہیں جس سے حال کا اظہار نہ ہو۔ شاید کسی مصور نے بھی اتنے خاکے نہیں چھوڑے۔ ان میں سے بعض بعض اس کی بہترین تصویروں کے مقابلہ کے ہیں۔ ان سبھوں میں نفاست و غرابت موجود ہے۔ ایک نقاد

لکھتا ہے کہ "لیڈیوں کے جو خاکے میں نے ان کے دیکھے، ویسے اور کہیں دیکھنے میں نہیں آئے۔ ان میں بہت سے خاکوں کے نام مٹ گئے ہیں، مگر حال میں اسی مصور کے ایک پڑپوتے رچرڈ لین نے جو خود بھی اعلیٰ پایہ کے مصور ہیں ان خاکوں کا شائع کرنا شروع کیا ہے۔ اب تک دو ڈھائی درجن نکل چکے ہیں، اور شاید یہ سلسلہ عرصہ تک قائم رہے گا۔"

مگر ٹامس گِنیس برو محض منظر نگار نہ تھا۔ ایسے مصوروں کا قاعدہ ہے کہ اپنے باغیچوں کی جنت کا باغیچہ بنا دیں گے۔ ان کی ندیاں نہر طوبیٰ کو شرمائیں گی۔ ان کے میدان، ان کے کوہسار، ان کے آبشار، سبھی ایسے نظر آئیں گے گویا وہ انسان کے لیے نہیں بنے ہیں بلکہ فرشتے، اور دیوتے ان کے سیر و کیفیت کا مزہ اٹھاتے ہیں۔ان تصویروں میں انسان کا کام نہیں ہوتا، باغیچے سجے رکھے ہوئے ہیں مگر سجانے والے نظروں سے پوشیدہ ہیں، آبشاروں سے پانی بڑی خوبصورتی سے گر رہا ہے۔ مگر اس سین کا لطف اٹھانے والا کوئی تصویر میں نہیں ہے۔ برعکس اس کے گِنیس برو جب کسی منظر کی تصویر لیتا ہے تو اس میں انسان کا پارٹ بھی بڑی خوبی سے دکھاتا ہے۔ اس کے باغیچے فرشتوں سے بسنے کے لیے نہیں بلکہ انسان کے سیر و تفریح کے لیے بنے ہوئے ہیں اور اس میں انسان چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اس کے چہرے سبھی مواقع پر حضرت انسان موجود نظر آتے ہیں۔ وہ کسی خاص اصول، کسی خاص اسکول کا پابند نہ تھا۔ وہ فلورنس یا وینس یا ڈیمارک کا مقلد نہ تھا، وہ وینڈائیک، یا ٹشین یا رفیلی کا مقلد نہ تھا۔ وہ انگلستان میں پیدا ہوا تھا، اور وہیں اپنے فن کی تحصیل کی۔ چنانچہ اس کے منظر سب انگریزی مناظر ہیں۔ اس کے مرد و عورت سب انگریز ہیں۔ اس کی ندیاں جھونپڑے سب انگریزی ہیں۔ وہ رینالڈ کی طرح اساتذہ سے اپنی تصویروں کے نمونے نہیں طلب کرتا اور نہ ولسن کی طرح سوئٹزر لینڈ اور اٹلی کی سینری کھینچتا ہے۔ کسی اسکول، کسی روش، اور کسی طرز سے وہ مانوس نہیں، اس نے قدرت کے مدرسہ میں تعلیم پائی اور اسی تعلیم کی بدولت صفحہ دنیا پر اپنا نام ثبت کرگیا۔

بعض اوقات اس کی تصاویر عجلت یا کم توجہی سے خراب ہوگئی ہیں جیسا کہ بالعموم طباع آدمیوں کا قاعدہ ہے کہ وہ کسی ایک امر پر طبیعت کو بہت دیر تک نہیں لگا سکتے۔

اسی طرح گنیس برو بھی ایک تصویر کو بناتے بناتے جب گھبرا جاتا تھا تو اسے جلدی جلدی ختم کردیتا اور پھر اس پر نظر ثانی نہ کرتا۔ دماغ میں خیالات بجلی کی دمک کی طرح آتے ہیں۔ یکایک کوئی تازہ قابل تصویر خیال آیا۔ اور فوراً پنسل سے اس کا خاکہ کھینچ لیا۔ اب جب تک اس خاکہ کو تصویر کی صورت میں لائے اس پر رنگ بھرے اور اس میں بہت سی ایسی ایسی چھوٹی موٹی خوبیاں پیدا کرے جو مشق اور غور سے پیدا ہوتی ہیں تب تک خیال کی وہ تازگی رخصت ہوگئی۔ اس لیے وہ بہ عجلت تمام کام کیا کرتا تھا۔ تاکہ جہاں تک جلد ممکن ہو خیال ادا ہوجائے۔ اس عجلت کی بدولت اس کی بعض بیش بہا تصویریں ناقص ہوگئی ہیں۔ رینالڈ اپنے ہمعصروں کے عیوب و محاسن پر کبھی زبان نہیں کھولا کرتے تھے مگر جب گنیس برو کے انتقال نے اس کو ہمعصروں کی فہرست سے خارج کردیا تو کبھی کبھی اس کے کمال کا اعتراف کرنے لگے۔ فرماتے ہیں ''گینس برو کی تصاویر کو جب نزدیک جاکر خوب نظر غور سے دیکھیے تو بیشمار چھوٹے چھوٹے نشانات اور لکیریں نظر آتی ہیں۔ جو نکتہ فہم مصوروں کی نگاہوں میں بھی اس وقت ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا اتفاق سے رہ گئی ہیں۔ اور ان سے مصور کی کوئی خاص منشا نہیں ہے لیکن جب کچھ فاصلہ پر چلے جایئے تو یہی لکیریں ، یہی بے جوڑ، غیر ضروری نشانات گویا جادو کے زور سے متشکل نظر آنے لگتے ہیں۔ او رجو کام اِن کے سپرد کیا گیا ہے اسے انجام دینے لگتے ہیں۔ اس لیے یہ مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ گنیس برو میں عجلت اور کم توجہی کے پردہ میں محنت اور عرق ریزی چھپی ہوئی ہے۔ گنیس برو خود اپنے تصویروں کی اس خوبی سے واقف تھا جو اس کی اس تاکید سے واضح ہوتا ہے کہ نمائش گاہ میں ہمیشہ میری تصاویر پہلے نزدیک اور تب ذرا فاصلہ سے دیکھی جایا کریں۔''

گنیس برو کے منظروں میں چھوٹے چھوٹے خوش و خرم بچوں کا ادھر ادھر آزادی سے دوڑنا بہت پیارا معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً جب انھیں رینالڈ کے بچوں سے موازنہ کرکے دیکھیے۔ اس میں شک نہیں شیر شعراء کے بچے بھی بڑی پیاری چیزیں ہیں۔ بے تکلف، آزاد اور خوبصورت، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مخملی گدوں پر سونے اور سنہرے چمچوں سے کھلائے جانے کے عادی ہیں۔ گنیس برو کے بچوں میں ایک قسم کی دہقانی خوبصورتی، ایک آزادانہ ادا ایک صحت آمیز بے خبری پائی جاتی ہے۔ جس سے

ان کے دیہاتی اور اکھڑ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ وہ قدرت کے بچے معلوم ہوتے ہیں جو باغ قدرت میں آزادی و خرمی کے ساتھ دوڑ رہے ہیں۔ ان کو اس بات کی پرواہ کی ضرورت نہیں کہ میرے ساٹن کے کوٹ خراب ہوجائیں گے یا میرے نرم نرم جوتے بھیگ جائیں گے۔ وہ ہری ہری گھاس پر لوٹتے، خرگوشوں کی طرح جھاڑیوں میں پھدکتے اور نالوں اور چشموں میں مچھلیوں کی طرح تیرتے پھرتے ہیں۔

''زمانہ'' ستمبر ۱۹۰۷ء

تنقید (حال کی کتابیں)

(۱) ''وکرم اروسی'' مترجمہ مولوی عزیز مرزا صاحب بی اے ہوم سکریٹری حضور نظام

اردو زبان کا مخرج اگرچہ فارسی اور سنسکرت دونوں ہی ہیں مگر شعرائے اردو ابتدا ہی سے فارسی کلام کی تتبع میں اس حد تک منہمک رہے ہیں کہ شاید بجز رامائن اور دو ایک اور مذہبی کتابوں کے کسی اعلیٰ پایہ کی سنسکرت تصنیف نے اردو زبان کا جامہ نہیں پہنا۔ عرصہ ہوا کہ ہندی بھاشا نے جس کی کم بضاعتی امر مسلمہ ہے کالی داس اور بھوبھوتی کی بیشتر تصانیف سے اپنا خزانہ مالا مال کرلیا ۔ اردو زبان میں بجز شکنتلا کے ایک ٹوٹے پھوٹے ترجمہ کے ابھی تک ان میں سے کسی ایک کا بھی ترجمہ نہیں ہوا۔ خوشی کا مقام ہے کہ اردو کے مشہور جادونگار مولوی محمد عزیز مرزا صاحب نے اپنی توجہ اس طرف مبذول کی ہے اور کالی داس کے مشہو رناٹک ''وکرم اروسی'' کا ترجمہ اردو پبلک کے سامنے پیش کیا ہے۔ مرزا صاحب پختہ کار انشا پرداز ہیں اور آپ کا نام اردو زبان میں بہت مشہور و معروف ہے۔ اس ترجمہ کی وقعت اس وجہ سے اور بھی بڑھ گئی ہے کہ ایک مسلمان انشا پرداز کے قلم سے اس کا وجود ہوا۔ گر کسی ہندو نے یہ کام انجام دیا ہوتا تو غالبًا اس کے ہندو پن کی وجہ سے یہ کتاب اہل اسلام میں اتنی عام نہ ہوسکتی جس کا اسے حق حاصل ہے۔

مولوی صاحب نے اصل ترجمہ کے قبل ایک بسیط دیباچہ لکھا ہے جس کی تحقیقات قابل ستائش ہے اس کو بغور دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم میں ہندوستان میں ڈراما نویسی کا مذاق کس قدر اعلیٰ اور ارفع تھا۔ ڈراما کے اصولوں، قسموں، مضامین، اقسام مضامین، طرز بیان، ہیرو کے اقسام وغیرہ نکات پر جو جو موشگافیاں ہندو قدمانے کی ہیں ان سے ان کی ہمہ گیر طبیعت اور ذہن وقار کا پتہ چلتاہے۔ اس میں مطلق شک نہیں

کیا جاسکتا کہ انھوں نے ڈراما نگاری کو بہ منزلہ ایک سائنس کے بنا دیا تھا۔

مگر یہ الزام کچھ مسلمانوں ہی کے سر نہیں ہے کہ انھوں نے ہندی علم ادب سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہندوؤں پر بھی یہی الزام کلی طور پر وارد ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے زمانے میں تو خیر سنسکرت کے مذہبی اور بعض ادبی تصانیف کے ترجمے ہوئے بھی مگر ہندوؤں نے تو شاید فارسی اور عربی علم ادب کی کسی ایک تصنیف کو بھی بھاشا یا سنسکرت کا جامہ نہیں پہنایا۔ گلستان جیسی مقبول عام تصنیف کا ترجمہ بھی ہندی بھاشا میں چند ماہ قبل تک نہ موجود تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوؤں نے فارسی میں اپنے کلام کی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ٹیک چند، مادھو رام قتیل سب لافانی نام ہیں، مگر ان میں سے کسی نے بھی یہ کوشش نہ کی کہ فارسی تصانیف کو ہندی یا سنسکرت کا زیور پہنائے۔ انھوں نے مروجہ شعار کی تقلید کی اور اسی پر قانع رہے۔ اس طرح دونوں قومیں باوجود صدیوں سے یکجا رہنے سہنے کے بھی ایک دوسرے کے علم ادب سے بے خبر ہیں اور حالانکہ یہ بیگانگی پورے طور پر دونوں قوموں کے اختلافات کی ذمہ دار نہیں کہی جاسکتی۔ تاہم الزام سے بری نہیں ہے، حضرت مصنف نے دیباچہ میں فرمایا ہے۔

> ''اس کام کی ضرورت مجھے اس وجہ سے اور بھی محسوس ہوئی کہ زمانے میں ملک کی بدنصیبی سے ہندوستان کی بڑی قوموں، ہندو مسلمانوں میں سخت اختلاف پیدا ہوتا جاتا ہے اور میرے خیال میں اگر کوئی تدبیر اس اختلاف کو روکنے یا اس کے بجائے ہمدردی پیدا کرنے کی ہے تو وہ یہی ہے کہ ایک دوسرے کے لٹریچر سے مستفیض ہونے کا موقع جو فارسی لٹریچر کے دونوں قوموں کی ترقی دماغی و دنیوی کے لیے لازمی ہونے کی وجہ سے تھا باقی نہیں رہا۔''

ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کا مسئلہ ایسا اہم اور پیچیدہ ہے کہ اس کی تحریک جس کسی سے ہو وہ سچا قومی ہمدرد کہے جانے کا مستحق ہے۔ اور اس کی کوشش مبارکباد کے قابل ہے۔

کالی داس کے سوانحی حالات اس قدر پردہ خفا میں مستور ہیں کہ اس کی نسبت بجز اس کے اور کچھ معلوم نہیں ہے کہ وہ راجہ وکرمادت کے نورتن کا ایک انمول ہیرا

تھا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات محققوں کو مثل شیکسپیئر کے اس کے وجود پر بھی شبہ ہوتا ہے۔ سنسکرت شعراء متاخرین میں اس کا کلام جو پایہ عالی رکھتا ہے اور اس کو جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہے وہ بجز بھوبھوتی کے جو اس کے ایک صدی بعد پیدا ہوا اور کسی سنسکرت شاعر کو حاصل نہیں۔ اس کے کمال شاعری پر حضرت مولف فرماتے ہیں۔

''یورپ اور ہندوستان کے بڑے بڑے ماہران فن متفق ہیں کہ کالی داس ازل سے مصور کی نظر شاعر کا دماغ اور نقاش کا ہاتھ لے کر آیا تھا۔ اس کی عالمگیر نظر نہ صرف فطرت انسانی کے پیچیدہ رازوں بلکہ تمام مظاہر قدرت کے دل افزا کرشموں، یا ہوش ربا سانحوں کی تہ تک پہنچ گئی تھی۔ اور وہ جو کچھ دیکھتا تھا اس کا قوی حافظہ اس کو بلا کم و کاست خزانہ خیال میں جمع کر دیتا تھا۔''

جرمن کے سب سے بڑے شاعر گیٹے نے ''شکنتلا'' کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے جو شاعرانہ سخن فہمی سے مملو ہے۔

'' سال نو کی کلیاں اور ختم سال کے میوے اور وہ سب چیزیں جو روح کے لیے ''غذا یا لذت دہ کام و زبان ہیں، یا جو اس کو لبھایا وجد میں لاسکتی ہیں۔ غرض جو کچھ زمین و آسمان میں عمدہ اور نفیس ہے وہ سب تو نے ایک نام میں جمع کر دیا ہے۔ اور شکنتلا تیرا نام زبان پر آیا اور وہ سب نعمتیں گویا کہ مل گئیں۔''

جذبات نازک کے اظہار اور مناظر فطرت کے بیان میں اس کو جو کمال حاصل ہے اس کی بدولت تمام اقوام عالم کے شعراء میں اسے اعلیٰ درجہ ملا ہے۔

''وکرم اروسی'' کالی داس کے تین مشہور ومعروف ڈراموں سے ہے اور اگرچہ اس میں شکنتلا کی سی دل آویزی نہیں ہے مگر رنگینی و سلاست بیان اور جذبات نازک کی چاشنی کے لحاظ سے جو کالی داس کے کلام کی خصوصیات ہیں وہ اور ڈراموں کے مدمقابل ہے۔ شیکسپیئر کی طرح کالی داس بھی اپنے ڈراموں کے لیے نئے پلاٹ نہیں گڑھتا۔ بلکہ پرانے واقعات پر رنگ و روغن چڑھا کر ایک دل پسند صورت میں پیش کرتا ہے۔ شکنتلا اور وکرم اُروسی دونوں پرانے قصے ہیں۔ ہاں مالوی کاگنی متر ایک

تاریخی قصہ ہے۔

مسلمانوں نے کیوں ہندو ڈراما سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس مسئلے پر فاضل مترجم نے چند منصفانہ ریمارک کیے ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ اہل اسلام اپنے قومی علم وادب پر اس قدر نازاں تھے کہ کسی دوسری قوم کے ادب سے فائدہ اٹھانا کسر شان سمجھتے جس کا قابل افسوس نتیجہ یہ ہے کہ اردو ادب کی ترقی تصنع پر جاکر ختم ہوگئی۔ کاش!۔اردو شاعری کی بنیاد بھاکھا یا سنسکرت پر قائم کی گئی ہوتی تو

> ''آج دوسرا ہی سماں نظر آتا اور زور بیان اور مطابقت فطرت کی کیفیت ہی دوسری ہوجاتی اور وہ چیز جس کو اب ہماری آنکھیں بے فائدہ اردو شاعری میں ڈھونڈتی ہیں اور جو ہر قوم کی شاعری کی جان ہے وہ محض عدم موجودگی سے نمایاں نہ ہوتی۔ چنانچہ اب ضرورت ہے کہ اردو شاعری کی رگوں میں نیا خون دوڑایا جائے۔''

اس دیباچہ میں صرف ایک نکتہ ہے جس پر ہم کو حضرت مولف سے اتفاق نہیں ہوسکتا۔ آپ فرماتے ہیں کہ ڈراما کا تصور سب سے پہلے اہل یونان نے قائم کیا اور اس معاملے میں جرمنی محققوں کو آپ سند مانتے ہیں جن کا بالعموم یہ شعار ہے کہ ہر قسم کی روشنی و تہذیب کو یورپ ہی سے منسوب کریں۔ یا اگر کبھی انصاف پسندی کے جذبہ میں آکر ہندوستان کے علم وہنر کی تعریف بھی کریں تو مربیانہ لہجے میں جس میں صداقت کی بہت کم بو آتی ہے۔ آپ یہ فرماتے ہیں کہ ہندوستان نے شاعری کی دو قسمیں کی تھیں۔ ایک ''درشے'' جو دیکھی جاسکے اور دوسری ''سروتے'' جو سنی جاسکے۔ چونکہ ڈراما قسم اول کی خاص ظاہری صورت ہے۔ اس سے یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ دو قسمیں کیں وہ ڈراما کے فن سے ناواقف نہ تھے کسی طبعی قسم بندی کے لیے اشیاء کا وجود لازمی ولابدی ہے۔ جب تک ہمارے سامنے جمیع اقسام کے رنگ موجود نہ ہوں ہم ان کی مختلف قسموں میں تمیز نہیں کرسکتے۔ اور ہندوؤں کا تقسیم اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ ہندو شاعری ۔لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ ہندوؤں نے ڈراما کا تصور ہندوستانیوں سے نہیں لیا۔یہ بیشک قرین قیاس ہے کہ سنسکرت کے متقدین نے ''سروے'' قسم پر زیادہ زور دیا اور اسی صف میں طبع آزمائیاں کرتے رہے۔ ''درشے'' کی طرف

مقابلتاً توجہ کم کی۔ اس کی مثال اردو شاعری سے مل سکتی ہے کہ باوجود دو سو برسوں سے زائد کی مشق کے ابھی ایک بھی ایسا ڈراما نہیں نکلا۔ جسے بقا دوام کا حق حاصل ہو۔ یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ ڈراما کا مفہوم جو آج کل ہے وہ ہندوؤں کے یہاں نہیں تھا۔ اور نہ صرف ہندوؤں کے یہاں بلکہ انگلستان میں بھی شیکسپیئر کے وقت تک ڈراموں نے موجود روش اختیار نہ کی تھی، نہ جادو کار پردے ہوتے تھے، نہ حیرت انگیز نظارے۔ لوگ محض جذبا ت نازک اور زبان لطیف سے لطف اٹھانے کے لیے جایا کرتے تھے۔

جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے کتاب تقریباً بے عیب ہے۔ بعض بعض مقامات پر سنسکرت تشبیہات اردو لباس میں بھونڈی نظر آتی ہیں۔ جس کا سبب غالبًا یہ ہے کہ ہمارے مذاق بگڑے ہوئے ہیں ڈراما کے لیے محض خیالات کی شاعری کی ضرورت نہیں ہے بلکہ لباس شاعری کی بھی ضرورت ہے۔ اور نظم جب نثر کی صورت اختیار کرتی ہے تو اس کی دل آویزی میں بہت فرق آجاتا ہے۔ کیا اردو کے شعراء جلیل القدر جوگل و بلبل اور غمزہ و ادا اور شکوہ شکایات میں اپنی جان کھپایا کرتے ہیں اس طرف متوجہ نہ ہوں گے ۔ حضرت سرورؔ، طالبؔ بنارسی، پنڈت برج نرائن چکبستؔ، حضرت کیفیؔ اور حضرت نظرؔ اگر اس کام میں ہاتھ لگائیں تو اپنی لافانی شہرت کی بنیاد ڈال سکتے ہیں۔ لکھائی چھپائی اس کتاب کی خاصی ہے۔ اور جلد نہایت نفیس اور پائدار قیمت عہ دفتر زمانہ کانپور سے مل سکتی ہے۔

(۲) ویدور نیتی، مترجمہ سری جت مانک راؤوٹھل راؤ حیدر آبادی

زمانۂ قدیم کے ہندو علماء اخلاق میں ویدور جی مہاراج کو جو رتبہ عالی حاصل ہے۔ اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ سنسکرت میں شکرؔ، چانکیہؔ اور ویدورؔ کے پند نامے بہت وقیع سمجھے جاتے ہیں۔ موخر الذکر مہاراجہ دھرت راشٹ اور پانڈو کے بھائی تھے۔ مگر نجیب الطرفین نہ ہونے کے باعث دولت و ثروت سے محروم کردئے گئے تھے۔ ان کی زندگی بہت سادہ اور بے لوث تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی خیالات نہایت اعلیٰ و ارفع ان کی بے سروسامانی کی یہ کیفیت تھی کہ سری کرشن جی مہاراج جیسے ذی اقتدار بزرگ کی دعوت کی تو معمولی ساگ سے زیادہ لذیذ کوئی چیز نہ پیش کرسکے۔ ویدور کا

ساگ آج تک مشہور رہے۔ مگر بایں ہمہ بے سروسامانی آزاد رو ایسے تھے کہ جب ان سے کبھی کسی امر میں مشورہ لیا جاتا تھا تو وہ بڑی بیباکی سے اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ ان کے نصائح دل پسند سنسکرت لٹریچر میں ہمیشہ سے ممتاز درجہ پاتے رہے ہیں۔ جب کوروؤں اور پانڈوؤں میں مصالحت سے کام نہ نکلنے کے باعث مناقشے پیدا ہوئے تو دھرت راشٹ جی اپنے بھائی دیدور کے پاس صلاح لینے گئے۔ ویدور جی نے اس وقت انھیں جو تلقین کی ہے اس کا ایک ایک حرف آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ افسوس ہے کہ اب تک دنیائے اردو اس در بے بہاو کان علم و خرد کے وجود سے بالکل بے خبر تھی۔ حال میں حیدر آباد کے سری جت مانک راؤ وٹھل راؤ نے اس کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ صاحب ممدوح پہلے بھی کئی مفید کتابیں تالیف کرچکے ہیں۔ اور یہ ترجمہ بحیثیت مجموعی برا نہیں۔ ہم ناظرین کی ضیافت اور استفادہ کے لیے اس میں سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ انھیں پڑھ کر یہ اندازہ کیا جاسکے گا کہ مسائل دنیا پر صائب اور معقول رائے قائم کرنے کے لیے اس امر کی مطلق ضرورت نہیں کہ انسان بندۂ دنیا ہوکر رہے۔ پہلے ہی اقتباس میں ''عالم'' کے جو اوصاف بتلائے ہیں اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا معیار فضیلت کس قدر گر گیا ہے۔ آج ہم اس شخص کو عالم کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے جس کو دوچار زبانوں سے واقفیت ہو جو اپنے خیالات کا صفائی سے اظہار کرسکے۔ اور جو حسب ضرورت معقولیت سے بحث مباحثہ کرسکے، ہم یہ اکثر سنتے ہیں کہ فلاں صاحب اگرچہ ذرا شراب نوش کرتے ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اپنے وقت کے عالم ہیں۔ علیٰ ہذا انسان میں صدہا عیوب ذاتی موجود ہوں۔ مگر محض اس کے ذہنی کمالات کے بنا پر اسے عالم کہنے میں مطلق دریغ نہیں کیا جاتا۔ دیکھیے ویدور جی کیا فرماتے ہیں۔

''عالم کہلانا اسی کو سزاوار ہے جو دنیا کے کاروبار میں محو ہونے پر بھی خواہشات نفسانی اور مال و دولت پر راستی کو ترجیح دیتا ہو جو شخص اپنا قیمتی وقت رائگاں نہیں صرف کرتا اور خیالات پر جس کو قابو ہوتا ہے کہ اسے عالم کہتے ہیں۔ عالم و دانشمند وہی ہے جو حوادث روزگار سے ایسا ہی بے پروا ہو جیسا دریا اپنے میں کنکر پتھر پھینکے جانے سے ہوتا ہے۔

مشتے نمونہ از خروارے چند اور نصیحتیں سن لیجیے۔

۱۔ انسان کے جسم سے خون خارج کرنے کے لیے دو نشتر ہیں۔ جن میں سے پہلا نشتر تو مفلس کو کثیر دولت کی خواہش ہے۔ اور دوسرا باوجود کمزوری کے دوسروں پر برہمی۔

۲۔ ذیل کے دو شخصوں کو کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں غرق کر دینا چاہیے۔ ایک تو ایسے دولت مند کو جو اپنی دولت میں مستحق لوگوں کو شریک نہ کرے۔ اور دوسرے ایسے مفلس کو جو باوجود افلاس کے پرمیشور کی عبادت نہ کرے۔

۳۔ دو شخص ایسے آفت کے پرکالے ہوتے ہیں کہ آفتاب کے خط محیط کو بھی چیر پھاڑ کر اوپر داخل ہوسکتے ہیں۔ ان میں سے اول تو حبس دم کرکے ریاضت کرنے والا سنیاسی ہے۔ اور دوسرا میدان کارزار میں دلیری کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرکے شہید ہوجانے والا بہادر۔

۴۔ جلیل القدر حکمرانوں کے لیے اگلے لوگ کہہ گئے ہیں کہ اسے بزدل، غیر ہمدرد اور خوشامدی آدمیوں سے مشورہ نہ کرنا چاہیے۔

۵۔ بھائی اگر تو خوشحالی سے زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو ان چاروں باتوں پر عمل کر۔ بزرگ خاندان، فلاکت زدہ شریف، مفلس دوست۔ اور لاولد ہمشیرہ کو اپنے گھر میں جگہ دے۔ ان کی عزت کر، اور ان کی خبر گیری کرتا رہ بزرگ خاندان سے نہ صرف تیرا بھرم قائم رہے گا بلکہ تجھے گزرے ہوئے زمانہ کے حالات بھی معلوم ہوسکیں گے۔ شریف اگرچہ فلاکت زدہ کیوں نہ ہوگا لیکن اس کے اچھے صفات کا اثر تیرے بچوں پر پڑے گا۔ دوست ہمیشہ تیری بہبودی چاہے گا اور اس سے اچھا مشورہ دینے والا تجھے نہ ملے گا۔ ہمشیرہ خانہ داری کے انتظام میں تجھ کو مدد دے سکے گی وہ دوسرے سے ممکن نہیں۔

۶۔ انسان میں جو حواس خمسہ موجود ہیں اگر ان میں سے ایک پر بھی بے قابو ہوتو روزن دار چرمی ڈول سے بہہ کر نکل جانے والے پانی کی طرح

انسان کے دماغ سے تمام خوبیاں نابود ہوجاتی ہیں۔
۷۔ چھ شخص محسنوں کے احسان کی وقعت اور پروا نہیں کرتے۔ فارغ التحصیل شاگرد اپنے استاد کی، اہل عیال اولاد اپنی ماں کی، خواہشات نفسانی سے سیر آدمی عورت کی۔ اہل غرض ایسے شخص کی جس سے غرض حاصل ہوگئی ہو۔ طوفان سے بچا ہوا آدمی کشتی کی۔ صحت کے بعد مریض طبیب کی۔
۸۔ جس طرح شہد کی مکھی پھول کو قائم رکھ کر اس میں سے صرف شہد لے لیا کرتی ہے علیٰ ہذا حکمراں کو لازم ہے کہ رعایا کی حیثیت قائم رکھ کر ان سے محاصل وصول کرے۔
۹۔ راستی سے نیکی، مطالعہ سے علم کی، نیک روی سے حسن کی، نیک طریق سے خاندان کی، ناپ تول سے غلہ کی، پھیرنے سے گھوڑے کی، غور و پرداخت سے جانوروں کی اور سادہ لباس سے عورت کی عصمت کی حفاظت ہوتی ہے۔

ہم ناظرین سے استدعا کرتے ہیں کہ یہ کتاب پڑھیں۔ اسے وہ دینی، دنیوی، ملکی غرض جملہ مسائل میں سچا رہنما پائیں گے۔ منیجر زمانہ کے پاس سے مل سکتی ہے۔

''زمانہ'' فروری ۱۹۰۸ء

سوامی ویویکا نند

بھگوان کرشن نے بھگوت گیتا میں کہا ہے کہ جب کبھی نیکی مغلوب ہوجاتی ہے اور بداعمالیوں کا زور ہوتا ہے تو میں بنی نوع انسان کی امداد کے لیے نازل ہوتا ہوں ۔'' اس دہر ناپائدار میں عموماً اور ہند میں خصوصاً جب کبھی آبادی کی زیادتی یا کسی اور وجہ سے ازسرنو ترمیم اور اصلاح کی ضرورت ہوئی ہے تو ایسے ہادیان برحق ظہور پذیر ہوئے ہیں جن کی روحانی طاقت حالات موجودہ پر غالب آئی ہے۔ زمانۂ قدیم میں جب شروفساد نے زور پکڑا تو سری کرشن بھگوان آئے اورظلم و بدی کی آگ بجھائی اس کے بہت دنوں بعد جب پھر حیوانیت و نفسانیت کا غلبہ ہوا تو بھگوان گوتم بدھ نے جنم لیا اور ان کی تعلیم و تلقین نے روحانیت کی ایک موج پیدا کردی جس نے کئی صدیوں تک مادیت کو سر نہ ابھارنے دیا۔ مگر جب مرور ایام نے اس روحانی تعلیم کی بنیاد بھی کمزور کردی اور اس کے پردے میں نفسانیت اور بداخلاقیوں کا پھر زور ہوا، تو سری شنکر اچارج سوامی نے اوتار لیا۔ اور ان تمام برائیوں کو جو مذہب کے پردے میں رائج ہو رہی تھیں اپنے زور تقریر اور یوگ بل سے ایک قلم مٹا دیا۔ بعد ازاں کبیر صاحب اور سری چتین سوامی اپنی روحانیت کا سکہ دلوں پر بٹھا گئے۔

گذشتہ صدی عیسوی کے ابتدا میں مادیت نے پھر سر اٹھایا۔ اور اس دفعہ اس کا حملہ ایسا پرزور تھا اور اس کے آلات حرب ایسے کارگر، اور اس کے معاونین ایسے دلیر اور طاقتور تھے کہ ہندوستان کی روحانیت کو اس کے مقابل میں سر تسلیم خم کرنا پڑا اور تھوڑے ہی دنوں میں اس نے کوہ ہمالیہ سے راس کماری تک اپنا سکہ بٹھا دیا۔ ہماری نگاہیں اس مادی روشنی کے سامنے خیرہ ہوگئیں۔ ہم نے اپنے قدیم فلسفہ اپنے قدیم علم، اپنے قدیم معاشرت، اپنے قدیم مذہب، اور اپنے قدیم معیاروں کو ترک کرنا شروع کیا،

ہم میں یہ خیال راسخ ہوگیا کہ ہم مدت ہائے دراز سے گمراہ تھے اور روحانیت کی تعلیم محض ڈھکوسلہ ہے اور خواہ زمانہ قدیم میں اس سے مفید نتائج پیدا ہوئے ہوں مگر زمانہ موجودہ کے لیے وہ کسی طرح موزوں نہیں ہے۔ اور اگر اس راستے سے ہٹ کر یہ نئی شاہراہ اختیار نہ کریں گے تو کچھ دنوں میں صفحہ ہستی سے معدوم ہوجائیں گے۔ ایسی حالت میں ہندوستان کے خاک پاک سے پھر ایک بزرگ اٹھا جو روحانیت کے جوش سے معمور تھا جس کا حوصلہ بلند اور نظر وسیع تھی جس کا دل جوش محبت سے لبریز تھا۔ اس کی صداقت آمیز للکارنے دم زدن میں مادی دنیا میں ایک تہلکہ سا ڈال دیا۔اس نے مادّیت کے قلعہ میں گھس کر ثابت کردیا کہ یہ روشنی جسے تم روشنی سمجھے ہوئے ہو تاریکی ہے اور یہ تہذیب جس پر تمھیں اس قدر ناز ہے اصلی تہذیب نہیں۔ اس جوش صداقت سے مالا مال تقریر نے ہندوستان پر بھی جادو کا اثر پیدا کیا اور مادیت کی موج در موج رفتار نے اپنے مقابل ایک رفیع دیوار کھڑی دیکھی جس کی جڑ کو ہلانا، جس کے اوپر سے ہوکر گزر جانا اس کے لیے غیر ممکن تھا۔آج اپنے طرز معاشرت، اپنے علم ودین اپنے رسم و رواج اور اپنے مذہب کو ہم فخر اور اعزاز کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ اس نفس پاک کی تعلیم کی برکت ہے کہ آج ہم اپنے قدیم میعاروں کی پرستش کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اور یورپ کے ہیرو اور دلاور، عالم اور فلاسفر ہم کو اپنے علمااور فضلا کے مقابل بالکل ناتواں بچے نظر آتے ہیں۔ آج ہم کسی امر کو خواہ وہ مذہب معاشرت یا علم و فن سے تعلق رکھتا ہو۔ محض اس دعویٰ پر ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ یورپ میں اس کا رواج ہے بلکہ ہم اس کے لیے اپنے مذہبی کتب اور اپنے قدیم بزرگوں سے مشورہ لیتے ہیں۔ اور ان کے فیصلے کو قول فیصل سمجھتے ہیں۔ یہ سب سری سوامی ویویکانند مرحوم کے تعلیم روحانیت کی کرامات ہے۔

سوامی ویویکانند جی کے سوانح زندگی بہت مختصر ہیں۔ افسوس! آپ عین عالم شباب میں اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ اور ملک و قوم کو جتنا فیض ان کی ذات قدسی صفات سے پہنچ سکتا تھا نہ پہنچ سکا۔ ۱۸۶۳ء میں وہ ایک معزز کائستھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ آثار نیک بچپن ہی سے ظاہر تھے۔ انگریزی مدارس میں تعلیم پائی اور ۱۸۸۴ء میں بی۔اے۔ کی سند حاصل کی اس وقت ان کا نام نریندر ناتھ دت تھا۔

برائے چندے انھوں نے برہمو سماج کی پیروی کی۔ روزانہ عبادت میں شریک ہوتے۔ اور چونکہ انتہا درجے کے خوش گلو تھے کیرتن سماج میں بھی شریک ہوا کرتے تھے۔مگر برہمو سماج کی تلقینات ان کی پیاس کو نہ بجھا سکیں۔ مذہب ان کے نزدیک محض کسی کتاب سے شلوک پڑھنے، چند رسمیات ادا کرنے اور گیت گانے کا نام نہیں ہوسکتا تھا۔ کچھ دنوں تک وہ تلاش حقیقت میں سرگرداں رہے۔ ان دنوں شری سوامی رام کرشن پرم ہنس سے لوگوں کو بہت عقیدت تھی۔ نوجوان نریندر ناتھ نے ان کی صحبت سے فیض اٹھانا شروع کیا اور رفتہ رفتہ پرم ہنس جی کی تعلیم کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ وہ ان کے زمرۂ معتقدین میں شامل ہوگئے اور اس مرشد کامل سے اسرار حقیقت اور نکات معرفت کی خاطر خواہ سبق سیکھے۔ پرم ہنس جی کے پرلوک سدھارنے کے بعد نریندر نے کوٹ پتلون اتار پھینکا اور یوگ دھارن کرلیا، اس وقت سے آپ ویویکا نند مشہور ہوئے۔ اپنے مرشد پر انھیں پرستش کی حد تک اعتقاد تھا۔ جب کبھی آپ ان کا تذکرہ کرتے ہیں تو ایک ایک لفظ سے ادب و احترام کا اظہار ہوتا ہے، ''میرے مرشد'' کے نام سے انھوں نے نیو یارک میں ایک استادانہ تقریر کی جس میں شری پرم ہنس جی کے اوصاف و فضائل کا ایک نہایت پرجوش اور معتقدانہ لہجہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

سوامی ویویکا نند نے اپنے مرشد کامل کی خدمت میں پہلی بار نیاز حاصل کرنے کا تذکرہ یوں لکھا ہے:

''وہ ظاہراً بالکل معمولی آدمی معلوم ہوتے تھے۔ ان کی صورت میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ ان کی زبان بہت سادہ تھی۔ میں نے اپنے دل میں خیال کیا کیا ممکن ہے کہ یہ درویش کامل ہوں، میں آہستہ آہستہ ان کے قریب گیا اور ان سے وہ سوالات پوچھے جو میں اکثر اوروں سے پوچھا کرتا تھا۔ ''مہاراج کیا آپ خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا ''ہاں'' پھر میں نے پوچھا ''کیا آپ اس کا وجود ثابت بھی کرسکتے ہیں۔ جواب ملا ''ہاں'' میں نے پوچھا ''کیوں کر'' جواب ملا ''کیونکہ میں اسے بجنسہٖ اسی طرح دیکھتا ہوں جیسے تم کو۔''

پرم ہنس جی کے کلام اور انداز بیان میں ایک برقی تاثیر تھی جو اہل شک کو فوراً راہ راست پر پہنچا دیتی تھی اور یہی تاثیر سوامی ویویکانند جی کے کلام اور نگاہ میں بھی

تھی۔ یہ ہم کہہ چکے ہیں کہ پرم ہنس جی رحلت گرائے جادوانی ہوئے تو ویویکا نند نے یوگ دھارن کرلیا۔ ان کی والدہ محترمہ بڑی حوصلہ مند عورت تھیں۔ انھیں ارمان تھا کہ میرا لڑکا وکیل ہو۔ اچھے خاندان میں شادی کرے اور عیش و آرام سے بسر کرے۔ جب اس کے سنیاسی ہونے کی خبر پائی تو فوراً پرم ہنس جی کی خدمت میں حاضر ہوکر بہت التجا کی کہ میرے بیٹے کو یوگ نہ دیجیے۔ مگر جس دل نے محبت لافانی اور روحانیت کا مزہ چکھ لیا۔ اسے دنیائے دوں کی نعمتیں اور خوشیاں کب اپنی طرف کھینچ سکتی ہیں۔پرم ہنس جی کا قول تھا کہ جو دوسروں کو روحانی تعلیم دینے کا ادّعا کرے اسے پہلے خود عرفان کے رنگ میں ڈوبنا چاہیے۔ اس ارشاد کے موافق سوامی جی ہمالیہ پہاڑ پر چلے آئے۔ اور یہاں وہ کامل چھ برس تک ریاضت و تزکیہ نفس میں مصروف رہے۔ بالکل برہنہ تن، بے خواب و خور، یکہ و تنہا وہ ارباب طریقت کی تلاش میں گھومتے اور ان کی صحبت سے فیض اٹھاتے رہتے تھے۔ کہتے ہیں کہ تلاش حقیقت انھیں تبت کھینچ لے گئی۔ جہاں انھوں نے بدھ مذہب کے اصول و طریق کا بہت محققانہ مطالعہ کیا۔ سوامی جی خود فرماتے ہیں کہ مجھے دو دو تین تین دن کھانا میسر نہ ہوتا تھا۔ بسا اوقات ایسے مقام پر برہنہ سویا ہوں جہاں کی سردی کا اندازہ لگانے سے مقیاس الحرارت بھی قاصر ہے۔ بارہا شیروں اور شکاری جانوروں سے سامنا ہوا۔ مگر رام کے پیارے کو ان باتوں کا کیا ڈر۔

سوامی ویویکا نند ہمالیہ میں تھے جب انھیں القا ہوا کہ اب اپنے مرشد کامل کے ارشاد کی تعمیل کرنی چاہئے۔ چنانچہ وہ پہاڑ سے اترے اور بنگال، ممالک متحدہ، راجپوتانہ بمبئی، مدراس وغیرہ مقامات میں کبھی ریل پر اور اکثر پیادہ پا سفر کرتے رہے۔ اس وقت وہ عام جلسوں میں تقریر نہ فرماتے تھے۔ بلکہ نج کے طور پر شائقین کو جو ان کی خدمت میں از راہ عقیدت حاضر ہوجاتے اخلاق و مذہب کے مسائل سمجھاتے جسے مصیبت میں دیکھتے اس کی تشفی فرماتے۔ مدراس اس وقت دہریوں اور مادہ پرستوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ انگریزی یونیورسٹیوں کے نئے نئے نوجوان جو اپنے مذہب و معاشرت سے بالکل بے خبر تھے علانیہ خدا کے وجود سے منکر ہوتے تھے۔ سوامی جی نے یہاں عرصے تک قیام کیا اور کتنے ہی ہونہار نوجوانوں کو تبدیل مذہب سے روکا اور دہریت

کے دام سے بچایا۔ بارہا لوگوں نے ان سے مباحثے کیے۔ بارہا ان کا مضحکہ اڑایا۔ مگر وہ اپنے رنگ عرفان میں اس قدر محو تھے کہ نھیں کسی کے تمسخر یا تضحیک کی مطلق پروانہ تھی۔ رفتہ رفتہ ان کی شہرت نوجوانوں کے حلقے سے نکلی اور بوئے مشک کی طرح پھیلنے لگی ۔ روٴسا امرا عقیدت مند ہوگئے اور ان کی زبان مبارک سے اخلاق و ویدانیت کے سبق سیکھے۔ جسٹس سبرمینیا اتیار مہاراجہ رام ند (مدراس) اور مہاراجہ کھیتری (راجپوتانہ) ان کے خاص عقیدت مندوں میں تھے۔

سوامی جی مدارس میں تھے جب امریکہ میں پارلیمنٹ مذاہب کے انعقاد کی خبر ملی۔ وہ فوراً اس میں شریک ہونے کے لیے تیار ہوئے۔ اور ان سے زیادہ باخبر زیادہ جادو بیان اور تھاہی کون؟ عقیدت مندوں نے مدد کی اور آپ اس مقدس سفر پر روانہ ہوگئے۔ امریکہ کی تاریخ میں یہ واقعہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مغربی قوم نے دیگر اقوام کے مذہب کی تحقیق اور خیر مقدم کے لیے آمادگی ظاہر کی ہو۔ راستے میں سوامی جی نے چین و جاپان کی سیر کی اور جاپان کی طرز معاشرت سے بہت متاثر ہوئے۔ وہاں سے انھوں نے ایک خط لکھا تھا فرماتے ہیں:

”آؤ! ان لوگوں کو دیکھو اورجاکر شرم سے منہ چھپالو۔ آؤ، مردنبو، اپنے تنگ سوراخوں سے باہر نکلو ذرا دنیا کی ہوا کھاؤ۔“

امریکہ پہنچ کر انھیں معلوم ہوا کہ ابھی انعقاد پارلیمنٹ کو بہت عرصہ ہے۔ یہ دن ان کے بڑی تکلیف میں بسر ہوئے۔ بے زری کا یہ حال تھا کہ پاس اوڑھنے اور بچھانے تک کو کافی نہ تھا۔ مگر ان کی استغنا ان سب وقتوں پر حاوی ہوتی گئی۔ آخر بڑے انتظار کے بعد تاریخ مقررہ آ پہنچی۔دنیا کے مختلف مذاہب نے اپنے اپنے سفیر بھیجے تھے اور یورپ کے بڑے بڑے پادری اور دینیات کے پروفیسر اور بشپ ہزاروں کے شمار میں موجود تھے۔ ایسی جماعت میں ایک بے زر، بے یارومددگار نوجوان کا کون پرسان حال تھا جس کے بدن پر ثابت کپڑے بھی نہ تھے پہلے تو کوئی ان سے مخاطب بھی نہ ہوا۔ مگر صدر انجمن نے بڑی فراخ دلی سے ان کی استدعا قبول کی اور وہ وقت آ گیا کہ سوامی جی اپنے زبان فیض ترجمان سے کچھ فرمائیں۔ اس وقت تک انھوں نے کسی عام مجلس میں تقریر نہ فرمائی تھی۔ یکا یک ایک آٹھ دس ہزار باعلم باخبر اور نکتہ رس

آدمیوں کے مقابل کھڑے ہوکر تقریر کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ تقاضائے بشریت سے ایک لمحہ کے لیے سوامی جی کو بھی گھبراہٹ رہی، مگر صرف ایک بار طبیعت پر زور ڈالنے کی ضرورت تھی۔ سوامی جی نے ایسی عالمانہ اور پرزور تقریر فرمائی کہ سامعین نقش حیرت بن گئے۔ یہ غیر مہذب ہندو! اور ایسی عالمہ تقریر! کسی کو یقین نہ آتا تھا۔ آج بھی اس تقریر کے پڑھنے سے دل پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ تقریر کیا ہے بھگوت گیتا اور اپنشد وں کا لب لباب ہے۔ آپ نے پہلی بار اہل مغرب کو سوجھایا کہ بے تعصبی کسے کہتے ہیں۔ آپ نے برعکس اوروں کے کسی مذہب کی مذمت نہ کی۔ اور ان لوگوں کے دل میں جو خیال عرصے سے جاگزیں تھا کہ ہندو تعصب کے پتلے ہیں وہ یک لخت دور ہوگیا۔ یہ تقریر ایسی وسیع اور پرمعنی ہے کہ اس کا خلاصہ کرنا محال ہے۔ مگر اس کا نچوڑ یہ تھا۔

''ہندو مذہب کسی مسئلہ پر اعتقاد لانے یا خاص قوانین و رسمیات کی پیروی کرنے پر مبنی نہیں۔ ہندو کا دل الفاظ و مسائل سے تسکین نہیں پاسکتا۔ اگر کوئی ایسی دنیا ہے جو ہماری نظر مجازی سے پنہاں ہے تو ہندو اس دنیا کی سیر کرنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی ایسی روح ہے جو مادہ نہیں، اگر کوئی عدل مجسم، رحم مجسم قادر مطلق ہے تو ہندو اسے اپنی آنکھوں۔ حقیقی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے شکوک جبھی دور ہوتے ہیں جب وہ انھیں دیکھ لیتا ہے۔''

آپ نے اہل مغرب کو پہلی بار سوجھایا کہ وہ سائنس کے نتائج جن پر وہ ناز کرتے ہیں اور جن کا وہ مذہب سے کوئی تعلق نہیں سمجھتے، ہندوؤں کو زمانہ قدیم سے معلوم تھے۔ اور ہندو مذہب کی بنیاد انھیں پر قائم ہے۔ اور جبکہ اور مذاہب کسی خاص شخص کی شخصیت اور اس کی ذاتی تعلیم پر مبنی ہیں۔ ہندو مذہب کی بنیاد ابدی اور ازلی اصولوں پر ہے اور یہ اسباب کا ثبوت ہے کہ کبھی نہ کبھی دنیا کا عام مذہب یہی ہوگا، فرض کو فرض سمجھ کر ادا کرنا، کام کو محض کام سمجھ کر کرنا ایسی باتیں تھیں جو اہل مغرب کو اب تک نہ معلوم تھیں، ان کی پرجوش تقریروں اور صداقت آمیز تلقینات سے لوگ اس حد تک متاثر ہوئے کہ امریکہ کے اخباروں نے سوامی جی کی بڑے اعتقاد مندانہ لہجہ میں تعریفیں کرنا شروع کیں۔ آپ کی تقریروں میں وہ جادو ہوتا تھا کہ سامعین پر محویت

کا عالم طاری ہوجاتا تھا۔

ارادت مندوں کی تعداد روز افزوں ہونے لگی اور اطراف و اکناف سے متلاشیان حقیقت ان کے پاس آنے اور اپنے شہروں میں آپ کو مدعو کرنے لگے۔ سوامی جی کو بسا اوقات دن دن بھر دوڑنا پڑتا تھا۔ بڑے بڑے پروفیسر، علماو فضلا نے ان کے روبرو زانوئے ادب تہہ کیا اور ان کی تلقینات کو اپنے گوشہ جگر میں جگہ دی۔ سوامی جی کا قیام یہاں قریب تین برس کے رہا اور اس عرصے میں انھوں نے جسمانی تکالیف کا ذرا بھی خیال نہ کرکے اپنے مرشد کامل کے ارشاد کے موافق ویدانت کی اشاعت کی۔ اس کے بعد آپ انگلستان تشریف لے گئے۔ آپ کی شہرت وہاں پہلے ہی پہنچ گئی تھی۔ اگرچہ پہلے انگریزوں کو جو مادہ پرستی میں تمام دنیا سے گوے سبقت لے گئے ہیں متوجہ کرنے میں آپ کو بہت تکلیف ہوئی مگر آپ کا حیرت انگیز استقلال اور آپ کی زبردست قوت ارادی آخر کار ان مشکلات پر غالب ہوگئی۔ اور آپ کی تقریروں کا جادو انگریزوں پر بھی چل گیا۔ ایسے ایسے علما جنھیں کھانے کے لیے بھی اپنے لیبوریٹری سے نکلنا تھا۔ آپ کی تقریریں سننے کے لیے گھنٹوں قبل سے آجاتے اور منتظر رہتے۔ آپ نے وہاں تین بڑے معرکے کی تقریریں کیں اور آپ کے زور بیان اور علمی لیاقت کا سکہ سب کے دلوں پر بیٹھ گیا۔ اب یہ سب پر روشن ہوگیا کہ مادہ پرستی میں یورپ چاہے ہندوستان سے کتنا ہی آگے ہو مگر روحانیت اور معرفت کا میدان ہندوستانیوں کا ہے۔ آپ تقریباً ایک سال یہاں رہے، متعدد سوسائٹیوں اور انجمنوں اور کالجوں اور کلب گھروں سے آپ کے پاس دعوتیں آتی تھیں مگر آپ وید مقدس کے اصولوں کی اشاعت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ آپ کی پرجوش تقریروں کا یہ اثر ہوا کہ بشپوں اور پادریوں نے ویدانت پر اپنے کلیساؤں میں تقریریں کیں۔

ایک روز لندن کے معلموں کا ایک خاص جلسہ ایک لیڈی کے گھر پر ہونے والا تھا۔ لیڈی صاحبہ مسئلہ تعلیم پر بہت دستگاہ رکھتی تھیں، اور ان کی تقریر سننے اور اس پر مباحثہ کرنے کے اشتیاق میں بہت سے علما جمع تھے۔ اتفاق سے لیڈی صاحبہ کی طبیعت اس موقع پر ناساز ہوگئی۔ سوامی جی وہاں موجود تھے، لوگوں نے استدعا کی کہ آپ کچھ فرمائیں، سوامی جی اٹھ کھڑے ہوئے اور ہندوستان کے طرز تعلیم پر ایک استادانہ تقریر

فرمائی۔ ان علم فروشوں کو کتنی حیرت ہوئی جب سوامی جی نے زبان فیض ترجمان سے فرمایا کہ ہندوستان میں ودیا دان ہر قسم کی سخاوت سے افضل مانا گیا ہے۔ ہندو معلم اپنے شاگردوں سے کچھ نہیں لیتا بلکہ انھیں اپنے گھر پر رکھتا ہے، اور دماغی ضروریات کے ساتھ ان کے جسمانی ضروریات کا کفیل ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہاں بھی آپ کے ارادت مندوں کا حلقہ وسیع ہوگیا۔ بہت سے لوگ جو اپنے مزاج کے موافق روحانی غذا نہ پاکر مذہب سے بیزار ہو رہے تھے۔ ویدانت کے والہ و شیدا ہوگئے اور سوامی جی سے ان کی عقیدت ایسی پختہ ہوگئی کہ جب وہ چلے تو ان کے ساتھ کئی انگریز شاگرد تھے جن میں مس نوبل (جو اب مسٹر نویدیتا کے نام سے مشہور ہیں) بھی تھیں۔ سوامی جی نے انگریزوں کے طرز معاشرت اور ان کی عادات و خصائل کا بڑی باریک بین نگاہوں سے مشاہدہ کیا۔ ان تجربات کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے ایک تقریر میں فرمایا ہے کہ یہ چھتریوں اور بہادروں کی قوم ہے۔

۱۶/دسمبر ۱۸۹۶ء کو سوامی جی اپنے چند انگریز چیلوں کے ساتھ وطن مالوف کی طرف روانہ ہوئے۔ ہندوستان کے خاص و عام آپ کے کارہائے نمایاں کی خبریں سن کر آپ کے دیدار کے مشتاق ہو رہے تھے۔ آپ کے خیر مقدم اور استقبال کے لیے شہروں میں کمیٹیاں ہونے لگیں۔ جس وقت وہ جہاز سے کولمبو میں اترے تو عوام نے جس جوش و خروش سے آپ کا خیر مقدم کیا وہ ایک مسرت بخش نظارہ تھا۔ کولمبو سے لے کر الموڑہ تک جس شہر میں آپ تشریف لے گئے۔ لوگوں نے آنکھیں آپ کے فرش راہ کیں، صغیر و کبیر، امیر و غریب سب کے دلوں میں آپ کا اعزاز و احترام یکساں جلوہ گزیں تھا۔ یورپ میں بڑے سے بڑے فاتح کی جو خاطر و مدارات ہوسکتی ہے اس سے بدرجہا زیادہ ہندوستان میں سوامی جی کی ہوئی، آپ کے درشن کے لیے لاکھوں آدمیوں کا مجمع ہوجاتا تھا۔ اور لوگ آپ کو ایک نظر دیکھنے کے لیے منزلیں طے کرکے آتے تھے۔ کیونکہ گوہندوستان لاکھ گیا گزرا ہے تاہم ایک سچے درویش اور ایک عارف کامل کی عزت جیسی کچھ ہندوستانی کرسکتے ہیں۔ کسی ملک میں ممکن نہیں۔ یہاں دلوں پر فتح پانے والے نفس پر غالب آجانے والے فاتح کی۔ ملک پر فتح کرنے والے اور ابنائے جنس کے خون بہانے والے فاتح سے کہیں زیادہ عزت و حرمت ہوتی ہے۔

ہر شہر میں عوام نے آپ کو اپنی قدردانی اور شکر گزاری کے ایڈریس پیش کیے۔ بعض بعض بڑے شہروں میں آپ کو پندرہ پندرہ بیس بیس ایڈریس دیئے گئے اور آپ نے ان کے جواب میں اپنے ہم وطنوں کو حوصلہ بخش جوش حب وطن سے معمور اور روحانی صداقت سے مالا مال تقریریں فرمائیں۔ مدراس میں آپ کے لیے سترہ عالی شان پھاٹک بنائے گئے تھے۔ مہاراجہ رام ندنے جن کی معاونت سے سوامی جی امریکہ گئے تھے۔ اس وقت بڑی فراخ دلی اور فیاضی سے آپ کے استقبال کا اہتمام کیا۔ صوبہ مدراس کے مختلف مقامات کی سیر کرتے اور شائقین کو اپنے کلام فیض التیام سے شادکام کرتے آخر کار ۲۸ فروری کو سوامی جی کلکتہ میں تشریف لائے۔ یہاں آپ کی تعظیم و تکریم کے لیے پہلے ہی سے لوگ بے قرار ہو رہے تھے۔ جس وقت آپ کو ایڈریس پیش کیا گیا۔ پانچ ہزار آدمیوں سے زیادہ جمع تھے۔ راجہ بنے کرشن بہادر نے خود ایڈریس پڑھا۔ جس میں سوامی جی کے کارہائے نمایاں کا جس گایا گیا تھا۔

کلکتہ میں سوامی جی نے ایک نہایت عالمانہ تقریر فرمائی مگر درس و تدریس میں سے حد سے زیادہ محو ہونے کے باعث آپ کی صحت میں فرق آ گیا۔ اور مجبوراً آپ تبدیل آب و ہوا کے لیے دار جلنگ تشریف لے گئے۔ وہاں سے الموڑہ گئے مگر سوامی جی وید مقدس کے اشاعت کا بیڑا اٹھائے ہوئے تھے۔ ان کو بیکاری میں کب چین آ سکتا تھا۔ جوں ہی ذرا طبیعت سنبھلی آپ سیال کوٹ تشریف لے گئے۔ اور یہاں سے باشندگان لاہور کی عقیدت مندیوں نے لاہور بھی کھینچ بلایا۔ ان دونوں مقامات میں آپ کی تکریم بڑے جوش سے ہوئی۔ او رآپ نے اپنے گراں بہا کلمات سے سامعین کے ضمیر روشن کیے۔ لاہور سے آپ کشمیر گئے، اور راجپوتانہ کی سیر کرکے پھر کلکتہ واپس آئے۔ اس اثنا میں آپ نے دو خانقاہیں قائم کردی تھیں۔ اس کے کچھ دنوں بعد آپ نے رام کرشن مشن کی بنیاد ڈالی جس کے اغراض و مقاصد فلاح نام و بہبود عام پر مبنی ہیں اور جس کی شاخیں ہندوستان کے ہر حصے میں موجود ہیں اور قوم کو اپنی کوششوں سے بے انتہا فائدہ پہنچا رہی ہیں۔

۱۸۹۷ء سارے ہندوستان کے لیے منحوس سال تھا۔ طاعون کی گرم بازاری تھی اور قحط کا بھی سامنا تھا۔ لوگ فاقہ کشی اورموت کے شکار ہونے لگے۔ سوامی جی رحم مجسم

تھے۔ اپنے ہم وطنوں کی یہ مصیبت دیکھ کر کیسے خاموش بیٹھ سکتے تھے۔ آپ نے اپنی لاہور والی تقریر میں فرمایا تھا۔

''عام آدمی کا مذہب یہی ہے کہ وہ فقیروں یا خستہ حال آدمیوں کو بھر پیٹ کھانا کھلائے انسان کا دل ایشور کا سب سے بڑا مندر ہے۔ اور اسی مندر میں ایشور کی پرستش کرنا چاہیے۔''

چنانچہ آپ نے بری سرگرمی سے محتاج خانے کھولنا شروع کیے۔ سری رام کرشن جی نے فنا فی القوم سنیا سیوں کی ایک قلیل جماعت بنا دی تھی۔ یہ سب اب سوامی جی کے زیر نگرانی و غریب اور آزردہ حال آدمیوں کی مدد میں دل و جان سے مصروف ہوئے۔ مرشد آباد، ڈھاکہ، کلکتہ، مدراس وغیرہ متفرق مقامات میں محتاج خانے کھولے گئے۔ وید پرچار کے لیے جابجا مدرسے بھی قائم کیے گئے۔ کئی یتیم خانے بھی کھلے اور یہ سب سوامی جی کی مساعی جمیلہ کی برکت تھی۔ ان کی صحت بہت خراب ہوگئی۔ مگر وہ خود در بدر گھومتے اور آفت رسیدوں کی تشفی کرتے۔ تسکین دیتے اور انھیں ضروری امداد پہنچاتے تھے۔ طاعون زدہ لوگوں کی مدد کرنا جن سے ڈاکٹر لوگ بھی بھاگتے تھے۔ انھیں دیس بھگتوں کا کام تھا۔ ادھر انگلستان اور امریکہ میں بھی وہ پودھا بڑھ رہا تھا جس کا بیج سوامی جی نے بویا تھا۔ دو سنیاسی امریکہ میں اور ایک انگلستان میں ویدانت کی اشاعت میں مصروف تھے۔ اور شائقین کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔

جب سوامی جی کی صحت بہت خراب ہوگئی تو ناچار آپ نے ولایت کا سفر دوبارہ اختیار کیا اور وہاں چندے قیام کرکے امریکہ تشریف لے گئے۔ وہاں آپ کا بڑے جوش سے خیر مقدم کیا گیا۔ چھ برس پہلے جن لوگوں نے آپ کی زبان مبارک سے فلسفہ ویدانت پر پرزور تقریریں سنی تھیں وہ اس وقت تک پکے ویدانتی ہوگئے تھے۔ سوامی جی کے درشن سے خوشی کی انتہا نہ رہی۔ یہاں کی آب و ہوا مفید ثابت ہوئی اورمحنت شاقہ کے باوجود اب پھر توانا ہوگئے۔ آخر ہندو فلسفہ کے شیدائیوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ سوامی جی شبانہ روز کی ریاضت کے باوجود بھی ان کی آرزوئیں پوری نہ کرسکتے تھے۔ امریکہ جیسے تجارتی مقام میں ایک ہندو سنیاسی کی تقریر سننے کے لیے دو دو ہزار آدمیوں کا جمع ہوجانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ صرف سین فرانسسکو میں آپ نے

ہندو فلسفہ پر پچاس لکچر دیئے۔ حاضرین کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی گئی اور شائقین محض فلسفی تقریریں سننے پر قانع نہ ہوئے بلکہ عملی ریاضت اور یوگ سیکھنے کی تمنا بھی ان کے دل میں موجزن ہوئی۔ سوامی جی نے ان کی مدد سے سین فرانسسکو میں ایک ''ویدانت سوسائٹی'' اور شانتی آشرم قائم کیا۔ اور آج تک دونوں سر سبزیں شانتی آشرم شہر کے شور وغل سے دور ایک نہایت پر فضا مقام پر واقع ہے۔ اس کا احاطہ تقریباً دو سو ایکڑ ہے۔ اور یہ ایک فیاض لیڈی کے ایثار اور دریا دلی کی یادگار ہے۔ سوامی جی نیویارک میں تھے کہ پیرس میں ایک مختلف مذاہب کے کانگریس کی تجویز ہوئی اور آپ بھی مدعو کیے گئے۔ اس وقت تک انھوں نے فرانسیسی زبان میں کبھی تقریر نہ فرمائی تھی مگر یہ نوید پاتے ہی آپ اس نئی زبان کی تحصیل میں مصروف ہوگئے اور اپنی روحانی طاقت سے دو مہینے میں ایسی مہارت حاصل کرلی کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ پیرس میں آپ نے ہندو فلسفہ پر دو لکچر دیئے۔ مگر چوں کہ یہ صرف چند مضمون خوانوں کی جماعت تھی اور اس کا منشا دریافت حقیقت نہیں۔ بلکہ پیرس کے نمائش گاہ کی رونق بڑھانا تھا۔ اس لیے فرانس میں سوامی جی کو کامیابی نہ حاصل ہوئی۔

آخر کثرت مشاغل سے سوامی جی کی جسمانی حالت بالکل مضمحل ہوگئی۔ آپ بہت نحیف ہوگئے تھے، خصوصاً پیرس کانگریس کی تیاری نے آپ کو اور بھی ضعیف بنا دیا جب امریکہ، انگلستان، فرانس کی سیر کرتے ہوئے آپ وطن کو لوٹے تو جسم میں صرف ہڈیاں باقی رہ گئی تھیں۔ اور اس قابل نہ تھے کہ عام جلسوں میں تقریر فرما سکیں۔ ڈاکٹروں کی سخت تاکید تھی کہ آپ کم از کم دو سال تک آرام فرمائیں مگر جو دل اپنے ہم وطنوں کی مصیبت پر پگھل جاتا ہو اور جس میں اپنے ہم وطنوں کے ساتھ بھلائی کی دھن سمائی ہو، جس میں یہ ارمان ہو کہ آج کی مفلس نادار اور کمزور قوم پھر زمانۂ قدیم کی خوشحال توانا اور روحانی آریہ قوم ہوجائے اس سے یہ کب ممکن تھا کہ ایک دم کے لیے بھی آرام کرسکے۔ کلکتہ میں پہنچتے ہی آپ چند دنوں کے بعد آسام کی طرف روانہ ہوئے۔ اور مختلف مقامات میں وید کی تلقین کی۔ کچھ تو آپ کی صحت پہلے ہی سے خراب ہو رہی تھی کچھ ان اطراف کی آب و ہوا مضر ثابت ہوئی۔ آپ پھر کلکتہ لوٹے تو دو ماہ تک حالت بہت نازک رہی۔ بعد ازاں آپ بالکل تندرست ہوگئے ان دنوں آپ

اکثر فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں میرا کام اب پورا ہوچکا۔ مگر چونکہ اس کام کو جاری رکھنے کے لیے نفس کش بے غرض اور روحانی قوت سے معمور سنیاسیوں کی اشد ضرورت تھی اس لیے آپ نے اپنی مبارک زندگی کے باقی چند ماہ اپنے شاگردوں کی تعلیم و تلقین میں صرف کیے۔

آپ کا قول تھا کہ تعلیم کا منشا سبق پڑھانا نہیں بلکہ آدمی کو انسان بنانا ہے۔ ان دنوں آپ اکثر استغراق کی حالت میں رہتے تھے اور اپنے معتقدوں سے یہ فرمایا کرتے تھے کہ اب میرے سفر آخرت کا زمانہ بہت قریب آگیا ہے۔ ۴/جولائی ۱۹۰۲ء کو یکا یک آپ محو ہوگئے۔ اس وقت آپ کی صحت بہت اچھی تھی۔ سویرے آپ دو گھنٹہ تک مراقبہ میں رہتے تھے۔ دو پہر کو آپ نے اپنے شاگردوں کو پانی کے سبق دیتے۔ سہ پہر کو دو گھنٹہ تک آپ وید پر لوگوں کو تلقین فرماتے رہے۔ بعد ازاں چہل قدمی کے لیے نکلے، شام کو لوٹے تو ذرا دیر مالا جپنے کے بعد آپ پر پھر استغراق کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اور اسی شب کو آپ نے قالب عنصری ترک کرکے عالم جاودانی کی راہ لی۔ یہ نحیف اور ناتواں قالب خاکی روحانیت کی موج کی تاب نہ لاسکا۔ پہلے لوگوں نے سمجھا یہ محض سادھی ہے اور ایک سنیاسی نے آپ کے کان میں شری پرم ہنس جی کا نام سنایا۔ مگر جب اس کا کچھ اثر نہ ہوا تب لوگوں کو یقین ہوگیا کہ آپ کا وصال ہوگیا۔ آپ کا چہرہ روشن تھا اور نیم باز آنکھیں نور حقیقت سے منور تھیں۔ یہ حسرت ناک خبر سنتے ہی تمام ملک میں تہلکہ مچ گیا۔ دور دور سے لوگ آپ کے جسم پاک کا دیدار حاصل کرنے کے لیے آئے۔ اور آخر دوسرے دن دو بجے دن کو گنگا کے کنارے آپ کی داہ کریا ہوئی۔ پرم ہنس جی نے پیشین گوئی کی تھی کہ جب میرے اس شاگرد کا مشن پورا ہوجائے گا تو وہ عین شباب میں اس دارفانی کو خیر باد کہے گا۔ اور پیشین گوئی لفظ بہ لفظ پوری ہوگئی۔

سوامی جی نہایت وجیہہ اور شکیل بزرگ تھے۔ آپ کے قویٰ بہت مضبوط تھے آپ کا وزن دو من سے زائد تھا۔ آپ کی نگاہ میں برقی تاثیر تھی۔ اور آپ کا چہرہ روحانیت کے رعب و جلال سے منور تھا۔ آپ کی رحم دلی کا ہم اوپر ذکر کرچکے ہیں۔ سخت کلام شاید آپ کی زبان سے ایک بار بھی نہ نکلا ہو۔ باوجود ایسی عالمگیر شہرت کے

ان کا مزاج بہت سادہ اور روش بالکل منکسرانہ تھی۔ ان کی علمیت لامحدود تھی انگریزی کے استاد کامل اور انگریزی مقرروں میں سرآمد روزگار تھے۔ سنسکرت ادب و فلسفہ کے عالم تبحر، جرمنی، عبرانی، یونانی، فرانسیسی وغیرہ السنہ میں دستگاہ کافی ودانی رکھتے تھے۔ محنت شاقہ آپ کی فطرت میں داخل تھی۔ صرف چار گھنٹہ سوتے، چار بجے سویرے اٹھ کر جپ تپ میں مصروف ہوجاتے۔ مناظر فطرت کے آپ والہ و شیدا تھے۔ علی الصباح جپ تپ سے فارغ ہوکر آپ میدان میں نکل جاتے اور نظارہ ہائے قدرت سے محظوظ ہوتے۔ پالو جانوروں کو پیار کرتے اور ان کے ساتھ کھیلتے۔ اپنے مرشد کامل کی آخر وقت تک پرستش بھی کرتے رہے۔ آپ بہت خوش الحان تھے۔ اور آواز نہایت پرموثر پائی تھی۔ شری پرم ہنس جی کبھی کبھی آپ سے بھجن گانے کی فرمائش کرتے تھے۔ اور اس سے اس قدر متاثر ہوجاتے تھے کہ وجدانی کیفیت طاری ہوجاتی۔ میرابائی، اور تان سین کے عاشقانہ زمزموں سے آپ کو عشق تھا۔ زبان میں جادو تھا، آپ کی تقریریں سامعین کے دلوں پر نقش کالحجر ہوجاتی تھیں۔ آپ کا طرز تقریر سادہ اور عام فہم تھا۔ مگر ان معمولی لفظوں میں ایسا روحانی جذبہ بھرا ہوتا تھا کہ سننے والے محو ہوجاتے تھے۔ آپ قوم کے سچے جاں نثار تھے۔ فنا فی القوم کے لقب کا مستحق شاید آپ سے زیادہ کوئی دوسرا نہ ہوگا۔ حب وطن ہی کا جوش آپ کو امریکہ لے گیا تھا۔ اپنی آفت رسیدہ قوم اور اپنی قدیم فلسفہ و ادب کا وقار دوسری اقوام کی نگاہ میں جمانا برہمچاریوں کو تعلیم دینا۔ اپنے ستم زدہ ہم وطنوں کے لیے جابجا خیرات خانے کھلوانا یہ سب آپ کے صادق حب وطن کی یادگاریں ہیں۔ آپ صرف مہرشی نہیں بلکہ فنا فی القوم مہرشی تھے۔ ایک تقریر میں فرماتے ہیں۔

''میرے نوجوان دوستو! مضبوط بنو، تمھارے لیے یہی میری صلاح ہے، تم بھگوت گیتا کے مطالعہ کے بہ نسبت فٹ بال کھیل کر کہیں زیادہ آسانی سے نجات حاصل کرسکتے ہو جب تمھاری رگیں اور پٹھے زیادہ مضبوط ہوں گے تو تم بھگوت گیتا کی تلقینات پر زیادہ خوبی کے ساتھ عمل کرسکتے ہو۔ گیتا کی تعلیم بزدلوں کو نہیں دی گئی تھی بلکہ ارجن کو جو بڑا سورما بہادر اور چھتریوں کا سرتاج تھا۔ شری کرشن کی تعلیم اور ان کے حیرت انگیز اعجاز کو

تم جبھی سمجھ سکو گے جب تمھاری رگوں میں خون کی حرکت ذرا زیادہ تیز ہوگی۔"

ایک دوسری تقریر میں آپ فرماتے ہیں:

"یہ وہ وقت نہیں ہے کہ عالم مسرت .ں بھی روئیں، ہم رو تو بہت چکے، اب ہمارے لیے نرم بننے کی ضرورت نہیں، اس نرمی نے ہمیں اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ اب ہم روئی کے تودے کے مانند ہوگئے ہیں۔ اب جن چیزوں کی ہمارے ملک و قوم کو ضرورت ہے وہ آہنی اعضا اور فولادی رگ و پٹھے اور وہ زبردست قوت ارادی ہیں جسے دنیا کی کوئی چیز نہیں روک سکتی جو اسرار قدرت کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اپنے مقصد سے منہ نہیں موڑتی، خواہ اس کوشش میں اسے سمندر کی تہہ میں جانا اور موت سے سامنا کرنا پڑے۔ عظمت کا راز ہے عقیدت مضبوط اور پختہ عقیدت، اپنی اور قادر مطلق کی ذات سے۔"

سوامی جی کو اپنے اوپر نہایت مضبوط اعتقاد تھا وہ خود کہتے ہیں:

"پرم ہنس جی کے حلق میں ایک خوفناک پھوڑا نکل آیا تھا۔ اور بالآخر اس نے یہاں تک زور پکڑا کہ کلکتہ کے مشہور و معروف ڈاکٹر بابو مہندر لال سرکار طلب کیے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے پرم ہنس جی کی حالت دیکھ کر مایوسی جتائی اور چلتے وقت ان کے چیلوں سے کہا کہ چونکہ یہ مرض وبائی ہے اس لیے تم لوگ اس سے بچتے رہو۔ اور گرو جی کے پاس بہت دیر تک نہ ٹھہرا کرو، یہ سن کرشاگردوں کے دم پھول گئے اور آپس میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ میں اس وقت کہیں گیا ہوا تھا جب لوٹا تو اپنے گرو بھائیوں کو حد درجہ خائف پایا، سبب معلوم ہوتے ہی میں سیدھے اپنے مرشد برحق کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ پیالی جس میں پرم ہنس جی کے حلق سے مواد فاسد خارج ہوا تھا اٹھائی۔ سب شاگردوں کے روبرو نہایت اطمیان سے پی گیا اور بولا "دیکھیں میرے قریب موت کیوں کر آتی ہے۔"

آپ اصلاح تمدن کے پرجوش حامی تھے مگر اس کی موجودہ رفتار سے آپ کو

اتفاق نہ تھا۔ اس وقت ریفارم کی جو کوششیں کی جا رہی ہیں وہ زیادہ تر اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ رسم پردہ ، ازدواج بیوگان قیود ذات یہ آج کل کے اہم ترین تمدنی مسائل ہیں جن میں اصلاح کی سخت ضرورت ہے اور یہ سب تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ سوامی جی کا معیار بہت اعلیٰ تھا، یعنی نیچے طبقے کو ابھارنا، انھیں تعلیم دینا، اور اپنا بھائی بنانا، یہ لوگ ہندو قوم کی بیخ و بنیاد ہیں، اور تعلیم یافتہ طبقے ان کی شاخیں محض شاخوں کو تراشنے سے درخت تازہ و توانا نہیں ہوسکتا۔ اگر درخت کو سرسبز بنانا ہے تو جڑ سے اصلاح ہونی چاہئے۔ علاوہ بریں آپ اس معاملے میں درشت کلامیوں کو سخت مذموم سمجھتے تھے جن کا نتیجہ صرف یہی ہوتا ہے کہ وہی لوگ جنھیں حلقہ اصلاح میں لانا ہے۔ سخت کلامیوں سے تنگ آکر ترکی بہ ترکی جواب دینے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں اور ریفارم کی غرض و غایت صرف یہی ہوجاتی ہے کہ لاطائل مباحثوں اور دل دکھانے والی نکتہ چینیوں سے ورق کے ورق سیاہ کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ سو برس سے زائد ہوئے کہ ریفارم کا کام جاری ہے مگر ہنوز کوئی نتیجہ نہیں برآمد ہوا۔ سوامی جی نے ریفارمروں کے لیے تین شرائط مقرر فرمائے ہیں۔ اول یہ کہ قوم وملک کی محبت ان کے سرشت میں داخل ہوگئی ہو۔ ان کا دل وسیع ہو اور ابناء وطن کے فلاح کی سچی خواہش ان کے دل میں جاگزیں ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنی اصلاح تجاویز پر پختہ اعتقاد رکھتے ہوں۔ اور تیسرے مستقل مزاج اور ثابت قدم ہوں۔ اصلاح کے پردے میں کوئی ذاتی مفاد مدنظر نہ رکھتے ہوں۔ اور اپنے اصولوں کے لیے سخت سے سخت مقابلہ پشیمانی اور تکلیف اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔ یہاں تک کہ موت کا خوف بھی انھیں اپنے ارادے سے باز نہ رکھ سکے۔ جب تک ہم میں یہ تین قابلیتیں بدرجۂ اتم پیدا ہوجائیں۔ ریفارم کے لیے ہماراکوشش کرنا بالکل فضول اور بیکار ہے مگر ہمارے ریفارمروں میں کتنے ہیں جن میں یہ قابلیتیں ہوں ، فرماتے ہیں۔

"کیا ہندوستان میں کبھی مصلحوں کی کمی رہی ہے؟ کیا تم کبھی ہندوستان کی تاریخ پڑھتے ہو؟ رامانج کون تھے؟ شنکر کون تھے؟ نانک کون تھے؟ چتین کون تھے؟ داؤد کون تھے؟ کیا رامانج نیچی ذاتوں کی طرف سے بے خبر تھے۔ کیا وہ زندگی بھر اس امر کی کوشش نہیں کرتے رہے کہ چماروں کو بھی اپنے فرقے میں شامل کرلیں۔ کیا انھوں نے

مسلمانوں کو اپنے طبقے میں ملانے کی کوشش نہیں کی۔ کیا گرو نانک نے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کو باہم ملا کر ایک بنانا نہیں چاہا تھا۔ ان سب بزرگوں نے کوشش کی اور ان کا کام ابھی تک جاری ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ آج کل کے ریفارمروں کی طرح وہ سخت کلامیوں کے عادی نہ تھے۔ ان کے منہ سے جب نکلتے تھے کلمات شیریں۔ وہ کبھی کسی کو گالیاں نہیں دیتے تھے۔ کس کو مطعون نہیں کرتے تھے۔''

بیشک ہم نے اصلاح تمدن کے ان بزرگ اور اہم مسائل کو نظر انداز کردیا ہے اور قدما نے جو روش اختیار کی تھی اس طرف سے منحرف ہوگئے ہیں۔ اور اب اصلاح تمدن کی کوشش محض نمائشی رہ گئی ہے۔ اصلاح تمدن کے تمام مروجہ مسائل میں سوامی جی کو صرف ایک مسئلے سے اتفاق تھا۔ صغیر سنی کی شادیوں اور عوام میں متاہل زندگی بسر کرنے کی ہیجان سے انھیں نفرت تھی۔ چنانچہ رام کرشن مشن نے جو مدرسے قائم کیے ہیں ان میں والدین کو یہ شرط بھی منظور کرنی پڑتی ہے کہ لڑکے کی شادی کم از کم اٹھارہ برس کے سن کے قبل نہ کی جائے گی۔ برہمہ چریہ کے وہ بڑے زبردست حامی تھے۔ اور ہندوستان کی موجودہ پست ہمتی اور ذلت کو وہ بالخصوص اس نقص تمدن سے منسوب کرتے تھے۔ آج کل کے ہندوؤں کے بابت وہ اکثر حقارت آمیز لہجے میں فرمایا کرتے تھے کہ ''یہاں پر بھک منگا بھی یہ آرزو رکھتا ہے کہ شادی کرلوں اور ملک میں دس بارہ اور غلام پیدا کردوں۔''

موجودہ طرز تعلیم کے آپ سخت خلاف تھے آپ کا قول تھا کہ

'' تعلیم ان معلومات کا نام نہیں ہے جو ہمارے دماغ میں ٹھوس دی جاتی ہیں بلکہ تعلیم کا منشا اعلیٰ اخلاق کو سنوارنا، انسان کو ثابت قدم بنانا اور ہماری عادات اور خصائل کو سدھارنا ہے...... اس لیے ہمارا معیار یہ ہونا چاہئے کہ ہمارے ملک کی تعلیم علمی اور مذہبی سب کا انتظام ہمارے ہاتھوں میں ہو اور اس کی پیروی حتی المقدور ہماری قدیم روش اور قدیم طرز پر کی جائے۔''

سوامی جی کا تعلیمی پروگرام بہت وسیع تھا۔ ایک ہند ویونیورسٹی قائم کرنے کا بھی آپ کا قصد تھا۔ مگر بوجوہ چند در چند آپ اس پر عمل نہ فرما سکے۔ ہاں اس کی ابتدا بیشک فرما گئے ہیں۔

تعصب کا آپ کے مزاج میں کہیں لیس بھی نہ تھا۔ دیگر مذاہب کی توہین و تحقیر آپ بہت مذموم خیال فرماتے تھے۔ عیسائیت اسلام، بودھ مت سبھی مذاہب کو آپ یکساں احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ آپ نے اپنی ایک تقریر میں حضرت عیسیٰ کو ایشور کا اوتار تسلیم کیا تھا۔ آپ اپنے ہم قوموں کو ہمیشہ یاد دلاتے رہتے تھے کہ اپنے اوپر عقیدہ رکھنا ہی عظمت کا راز ہے۔ ہم اپنے اوپر بالکل بھروسہ نہیں رکھتے۔ ہم اپنے تئیں ذلیل و خوار سمجھتے ہیں اور اس وجہ سے ہم ذلیل و خوار ہیں۔ ہر انگریز سمجھتا ہے کہ میں بہادر ہوں۔ دلیر ہوں اور جو چاہے کرسکتا ہوں۔ ہم ہندوستانی اپنی ناتوانی کے اس حد تک قائل ہیں کہ مردانگی کا خیال بھی ہمارے دلوں میں پیدا نہیں ہوتا۔ جب کوئی کہتا ہے کہ تمھارے آباو اجداد گمراہ تھے۔ وہ غلط راستے پر چلے اور اس وجہ سے ہم اس حالت کو پہنچے تو ہم کو جتنی خجالت ہوتی ہے اس کا اندازہ کرنا محال ہے اور ہماری ہمتیں اور بھی پسپا ہوجاتی ہیں۔ سوامی جی اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے۔ اور کسی مذموم رسم کو وہ بزرگان سلف سے کبھی منسوب بھی نہیں کرتے تھے۔ ہر ایک رسم اپنے زمانے میں مفید تھی۔ اور آج اس کی مذمت کرنا تحصیل لاحاصل ہے۔ آج ہم اس امر پر زور دے رہے ہیں کہ سادھوؤں کے وجود سے ملک کو کچھ فائدہ نہیں اور ہماری فیاضی کو ادھر سے منتقل ہوکر اسکولوں اور کالجوں اور اصلاح تمدن کی کوششوں کی طرف آنا چاہئے۔ سوامی جی اسے خودغرضی خیال فرماتے تھے اور ہے بھی ایسا ہی۔ سادھو کیسا ہی کم علم ہو اپنے مذہب سے کیسا ہی بے خبر ہو۔مگر وہ ہمارے تعلیم یافتہ دیہاتی ہم وطنوں کی تسکین و تشفی کے لیے کافی علم رکھتا ہے۔ اور اس کی موٹی موٹی مذہبی باتیں کتنی ہی دلوں میں جگہ پاتی ہیں اور کتنوں ہی کے لیے خیر و برکت کا باعث ہوتی ہیں۔ اگر اب ان کا وجود ضروری نہیں خیال کیا جاتا تو کوئی ایسی تجویز سوچنی چاہئے جس سے ان کا کام جاری رہے۔ مگر ہم اس طرف مطلق خیال نہیں دوڑاتے۔ اور مذہبی تعلیم و تلقین کی جو گئی گزری مشین ہے اسے بھی توڑ پھوڑ کر برابر کیا چاہتے ہیں۔ الغرض سوامی جی اپنی قوم کا اخلاق، اس کے مراسم اس کا ادب اور فلسفہ اس کا طرز معاشرت، اس کے پرانے عظماء اور ہند کی خاک پاک، سب کو محترم اور ممتاز سمجھتے تھے۔ آپ کی تقریر سے ذیل کا اقتباس آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

''پیارے ہم وطنو! اے مقدس آریہ ورت کے بسنے والو! کیا تم اپنے ذلت آمیز بودے پن سے وہ آزادی حاصل کرسکوگے جو دلیروں کا حق ہے۔
اے برادران ہند! یہ خوب یاد رکھو کہ سیتا، ساوتری، اور دینتی تمھاری قوم کی دیویاں ہیں۔ اے بہادرو، مرد بنو اور للکار کر کہو ''میں ہندوستانی ہوں، میں ہند کا رہنے والا ہوں، ہندوستانی اور ہندوستان کا بسنے والا خواہ کوئی ہو میرا بھائی ہے۔ جاہل ہندوستانی نادار ہندوستانی، اعلیٰ قوم کا ہندوستانی، ادنیٰ قوم کا ہندوستانی سب میرے بھائی ہیں۔ ہندوستانی میرا بھائی ہے۔ میری زندگی ہندوستان ہے۔ ہندوستان کے دیوتے میرے پرورش کرنے والے ہیں۔ ہندوستان میرے بچپن کا گہوارہ، میرے شباب کا عیش گاہ اور میرے بڑھاپے کا فردوس بریں ہے۔ اے شنکر، اے مادر گیتی! مجھے مرد بنا، میری کمزوری کو دور کر اور میری بزدلی کو مٹادے۔''

سوامی جی کی تلقینات کا لب لباب یہ تھا کہ ہم اپنی قوم کے ساتھ اپنا فرض ادا کریں، روحانیت حاصل کریں، مضبوط شہ زور اور دلاور ہوں۔ نیچی ذاتوں کو ابھاریں اور انھیں اپنا بھائی سمجھیں۔ جب تک نوے فی صدی ہندوستانی اپنے تئیں ذلیل و نادار سمجھتے رہیں گے یہ بالکل غیر ممکن ہے کہ ہندوستان میں اتفاق و اتحاد پیدا ہوسکے۔ ہم مذہب پرست ہوں، مگر سنیاسی اور تارک الدنیا نہ بنیں۔ ہاں ہم اپنی قوم کے لیے ہر قسم کی قربانی کرنے پر آمادہ رہیں۔ ہم دولت و ثروت پیدا کریں، مگر اسے ذاتی عیش و آرام میں نہ صرف کریں بلکہ قوم پر نثار کردیں، ہندو فلسفہ کے عملی پہلو پر عمل کریں اور نفس کشی اور ریاضت اور ترک ان لوگوں کے لیے چھوڑ دیں جنھیں ایشور نے ان بلندیوں تک پہنچنے کی توفیق دی ہے۔ سوامی جی کی تلقینات محبت اور طاقت پر مبنی تھیں۔ بے خوفی اجل کے تعلیم کی روح تھی۔ اور اپنے اوپر اعتقاد اس کا ایمان، ان کی تعلیم میں کمزوری اور التجا کا مطلق گزر نہ تھا۔ ان کا ویدانت انسان کو مصائب روزگار سے بچانے اور اسے مصافات زندگی کا مقابلہ کرنے اور ذہنی اور روحانی تمنا براریوں کی یکساں تعلیم دیتا ہے۔

''زمانہ'' مئی ۱۹۰۸ء

ٹرکی میں آئینی سلطنت

انیسویں صدی میں ایک بار آزادی کی ہوا چلی تو اس نے اٹلی، فرانس، سوئٹزرلینڈ، امریکہ، ممالک متحدہ وغیرہ ملکوں کو آزاد کردیا۔ اس ہوا کا اثر یورپ ہی تک محدود رہا، مگر انیسویں صدی کی آغاز میں جو ہوا چلی ہے وہ مقابلتاً بہت زیادہ صحت بخش اور پرزور ہے۔ اس تھوڑی مدت میں اس نے فارس کو آزاد کردیا ہے اور اب خبریں آرہی ہیں کہ ٹرکی کی بوسیدہ ہڈیوں میں بھی اس نے روح پھونک دی۔

سلطنت ٹرکی باوجود یورپ میں واقع ہونے کے ایشیائی سلطنت ہے۔ اور یورپ کے مورخ اور مدبر اسے مدت ہائے دراز سے خسروانہ مطلق العنانیوں کا مرکز سمجھتے آئے ہیں۔ کوئی اسے یورپ کا بڈھا آدمی کہہ کر مطعون کرتا تھا، کوئی دوسرا ہی خطاب عطا کرتا تھا، مگر سلطان عبدالحمید کی اس فیاضانہ تدبیر نے سب کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ اہل یورپ کے نزدیک یہ مسلمہ بات تھی کہ آزادی کا پودا صرف سرزمین یورپ ہی میں نشو ونما پاسکتا ہے۔ ایشیا کی زمین اور آب و ہوا اس کے لیے ناموافق ہیں۔ لارڈ مارلی جیسا عالم بھی علانیہ یہ خیال ظاہر کرنے سے نہ چوکا، مگر ترکی اور فارس دونوں ہی نے اس مسلمہ امر کی جڑ کھود کر پھینک دی اور ثابت کردیا کہ جس آزادی اور آئین کے لیے یوروپ میں بادشاہوں کے سر کٹے ہیں۔ اور رعایا کے خون کی ندیاں بہتی ہیں وہ آزادی اور آئین ایشیا میں بلاشور و شر کے مل جاتے ہیں۔ جمہور کے خیال اور رائے کی وقعت جو اس موقع پر ان دونوں ملکوں میں کی گئی ہے وہ دنیائے یورپ میں کہیں نظر نہیں آتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سلطان ٹرکی نے یہ آئین بلا کافی آزمائش اور امتحان کے نہیں عطا کیا۔ مصر اور ہندوستان کی طرح وہاں بھی کچھ عرصے سے نوجوان محبان وطن کی ایک جماعت پیداہوگئی تھی۔ جو تحریر اور تقریر کے آئین کی ضرورت رعایا

کی ذہن نشیں کرتی رہتی تھی۔ اور وہ سختیاں جو آزادی کا پیش خیمہ ہیں وہاں بھی خوب کی گئیں۔ اخباروں کی زبانیں بند کی گئیں۔ نوجوان فدایان وطن مفسد اور سرکش خیال کیے گئے۔ اور کتنوں ہی کو جلاوطن ہونا پڑا۔ پولیس نے من مانا راج کیا، اور کمشنر پولیس نے خوب دل کھول کر نوابی کی۔ شورشیں ہوئیں، یہ سب کچھ ہونا لازم تھا۔ اور ہوا، اس کا ہونا اس کی دلیل تھی کہ رعایا اپنے ارادوں میں مضبوط ہے۔ اور وہ جس چیز کی متقاضی ہے وہ بلالیے نہ مانے گی۔

سلطان عبدالحمید اس تمام کشمکش کو ایک سچے اور دور اندیش مدبر کی نگاہ نہ کہ ایک خود رائے فرماں بردار کی نظر سے دیکھتے رہے۔ اور جب انھیں یقین ہوگیا کہ رعایا اپنے ارادے میں مضبوط ہے تو انھوں نے اور زیادہ امتحان لینا مناسب نہ سمجھا ایک پوری قوم کی رفتار خیال کا اندازہ لگانا بہت مشکل کام ہے۔ اور ان جابرانہ بے عنوانیوں کے لیے سلطان پر کوئی الزام نہیں عاید کیا جاسکتا۔ کیونکہ یہی وسیلہ ہے جس سے رعایا کے استقلال اور مضبوط ارادے کی جانچ ہوسکتی ہے۔ وہ دن مبارک تھا جبکہ ایک مشرقی فرماں روا نے جو مذہبا ظل اللہ سمجھا جاتا ہے اور جو بارہ صدیوں سے کسی قید اور قاعدے کا پابند نہ تھا قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ میں رعایا کی رائے اور مشورے پر عمل کروں گا۔ اور نہ آئین موضوعہ سے ہرگز منحرف نہ ہوں گا۔ وہ دن مبارک تھا اور دنیا کی تاریخ میں شاید اس سے زیادہ سعید اور مبارک کوئی دن نہ ہوگا۔

آج ٹرکی کا ہر فرد بشر سلطان کے نام پر فخر کر رہا ہے۔ اور ہر چہار طرف سے صدائیں آرہی ہیں کہ خدا سلطان عبدالحمید کو ابدتک مامون ومقون رکھے۔ وہ محبان وطن جو جلاوطنی کی مصیبتیں جھیل رہے تھے۔ خوش خوش اپنے پیارے وطن کو واپس آرہے ہیں۔ وہ اخبارات جن کی زبانیں بند تھیں۔ اور وہ مقررین جن کے لبوں پر جبراً مہر خاموشی لگادی گئی تھی آج ہر گوشہ اور ہر خطے میں پکارپکار کر آزادی کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔ اور خوشیاں منا رہے ہیں۔ آزادی کا علم بلند ہے اور وہ سب جابرانہ قوانین جو کچھ دن قبل وضع کیے گئے تھے۔ منسوخ کیے جارہے ہیں پولیس اپنے کرتوت کا پھل بھوگ رہی ہے اور کمشنر پولیس اپنے دنوں کو رو رہے ہیں۔ اے اہل ٹرکی اے ہمارے ایشیائی بھائیو تم خوش قسمت ہو۔ تم دلیر ہو، تمھیں یہ آئین اور آزادی مبارک ہو۔

دیکھیے ہمارے مسلمان اہل وطن بھائی لائلٹی کا راگ کب تک الاپتے ہیں۔ کب تک نوکریوں چاکریوں کے لیے سر بسجود اور دست بد عاہے ہیں۔ کیا تعجب ہے مقام خلافت کی پرزور ہوا کا اثر ان کے دلوں پر بھی ہو۔ اگر دل میں مردانہ جذبات باقی ہیں تو ضرور ایسا ہوگا۔ سلطان نے لائلٹی کے جلسوں پر یہ آئین نہیں عطا کیا اس کا راز ہی کچھ اور ہے۔ ہم نے لائلٹی کی کیا مٹی پلید کی ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو کہ وہ لوگ جو ایک ماہ قبل ڈسلائل اور مفسد اور سرکش اور گردن زدنی کے قابل تھے وہ آج محبان وطن اور ہادی قوم اورمعماران ایوان حریت ہیں۔

'زمانہ' اگست ۱۹۰۸ء

دارا شکوہ کا دربار

شہزادہ دارا شکوہ شاہجہاں کے فرزند اکبر تھے۔ اور اوصاف ظاہری و باطنی سے آراستہ۔ گو تھے تو ولی عہد مگر صاحب قران ثانی نے ان کی ذہانت و جدت جوہر و کمالات دیکھ کر کل سلطنت کا نظم و نسق عملی طور پر انھیں کے ہاتھوں میں دے رکھا تھا۔ وہ دوسرے شہزادوں کی طرح صوبجات ملحقہ کی صوبہ داری پر مامور نہ کیے جاتے۔ بلکہ دارالخلافہ میں جلوہ افروز رہتے اور اپنے مشیروں کی مدد سے سلطنت کا بوجھ سنبھالتے۔ افسوس کا مقام ہے کہ گو ان کو ایک قابل، تجربہ کار سرمایہ ناز فرماں روا بنانے کے لیے عملیات کے مدرسے میں تعلیم دی گئی۔ مگر ملک یا قوم کو ان کی ذات سے کوئی قابل یادگار فائدہ نہ پہنچا۔ مورخین کا قول ہے کہ اگر بجائے اورنگ زیب کے شہزادہ دارا شکوہ کو تخت ملتا تو ہندوستان ایک بڑی زبردست متفقہ سلطنت ہوجاتا۔ یہ قول گو کسی قدر ایک خاصہ انسانی پر مبنی ہے کیونکہ بعد مرگ لوگ اکثر آدمیوں کی وقعت کیا کرتے ہیں۔ تاہم یہ دیکھنا بہت مشکل نہیں کہ اس میں راستی کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔

شہزادہ دارا شکوہ اکبر کا مقلد تھا۔ وہ محض نام کا اکبر ثانی نہ تھا۔ اس کے خیالات بھی ویسے ہی تھے اور ان خیالات کو واقعات کی صورت میں لانے کا طریقہ بھی بالکل ملتا ہوا نہیں بلکہ خیالات زیادہ پسندیدہ تھے۔ اور ان کو عمل میں لانے کے طریقے، قواعد و اصولوں کے زیادہ پابند۔ اس کی تعمق نظری نے دیکھ لیا تھا کہ ہندوستان میں سلطنت کا مستقل طور پر قائم رہنا ممکن نہیں تاوقتیکہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ربط ضبط و اتحاد قائم نہ ہوجائے وہ خوب جانتا تھا کہ جبر سے سلطنت کی جڑ نہیں جمتی۔ استحکام و بقائے سلطنت کے لیے ضرورت ہے اس کی کہ سلاطین پسندیدہ اصولوں اور مترجمانہ قوانین سے رعایا کے دلوں میں گھر کرلیں۔ دلوں میں گھر کرنا بہ نسبت پتھر کے مضبوط قلعوں

کے زیادہ اہم ہے اور رعایا کی محبت و جاں نثاری پر بہ نسبت افواج کے زیادہ بھروسہ رکھنا ضروری ۔ داراشکوہ نے ان اصولوں پر عمل کرنا شروع کیا تھا۔ اس نے ایک نہایت دلچسپ ونتیجہ خیز کتاب تصنیف کی تھی۔ جس میں براہین قاطعہ سے یہ ثابت کیا تھا کہ مسلمانوں کے بقاء کا دارومدار ہندود کے اتحاد و اتفاق پر ہے۔ اس کی نظروں میں بابا کبیر داس، گرونانک جیسے آدمیوں کی بہت زیادہ وقعت تھی۔ کیونکہ دوسرے پیغمبر نبی نوع انسانی میں تفرقہ ڈالتے تھے۔ مگر یہ حضرات صلح کل کی تعلیم دیتے تھے۔

اس وقت ہندو ومسلمان دونوں قومیں بمنزلہ دو بچوں کے تھیں۔ ایک نے تو چند ہی دن ہوئے دودھ چھوڑا تھا۔ دوسرا ابھی شیر خوار تھا۔ دارا شکوہ کا خیال تھا کہ اس شیر خوار بچہ پر دوسرے بچے کو قربان کردینا مصلحت کے خلاف ہے۔ گو اس کے دودھ کے دانت ٹوٹ گئے ہیں۔ مگر اب وہ دانت نکلیں گے جو اور بھی زیادہ مضبوط ہوں گے۔ دانت نکلنے سے پہلے ہی چنے چبوانا انسانیت کے خلاف ہے۔ کیوں نہ دونوں بچوں کی ساتھ ساتھ پرورش ہو۔ اگر ایک کو دودھ زیادہ دیا جائے تو دوسرے کو اغذیہ لطیف کا استعمال کرایا جائے۔

اس قومی اتحاد کے لیے داراشکوہ کے ذہن میں بھی وہی بات آئی تھی جو اکبر کے ذہن میں۔ یعنی یہ کہ دونوں قوموں کے دلوں سے فاتح و مفتوح غالب و مغلوب کا خیال اٹھ جائے۔ دونوں دل کھول کر ملیں۔ آپس میں شادیاں ہوں، ربط ضبط بڑھے نہ کوئی ہندو رہے نہ کوئی مسلمان بلکہ دونوں اہل ہندوستان دونوں میں کوئی علامت تمیز باقی نہ رہ جائے۔ اس اتحاد کے معاملہ میں شہزادہ اکبر سے بھی ایک انچ بڑھا ہوا تھا۔ اکبر نے راجاؤں کی لڑکیوں سے عقد کیا تھا، راجاؤں کو مناسب جلیلہ پر ممتاز کیا تھا، ہندوؤں کے سر سے جزیہ کا بوجھ اٹھا دیا تھا۔ جو ان کو بوجہ ہندو ہونے کے دینا پڑتا تھا۔ مگر شہزادہ کہتا تھا کہ کیوں راجاؤں کی لڑکیوں ہی سے عقد کیا جائے۔ کیوں نہ مغل خاندان کی لڑکیاں بھی راجاؤں سے منسوب کی جائیں۔ اس نے خوب سمجھ رکھا تھا کہ اہل ہند اپنی لڑکیوں کی دوسری قوموں کے ساتھ شادی کرنا اپنی توہین و تذلیل سمجھتے ہیں۔ اور یہ خیال اور بھی مضبوط ہوجاتا ہے جب ان کی لڑکیاں لی جاتی ہیں۔ مگر مسلمانوں کی لڑکیاں دی نہیں جاتیں۔ سچا میل جول اسی حالت میں ہوگا جب لڑکے اور

لڑکی میں کوئی فرق باقی نہ رہ جائے۔ اس نے خود مقدمۃ الجیش بننا چاہا تھا۔ صرف موقع و محل کا متلاشی تھا۔

شہزاہ دارا شکوہ ملکی مجدد ہی نہ تھا۔ اس کے سر علم و فضیلت کی پگڑیؒ بھی بندھی تھی۔ اس نے ہند کے کل مستند زبانوں پر عبور حاصل کرلیا تھا۔ خصوصاً سنسکرت سے تو اسے الفت سی ہوگئی تھی۔ گھنٹوں حوض کے کنارے پاتنجلی یا گوتم کی فلاسفی لے کر پڑھتا اور غور کرتا اور روتا، علاوہ ایشیائی زبانوں کے اس نے یورپ کی کئی زبانوں میں بھی مہارت بہم پہنچائی تھی۔ لاطینی، یونانی، وعبرانی زبانوں میں اچھی دستگاہ تھی۔ جدید زبانیں مثل فرانسیسی، انگریزی و جرمنی جن کی ابھی اتنی ترقی نہ ہوئی تھی کہ ان کی خوبی و لطافت دوسری قوموں کو فریفتہ کرتی۔ اس کو اپنے اوپر مائل نہ کرسکیں۔ تاہم ان زبانوں سے وہ بالکل غیر مانوس نہ تھا۔ معمولی گفتگو سمجھ لیتا اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار بھی کرلیتا۔ جب غور کیجیے کہ وہ ایسے وسیع ملک کی حکومت کرتا، اور اس کے ساتھ اپنی ذاتی تعلیم کے لیے ایسی کوششیں کرتا تھا تو حیرت معلوم ہوتی ہے کہ اس کے قوئے کیسے تھے اور ذہن کیسا؟

دارا شکوہ اس غلطی میں نہ پڑا جس میں اکبر پڑا تھا۔ اکبر کے مشیر یا تو ہندو تھے یا مسلمان۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ فریقین میں برابر چخیں چلا کرتی تھیں اگر اکبر جیسا مستقل مزاج فرماں روا نہ ہوتا تو اس جماعت کو ہرگز قابو میں نہ رکھ سکتا۔ جس میں مان سنگھ ابو الفضل جیسے جیسے دل و دماغ کے لوگ تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسے مشیروں کی رائیں کبھی غرض مندی سے خالی نہ ہوں گی۔ ہر ایک اپنی ہی قوم کی طرف کھینچے گا۔ اس خوف سے شہزادہ نے اپنے مشیر فرنگیوں سے لیے تھے۔ کیونکہ ان کے اوپر بے جا طرف داری کا گمان نہیں ہوسکتا تھا۔ پہلے اپنے درباریوں سے ہر ایک امر کی تحقیقات کرتا اور تب اپنے فرنگی مشیروں سے رائے لے کر فیصلہ کرتا۔

آج سہ پہر کا وقت ہے۔ شہزادہ دارا شکوہ کا دربار خاص آراستہ ہے۔ مشیران صائب الرائے پر تکلف پوشاکیں پہنے درجہ بدرجہ رونق افروز ہیں۔ عین وسط میں ایک مرصع تخت ہے۔ جس پر شہزادہ صاحب جلوس فرما ہیں۔ ان کے چہرہ سے غور و خوض عیاں ہے۔ ہاتھ میں ایک فرمان شاہی ہے۔ جس پر وہ رہ رہ کر مضطرب نگاہیں ڈالتے

ہیں۔ اور پھر کچھ سوچنے لگتے ہیں۔ تخت کے جانب راست ہنری بوزے ایک جواہر نگار کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ یہ شہزادہ کا برگزیدہ مشیر ہے۔ اور اس کے رایوں کی بڑی وقعت کی جاتی ہے۔ہنری بوزے کے بغل میں دوسری مرصع کرسی پر مال پیکا بیٹھا ہوا ہے۔ تخت کے بائیں جانب ڈاکٹر برنیر فرانسیسی سیاح ایک کرسی پر بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا ہے اور اس کے بغل میں ایک دوسری کرسی پر پادری جوزریٹ پرتگالی سفیر متمکن ہے۔ تمام دربار میں غضب کی خاموشی طاری ہے، دروازے چاروں طرف سے بند ہیں ۔ مشیروں کی آنکھیں بار بار شہزادہ کی طرف اٹھتی ہیں مگر ان کو خاموش دیکھ کر پھر نیچے گرجاتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد شہزادہ صاحب نے فرمایا ''حضرات! شاید آپ لوگوں کو مہم قندھار کی تباہی کی خبر ملی ہو۔''

اس مختصر سے جملہ نے حاضرین کے چہروں کے رنگ اڑا دیے۔ ہر شخص سناٹے میں آ گیا۔ اور کئی منٹ تک کسی کو بولنے کی ہمت نہ پڑی۔ آخرہنری بوزے نے فرمایا ''خانہ زادوں کو اس خبر کے استماع سے سخت افسوس ہوا ہم سلطنت کی سچے دل سے ہمدردی کرتے ہیں۔''

پادری جوزریٹ ''مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں ناکامی ہوئی، گولہ اتارنے والے، فوج کو تربیت دینے والے تو زیادہ تر اہل فرنگ تھے۔ جن کے سروں پر حضرت مسیح کا سایہ تھا۔ ان کا ناکام رہنا خیال میں نہیں آتا۔

یہ کہہ کر انھوں نے گلے سے مسیح کی ایک چھوٹی سی تصویر نکالی، اور اس پر بڑے ادب کے ساتھ بوسہ دیا، اب ڈاکٹر برنیر کی باری آئی، پہلے انھوں نے ناظرین پروہ نگاہ ڈالی جو راستی پسند بھی ہوتی ہے اور راست گو بھی۔ بعد ازاں فرمایا ''حضرات ! سچ پوچھیے تو مجھے اس مہم کی کامیابی میں پہلے ہی سے شک تھا۔ شہزادہ محی الدین اس کی قسمتوں کے مالک بننے کے قابل نہ تھے۔ اس لیے نہیں کہ ان میں یہ قابلیت نہیں بلکہ محض اس لیے کہ وہ اپنے تعصب کو دبا نہ سکتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اس ناکامی کا باعث راجہ جگت سنگھ کی کنارہ کشی ہے۔''

اس کے بعد کئی منٹ تک سناٹا رہا۔

آخر شہزادہ صاحب نے خاموشی کو یوں دور کیا ''حضرات! مجھے اس سے کوئی بحث

نہیں کہ اس ناکامی کا کیا اصلی سبب ہے اس امر کی چھان بین کرنا مناسب نہیں۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ ایسا کرنا دانشمندی کے خلاف ہوگا۔

شہزادہ صاحب نے رک رک کر ان الفاظ کو اداکیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت یہ دل میں ابھرنے والے خیالات سے پریشان ہو رہے ہیں۔ جیسے کوئی اندرونی کش مکش میں پڑا ہو۔ دل پہلے کہتا ہو بہتر ہے ایسا کر، مگر پھر پہلو بدل جاتا ہو، اپنی بات ختم کرکے شہزادہ نے حاضرین کو پر معنی نگاہوں سے دیکھا۔ زبان سے جو کچھ نہ ادا ہوا تھا آنکھوں نے ادا کردیا۔ شہزادہ کا جواب پادری جوزریٹ نے یوں دیا۔ ''جہاں پناہ! گستاخی معاف ہو، غلام کی رائے ناقص تو یہ ہے کہ اس ناکامی کے اسباب کو ایک پہلو سے غور کریں۔ خواہ یہ کتنا ہی ناگوار خاطر ہوا ہو تاکہ آیندہ کے لیے ان اسباب مزاحم کے دفعیہ کے لیے پیش بندیاں بھی کرلی جائیں۔ ناکامیابی ہم کو غلطیوں سے متنبہ کردیتی ہے۔ اس لحاظ سے میری نگاہوں میں کامیابیوں کی اتنی وقعت نہیں۔ جتنی کہ ناکامیوں کی۔ بیشک دنیاوی تجربہ کا معلم ناکامی سے بڑھ کر اور کوئی نہیں۔''

یہ کہہ کر پادری صاحب نے حاضرین پر ایک پرناز نگاہ ڈالی۔ گویا اس وقت انھوں نے کوئی غیر معمولی کام کیا ہو۔ اور بیشک شہزادہ صاحب کی تقریر پر اعتراض جمانا معمولی کام نہ تھا۔ ان کی صلاح سب کو پسند آئی۔ شہزادہ صاحب نے بھی اتفاق کیا اور فرمایا۔ ''پادری صاحب! آپ جو کچھ فرماتے ہیں بہت صحیح ہے۔ بیشک میں غلطی پر تھا۔ مگر شاید آپ نے میرے لہجہ سے اتنا تو ضرور سمجھ لیا ہوگا کہ مجھ کو یہ غلطی دیدہ و دانستہ کرنی پڑتی ہے۔ مجھ کو اس ناکامی کے اسباب کی تحقیق کرنے میں فی نفسہ کوئی اعتراض نہیں مگر ...... مگر بعض اوقات چشم پوشی کرنا ہی عین مصلحت ہے۔ خصوصاً اس وقت جبکہ خاندان شاہی کے ایک رکن اعظم کی حرمت میں فرق آتا ہو، پس فی الحال ہم صرف اس امر کا تصفیہ کیا چاہتے ہیں کہ آیا قندھار سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہوجانا بہتر ہے اس وقت تک قندھار کو دو مہمیں جاچکی ہیں مگر دونوں کی دونوں ناکام رہیں۔ آپ سے مخفی نہیں، کہ ان دور دراز مہمات میں سلطنت کو کثیر تعداد صرفہ کا متحمل ہونا پڑتا ہے۔''

یہ سنتے ہی مشیران ارسطو نژاد پھر سر بہ زانو ہوئے، مسئلہ بیشک نہایت اہم تھا، اور

اس کے حل کرنے کے لیے غور وخوض کرنے کی بھی ضرورت تھی پندرہ بیس منٹ تک تو سب کے سب استغراق کی حالت میں تھے۔ بعد ازاں مباحثہ یوں شروع ہوا۔

ہنری بوزے : ''قندھار پر مغل بادشاہوں کا قبضہ کب سے ہے؟''

ڈاکٹر برنیر : '' شہنشاہ بابر کے عہد مبارک سے۔''

ہنری بوزے : ''باوجود اس مدت دراز کی حکومت کے وہاں اس خاندان کا تسلط نہیں جما۔''

برنیر : ''اس کی وجہ یہی ہے کہ شہنشاہ بابر کے بعد شاہان ہند ہندوستانی معاملات میں اس قدر مشغول رہنے لگے کہ قندھار پر کافی توجہ نہ رکھ سکے۔ اس وجہ سے دونوں ملکوں کے مابین تعلقات روز بروز کمزور ہونے لگے۔''

ہنری بوزے : ''مختصراً اس کے یہ معنی ہیں کہ شاہان ہند کو قندھار سے اتنا فائدہ نہ تھا کہ اس کو بھی ہند کا ایک صوبہ سمجھ کر اس پر کافی توجہ رکھتے اگر ایسا کرتے تو قندھار کبھی سر نہ اٹھا سکتا۔''

برنیر : ''بیشک شاہان ہند کا وقت زیادہ تر ہندو راجاؤں کو زیر کرنے اور صوبوں کے عناد و فساد کے فرو کرنے میں صرف ہوا کرتا تھا۔ حضرت عرش آشیانی نے البتہ ایک بار قندھار کو ایک مہم بھیجنی چاہی تھی۔ مگر چند در چند رکاوٹوں سے عاجز آ کر ارادہ ترک کردیا۔ یہ قطعی طور پر کہنا کہ شاہان ہند کیوں قندھار سے غافل رہے۔ آسان نہیں، ممکن ہے کہ فاصلہ کے خیال نے باز رکھا ہو یا ناکامی کے خوف نے۔ یا خزانہ عامرہ کے افلاس نے۔''

مال پیکار : مگر کیا فی الحال وہی تردداۃ در پیش نہیں، دکن کی پیچیدگیاں ایسی بڑھ گئی ہیں کہ ان کا سلجھانا اب بہت مشکل ہے اور اس کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ فتح دکن فتح قندھار سے بدرجہا اہم ہے۔ ہندو قندھار کے درمیان جو فاصلہ تھا وہ جو بھر بھی کم نہ ہوا، اور ناکامی کا خوف اب ہمیشہ سے زیادہ ہے، کیونکہ اب قہر مان ایران بھی

قندھار کی مدد پر کمر بستہ ہے۔"

پاردی جوزریٹ : درست فرمایا۔ مگر اب تخت ہند پر وہ بادشاہ نہیں جس کو فاصلہ یا ناکامی کا خوف اپنے ارادہ سے باز رکھ سکے۔ شاہان سابقہ کے زمانہ میں ہند کی سلطنت طفولیت میں تھی۔ اب اس کا شباب جوشوں پر ہے اس زمانہ میں ہند پر حضرت مسیح کی برکت نہ نازل تھی۔ صاحب قران ثانی مدظل اللہ تعالیٰ کے فرق مبارک پر تو مسیح نے اپنے ہاتھوں سے شوکت کا تاج رکھ دیا ہے۔"

اس پرزور دلیل پر شہزادہ دارا شکوہ کے لبوں پر بھی خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ ڈاکٹر برنیر جو دو تین منٹ سے غور میں تھے بولے۔" حضرات! سلطنت کی بقا کے لیے ضرورت ہے کہ مخالف قوتیں اس کا لوہا مانیں۔ اس کی وقعت کا دوسرے کی نگاہوں میں کم ہوجانا اس کے لیے زہر قاتل ہے۔ اگر مخالفین کے دلوں میں اس کی ہیبت قائم ہوجائے۔ تو پھر سلطنت اٹل ہے تاوقتیکہ اندرونی عوارض اس کی تباہی کا باعث نہ ہوں۔ دکن کی پیچیدگیاں بڑھتی ہی جاتی ہیں۔مرہٹوں نے مفسدہ پردازی پر کمر باندھی ہے، جاٹوں نے بھی کچھ سر اٹھایا ہے۔ پس یہ وقت سلطنت ہند کے لیے نہایت نازک و خطرناک ہے۔ اس نازک وقت میں قندھار سے غافل ہوجانا ان مفسدوں کو شیر بنادے گا۔ اگر صاحب قران ثانی نے علی مردان خان کو پناہ نہ دی ہوتی اور قندھار کو دو مہمیں روانہ نہ ہوچکی ہوتیں، تو اس وقت اس ملک سے کنارہ کش ہوجانے میں چنداں نقصان نہ تھا۔ مگر جب دنیا پر یہ ظاہر ہوگیا کہ شہنشاہ ہند قندھار پر تسلط جمانا چاہتے ہیں اور اس کام پر آمادہ ہیں تو پھر اس ارادہ سے ہٹنا سلطنت کے لیے نہایت خطرناک ہے۔ اب تو ہند کا یہ مقولہ ہونا چاہئے کہ لڑیں گے مریں گے، مگر قندھار کو نہ چھوڑیں گے۔ اگر اس وقت قندھار سے دست بردار ہوگئے تو مرہٹوں کو فطرتاً یہ خیال پیدا ہوگا کہ اگر ہم بھی اسی طرح فساد برپا کرتے رہیں۔ تو قندھار کی طرح خود مختار ہوجائیں گے۔ شاہان دکن کو ہماری قوت کا اندازہ ہوجائے گا، والیٔ ایران سمجھے گا کہ ہند میں اب دم نہیں تو وہ قندھار سے ہوتا کابل تک چلا آئے گا کیا تعجب ہے۔ ہند کی طرف بھی رخ کرے، پھر تو کابل کے افغان بلا سر اٹھائے ہرگز نہ مانیں گے۔

خلاصہ یہ کہ مہم قندھار سے اس وقت منہ پھیرنا نہایت خطرناک ہے۔"

ڈاکٹر برنیر کی گرم و مصلحت آمیز تقریر نے ناظرین پر خوب اثر پیدا کیا۔ شہزادہ صاحب تو سکتے میں آگئے۔ انھوں نے ابھی تک نہ سوچا تھا کہ قندھار سے کنارہ کش ہوجانے سے کیاکیا نتیجے پیدا ہوں گے۔ کیا کیا دشواریاں سامنے آئیں گی، اب ڈاکٹر برنیر کی زبان سے اس انجام بد کی کیفیت سن کر ان کے ہوش اڑ گئے۔ بارے ہنری بوزے کی اس تقریر نے دل کو کچھ ڈھارس دی۔ "حضرات! ڈاکٹر برنیر صاحب ایک غلط فہمی میں پڑگئے۔ ان کو شاید نہیں معلوم کہ سلطنتوں کو اپنا سکہ بٹھانے کے لیے محض فوجوں کی ضرورت نہیں۔ ایسی سلطنتیں جن کا دارومدار حربہ و ہتھیار پر ہوتا ہے عرصہ تک قائم نہیں رہتیں۔ بلکہ ضرورت ہے اخلاقی قوت کی تاکہ رعایا کے دل میں اس کے جانب سے کوئی بدگمانی نہ پیدا ہو۔ سلطنت کا ہر ایک قول وفعل انصاف و راستی کی تائید میں ہو۔ کوئی اس کو حریص و طماع نہ سمجھے۔ جب تک سلطنت اس معیار کو نظروں کے سامنے نہ رکھے گی۔ اس کا رعب نہ تو دلوں میں جمے گا اور نہ دوسری مخالف طاقتیں اس کا لوہا مانیں گی۔ میں مانتا ہوں کہ سلطنت کو اولو العزم ہونا چاہیے تاکہ رعایا کے دلوں میں بھی جوش پیدا ہو۔ اپنے حاکموں سے اولو العزمیوں کا سبق سیکھیں۔ مگر یہ خیال رہے کہ اولو العزمیاں بیجا نہ ہوں، بیجا اولو العزمی اور حرص دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ میں ایک تمثیل دے کر سمجھانا چاہتا ہوں کہ جا اور بیجا اولو العزمی سے میری کیا مراد ہے۔ یوروپی اقوام آج بڑی سرگرمی سے جہاز بنا رہی ہیں۔ فوجوں کی تعداد روز بروز افزوں ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان جہازوں پر دور دراز ملکوں کا سفر کیا جاتا ہے۔ ان ملکوں سے تعلقات پیدا کیے جاتے ہیں۔ خواہ تجارتی ہوں یا ملکی نو آبادیاں قائم کی جاتی ہیں۔ اس کو میں جائز اولو العزمی کہتا ہوں۔ لیکن جب کسی کمزور قوم یاطاقت کو بزور شمشیر مغلوب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تو میں اس کو بیجا اولو العزمی کہتا ہوں، کیونکہ ناحق و ناراستی اس کے پردے میں چھپی ہوتی ہے۔ اب آپ خود فیصلہ کرسکتے کہ سلطنت ہند کا قندھار کو مہم بھیجنا بجا ہے یا بیجا۔ میں کہتا ہوں بیجا ہے، سراسر بیجا، اور سخت افسوس کا مقام ہے کہ رعایا کا بھی یہی خیال ہے۔ گو اس کی آوازیں آپ کے کانوں تک نہیں پہنچتیں۔ اب غور کیجیے کہ اس خیال کا پیدا ہوجانا کیسا خطرناک ہے کیونکہ جب دوسری

دولتیں دیکھیں گی کہ ہند فتاحی یا کشور کشائی پر آمادہ ہے تو وہ حفظ ماتقدم کے طور پر اپنی فوجیں بھی بڑھائے گی۔ اور کیا تعجب ہے کہ باہم متفق ہوکر ہندوستان ہی پر چڑھ دوڑیں۔ جہاں پناہ ! ڈاکٹر برنیر صاحب نے فرمایا کہ ہند کا اب یہ قول ہونا چاہئے کہ لڑیں گے، مریں گے مگر قندھار نہ چھوڑیں گے۔ یہ ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں۔ میں ان کی اجازت سے چند الفاظ اور بڑھائے دیتا ہوں یعنی قندھار کو نہ چھوڑیں گے! نہ چھوڑیں گے! ساری دنیا زیر و زبر ہوجائے مگر قندھار کو نہ چھوڑیں گے دنیا بھر متفق ہوجائے۔ ہم مٹی میں مل جائیں مگر قندھار ہم سے نہ چھوٹے گا۔" حضرات! غور تو کیجیے یہ مصلحت ہے ایک چھوٹے سے صوبے کے لیے ایک عظیم الشان سلطنت کو خطرے میں ڈالنا، میں یہ نہیں کہتا کہ خطرہ نزدیک ہے۔ مگر خطرہ سر پر بھی ہوتا تو ڈاکٹر صاحب کے قول کے مطابق ہندوستان کو جان پر کھیل جانا چاہیے تھا۔ یہ مصلحت ملکی نہیں، مصلحت ملکی اسے کہتے ہیں کہ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے مانا کہ آپ نے دوبارہ قندھار کو ایک زبردست مہم روانہ کی۔ فرض کیجیے معاملہ نے طول کھینچا۔ والیٔ ایران اپنی پوری طاقت سے آڈٹا۔ تو آپ کو کمک کی ضرورت ہوئی اس طرح آٹھ مہینے گزر گئے۔ نویں مہینے میں جب برف پڑنے لگی تو آپ کو مجبوراً ہٹنا پڑا اور غنیم نے اس موقع سے خوب دل کھول کر فائدہ اٹھایا۔ بتلائیے بجز ذلت و خواری و ناکامی کے کیا ہاتھ لگا۔ آپ کہیں ہم پوری طاقت سے قندھار پر چڑھیں گے اور آٹھ مہینے کے اندر ہی اس پر قابض ہوجائیں گے۔ آپ پوری طاقت سے ادھر گئے۔ ادھر اہل دکن اور مرہٹے اور جاٹ جو ہماری ذرا ذرا سی نقل و حرکت کی ٹوہ لیا کرتے ہیں، موقع میدان خالی دیکھ کر آدوڑے۔ بتلائیے اس وقت ہند کی سلطنت کیا کرے گی۔ کیا قلعہ کی دیواریں لڑیں گی یا قلم پکڑنے والے متصدی یا سودا بیچنے والے سوداگر؟ جہاں پناہ! میں ڈاکٹر صاحب سے اتفاق کرتا ہوں کہ سلطنتوں کو اپنا سکہ بٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ بیشک اگر ان کی دھاک بندھ جائے تو بہت مفید ہے۔ مگر کیا اس کے لیے سلطنت ہی کو معرض خطر میں ڈالنا مصلحت ہے۔ اگر ملک کی اصلی طاقت کو ضرر پہنچائے بغیر آپ اپان رعب جماسکتے ہیں۔ تو شوق سے جمائیے مگرمیں ایک بارنہیں سوبار کہوں گا کہ اگر ایسا کرنے سے ملک کمزور ہوتا ہو تو اس کا خیال ہی نہ کیجیے۔ دو مہموں کا ناکام رہ جانا صاف

ثابت کر رہا ہے کہ قندھار کا فتح کرنا منہ کا نوالہ نہیں۔ دول دکن کا قریب قریب آدھی صدی کی خوں ریزیوں کے بعد بھی مقابلہ کے لیے طیار رہنا ان کی اندرونی طاقت کا بین ثبوت ہے۔ میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں کہ یہ سلطنت ان دونوں صعب دشمنوں کا مقابلہ ایک ساتھ نہیں کرسکتی۔ قندھار اور دکن دونوں پر فتح پانا محال ہے۔ ان میں سے ایک لے لیجیے۔ قندھار یا دکن، میری صلاح یہ ہے کہ دکن کو قندھار پر ترجیح دیجیے۔

جہاں پناہ! میرا خیال ہے کہ دنیا کی ہر ایک نامور قوم کا زوال اسی وجہ سے ہوا کہ اس نے اپنی کملی کے باہر پاؤں پھیلانے کی کوشش کی۔ ان کی الو العزمیاں حرص و طمع کے درجہ تک پہنچ گئیں۔ ایران، یونان، اطالیہ، روم ہر ایک نے اعتدال سے زیادہ پاؤں پھیلائے۔ محض جنگی قوت و زور شمشیر سے دور درواز ملکوں پر قابض رہنا چاہا۔ مگر کیا نتیجہ ہوا، ان کو زیر کرنے کے زعم میں اپنی طاقت کو کھو بیٹھے۔ حتی کہ نہ صرف اپنے مقبوضات ہی سے ہاتھ دھونا پڑا بلکہ اپنے جتھے کو بھی رو بیٹھے ان کا نام صفحہ ہستی سے ہمیشہ کے لیے مٹ گیا۔ ہند کیوں اس غلطی میں پڑے؟ کیوں نہ دوسری قوموں سے عبرت حاصل کرے؟ ہندوستان کا ملک بہت وسیع ہے اگر ہندوستان کی آبادی پچیس برس میں بھی دوگنی ہوجائے۔ تو صدیوں تک تنگی کی شکایت نہ سننے میں آئے گی۔ قندھار کو ممالک محروسہ میں شامل کرنا مصارف جنگی کو دو چند کرنا ہے کیونکہ وہاں کی کوہستانی قومیں ہمیشہ عناد و فساد کا بازار گرم رکھیں گی۔ اور ان شورشوں کو زیر کرنے کے ایک زبردست فوج رکھنی پڑے گی۔ پس محض سلطنت کو وسیع کرنے کے خیال سے قندھار پر حملہ آور ہونا یا مہمیں روانہ کرنا میری دانست میں مناسب نہیں۔''

ڈاکٹر برنیر اس وقت خیالات کے دریا میں غرق تھے۔ انھوں نے ہنری بوزے کے اعتراضوں کی تردید کرنے کے لیے چند نوٹ لکھے تھے۔ ان کے چہرہ سے جوش یا بے صبری ذرا بھی نہ ظاہر ہوتی تھی۔ لوگوں کی نگاہیں ان کی طرف لگی ہوئی تھیں کہ دیکھیں اب یہ کیا جواب دیتے ہیں۔ آخر کئی منٹ کے تامل کے بعد بولے ''حضرات! مجھے کمال افسوس ہے کہ اس وقت مجھے چند نامرغوب سچائیوں کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ مگر چونکہ سچائیاں بہت کم مرغوب ہوتی ہیں۔ امید ہے کہ آپ لوگ مجھے معاف فرمائیں گے میرے مشفق قدردان ہنری بوزے صاحب نے فرمایا کہ حکومت کا قیام و دوام اخلاقی

اثرات پر مبنی ہے۔ نہ کہ طبعی اثرات پر جس کے یہ معنی ہیں کہ "اے شاہان روئے زمین یہ حرب و خرب کس لیے؟ یہ جنگ و جدل کس لیے یہ پیدل و سوار کس لیے۔ ان کو جہنم میں پھینکئے چند خدا پرست، متقی تقدس تاب بزرگوں سے فرمائیے کہ شارع عام پر کھڑے ہوکر وعظ کیا کریں بس باقی اللہ اللہ خیر صلا۔ پھر دیکھیے تو کیسے زناٹے کی حکومت چلتی ہے۔" تعجب ہے کہ مسٹر نورے صاحب باوجود وسیع التجربہ ہونے کے ایسی فاش غلطی میں پڑ گئے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جو اصول انھوں نے بیان کیا وہ غلط ہے۔۔ ہرگز نہیں وہ بہت صحیح ہے۔ مگر اصولوں کی درستی اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ عملاً تمام ضروریات کو رفع کرسکتی ہیں۔ شاید صاحب موصوف جمہور اوٹوپیا Utopia کا خواب دیکھ رہے تھے وہ بھول گئے تھے کہ اوٹوپیا کا وجود خواب ہی تک محدود ہے۔ اور یہاں اس کا ذکر کرنا لاحاصل ہے۔ میں مسٹر بورزے سے پوچھتا ہوں خدا نے نیکی کے ساتھ بدی بھی پیدا کی تھی۔ ان کا جواب ہوگا، نہیں۔ خدا نے نیکی پیدا کی، نیکی کی غیرموجودگی بدی ہے باوجود اس کے جدھر دیکھئے بدی ہی کی گرم بازاری ہے نیکی اور بدی میں پہلی لڑائی جو باغ عدن میں ہوئی اس میں بھی میدان بدی ہی کے ہاتھ رہا۔ دنیا میں مشعل لے کر ڈھونڈئے تب بھی مشکل سے اتنے نیک آدمی ملیں گے جو ایک شہر آباد کرسکیں۔ ساری دنیا بدی سے بھری ہوئی ہے۔ ایسی حالت میں کیوں کر ممکن ہے کہ کوئی حکومت قائم رہ سکے تاوقتیکہ وہ سرکشوں، مفسدوں، باغیوں، ظالموں کی سرکوبی کے لیے ہمیشہ آمادہ نہ رہے۔ ہماری خدا سے دعا ہے کہ مسٹر بوزے کسی ملک کے بادشاہ ہوں اور وہ اپنے اصولوں پر عمل کرکے تمام دنیا کو سبق دیں کہ حکومت اخلاقی اثرات پر کیونکر قائم رہتی ہے۔

جہاں پناہ! کون نہیں جانتا کہ بنی نوع انسان کے فرائض جدا جدا ہیں۔ باپ کا فرض بیٹے کے فرض سے جدا ہے۔ باپ کا فرض بیٹے کی تعلیم و تربیت، خورش و پوش اور دیگر ضروریات کا مہیا کرنا، اور بیٹے کا فرض ہے والدین کی اطاعت و فرماں برداری کرنا، بادشاہ کا فرض عوام کے فرض سے بالکل جدا ہے۔ رعایا پروری و معدلت گستری بادشاہوں کے اعلیٰ ترین فرائض ہیں۔ اور اطاعت و شکر گزاری رعایا کے۔ اگر باپ اپنے بیٹے کو مارے کوئی اس کو برا نہیں کہہ سکتا۔ مگر بیٹے کا باپ کی شان میں ایک سخت کلمہ

بھی نکالنا کفر ہے۔ اگر عام افراد بلا اجازت ایک دوسرے کی چیزیں لیویں تو اس کو سرقہ یا رہزنی کہیں گے۔ مگر ایک بادشاہ کا بغرض ملک گیری دوسرے بادشاہ پر حملہ کرنا ہرگز ہرگز ناجائز نہیں۔ توسیع مملکت تو بادشاہوں کا سب سے اہم فرض ہے کہ رعایا پروری اس کا ایک خاص جزو ہے۔ توسیع مملکت سے تجارت کو فروغ ہوتا ہے، صنعت کو ترقی ہوتی ہے، رعایا کا جوش قومی بڑھتا ہے، حب الوطنی پیدا ہوتی ہے اپنی قوم کے کارناموں پر ناز ہوتا ہے، کیا یہ سب اہم اور مفید نتائج نہیں ہیں۔ دول قدیمہ کی بربادی کو توسیع مملکت سے منسوب کرنا دانشمندی کے خلاف ہے۔ روم و ایران و یونان کا نام اس وجہ سے نہیں مٹا کہ انھوں نے اپنے مقبوضات کو وسعت دی بلکہ اس وجہ سے کہ ان میں کاہلی، بزدلی، آرام طلبی، نفس پرستی اور بداعمالی کا زور ہوگیا۔ وہ فطرت کے اس قانون سے متاثر ہوئے جس کو انتخاب فطرت کہتے ہیں۔ آغاز دنیا سے تمام جانداروں میں وہ کھینچا کھینچی، وہ کش مکش مچی ہوئی ہے جس کو مصاف ہستی کہیں تو نازیبا نہ ہوگا۔ اس مصاف ہستی میں زبردستوں کو فتح ہوتی ہے، اور جو نحیف و ناتواں ہیں وہ شکست پاتے ہیں اور ان کا نام ہمیشہ کے لیے صفحہ ہستی سے نقش باطل کی طرح مٹ جاتا ہے۔ اس قانون کا اثر انسان و حیوان سب پر یکساں پڑتا ہے۔ جانوروں کی صدہا قسمیں معدوم ہوگئیں۔ اور صدہا بڑی بڑی قومیں بے نام و نشان۔ کیونکہ ایک خاص مدت کے بعد ہر ایک قوم میں وہ عوارض پیدا ہوجاتے ہیں جو دولت و ثروت و حشمت و شوکت کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ علاوہ اس کے زمانہ کی رفتار ترقی پر ہے، اور جب کوئی قوم ایک مدت دراز تک قائم رہتی ہے تو اس میں بے اختیاری طور پر قدامت کی بو آنے لگتی ہے۔ اور چونکہ اسلاف پرستی ایک خاصہ انسانی ہے۔ یہ قوم اپنے رسم و رواج، تمدن و طرز معاشرت میں ایسی ترمیمیں نہیں کرسکتی جو موجودہ زمانہ کے موافق ہوں۔ آخر نئی نئی قومیں اٹھ کھڑی ہوتی ہیں جن کا جوش تازہ ہوتا ہے۔ پرانی قومیں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ کیا مسٹر بوزے کا یہ منشا ہے کہ ہندوستان اس مصاف ہستی سے منہ پھیرے اور بزدل گنا جائے اور دوسری نئی قوموں کا شکار بنے؟ دیکھیے آج کے دن یوروپ میں یہ زندہ رہنے کی لڑائی کیسے سرگرمی سے لڑی جا رہی ہے۔ کون ایسی سلطنت ہے جو اپنے حدود سے باہر پاؤں پھیلانے کے لیے دل و جان سے کوشش نہیں کر رہی

ہے۔ جہاز بنائے جا رہے ہیں ان پر ہزاروں میل کا خطرناک سفر طے کیا جا رہا ہے۔ روپے کوڑیوں کی طرح پھونکا جا رہا ہے، اور آدمیوں کی جانیں نہایت ارزاں قیمت پر فروخت کی جارہی ہیں کیوں؟ اس لیے کہ نوآبادیاں قائم کی جائیں ملک کی تجارت کو وسعت ہو۔ دولت میں افزونی ہو، اور ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے جگہ نکلے۔ دو صدیوں میں فرانس کی آبادی چوگنی ہوجائے گی۔ اس کے لیے معیشت کا کیا سامان ہوگا، اگر ابھی سے پیش بندیاں نہ کی جائیں گی، ہم یہ نہیں کہتے کہ ہندوستان کو فی الحال تنگی محسوس ہو رہی ہے۔ نہیں ابھی بہت سے وسیع خطے بالکل غیر آباد ہیں۔ مگر جلد یا دیر میں یہاں بھی تنگی ضرور بالضرور محسوس ہوگی۔ آبادی کی افزونی ایک فطرتی قانون ہے۔ اس کو کوئی روک نہیں ہوسکتا۔ کیوں نہ ہندوستان یوروپی اقوام کی تقلید کرے۔ اور ابھی آئندہ کے لیے کوشش کرے۔ آنے والا زمانہ موجودہ زمانہ سے زیادہ قیمتی سمجھا جاتا ہے۔"

جس وقت ڈاکٹر برنیر اپنی جگہ پر بیٹھے کہ اہل مجلس نے تعریفوں کی بوچھاڑ کردی۔ خصوصاً شہزادہ صاحب کو ان کی تقریر نہایت پسند آئی۔ فوراً تخت سے اتر کر اس نے ہاتھ ملایا۔ ہنری بوزے صاحب دل ہی میں کٹے جا رہے تھے وہ سمجھتے تھے کہ ڈاکٹر برنیر کی توقیر میری درپردہ توہین ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب ان سے بہت کم اختلاف کیا کرتے تھے۔ اور اگر کرتے بھی تھے تو منہ کی کھاتے تھے۔ مگر اس وقت پالا انھیں کے ہاتھ رہا، چند منٹ کی خموشی کے بعد بھی جب ہنری بوزے صاحب جگہ سے نہ ہلے تو پادری جوزریٹ نے یوں در افشانی کی۔ "حضرت ! میرے دانست میں مہذب اقوام کا فتوحات سے ہرگز یہ منشا نہیں ہونا چاہئے کہ اپنے ہی ملک کا فائدہ سوچیں۔ اپنے ہی ملک کو دولت سے مالا مال و نہال کریں۔ اور محض اپنی ہی مطلب براریوں کے لیے غیر قوموں کے گلے میں فرماں برداری کا طوق پہنائیں۔ بلکہ ان فتوحات سے مفتوح قوموں کا فائدہ مدنظر ہونا چاہئے۔ یونان کے فتوحات نے یونان کی صرف شہرت نہیں بڑھائی مگر اس کی مفتوح قوموں میں علم و تہذیب صنعت و حرفت و فنون لطیفہ کی بنیاد ڈالی۔ سارا یورپ نہیں بلکہ ساری دنیا نے یونان ہی کے مدرسہ تہذیب میں تعلیم پائی ہے۔ یونان نے پہلے پہل دنیا کو اصول سیاست سکھائے۔ فلسفہ اور منطق، علم عروض و

کیمیا، علم علاج و علم موسیقی سب اسی یونانی ذہن کے کھلونے ہیں۔ آج یوروپ میں یہ آنکھوں کو چوندھیا دینے والی روشنی کہاں ہوتی۔ اگر یونان نے اپنی تہذیب کو اعجاز نما مشعل سے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے کو دور نہ کردیا ہوتا۔ یونان کی تاریخ ان قربانیوں سے بھری پڑی ہے جو یونانیوں نے دوسروں کو مہذب بنانے کے لیے کیں۔ اطالیہ کی فتوحات نے دنیا پر وہ احسان کیا جس کو وہ ابد تک کبھی فراموش ہیں کرسکتی۔ جس نے مہذب کافروں کو آدمی بنایا جس نے دنیا کی نجات کا دروازہ کھول دیا۔ حضرات! وہ کون سا احسان ہے ؟ وہ یہ ہے کہ اطالیہ نے مسیح کے مشن کو ساری دنیا میں پھیلایا، مسیحی روشنی سے کفر کی تاریکی کو دور کیا۔ اٹلی ہی وہ سرچشمہ ہے جس سے روحانی تشنگی کو بجھانے والا پانی نکلا۔

جہاں پناہ! کون کہتا ہے کہ اٹلی کا نام و نشان مٹ گیا؟ کون کہتا ہے کہ اطالیہ کی سلطنت نیست و نابود ہوگئی۔ آج کی دنیا ایک بڑی اٹلی ہے اور دنیا کی تمام سلطنتیں اٹلی کا نام روشن کرہی ہیں۔ اگر ۲۰۰ء میں اطالیہ کی بادشاہت انتہائے عروج پر پہنچی ہوئی تھی تو آج فلک چہارم تک پہنچی ہوئی ہے۔ ہر ایک قوم کا تمدن، اخلاق و آداب، اصول سلطنت جو آج دنیا میں رائج ہیں۔ اٹلی ہی کی ٹکسال سے ڈھل کر نکلتے ہیں۔ حتی کہ یونان کا ہم پر جو اثر پڑا ہے وہ بھی اٹلی ہی کا طفیل ہے آج لاطینی جو اطالیہ کی زبان ہے، دنیا کی مہذب اقوام کی پاک زبان ہے۔

ایشیا میں خدا نے ہند کو علم و تہذیب کا خزانچی بنایا ہے۔ اور اب کچھ دنوں سے مسیحی انمول جواہرات بھی اس کو سپرد کیے جانے لگے ہیں۔ پس اس کا فرض ہے کہ دوسری ایشیائی قوموں کو اپنی دولت سے فیض بخشے۔ دل کھول کر اس خزانہ کو صرف کرے۔ سیر چشمی دکھائے، فیاضی کا ثبوت دے۔ اگر اس بے انتہا دولت سے خود فائدہ اٹھائے گا تو خود غرض کہلائے گا۔ آنے والی نسلیں اس پر بخل کا الزام لگائیں گی۔اگر وہ تہذیب کا پیالہ خود دپیے گا۔ اور دوسری قوموں کو اس سے محظوظ نہ ہونے دے گا۔ تو اس پر شکم پروری کا الزام لگایا جائے گا پس اس کا فرض ہے کہ قندھار کو یہ پیالہ پلائے۔ اور دل میں سمجھے کہ وہ خدا کی طرف سے اس کام کو کرنے کے لیے تعینات ہوا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ قندھار، آسانی سے یہ پیالہ نہیں پیے گا۔ مگر اس کا

باعث یہ ہے کہ وہ اس کی لذت کو نہیں جانتا۔ اس کے فوائد سے بے علم ہے۔ اب ہند کا فرض ہے کہ اس کو اس کا مزہ چکھائے۔ اس کے فوائد ذہن نشیں کرے۔"

پادری جوزریٹ نے مشکل سے اپنی تقریر ختم کی تھی کہ شہزادہ والا تبار نے تخت سے اتر کر ان سے ہاتھ ملایا۔ ڈاکٹر برنیر کا چہرہ جوش مسرت سے کھل اٹھا۔ مگر ہنری بوزے صاحب کا چہرہ مدھم پڑ گیا۔ کیوں کہ ان پر صاف ظاہر ہوگیا کہ اب میری صلاح کے منظور کیے جانے کی ذرا بھی امید باقی نہیں۔ پادری صاحب کا کیا پوچھنا اور تو سمجھتے تھے آج جگ جیت لیا اور کیوں نہ سمجھتے ابھی تک مہم قندھار پر کسی نے اس پہلو سے بحث نہیں کی تھی۔ یہ پادری ہی صاحب کی سوجھ بوجھ ہے۔

اس تقریر کے بعد کئی منٹ تک خاموش رہی۔ آخر شہزادہ صاحب نے یوں فرمایا۔ حضرات! میں آپ کا تہ دل سے ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی دانشمندانہ تقریروں سے مجھ کو مسرور کیا۔ جس وقت میں نے اس دیوان خاص میں قدم رکھا تھا، میں مہم قندھار کے بالکل برخلاف تھا۔ متواتر دو شکستوں نے میرے حوصلے پست کردیے تھے اور مجھے فطرتاً یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ خدا نے ہمارے جوش تغلب کی سزایوں دی ہے۔ مگر ڈاکٹر برنیر و پادری جوزریٹ کی پراثر تقریروں نے میرے خیالات کی کایا پلٹ کردی۔ اور میرا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ حتی الوسع قندھار کو ہاتھ سے نہ جانے دوں گا۔ میں قندھار کو ہندوستان کا ایک صوبہ بنا دوں گا۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں سنسکرت کتابیں شاہد ہیں کہ زمانہ قدیم میں جبکہ آریوں کا ستارہ عروج پر تھا۔ قندھار ہند کا ایک صوبہ تھا۔ دونوں ملکوں کے فرماں رواؤں میں شادیاں ہوتی تھیں۔ راجہ دھرت راشٹر کی بیوی گاندھاری راجہ قندھار کی لڑکی تھی۔ دونوں بہنوں میں اب ذرا سرد مہری آ گئی ہے۔ مگر میں ازسرنو ان کو گلے ملاؤں گا۔"

اس تقریر کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

"آزاد" ستمبر ۱۹۰۸ء

رینالڈس

جوشوا رینالڈس سموئیل رینالڈس کا لڑکا تھا۔ ۶؍جولائی ۱۷۲۳ء کو پیدا ہوا۔ اور اپنے دوران حیات میں انگریزی مصوری کو سطح زمین سے اٹھاکر عرش معلیٰ تک پہنچا گیا۔ہوگارتھ اس وقت ملک میں مشہو ر ہو رہا تھا مگر اس کی تصویروں کے قدر کرنے والے بہت تھوڑے تھے۔ اس نے اساتذہ سلف سے سبق نہ لیا تھا۔ اس کے برعکس رینالڈ پرانے اسکول کا شاگرد، اور میکائیل انجیلو، رفائیل، کوبجیو کا معتقد تھا۔ اس کی تصاویر کی ہر کس و ناکس نے قدر کی۔

سموئیل رینالڈس ایک موضع کے پادری تھے۔ مگر کثیر اولاد، ہونہار رینالڈ ان کا دسواں لڑکا تھا۔ اس کی تعلیم کیا ہوسکتی تھی۔ دیہاتی مدرسہ میں تھوڑی بہت انگریزی اور حساب سیکھنے کا موقع ملا اور گویا تحصیل سے فراغت ہوگئی۔ اس مختصر زمانے میں رینالڈ ایسا ذکی و ذہین لڑکا چاہتا تو بہت کچھ سیکھ لیتا۔ مگر اس کی طبیعت بجائے حساب کی مشق اور گریمر کے مطالعہ کے ڈرائنگ کھینچنے میں زیادہ لگتی تھی۔ گھر پر بیٹھا تصویریں بنایا کرتا، پادری صاحب جب کبھی اس کی تصویریں دیکھ لیتے تو ناراض ہوتے۔ اور اس تضیع اوقات پر لڑکے کو مارتے، بہرحال رینالڈ کی طالب علمی کا زمانہ بہت مختصر تھا۔ مگر جب اس نے ہوش سنبھالا، ذرا شہرت ہوئی، ڈاکٹر جانسن، گولڈ سمتھ، برک، ایسے ایسے مشہور آفاق آدمیوں سے ملنے جلنے کا موقع ملا تو اس نے یہ کمی بہت تھوڑی مدت میں رفع کرلی۔ ان فاضلانہ صحبتوں میں نیم تعلیم یافتہ آدمی بھگوا بنا کر نکال دیا جاتا۔ مگر رینالڈ کی بڑی عزت ہوتی تھی، اس نے فن تصویر پر جو تقریریں کی ہیں وہ اپنے حسن بیان، وسعت معلومات اور عالمانہ رنگ کے لیے انگریزی ادب میں نہایت ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔

اس زمانے میں طبابت بہت آسان پیشہ تھا۔ جس نے چند انگریزی اور لاطینی کی کتابیں پڑھ لیں، اور کسی طبیب کی دوکان میں رہ کر دواؤں اور امراض کے نام سیکھ لیے وہ مطب کرنے کا مستحق ہوجاتا تھا۔ پادری صاحب نے رینالڈ کے لیے یہی پیشہ تجویز کیا۔ اور اگر وہ حکمت کی طرف جھکتا تو ضرور اپنے زمانے کا حکیم حاذق بن جاتا۔ اس کا قول تھا کہ ریاضت اور استقلال اور محویت، ذہانت اور ذکاوت کے دوسرے نام ہیں۔

مصوری کا پہلا سبق رینالڈ کو اپنی دو بہنوں سے ملا جنھیں اس مشغلہ سے ذرا دلچسپی تھی جو کچھ وہ کھینچتیں رینالڈ فوراً نقل کرلیتا۔ اس کے علاوہ دوسری باتصویر کتابوں کی بھی نقلیں کیا کرتا۔ اس طرح بچپنے ہی سے اس کی نگاہوں میں قوت جذب، اور ہاتھوں میں صفائی آنے لگی۔ ابھی آٹھ ہی برس کا تھا کہ کہیں سے ایک مصوری کی کتاب اس کے ہاتھ لگ گئی۔ پھر کیا تھا، اس کو اس نے بڑے شوق سے ختم کیا۔ اس لیے مطالعہ کا یہ اثر ہوا کہ اس نے اپنے مدرسے کا ایک نقشہ کھینچا۔ پادری صاحب نے یہ نقشہ دیکھا تو بیٹے کی پیٹھ ٹھونکی۔ اور جب رینالڈ کو معلوم ہوگیا کہ ابا جان بھی میرے مشاغل کو پسند کرتے ہیں تو وہ تصویر نگاری میں جی جان سے محو ہوگیا۔ رفتہ رفتہ خاندان کے تمام آدمیوں کی شبیہیں کھینچ لیں۔ دوستوں نے یہ تصویریں دیکھیں تو بڑھاوے دینے لگے۔ بیسویں سال نے اسے پختہ کار مصور بنا دیا۔

مگر جس قصبہ میں وہ رہتا تھا وہ بالکل گمنام مقام تھا۔ وہاں خیالات کو وسعت دینے، اساتذہ فن سے ملنے، ان کے سبق سے فائدہ اٹھانے اور نام و نمود پیدا کرنے کے ذرائع بالکل مفقود تھے۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ وہ لندن آئے اور کسب فن کرے۔ ہڈسن اس زمانے میں ایک رونگار تھا۔ اس کا شاگرد ہوگیا، مگر ہڈسن میں بجز چہرہ نگاری کے اور کوئی قابلیت نہ تھی۔ رینالڈ ایسا طباع نوجوان جس کے سینے میں حوصلوں اور امنگوں کا دریا جوش مارتا تھا اس کی تعلیم سے کیا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ ہڈسن نے اس کی طبعی مناسبت کا اندازہ نہ پایا۔ ایک اوسط درجے کے اٹالین مصور کی تصاویر اس سے نقل کرانے لگا۔ رینالڈ نے اسے ایسی خوبی سے نقل کیا کہ اس میں اور اصل میں سر مو تفاوت نہ رہی۔ تاہم اس نے یہاں جوں توں کرکے دو برس کاٹے۔ اس

مدت میں اس نے بہت سی تصویریں بنائیں۔ کہتے ہیں کہ ان میں اس کی آنے والی شہرت کی جھلک موجود ہے۔ شاگرد کا کمال دیکھ کر استاد کے دل میں رقابت کا جوش پیدا ہوا، آخر ایک تصویر جس پر رینالڈ نے اپنی تمام ہنرمندی صرف کردی تھی دونوں آدمیوں میں علاحدگی کا باعث ہوئی۔ اس نے بھی سمجھ لیا کہ حضرت استاد کو جو کچھ پڑھانا تھا پڑھا چکے۔ اپنے وطن کو لوٹ آیا۔ اس علاحدگی کو وہ ہمیشہ فال نیک سمجھا کرتا تھا کیونکہ اگر وہ اور کچھ عرصے تک ہڈسن کی شاگردی میں رہتا تو اس کی طبیعت میں بھی وہی نقالی کی عادت پڑ جاتی جو سچی مصوری کی جان لیوا ہے۔ اس بیکاری میں اس نے تین سال کاٹے۔ مگر حق یہ ہے کہ اسی مشق نے اسے رینالڈ بنا دیا۔ اس عرصے میں تصویر بنانے کے سوا اسے اور کوئی کام نہ تھا اسی زمانے میں اس نے کتاب فطرت کی بھی تلاوت کی۔ جو بعد کو اس کی شہرت و نمود کا بڑا سبب ہوئی۔

ایک روز جبکہ وہ ہڈسن کے حلقہ ارادت میں تھا بازار میں نیلام دیکھنے گیا۔ بہت سے آدمی حلقہ باندھے کھڑے تھے۔ یکا یک ''پوپ ! پوپ!'' کا غل مچا اور مشہور و مقبول شاعر پوپ آتا دکھائی دیا۔ لوگ تعظیماً ادھر ادھر ہٹنے اور جھک جھک کر سلام کرنے لگے۔ جس کے پاس سے وہ ہوکر گزرتا وہ اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ چھولیتا۔ جب رینالڈ کی باری آئی تو پوپ نے خود اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ہلادیے۔ رینالڈ ہمیشہ اس واقعہ کو فخریہ بیان کیا کرتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عالموں کی اس کے دل میں کتنی عزت تھی اور اس زمانے کے عوام علما و شعرا سے کیسی محبت اور عزت سے پیش آتے تھے۔

شہر روم ہمیشہ سے مصوروں کا زیارت گاہ رہا ہے۔ یہی شہر ہے جہاں یورپین فن تصویر کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ پوپ لیو کے عہد مبارک سے یہ سرزمین ہمیشہ نامی مصوروں کا مسکن رہی ہے۔ رفیلی، میکائیل انجیلو، کریجیو جن کورس فن کا خدا کہہ سکتے ہیں اسی پاک خطے سے اُٹھے تھے۔ لیونارڈ اور ٹشین اسی بستی کے بسنے والے تھے۔ انھوں نے جو تصویریں بنا کر وہاں کے نگار خانوں میں رکھ دیں وہ آج تک لاثانی، اور انتہائے فن سمجھی گئی ہیں۔ جیسے کالی داس ہومر اور فردوسی کی شاعری تقلید سے بلند تر ہے۔ اسی طرح یہ تصویریں بھی تقلید کی دستبرد سے محفوظ ہیں۔ سارے یورپ کے شائقین فن

ان تصاویر کو دیکھنے جاتے ہیں۔ کوئی مصور اس وقت تک مصور نہیں بن سکتا جب تک ان تصاویر کا اچھی طرح مطالعہ نہ کرلے۔ اگرچہ ان پر چار چار صدیوں کے گرد و غبار پڑے ہوئے ہیں مگر ان کی رنگت کی تازگی میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں آیا۔ نہیں معلوم کہاں سے ایسے رنگ لائے کہ مدھم ہونا نہیں جانتے۔ رینالڈ نے روم کی بہت تعریف سنی تھی۔ اور اس کے دل سے لگی تھی کہ کسی طرح وہاں کی سیر کرے، مگر تہی دستی سے لاچار تھا۔ آخر اس کے ایک جہازی دوست نے اسے سیر روم کی دعوت دی اور دونوں دوست چل کھڑے ہوئے۔ پہلے پرتگال کے دارالخلافہ لسبن کی سیر کی بعد ازاں جبل الطارق پہنچے اور یہاں سے روم میں داخل ہوئے۔

اس شہر نے پہلے پہل اس کے دل پر جو اثرات کیے اس کا اس نے مفصل تذکرہ لکھا ہے، کہتا ہے۔ ”ایسا اکثر واقع ہوتا ہے کہ لوگ نگار خانہ وٹیکن (یہ نگار خانہ پوپ لیو نے قائم کیا تھا اور اس میں اٹلی کے باکمال مصوروں کی تصویریں رکھی ہوئی ہیں) کی سیر کے بعد جب رخصت ہونے لگتے ہیں تو رہنما سے پوچھتے ہیں یہاں رفیلی کی تصاویر کہاں ہیں۔ وہ ان حیرت انگیز تصویروں کو سرسری طور پر دیکھ جاتے ہیں۔ ان کا اثر ان پر مطلق نہیں ہوتا۔ میں نے جب پہلے پہل اس نگارخانہ کی سیر کی تو سخت مایوسی ہوئی۔ یہی کیفیت میرے ایک مصور دوست کی بھی تھی۔ مگر گو مجھے ان تصاویر کے دیکھنے سے وہ لطف نہ آیا جس کی امید تھی۔ تاہم مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہ آیا کہ رفیلی کی شہرت دور کے ڈھول ہیں۔ میں نے اس معاملے میں اپنے ہی کو خطاوار ٹھہرایا، ایسی عجائب روزگار چیزوں سے موثر نہ ہوتا ایک نہایت شرمناک بات تھی۔ مگر اس کا سبب یہ تھا کہ نہ تو میں اصولوں سے واقف تھا جن پر وہ نادر تصویریں بنائی گئیں تھیں۔ اور نہ کبھی کملاء فن کی تصاویر دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ مصوری کے متعلق جو خیالات میں انگلستان سے لایاہوں وہ بالکل غلط اور بہکانے والے ہیں۔ ضرورت ہوئی کہ وہ سب خیالات باطل دل سے نکال ڈالوں۔ آخر میں نے ایسا ہی کیا اور باوجود مایوسی کے ایک تصویر کی نقل کرنے لگا۔ میں نے اسے بار بار دیکھا۔ اس کی نزاکتوں اور باریکیوں پر دیر تک غورکیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں میرے دل میں ایک نیا مذاق اور نیا احساس پیدا ہوگیا۔ ”کسی فن کے محاسن پہچاننے، سمجھنے اور

ان سے محظوظ ہونے کی لیاقت ایک کسبی چیز ہے جو بلا سخت محنت، توجہ اور تربیت کے کسی طرح نہیں حاصل ہوسکتی ۔ صحیح شاعرانہ مذاق یا دقیق اوراک موسیقی حاصل کرنے کے لیے انھیں باتوں کی ضرورت ہے۔ کون نہیں جانتا کہ غیر تربیت یافتہ نگاہیں سچے اور جھوٹے موتی، شیشہ کے ٹکڑے اور ہیرے میں بمشکل تمیز کرسکتی ہیں۔ یہ معمولی بات ہے کہ ایک گنوار، بے مذاق شخص خوبصورت سی خوبصورت جھیل، اونچے سے اونچے پہاڑ، نادر سے نادر باغوں سے اسی طرح بنجر رہتا ہے جیسے روکھی روٹی اور جھونپڑے سے طلوع آفتاب کی رنگ آمیزیاں، چاندنی رات کی دلفریبیاں، کنار دریا کی جاں بخش ہوا اور سبزہ زار کی مخملی سبزی اس کے لیے معمولی باتیں ہیں۔ اس کو ان خوبیوں کا ادراک ہی نہیں۔ حالانکہ یہی چیزیں ہیں جو ایک تربیت یافتہ مذاق پر وجد کا عالم طاری کردیتی ہیں۔

رینالڈ نے ان تصاویر کی خوبیوں پر بڑی شرح و بسط سے محاکمہ کیا ہے۔ کہیں ان کی رنگ آمیزیوں کے اسرار سربستہ کھولے ہیں۔ کہیں مختلف اساتذہ فن کے کمالات کا موازنہ کیا ہے۔ اٹلی میں مصوروں کے کئی رنگ ہیں، روم، وینس، فلورنس، ملان ہر ایک جدا جدا رنگ کے مرکز ہیں۔ رینالڈ نے ہر رنگ کی خوبیوں اور باریکیوں کی مفصل تشریح کی ہے۔ لیکن خود اپنی تصویروں میں کسی خاص اسکول کی تقلید نہیں کی۔ مصور کو اپنے موازنہ اور مشاہدہ کی قوتوں پر خوب زور ڈالنا چاہئے۔ یہ لازم نہیں ہے کہ وہ اپنی تصاویر کے لیے دوسروں کی کتابوں میں قواعد ڈھونڈے۔ اسے تصاویر کے مطالعے سے اپنے قاعدے آپ نکالنا چاہئے۔ قاعدے تصاویر سے وضع ہوئے ہیں، نہ کہ تصویریں قواعد سے رینالڈ کہتا ہے "چونکہ نقالی میں دماغ کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی وہ رفتہ رفتہ مضمحل ہوجاتا ہے۔ اور وہ ایجاد و اختراع کے قویٰ جن کو خاص طور پر کام میں لانا چاہئے اس نامشقی سے ضعیف ہوجاتے ہیں۔" وہ تین سال اٹلی میں رہا اور ہر رنگ اور ہر صنف کی تصاویر و مرقعوں کا مطالعہ کیا۔ مگر انگلستان پہنچ کر اس نے جس صنف کو اپنی شہرت کا ذریعہ بنایا وہ شبیہ نگاری تھی۔ اس کی ایک وجہ تو غالبًا یہ ہوگی کہ اس وقت انگلستان میں اگر کچھ قدر تھی تو اسی صنف کی۔ جیسا کہ ہوگا رتھ کی ایک تصویر سے ظاہر ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ رینالڈ نے طبعًا وہ بلند پروازی اور مضمون آفرینی نہ پائی

تھی جس کے بغیر تاریخی یا مذہبی تصاویر کا بنانا غیر ممکن ہے۔ روم سے واپس آنے پر اس نے کچھ دنوں وطن کی سیر کی۔ بعد ازاں لندن میں سکونت پذیر ہوا۔ مگر جب اس نے دو ایک تصویریں بنائیں تو مصوروں نے غل مچاناشروع کیا کیونکہ ان تصاویر میں مروجہ رنگ اور انداز کی پابندی نہ کی گئی تھی۔ تاہم یہ شور و غل عرصہ تک قائم نہ رہ سکا، جب خریدار سودا اچھا دیکھتا ہے تو خود مول لیتا ہے۔ اسے پھر اس کی پروا نہیں ہوتی کہ دوسرے اہل فن اس کی نسبت کیا کہتے ہیں۔ معزز رؤسا اور شریف لیڈیاں جوق در جوق آنے لگیں۔ ہر رئیس کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ مصور مجھے ہیرو یا فلاسفر بنا کر دکھادے۔ ہر ایک لیڈی چاہتی تھی کہ میں حور بہشتی بنا دی جاؤں۔ میرے چہرے کی جھریاں مطلق نظر نہ آئیں۔ رینالڈ بلا کا تیز نگاہ تھا۔ ہر شخص کی خواہشیں پوری کردیتا تھا وہ کہا کرتا تھا کہ شبیہ نگاروں کے لیے ایسے مزاج کی ضرورت ہے جیسا ڈاکٹروں کا ہوتا ہے۔ انھیں ہر ایک بات میں اپنے خریداروں کی ناز برداری کرنا پڑتی ہے۔

۱۷۵۴ء میں رینالڈ کی ڈاکٹر جانسن سے دوستی ہوگئی۔ رینالڈ ڈیون شائر گیا ہوا تھا۔ وہاں اسے ایک دوست کے یہاں ڈاکٹر ممدوح کی لکھی ہوئی والٹر سیوج شاعر کی سوانح عمری نظر آئی۔ اس میں اس کا ایسا جی لگا کہ اس نے کھڑے کھڑے ختم کرکے دم لیا۔ اس وقت سے اسے اس دلچسپ کتاب کے مصنف سے نیاز حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوگیا۔ اتفاق سے ایک رئیس کی مرگ ناگہانی کے موقع پر دونوں آدمیوں سے ملاقات ہوگئی۔ اس شخص کی ذات سے بہت سے آدمیوں کو فیض پہنچتا تھا۔ اور لوگ اس کے دل و دماغ کے اوصاف حسنہ کی تعریفیں کر رہے تھے۔ رینالڈ کی زبان سے نکلا بیشک یہ سانحہ دردناک تو ہے ہی مگر اب بہت سے لوگ احسان کے بوجھ سے سبکدوش ہوگئے۔ حاضرین کو یہ ریمارک ناگوار معلوم ہوا، مگر ڈاکٹر جانسن بہت خوش ہوئے، اور لوگوں سے کہا کہ یہ شخص ذی خیال معلوم ہوتا ہے۔ جب رینالڈ گھرلوٹا تو ڈاکٹر صاحب اس کے ساتھ ساتھ آئے۔ اس طرح اس دوستی کا آغاز ہوا جو دونوں بزرگوں کے جیتے جی بڑے اخلاص سے نبھی۔ ڈاکٹر صاحب کا مزاج روکھا، پرنخوت اور کسی قدر اکھڑ تھا۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ اب تک ناقدری، عسرت اور تنہائی میں کٹا تھا اونچے طبقے سے غیرمانوس رہنے کے باعث نشست و برخاست، رفتار و گفتار کے مراسم سے بھی وہ

واقف نہ تھے۔ اس لیے رؤسا کے طبقے میں ان کی بہت قدر و منزلت نہ ہوتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے علم و فضل کا رعب سب کے دلوں پر چھایا ہوا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی ان کا بھونڈا طور و طریق، بدنما چہرا، بیخوف حاضر جوابی اور بیلاگ صاف گوئی انھیں رؤسا کے دلوں میں جگہ نہ پانے دیتی تھی۔ اہل زر خواہ عقل و دانش میں صفر ہی کیوں نہ ہو یہ نہیں بھولتے کہ ہم رئیس ہیں۔ وہ چاہتے ہیں: کہ علم یا فضیلت کوئی ہو جب سائل بن کر آئے تو خوشامد اور ناز برداری کا سامان ساتھ لیتا آئے۔ ڈاکٹر کی خلقت میں یہ بات نہ تھی۔ وہ جب ان کے حلقے میں آتا تو مسکرا کر اور سر جھکا کر اعزاز کا طالب نہ ہوتا تھا۔ بلکہ مسند افتخار کو وہ اپنی قابلیت کا صلہ سمجھتا تھا۔ اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور ڈاکٹر کی روشن دماغی کے جوہر کھلتے گئے توں توں باوجود جھلے پن اور ترش بیانی کے اعلی و ادنیٰ سبھی ان کے سامنے سر تعظیم خم کرنے پر مجبور ہوئے۔ برعکس اس کے رینالڈ خلقتۂ ہنس مکھ اور خوش اخلاق تھا۔ اور ضرورتاً اعلیٰ طبقہ کی معاشرت کی پیروی کرتا تھا۔

رینالڈ کو اساتذہ سلف سے سچی عقیدت تھی۔ رفائیل اور میکائیل انجیلو کو وہ کسی ولی اللہ یا پیغمبر سے کم نہ سمجھتا تھا۔ کہتا ہے ''تصاویر میں بے تکلفی کا ہونا کمال فن ہے۔ اور اس کی کمی خواہ رنگ میں ہو یا اصل تصویر میں، نقص فن، رنگ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک پاکیزہ صبیح اور مدھم۔ دوسرا شوخ، بھڑکیلا اور آنکھوں میں کھب جانے والا۔ اہل کمال پہلے رنگ کا استعمال کرتے ہیں اور معمولی پیشہ ور دوسرے رنگ کا۔ بعض مصوروں کا خیال ہے کہ ایسی سادگی تصویر کو بے رونق اور اندھا چراغ بنا دیتی ہے۔ مگر یہ نقص فن ہے اس سے تصویر کی سکون بخشنے والی قوت میں فرق آجاتا ہے۔''

رینالڈ کو علما کی صحبت کا بڑا شوق تھا۔ شام کو چار بجتے ہی اس کی میز آراستہ کردی جاتی اور اس کے گرد اہل کمال جمع ہونے لگتے۔ شعرا اپنے اشعار وہاں سناتے اور قدر دانوں سے داد سخن پاتے۔ جانسن اس جماعت کے سرغنہ تھے۔ گولڈ اسمتھ بھی کبھی کبھی آنکلتے اور اپنی بے تکلف سادہ باتوں اور طفلانہ حرکتوں سے مجلس کی زندہ دلی میں اضافہ کرتے زبردست مدبر اور مقرر اڈمنڈ برک بھی اکثر نظر آتے تھے مگر وہ طبیعت کے بہت شوخ اور چلبلے نہ تھے۔ رینالڈ نہ صرف علما کی عزت کرتا تھا بلکہ اکثر

ان کی مالی اعانت بھی کرتا رہتا تھا۔ جس شخص کی تعریف جانسن اور برک کے قلم سے نکلی ہو اس کی حیات وجاوید میں زمانہ کب مخل ہوسکتا ہے۔

۱۷۶۰ء میں رائل اکاڈمی کی بنیاد پڑی۔ یہ انگلستان میں فن تصویر کے باقاعدہ تعلیم کی پہلی کوشش تھی۔ جس کی آب و تاب میں کئی صدیاں گزر جانے پر بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ رینالڈ اس تعلیم گاہ کا آخر وقت تک پریسیڈنٹ رہا۔

پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ رینالڈ کے دل میں شاعر پوپ کی بہت عزت تھی۔ پوپ کو جب فکر سخن سے فرصت ملتی تو مصوری کیا کرتے تھے۔ ایک دستی پنکھے پر انھوں نے ایک یونانی قصے کی قصب بانی کی تھی۔ یہ پنکھا بازار میں نیلام کے لیے آیا۔ رینالڈ کو جب خبر ملی تو اس نے ایک آدمی بھیج دیا کہ وہ تیس پونڈ تک بولی بول کر اس تحفہ کو خرید لے۔ مگر یہ حضرت تیس شلنگ سے آگے نہ بڑھے۔ آخر ایک دوسرے خریدار نے اسے دو پونڈ پر لے لیا۔ رینالڈ کو اس پنکھے کا اتنا شوق تھا کہ اسے دونی قیمت دے کر اسے نئے خریدار سے لے لیا۔

ایک دعوت کے موقع پر جانس، برک، گیرک، گولڈ اسمتھ سب جمع تھے آپس میں خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ یکایک کسی نے کہا آؤ ایک دوسرے کی موت کا کتبہ کہیں مگر شرط یہ ہے کہ فی البدیہہ ہوا۔ اس پر لوگوں نے طبع آزمائی شروع کی۔ گیرک کو شرارت جو سوجھی تو آپ نے دو تین شعر ہزلیات کے طور پر کہے۔ جن میں گولڈ سمتھ کی خبر لی گئی تھی۔ گولڈ سمتھ کو یہ شرارت بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ اس کے جواب میں اس نے ''انتقام'' کے نام سے ایک پرزور نظم لکھی۔ افسوس ہے کہ اس مادر زاد شاعر کی یہ آخری نظم تھی۔ ایسا بے فکر ایسا رندانہ مزاج اور اس کے ساتھ ہی ایسا خوش فکر شاعر انگریزی زبان میں پھر نہ پیدا ہوا۔ یہ ذہانت جس قالب میں پنہاں تھی وہ بہت خوبصورت نہ تھا۔ رینالڈ نے گولڈ سمتھ کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں وہ نہایت کمزور نظر آتا ہے۔ مگر مصور کی بہن کا قول تھا کہ رینالڈ نے کسی تصویر میں اتنی خوشامد نہیں صرف کی جتنی کہ اس تصویر میں۔ صورت اور معنی میں تفاوت ہونا غیر معمولی بات نہیں ہے۔

۱۷۷۳ء میں رینالڈ نے Uglirro کی تصویر کھینچی۔ یہ اٹلی کے مشہور شاعر ڈینٹی کی ایک تصنیف کا ہیرو ہے۔ مگر رینالڈ ایسا مصور جو لیڈیوں کے ہونٹ اور گردن آراستہ

کرنے میں اپنا کمال صرف کرتا ہو، رنج و مصیبت کی داستان کیونکر بیان کر سکتا ہے۔ ڈینٹی کا مستقل مزاج ہیرو رینالڈ کی تصویر میں قحط زدہ اور خستہ حال نظر آتا ہے۔ اس کے آہنی استقلال اور نفس عالی کا بالکل اظہار نہیں ہوتا مگر رینالڈ کی پنسل سے جو کچھ نکلتا تھا اس کی قدردانی یقینی تھی۔ ایک رئیس نے اس تصویر کو چار سو پونڈ پر خریدا، اسی سال جولائی کے مہینے میں رینالڈ اکسفورڈ کی سیر کو گیا۔ جہاں اس کی بڑی تواضع و تکریم ہوئی، اور ڈاکٹر آف لا کا اعزازی لقب ملا۔ یہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر بیٹی سے ہوئی جس کا شمار ان دنوں اصحاب فضیلت میں تھا۔ بیٹی نے ''صداقت کی ناتبدل پذیری'' پر ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس نے گبن۔ والیٹر اور ہیوم ایسے آزاد خیال علما کو نشانہ ملامت بنایا تھا۔ رینالڈ چونکہ خود فلسفہ سے مانوس نہ تھا اس کے دل میں ڈاکٹر بیٹی کی بہت زیادہ وقعت ہوگئی۔ جب وہ لندن آیا تو اس نے بیٹی کی ایک شبیہہ کھینچی۔ جو اس کی بہترین تصاویر میں ہے بیٹی اکسفورڈ کے علما کا لباس پہنے بیٹھا ہے۔ صداقت کی نابندل پذیری، اس کے بغل میں ہے۔ اس کے پہلو میں سچائی کا فرشتہ کھڑا ہے جو کفر الحاد اور نافرمانی پر غالب آرہا ہے۔ ان مغلوب صورتوں میں سے ایک بہت لاغر اور عیش پرست نظر آتی ہے۔ یہ کفر کی صورت ہے اور والٹیر سے ملتی ہے، دوسری فربہ اور لحیم شحیم ہے۔ یہ الحاد کی تصویر ہے اور ہیوم سے مشابہ ہے۔ تیسری صورت نافرمانی کی ہے جو گبن کا عکس معلوم ہوتی ہے۔ گولڈ سمتھ نے جب یہ تصویر دیکھی تو اس کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ بولا ''آپ ایسے باکمال آدمی کے لیے اس حد تک خوشامد پر اتر آنا نہایت مذموم ہے۔ آپ کو والٹیر جیسے عالی دماغ آدمی کو بیٹی جیسے پوچ گو کے مقابلے میں ذلیل کرنے کی کیوں کر جرائت ہوئی بیٹی اور اس کی کتاب دس برس میں طاق نسیاں پر رکھی دی جائے گی۔ مگر آپ کی تصویر اور والٹیر کی شہرت ہمیشہ زندہ رہے گی۔'' گولڈ سمتھ نے بہت صحیح کہا تھا۔ بیٹی کا اب کوئی نام بھی نہیں جانتا، والٹیر، ہیوم اور گبن کے نام آفتاب کی طرح روشن ہیں۔

رینالڈ کی تصویروں کا رنگ دیرپا نہ ہوتا تھا، شوخ اور بھڑکیلے رنگوں کو وہ خود ناپسند کرتا تھا، مگر اس کی بیشتر تصویریں شوخ ہی نظر آتی ہیں۔ اس کا باعث غالبًا یہ ہے کہ اسے اپنے خریداروں کی خاطرداری منظور تھی۔ اور اس زمانے کا مذاق شوخ تصویروں کو

زیادہ پسند کرتا تھا، وہ اپنے رنگ سازی کے اصولوں اور قاعدوں کو سب سے پوشیدہ رکھتا تھا۔ عزیز سے عزیز شاگردوں کو بھی اس نے اپنی ترکیبوں کے اجزا نہ بتلائے۔ اس کا یہ بخل بالکل ہندوستانی صناعوں کی طرح تھا۔ جو اپنے گر اور کرتب اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ہاں وہ خود اساتذہ سلف کے رنگ و روغن کے اصولوں کی تحقیقات و دریافت کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنی کمائی کا بہت بڑا حصہ فن تصویر کے اعلیٰ نمونوں کے خریدنے میں صرف کیا۔ اگر اس کا ذخیرہ آج تک موجود ہوتا تو آج اس فن لطیف کا بیش بہا خزانہ سمجھا جاتا۔ مگر رینالڈ نے انھیں زینت کے لیے نہ خریدا تھا۔ بلکہ تحقیق و جستجو کے لیے، وہ ایک ایک تصویر کی جراحوں کی طرح تشریح کرتا تھا تاکہ اسے معلوم ہوجائے کہ استر کس رنگ کا ہے۔ اس پر کون رنگ دیا گیا اور کون کون سے رنگ یکجا ملائے گئے، اس امتحان کے بعد تصویریں کسی کام کی نہ رہ جاتی تھیں۔

رینالڈ کی تصویروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فطرت کا مطالعہ بڑی غائر نگاہ سے کرتا تھا۔ اپنے کمال کے ہیرے مختلف مخازن سے نکالتا۔ کیسی ہی حقیر رائے کیوں نہ ہو اس پر توجہ ضرور کرتا، بچے تو گویا اس کے اتالیق تھے، اس کا قول تھا کہ بچوں کے اشارے اور کنائے انداز اور طریق بناوٹ سے خالی ہونے کی باعث دل پسند ہوتے ہیں۔ جب بچے اس کے نگارخانہ میں آتے تو وہ ان کی حرکتوں کو بڑی غور سے دیکھا کرتا اور وہ جب مارے خوشی کے پھول اٹھتے، اور تصویروں کے وضع اور انداز کی نقل کرنے لگتے تو وہ اس نظارہ سے بہت محظوظ ہوتا۔ اپنی ایک یاد داشت میں لکھتا ہے ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی غیر واقف کار شخص کی رائے تصاویر کے بارے میں کیوں نہ تسلیم کی جائے۔ مثلاً اگر کوئی معمولی آدمی کسی تصویر کو دیکھ کر کہے کہ اس کا آدھا چہرہ کیوں سیاہ ہے یا ناک کے نیچے سیاہ دھبہ کیوں ہے تو میں یہ نتیجہ نکالوں گا کہ رنگ گہرا ہوگیا ہے۔ یا اچھی طرح صاف کیا گیا اگر یہ رنگ فطرت کے مطابق ہوتے تو ان کی طرف کسی کو توجہ نہ ہوتی۔

اس کی شہرت روز بروز عالمگیر ہوتی جاتی تھی۔ ۱۷۸۵ء میں روس کی نامور ملکہ کیتھرائن نے اس سے ایک تصویر کی فرمائش کی۔ رینالڈ نے مہینوں کے غور وخوض کے بعد ایک ایسا مضمون پسند کیا جو جدت اور دلچسپی کے لحاظ سے معمولی ہے۔ بلکہ کیتھرائن

استقلال اور زور دماغ میں اپنا نظر نہ رکھتی تھی۔

اس لیے رینالڈ نے شیر خوار ہرکیولیس کو دو سانپوں کا گلا گھونٹتے دکھایا۔ اگرچہ کیتھرائن کو ایسی پیچیدہ تصویروں کے سمجھنے کا دماغ نہ تھا تاہم اس نے خوب دل کھول کر قدردانی کی۔ ۱۵۰۰ پونڈ معاوضہ کے طور پر اور ایک سونے کی صندوقچی جس میں اس کی شبیہ بند تھی بطور تحفہ کے بھیجی۔

انھیں دنوں انگلستان کے ایک اولو العزم پبلشر نے شیکسپیئر کے باتصویر ایڈیشن نکالنے کا قصد کیا ۔ رینالڈ نے اس کے لیے تین تصویریں بنائیں۔ پہلی تصویر اس ظرافت کے جان کی ہے جس کا نام انگریزی ادب میں ضرب المثل ہوگیا ہے۔ پک ایک نہایت شوخ اور چلبلی طبیعت کا مسخرہ ہے جو رنگیلے شاہ ہنری ہشتم کا جلیس و انیس ہے۔ رینالڈ نے اس تصویر میں اعجاز کردکھایا۔ اس کا ہاتھ کوئی شرارت آمیز شوخی کرنے کے لیے آمادہ نظر آرہا ہے۔ اور آنکھوں سے کسی کو چھیڑنے، کسی سے کوسے جانے اور کسی سے گالیاں سننے کی خواہش ٹپک رہی ہے۔ دوسری تصویر میکبتھ کی ہے۔ جس میں حوض اور چڑیلوں کا نظارہ دکھایا گیا ہے۔ تیسری تصویر ایک پادری کی موت کی ہے۔ اس قسم کی تصویریں رینالڈ بہت دبنے پر بناتا تھا۔ کیونکہ اس کا تخیل بہت روشن نہ تھا، وہ چہرہ نگاری کرنے کے لیے بنایا گیا تھا، اور اسی صنف میں اس کی بہترین تصویریں موجود ہیں۔

سرجوشوا اب ٦٦ برس کا ہوگیا تھا۔ اور اگرچہ دولت و جاہ میں کوئی کمی نہ واقع ہوئی تھی ۔ مگر دوستوں کے اٹھ جانے کا صدمہ دنیاوی نعمتوں کی خوشی سے بہت زیادہ تھا۔ گولڈسمتھ ، جانسن، برک، گیرک، سب ایک ایک کرکے اس کا ساتھ چھوڑتے گئے۔ یہاں تک کہ ۱۷۸۹ء میں اس کے نام بھی پیام مرگ آپہنچا۔ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ ۱۷۹۲ء میں اس نے اس دارفانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کیا۔

رینالڈ سے نہ صرف متعدد اعلیٰ درجے کی شبیہیں یادگار ہیں۔ بلکہ اس کی فاضلانہ تقریریں اور اس کی شاعرانہ و تاریخی تصاویر بھی اس کے کمال کا سکہ ہمیشہ دلوں پر بٹھاتی رہیں گی۔ تقریروں سے اس کا منشا حوصلہ مند نوجوان مصوروں کے دلوں پر اس فن کی عظمت قائم کرنا، ان میں ریاضت اور مطالعہ کی عادت پیدا کرنا اور ان پر تصویرنگاری کے برگزیدہ اصولوں کا روشن کرنا تھا۔ کیا کیا ترکیبیں کی جائیں۔ کن کن

اصولوں کی پابندی کی جائے۔ دھوپ چھاؤں کا کیوں کر استعمال کیا جائے کہ تصویروں میں وہ جادو کا سا اثر پیدا ہوجائے جو اساتذہ سلف کی تصاویر میں پایاجاتا ہے۔ وہ محض ذہن اور مناسبت طبعی کا قائل نہ تھا۔ اس کی تلقین یہ تھی کہ اس فن میں کمال حاصل کرنے کے لیے شبانہ روز کی مشقت، مسلسل غور وخوض اور کملاء فن کی تصاویر سے سچی عقیدت درکار ہے۔

''زمانہ'' جنوری ۱۹۰۹ء

صوبہ متحدہ میں ابتدائی تعلیم

دسمبر کے ماڈرن ریویو میں سینٹ نہال سنگھ نے ایک نادر مضمون لکھا ہے جس میں امریکہ کے ایک موضع کی کیفیت بیان کی ہے۔ اسے پڑھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور مایوسی بھی۔ حیرت اس لیے کہ تہذیب کی جو آسانیاں اور اسباب اس گاؤں میں ہیں وہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کو نصیب نہیں۔ اور مایوسی اس لیے کہ شاید ہندوستان کی قسمت میں ترقی کرنا لکھا ہی نہیں۔ دو ہزار آبادی کا موضع اور ہائی اسکول اس کی عمارت، اس کے کتب خانہ، اس کے لیبورٹری پر ہندوستان کا کوئی کالج ناز کرسکتا ہے۔ کیا ہندوستان کے بھی کبھی ایسے نصیب ہوں گے۔

اب ایک طرف تو اس دیہاتی مدرسہ کو رکھیے، اور دوسری طرف ایک ہندوستانی دیہاتی مدرسے کا خیال کیجیے۔ ایک درخت کے نیچے جس کے ادھر ادھر کوڑا کرکٹ پڑا ہوا ہے، اور جہاں شاید برسوں سے جھاڑو نہیں دی گئی، ایک پھٹے پرانے ٹاٹ پر بیس پچیس لڑکے بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ سامنے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی اور پرانی میز ہے۔ اس پر حضرت مدرس کی ذات متمکن ہے۔ لڑکے جھوم جھوم کر پہاڑے رٹ رہے ہیں۔ شاید کسی کے بدن پر ثابت کرتہ نہ ہوگا۔ دھوتی ران کے اوپر تک بندھی ہوئی۔ ٹوپی میلی کچیلی صورتیں گرسنہ ، چہرے پژمردہ یہ آریہ ورت کا مدرسہ ہے جہاں کسی زمانے میں تکس شلا اور ندیا کے دارالعلوم تھے۔ کس قدر تفاوت ہے، ہم تہذیب کی دوڑ میں دیگر اقوام سے کس قدر پیچھے ہیں کہ شاید وہاں تک پہنچنے کا حوصلہ بھی نہیں کرسکتے۔

ہماری ابتدائی تعلیم کے اصلاح اور ترقی کے لیے سب سے بڑی ضرورت لائق مدرسوں کی ہے۔ اور لائق آدمی آٹھ روپے یا نو روپے ماہوار کے مشاہرے پر دنیا کے پردے میں کہیں نہیں مل سکتے۔ جس شخص کو فکر معاش سے آزادی ہی نصیب نہ ہوگی وہ

تعلیم کی طرف کیا خاک رجوع ہوگا۔ ایسے بہت سے اضلاع ہیں جہاں ابھی تک مدرسوں کو چار اور پانچ روپے سے زیادہ مشاہرہ نہیں ملتا۔ ایسے آدمیوں کے ہاتھوں میں ہماری سرکار نے رعایا کی تعلیم رکھ دی ہے اور تعجب کیا جاتا ہے کہ تعلیمی حالت کیوں ایسی ردی ہے۔ جب سرکاری مدرسوں کا یہ حال ہے تو امدادی مدرسوں کا ذکر ہی کیا۔ ان میں کم سے کم تین چوتھائی ایسے ہیں جنھیں سرکار للعہ، ماہوار امداد دیتی ہے۔ اور اس میں ایک آنہ منی آرڈر کا محصول کٹ جاتا ہے۔ تین روپے پندرہ آنے میں کون مہینے بھر درد سری گوارا کرے گا۔ شہروں میں کہاروں کی تنخواہیں چھ اور سات روپے ماہوار ہیں بلکہ بسا اوقات اس سے بھی زیادہ۔ معمولی مزدور چار آنے پیسے روز کما لیتا ہے۔ مگر غریب مدرس ان سے بھی ذلیل سمجھا جاتا ہے۔ مجبوراً یا تو وہ غریب کھیتی کی طرف رجوع ہوجاتا ہے، یا سرکاری قاعدے کے خلاف پاؤ آنہ کی جگہ ایک آنہ یا اس سے زیادہ فیس لینا شروع کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ لڑکوں کی تعداد میں افزونی نہیں ہونے پاتی۔ بہت سے امدادی مدرسے تو صرف اس لیے قائم ہیں کہ ایک غریب آدمی تین چار روپے گھر بیٹھے پا جاتا ہے، فرضی لڑکوں کے نام لکھ لیے جاتے ہیں اور جب کوئی افسر معائنہ کے لیے پہنچ جاتا ہے تو چند لڑکے ادھر ادھر سے جمع کر کے دکھا دیئے جاتے ہیں۔

مشاہرہ کا تو یہ حال ہے، اب یہ دیکھیے کہ ایک مدرس کے سر کام کا کتنا بوجھ لادا جاتا ہے۔ بالعموم لور پرائمری میں ایک مدرس رہتا ہے اور اپر پرائمری مدرسوں میں دو یا تین۔ غور کیجیے کہ ایک مدرس چار درجوں کی تعلیم کیونکر دے سکتا ہے۔ ایک انسپکٹر صاحب مدارس بہت صحیح طور پر پوچھتے ہیں کہ ایک شخص درجہ الف کے ۳۵ درجہ (ب) کے ۱۵۔ درجہ اول کے ۷۔ اور درجہ دوم کے ۵ لڑکوں کی تعلیم کا نگراں کیونکر ہوسکتا ہے۔ اپر پرائمری مدرسوں میں دو دو تین تین درجے ایک ایک آدمی کے سپرد رہتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مدرس کسی درجے کی بھی مناسب تعلیم نہیں دے سکتا۔ لڑکے سال سال بھر سے پڑھنے آتے ہیں، مگر ابھی حروف لکھنا بھی نہیں آیا۔ والدین دیکھتے ہیں کہ جب اس کا مدرسہ جانا نہ جانا برابر ہے تو گھر ہی پر کیوں نہ رہے تاکہ کچھ گھر کا کام کاج ہی سنبھالے۔ نارمل اسکولوں سے جو لوگ طرز تعلیم سیکھ کر

آتے ہیں وہ بھی مدرسوں میں آکر اپنا سب طریقہ بھول جاتے ہیں۔ بیچارے کیا کریں وہاں انھیں ایک وقت ایک درجے کی تعلیم کا سبق دیا گیا۔ یہاں انھیں ایک وقت مین چار درجے پڑھانے کو ملے، ان اصولوں پر کیونکر عمل کریں، ایک درجے کے پڑھانے میں مشغول ہوئے تو دوسرے درجے کو حساب دے دیا۔ کسی درجہ کو لکھنا، کسی درجہ کو جغرافیہ، آنکھ تو ایک ہی ہے، کیسے لکھنے کی اصلاح کرے ۔ کیسے حساب سمجھائے کیسے باقاعدہ طور پر جغرافیہ کی تعلیم دے۔ غرض ایک ہر بونگ سا مچنے لگتا ہے، لڑکے شیطان، مدرس کو مشغول دیکھا تو دھول دھپا شروع کیا۔

اس لیے اگر سرکار واقعی تعلیم کی ترقی چاہتی ہے ۔ سچی ترقی، کاغذی اور نمائشی نہیں تو مسٹر ڈی لافورس کی رائے کے مطابق مدرسوں کی تعداد اور تنخواہ بڑھائے۔ کسی مدرس کی تنخواہ پندرہ روپے سے کم نہ رہنی چاہیے اور کوئی مدرس نوکر نہ رکھا جانا چاہیے۔ جس نے اردو اور ہندی مڈل کی سند نہ حاصل کی ہو اور طرز تعلیم سے واقف نہ ہو اور کوئی مدرسہ ایسا نہ رہنا چاہیے جس میں کم سے کم دو مدرس نہ ہوں۔ تب ہی تعلیم کی حالت سدھر سکتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان سب ترقیوں کے لیے ایک کثیر رقم کی ضرورت ہے۔ مگر قومی تعلیم ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر مصارف کی کوئی مقدار ضائع نہیں ہوسکتی، گذشتہ سال صوبہ متحدہ میں ۱۹ لاکھ ابتدائی تعلیم میں صرف ہوا، اور بہ حساب اوسط فی طالب علم ساڑھے تین آنہ یہ اوسط دوسرے مہذب ملکوں کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔ کیا سرکار ایسے پاک کام کے لیے پچاس لاکھ سالانہ بھی خرچ نہیں کرسکتی۔ روپے کی قلت ایک ایسا حیلہ شرعی ہے جو گورنمنٹ کے لیے کبھی صادق نہیں کہا جاسکتا۔ گورنمنٹ کے ذرائع لامحدود ہیں اور اتنی رقم وہ بڑی آسانی سے خرچ کرسکتی ہے۔ جب جنگی مصارف اس کثرت سے سال بہ سال بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ افسروں کے عیش اور سہولتوں پر روپے کوڑیوں کی طرح لٹایا جا رہا ہے تو افلاس یا تنگدستی کا حیلہ کبھی قابل یقین نہیں ٹھہر سکتا۔ یہ بھی گورنمنٹ کی ایک چالاکی ہے کہ اس نے ڈسٹرکٹ بورڈوں پر تعلیم کا بار ڈال کر اپنے تئیں علیحدہ کرلیا۔ اور اب خس کم جہاں پاک کے مسئلہ پر عمل کر رہی ہے۔ بورڈ کہاں سے روپے لگائیں۔ جب پراونشل گورنمنٹ اپنے مقررہ حصہ کو سختی سے وصول کرتی چلی جاتی ہے۔

گذشتہ دو تین سالوں سے ہر ایک ضلع میں مدرسوں کو طرز تعلیم سکھانے کے لیے دو تین مدرسے قائم کیے گئے ہیں۔ ہر ایک مدرسے میں سالانہ چھ مدرسوں کی تعلیم ہوتی ہے۔ اور سند حاصل کرنے کے بعد وہ سرکاری مدارس میں ملازم رکھے جاتے ہیں۔ اس معاملہ میں بھی سرکار نے غلطی کی ہے ان مدرسوں میں معلم ایک نارمل سکول کا سندیافتہ شخص ہوتا ہے جس کی تنخواہ پندرہ روپے ماہوار ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص خود مڈل تک تعلیم پائے ہوئے ہے وہ مڈل پاس مدرسین کو کیا طرز تعلیم سکھائے گا۔ حقیقت میں یہ روپے بالکل ضائع ہوتا ہے۔ بہت بہتر ہوتا اگر ایک ایک ضلع میں ایسے تین تین مدرسوں کے بجائے صرف ایک مدرسے پر قناعت کی جاتی اور اس میں الٰہ آباد کے ٹریننگ کالج کا سند یافتہ سینیئر یا جونیئر شخص تعلیم دیتا۔ وہ انگریزی تعلیم یافتہ ہونے اور تعلیم کے اصولوں سے واقف ہونے کے باعث مدرسین کی تعلیم زیادہ خوبی سے کرسکتا۔

کچھ تو روپے کی کمی ہے اور کچھ بیجا خرچ۔ کبھی کبھی سرکا ر نے دو چار لاکھ زائد دیا بھی تو وہ انسپکٹر اور ڈائرکٹر اور میں اور تو کے بانٹ بخرے میں پڑ جاتا ہے۔ اور مدرس جوں کا توں بھوکا رہ جاتا ہے۔ امسال تین انسپکٹر اور بڑھائے گئے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ چالیس ہزار روپے کا خرچ اور بڑھ گیا۔ بدقسمتی سے سرکار کا خیال ہے کہ معائنہ زیادہ ہونا چاہیے، خواہ تعلیم ہو یا نہ ہو۔ معائنہ پر روپے خرچ کیا جاتا ہے مگر تعلیم کی خبر نہیں لی جاتی۔ گذشتہ سال مسٹر چودھری نے بنگال میں وہاں کی گورنمنٹ پر ایک اعتراض کیا تھا کہ تعلیم کے مقابلے میں معائنہ پر زیادہ خرچ کیا گیا۔یہی اعتراض غالبًا یہاں بھی کیاجاسکتا ہے۔ گورنمنٹ کب یہ سمجھے گی کہ معائنہ کبھی تعلیم کا نعم البدل نہیں ہوسکتا۔

طرفہ یہ ہے کہ مدرسین کے سر پر کام کا اتنا بڑا بوجھ بھی کافی نہیں سمجھا جاتا، کم سے کم پچیس فیصدی حلقہ بندی مدرسے ایسے ہیں جن میں مدرسین تعلیم کے علاوہ ڈاک خانہ کا کام بھی کیا کرتے ہیں۔ اس مزید کام کے لیے انھیں تین روپے سے لے کر پانچ چھ روپے تک ملتے ہیں چونکہ بورڈ جانتی ہے کہ مدرسین کو سرکار سے تنخواہ کافی نہیں ملتی اس لیے وہ انھیں ڈاک خانہ کا کام ہاتھ میں لینے سے روکنے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ بسا اوقات مدرسوں کی کارگزاریوں کا صلہ اسی پوسٹل الاؤنس کی شکل میں دیا جاتا

ہے۔ گورنمنٹ کا یہ بخل تعلیم کے حق میں جس قدر مضر ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ڈاک خانہ کا کام روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ مدرس اس کام کے لیے کوئی خاص وقت مقرر نہیں کرسکتا۔ دیہات کے زمیندار اور کاشت کار جس وقت فرصت پاتے ہیں۔ مدرس کے پاس پہنچ جاتے ہیں، اور غریب مدرس کو ان کی دل جوئی کرتے ہی بن پڑتی ہے۔ اگر وہ قاعدہ بگھارنے لگے تو زمیندار صاحب ناراض ہوجائیں۔ پوسٹ ماسٹر جنرل کے یہاں شکایت کر بیٹھیں یا مدرس کے لعن طعن کرنا شروع کریں اور اس کی ہستی خطرہ میں ڈال دیں۔ اس لیے وہ جس وقت آجاتے ہیں مدرس کو ان کا کام کرنا پڑتا ہے۔ یہ سلسلہ سویرے سے شام تک جاری رہتا ہے اور چونکہ مدرس کو بھی ڈاک خانہ کے کام سے کچھ ذاتی فائدہ ہو رہتا ہے وہ اس بے وقت مداخلت کو بیجا نہیں خیال کرتا۔ لگان کے فصل میں ایک ایک دن کئی گئی سو کے منی آرڈر آجاتے ہیں اور ہر ایک منی آرڈر پر مدرس کو کچھ آنے پیسے مل جاتے ہیں۔ یہ بہت نیچرل بات ہے کہ مدرس جیسی چھوٹی حیثیت کا آدمی ذاتی فائدہ کے ان موقعوں کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ افسوس کی بات ہے کہ ہماری گورنمنٹ کی نگاہوں میں ہماری تعلیم کی کوئی وقعت نہیں۔

دوسری اہم ضرورت نصاب تعلیم کے اصلاح کی ہے۔ اس مسئلہ پر نہ محکمہ تعلیم اور نہ گورنمنٹ کوئی قطعی رائے قائم کرسکی۔ کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ ابتدائی تعلیم کا منشا صرف یہ ہونا چاہیے کہ لڑکا حرف شناس ہوجائے۔ اور کچھ موٹا حساب جان لے، دوسری جماعت کا یہ خیال ہے کہ لڑکے کی ابتدائی تعلیم اس ڈھنگ پر ہو کہ اسے آگے چلنے میں مدد ملے۔ ہمارے خیال میں دونوں رائیں افراط و تفریط کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ جس تعلیم کو ہم ابتدائی تعلیم کہتے ہیں وہ دیہاتوں کے لیے ابتدائی تعلیم نہیں ہے۔ بلکہ نوے فیصدی لڑکوں کے لیے وہی انتہائی تعلیم ہے ۔ اپر پرائمری پاس کرنے کے لیے اوسطاً چھ برس کی مدت درکار ہے۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ طلباء کا دوتہائی حصہ اپر پرائمری درجہ تک بھی نہیں پہنچنے پاتا۔ اور پرائمری درجہ تک ہی اس کی تعلیم کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اس لیے ضروری اور بہت ضروری ہے کہ ہماری ابتدائی تعلیم کا نصاب ایسا مقرر کیا جائے کہ چار برس تک پڑھنے کے بعد لڑکا اپنی ضروریات

کے لیے کافی طور پر تعلیم پا جائے۔ ایک کلکٹر صاحب بہت صحیح لکھتے ہیں کہ "حلقہ بندی مدارس کے تقریباً تمام لڑکے مدرسہ چھوڑنے کے بعد ناخواندہ لڑکوں کی جماعت میں جا ملتے ہیں۔ تعلیم کا کوئی ظاہری اثر ان پر نہیں پایا جاتا۔ اور چونکہ ان کی تعلیم برائے نام ہوتی ہے وہ تھوڑے ہی دنوں میں سب کچھ بھلا بیٹھتے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ اپر پرائمری درجے کی تعلیم اگر وہ ذرا اور زیادہ وسیع کردی جائے تو کاشت کاروں کی ضروریات کے لیے کافی ہے۔ ریڈرین جو اس وقت مروج ہیں زبان کے لحاظ سے سب ناکارہ ہیں۔ ان کے پڑھنے سے لڑکے بجز معمولی بول چال کے نہ تو ہندی زبان جانتے ہیں اور نہ اردو، ان کی زبان کی اصلاح ہونی چاہیے تاکہ لڑکے رامائن تو سمجھ لیں۔ قاعدے کی کوئی ضرورت نہیں خارج کردینا چاہئے۔ جغرافیہ کی تعلیم کافی ہے۔ حساب میں بھی کچھ کسر نہیں، عملی سوالات کی مشق زیادہ ہونی چاہئے۔ ڈرائنگ فضول ہے، اس کے بجائے تندرستی کے متعلق ایک چھوٹی سی پرائمری ہونی چاہئے۔ اور قواعد زبان کے جگہ پر زراعت کے کچھ اصول سکھائے جانے چاہئیں۔ اس وقت خط و کتابت کا طریقہ نہیں سکھایا جاتا۔ یہ ایک بہت ضروری شے ہے، اس کا بھی کچھ انتظام ہونا چاہیے، اور تب ابتدائی تعلیم کا مسئلہ گویا حل ہوجائے گا۔ یہ خیال رہے کہ یہ سب کچھ صرف چار سالوں کا کورس ہے اور تاوقتیکہ مدرسین کی تعداد میں معقول اضافہ نہ کیا جائے یہ نتائج اتنی قلیل مدت میں نہیں حاصل ہوسکتے۔ مگر یہ بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اس کورس کو ختم کرنے کے لیے چار سال کی مدت ہرگز کم نہیں۔ ایک بڑا سبب تعلیم کے مطبوع عام نہ ہونے کا یہ ہے کہ لڑکے برسوں پڑھتے رہتے ہیں، اور کچھ نتیجہ نہیں نکلتا، اس کے لیے مدرسین کی کمی، کم لیاقتی اور نصاب تعلیم کی خامی تینوں جواب دہ ہیں۔

تیسری ضرورت تعلیم کے لیے مناسب مکان کی ہے، بالعموم مدرسوں کی عمارتی حالت نہایت افسوس ناک ہے۔ تحصیلی مدرسوں میں تو خیر کہیں کہیں پختہ مکانات بن گئے ہیں مگر لور پرائمری اور اپر پرائمری مدرسوں کی حالت بہت ردّی ہے۔ انھیں دیکھ کر مویشی خانہ یا محتاج خانہ کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ دیواریں بوسیدہ دروازے شکستہ حال، چھتیں گری ہوئی، فرش زمین کچی، یہاں بھی رشوت اور غبن کی گرم بازاری ہے۔ اگر

کسی تعمیر کے لیے ہزار روپے منظور ہوا ہے تو یہ یقینی بات ہے کہ کم از کم نصف رقم ضرور درمیانی منازل طے کرنے میں صرف ہوجائے گی۔ ذمہ دار افسروں میں حمیت کا مادہ ایسا سرد ہوگیا ہے کہ اس کار خیر کی امانت میں بھی خیانت کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ ایک تو بورڈوں کا افلاس اس پر منظور شدہ رقم کی یہ نوچ کھسوٹ، مدرسوں کی حالت کو نہایت ابتر بنائے ہوئے ہیں۔ بسا اوقات بورڈ کی جانب سے مدرسوں کے لیے عمارت بھی نہیں ہوتی۔ اگر گاؤں میں کوئی سمجھ دار آدمی ہوا تو اس نے اپنے دروازے پر یا تو کوئی جھوپڑا ڈلوا دیا، اپنے گئو شالے میں ایک ٹاٹ بچھانے کی جگہ دے دی۔ مدرس اور مدرسہ پر اتنا احسان کرکے وہ اپنی نگاہوں میں حاتم بن بیٹھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے جگہوں میں تعلیم کی طرف مطلق توجہ نہیں کی جاسکتی۔ زمیندار صاحب دروازہ پر آسامیوں کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور بہ آواز بلند فرماتے ہیں کہ ڈپٹی صاحب نے مجھ سے یہ سوال کیا تو میں نے یوں اظہار دیا۔ اور مدعا علیہ کے وکیل کو یوں لاجواب کردیا۔ حاضرین ہمہ تن گوش بنے ہوئے ان کی باتیں سن رہے ہیں، کیونکر ممکن ہے کہ لڑکے اس طرف مخاطب نہ ہوجائیں۔ لڑکوں میں دھیان جمانے کی قابلیت یوں بھی کم ہوتی ہے۔ اور جب توجہ ہٹانے کے لیے کوئی حیلہ ہاتھ آجائے تو پھر پوچھنا ہی کیا ہے۔ یہ تو ہوا ان مواضعات کا حال جہاں کے زمیندار صاحب ذرا فیاض دل ہیں۔ جن گاؤں میں ایسے آدمی نہیں ہیں وہاں کا حال ناگفتہ بہ ہے۔ مدرس پیڑ کے نیچے بیٹھ جاتا ہے اور اس کھلی ہوئی جگہ میں جاڑے کی سردی اور موسم گرما کی گرمی سب جھیل ڈالتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ مدرسہ اطراف میں مقبول نہیں ہونے پاتا اور تعلیم کی اشاعت میں حارج ہوتا ہے۔ تاوقتیکہ ہر ایک مدرسے کے لیے سرکاری عمارت نہ ہوجائے، طرز تعلیم کا سدھار بہت مشکل ہے، کیونکہ مدرس عوام کے روبرو ہنسی اور تمسخر کے خوف سے تعلیم کے بہترین طریقے پر عمل نہیں کرسکتا۔

ہماری تعلیم کا تو یہ حال ہے اور ہمارے پبلک کام کرنے والے ان مسئلوں کی طرف سے بالکل غافل بیٹھے ہوئے ہیں۔ کتنے ایسے اخبار نویس یا رزولیوشن پاس کرنے والے وکلا ہیں۔ جنھوں نے کسی ضلع میں دورہ کرکے یہ تحقیق کیا ہے کہ کتنے مدرسوں میں عمارت ہے اور کتنوں میں نہیں۔ ڈائرکٹر صاحب کی رپورٹ سے ظاہر نہیں ہوتا کہ

کتنے فیصدی مدارس سرکاری عمارت پر فخر کرسکتے ہیں۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر صاحبان جیسے لائق اور تعلیم یافتہ ہوتے ہیں ان سے یہ امید کرنا کہ ان مسئلوں پر وہ کچھ تحریک کرسکتے ہیں بالکل عبث ہے۔

''زمانہ'' مئی، جون ۱۹۰۹ء

زلیخا

فارسی دنیائے حسن و عشق میں زلیخا کو جو شہرت عام حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں اس کی زندگی حسن و عشق کی ایک بے نظیر اور دل آویز داستان ہے، ایک افسر تاج و تخت کے محل میں پیدا ہوئی، نازونعمت میں پرورش پائی، اور بہارعمر آتے ہی قید عشق میں مبتلا ہوگئی۔ پھر مدت العمر اس نے مصیبتیں جھیلیں، شہزادی سے فقیرن بنی، سب کچھ راہ عشق میں لٹا دیا، مگر باوجود متواتر ناکامیوں کے راہ الفت سے نہ ٹلی۔ اگرچہ بعض اوقات معشوق کی سرد مہری اور ابنائے زمانہ کی طعنہ زنیوں سے مجبور ہوکر اس نے اپنے معشوق پر سختیاں بھی روا رکھیں۔ مگر یہ بھی انتہائے محبت کا ایک جلوہ تھا۔ اس بسمل خنجر عشق کے نام کو فارسی کے زندہ جاوید شاعر جامی نے غیر فانی بنا دیا ہے، اس کے حسن کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہے۔

کف راحت دہ ہر محنت اندیش
نہادہ مرہم بر ہر دل ریش
میانش موے، بل کز موء نیمے
زباریکی برد از موے بیمے
سہی سروان ہوا داریش کردے
پریر ویان پرستاریش کردے

عین عنوان شباب میں عشق کی گھاتیں اس پر ہونے لگتی ہیں۔ مگر یہ عشق معشوق کے دیدار سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ ایک مافوق العادت طریقے پر وہ خواب راحت سے ہم آغوش تھی کہ یکایک

در آمد ناگہش از در جوانی
چہ میگویم جوانی نے کہ جانے

ہمایوں پیکرے از عالم نور
بباغ خلد کردہ غارت حور

اس جوان رعنا کو خواب میں دیکھتے ہی زلیخا پر اس کی رعنائی کا جادو چل گیا

گرفت از قامتش در دل خیالے
نشاند از دوستی در دل نہالے
زرویش آتشی در سینہ افروخت
وزان انس متاع صبر و دین سوخت

مگر یہ جلن یہ سوز اندرو خود برداشت کرتی ہے اور اصحاب سے حرف حکایت زبان پر نہیں لاتی۔ سکھیوں سہیلیوں سے ہنستی بولتی ہے۔ مگر راز دل کسی سے نہیں کہتی۔

نہان میداشت رازش در دل تنگ
چوکان لعل لعل اندرولے سنگ
فرد میخورو چوں غنچہ بدل خون
نمیداد از درون یک شمہ بیرون
نظر بر صورت اغیار میداشت
ولے پیوست دل بایار میداشت

کبھی کبھی جب اس جلن سے بے چین ہوجاتی ہے تو تصور یار سے یوں باتیں کرتی ہے۔

کہ اے پاکیزہ گوہر از چہ کانی
کہ از تو دارم ایں گوہر فشانی
نمیدانم کہ نامت از کہ پرسم
کجا آیم مقامت از کہ پرسم

مگر یہ راز عشق کب چھپتا ہے، زلیخا زبان سے کچھ نہیں کہتی۔ مگر اس کی خونبار آنکھیں اور زرد رخسارے آخر افشائے راز کر ہی دیتے ہیں۔ گل سرخ سا چہرہ لالہ زرد ہوجاتا ہے۔ سرد آہیں بھرتی ہیں، کنیزیں آپس میں سرگوشیاں کرنے لگتی ہیں۔ کوئی کہتی ہے آسیب ہے، کوئی کہتی ہے جادو ہے، ان کنیزوں میں زلیخا کی ایک دایہ بھی ہے۔

عشق کی داستانوں میں ایسی عورتیں اکثر آتی ہیں۔ مگر ان میں شاید ہی کسی کی تعریف ایسی خوبصورتی سے چند شعروں میں ادا کی گئی ہو۔

ازاں جملہ فسو نگر دایہ داشت
کہ از افسو نگری سرمایہ داشت
براہ عاشقی کار آزمودہ
گہے عاشق گہے معشوق بودہ
بہم وصلت وہ معشوق عاشق
موافق ساز یار ناموافق

یہ دایہ فسونگر ایک روز زلیخا سے یوں ہمدردانہ باتیں کرتی ہے۔

دگر رفتم طراز دوش بودے
چو خفتم خفتہ در آغوش بودے
چو بہ نشستی بخدمت ایستادم
چو خسپیدی بہ پایت سرنہادم
زمن راز دلت پنہاں چہ داری
نہ خود بیگانہ اہم زنیسان چہ داری

زلیخا دایہ مہربان سے رو رو کر اپنی رام کہانی کہہ سناتی ہے، مگر دایہ صاحب باوجودیکہ آسمان سے فرشتے اتار لانے کے تیار تھیں یہ قصہ سن کر بول اٹھتی ہیں۔

بلے حرف نقش ہر خیال است
کہ نادانستہ را جستن محال است

اس کے کچھ دنوں بعد زلیخا ایک روز بستر غم میں پڑی ہوئی اپنے دل سے فریاد کر رہی ہے کہ اسے دوبارہ جمال یار کا دیدار ہوتا ہے، وہ اسے خواب میں دیکھتے ہی اس کے قدموں پر گر پڑتی ہے۔ اور اپنی بیقراری کا اظہار کرنے لگتی ہے۔ اس کی بیقراری دیکھ کر معشوق، یا تصور معشوق یوں گویا ہوتا ہے۔

ترا از اگر بر سینہ داغ است
نہ پنداری کزان داغم فراغ است

مراہم دل بہ دام تست در بند
زداغ عشق تو ہستم نشانمند

تصور یار کی یہ دل سوزی زلیخا کی آتش عشق کو اور بھی بھڑکا دیتی ہے ۔ کچھ دنوں اور اسی کلفت میں گزرتے ہیں۔ اور تیسری بار پھر اسے معشوق کے جمال جہاں سوز کا نظارہ ہوتا ہے، نشو ونما عشق کی یہ نوعیت محبت کی داستانوں میں بالکل نرالی ہے۔ زلیخا پھر تصور یار کے پیروں پر گر پڑتی ہے اور ان الفاظ میں اس کے نظر التفات کی التجا کرتی ہے۔

نمیگویم کہ در چشمت عزیزم
نہ آخر مرترا کمتر کنیزم
چہ باشد گر کنیزے را نوازی
زبند محنتش آزاہ سازی

مگر دوسری بار کی طرح اس خیالی معشوق نے اب کی اس گریہ و زاری پر دلداری و درد مندی کا اظہار نہیں کیا بلکہ صرف یہ کہہ کر کہ

''عزیز مصرم و مصرم مقام است''

غائب ہوگیا۔ شاعر نے یہاں پر ٹھوکر کھائی ہے۔ جب عشق کی صورت بالکل الہامی اور وہبی ہے تو لازم تھا کہ تصور یار کا یہ پتہ صحیح ہوتا۔ مگر واقعات اس کے خلاف ہیں، کیونکہ حضرت یوسف عزیز مصر نہ تھے، تاہم زلیخا کو بہت تسکین ہوگئی۔ جب معشوق کانشان مل گیا تو اسے ڈھونڈ نکالنا کیا مشکل تھا۔ برائے چندے اس کی وحشت رفع ہوگئی۔

ادھر تو زلیخا فراق یار میں آشفتہ حال تھی۔ ادھر اس کے حسن و جمال کا شہرہ چار دانگ عالم میں پھیلا ہوا تھا۔

سران ملک را سودائے او بود
بہ بزم خسروان غوغا او بود
بہر وقت آمدے از شہر یارے
بہ امید وصالش خواست گارے

فرماں روایان ملک شام و روم و زنگ نے اپنے اپنے سفیر زلیخا کے باپ شاہ طیموس کی خدمت میں روانہ کیے۔ مگر عزیز مصر کی طرف سے کوئی پیغام نہ آیا۔ شاہ طیموس نے زلیخا کو اپنے رو برو بلایا اور پدرانہ شفقت سے پہلو میں بٹھا کر سب تاجداروں کے پیغام کا ذکر کیا۔ مگر جب عزیز مصر کا ذکر نہ آیا تو وہ مایوس ہوکر شاخ بید کی طرح کانپتی ہوئی اپنے گوشہ تنہائی میں آ بیٹھی۔ اور یوں گریہ و زاری کرنے لگی۔

مرا اے کاشکے مادر نمی زاد
و گر میزاد کس شیرم نی داد
کیم من از وجود من چہ خیزو؟
وزین بود نبود من چہ خیزو؟

ناچار شاہ طیموس نے اپنی طرف سے عزیز مصر کے پاس پیغام بھیجا۔ عزیز مصر فرط مسرت سے پھولا نہ سمایا۔ قصہ مختصر یہ کہ زلیخا بڑے تزک و احتشام سے مصر کی طرف چلی۔ حضرت جامی نے اس جلوس کے شان و شکوہ کا تذکرہ بہت تفصیل سے کیا ہے۔ اس فاقہ مستی اور ادبار کے زمانے میں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ زلیخا خوش خوش چلی جاتی تھی کہ اب عیش و کامرانی کے دن آئے۔

شب غم را سحر خواہد دمیدن
غم ہجران بسر خواہد رسیدن

مگر اسے کیا خبر تھی کہ فلک فسوں ساز اسے سبز باغ دکھا رہا ہے، عزیز مصر مایۂ تخت سے اس کے استقبال کے لیے آیا ہوا تھا، زلیخا نے خیمہ کے شگاف سے اسے دیکھا مگر جوں ہی

زلیخا کرد ازان خیمہ نگاہے
بر اور و ازدل غمدیدہ آہے
کہ واویلا عجب کاریم افتاد
بسر تا پائے دیواریم افتاد
نہ آنست آنکہ عقل و ہوش من برد
عنان دل بہ بے ہوشیم بسپرد

دریغا بخت سستم سستی آورد
طلوع اخترم بد بختی آورد

☆☆

منم آن بادیان کشتی شکستہ
برہنہ بر سر لوح نشستہ
رباید ہر زماں از جائے موجم
برو گہہ در حضیض گہہ در اوجم
زنا گہ زور ے آید پدیدار
شوم خرم کزو آساں بود کار
چو نزدیک من آید بے درنگے
بود بہرہلاک من نہنگے

اسی طرح پیچ و تاب کھاکر اس نے بہت دیر تک اشک حسرت بہایا اور بارگاہ خدا میں التجا کی کہ میری عزت و آبرو کا تو نگہبان ہے۔ خدا کی درگاہ میں اس کی دعا قبول ہوئی اور غیب سے ندا آئی

کہ اے بیچارہ روے خاک بردار
کزان مشکل ترا آسان بشود کار
عزیز مصر مقصود دولت نیست
ولے مقصود بے او حاصلت نیست
از و خواہی جمال دوست دیدن
وزو خواہی بمقصودت رسیدن
مباداز صحبت او ہیچ بیمت
کزو ماند سلامت فقل سیمت

اس ندائے غیب نے اس کے دل کو بہت تقویت بخشی۔ اب وہ عزیز مصر کی بیگم تھی اور عزیز وہاں کے رئیسوں کا سردار تھا۔ مال و دولت ، حشمت و جاہ، کنیز و غلام، غرض دنیا کی کمی نہ تھی۔ عیش و طرب کی محفلیں گرم رہتیں۔ مگر یہ تکلفات زلیخا کے

سوہان روح تھیں۔ اکثر راتوں کو سب سو جاتے تو وہ چرخ جفاکار سے شکوہ و شکایت کے دفتر کھول دیتی۔

چہ دانستم بہ وقت چارہ سازی
زخان و مان مرا آوارہ سازی
مرابس بود داغ بے نصیبی
فزوں کردی بران درد غریبی

اس کے سر پر تاج جواہر نگار زیب دیتا تھا۔ اس کی محل سرا رشک فردوس تھی۔ اور اس کا تخت مرصع تھا، مگر جب دل پر بارغم ہوتو ان ظاہری آرائشوں سے کیا سکھ!

اس طریق سے زلیخا نے عزیز مصر کے ساتھ عرصہ دراز تک عمر بسر کی۔ غالباً بعد کو اس کا راز نہفتہ عزیز مصر پر بھی روشن ہوگیا تھا۔ مگر زلیخا اسے چھپانے کی ہمیشہ کوشش کرتی رہی۔

لبش با خلق در گفتار می بود
و لے جان و دلش بایاری بود
بصورت بود بامردم نشستہ
بمعنے از ہمہ خاطر گستہ

اس عنوان سے جب دن گزر جاتا اور رات کی کالی بلا آجاتی تو وہ

خیال دوست را در خلوت راز
نشاندی تا سحر بر مسند ناز
بزانوے ادب بہ نشستیش پیش
بعرض او رسانیدی غم خویش

خدا جانے کتنے برسوں تک وہ اس سوز نہانی سے تفتہ جگر رہی۔ آخر اس کا عشق صادق دیکھ کر خدا وند کریم کو اس پر رحم آیا۔ زمانہ نیرنگ ساز نے چارہ سازی کی۔ حضرت یوسف کو ان کے بدخواہ بھائیوں نے مارے حسد کے کنوئیں میں ڈال دیا۔ یہ یوسف ہی تھے جن کے جمال جہاں آرا کا نظارہ زلیخا کو خواب میں ہوا تھا۔ حسن اتفاق سے چند تاجروں نے یوسف کو کنوئیں سے زندہ نکال لیا اور انھیں غلام بنا کر فروخت

کرنے کے لیے مصر میں لائے۔ جب یہاں پہنچے تو ان کے حسن و جمال کا شہرہ بوئے مشک کی طرح پھیلا۔ جو دیکھتا عش عش کرتا۔ شدہ شدہ شاہ مصر کے کانوں تک خبر پہنچی، اس نے عزیز مصر کو حکم دیا کہ جاکر اس غلام کو دیکھو۔ عزیز نے اسے دیکھا تو انگشت حیرت دانتوں تلے دبائی۔ اور آ کر بادشاہ سے غلام کے حسن کی بیحد تعریف کی۔

اسی اثنا میں زلیخا کو معمول سے زیادہ کرب اور بے چینی ہوئی۔ جب سے حضرت یوسف کنوئیں میں گرے تھے۔ زلیخا کو ان سے دلی لگاؤ ہونے کے باعث کسی پہلو چین نہ تھا۔ ایک روز وہ تفریح طبع کے لیے شہر کے قریب ایک جنگل میں گئی اور عیش کا بہت سامان لے گئی۔ مگر وہاں بھی اس کی طبیعت نہ لگی۔ محل سرا کی طرف واپس آ رہی تھی کہ راستے میں شاہی محل سرا کے مقابل ایک انبوہ کثیر جمع دیکھا۔ یوسف کی تعریف ہر کس و ناکس کی زبان پر تھی۔لوگ ان کے عشق میں دیوانہ ہو رہے تھے۔ زلیخا نے بھی اپنا ہاتھی ٹھہرایا۔ اور جوں ہی یوسف پر اس کی نگاہ پڑی اس کی نگاہوں سے ایک پردہ ساہٹ گیا اور بے اختیار دل سے ایک آہ سرد نکل آئی اور غشی کی حالت عارض ہوگئی۔ کنیزوں نے یہ حالت دیکھی تو ہاتھی کو تیزی سے خلوت گاہ میں لائیں۔ زلیخا کو جب ہوش آیا تو دایہ نے اس دیوانگی کا سبب پوچھا، زلیخا بولی۔

بہ گفت اے مہربان مادر چہ گویم
کہ گردد آفت من ہر چہ گویم
دراں مجمع غلامے را کہ دیدی
زاہل مصر وصف او شنیدی
ز عالم قبلہ گاہ جان من اوست
فدائش جان من جاناں من اوست
بہ تن در تپ بدل در تاب ازویم
زدیدہ غرق خون ناب ازدیم
زخان ومان مرا آوارہ او ساخت
درین بیچارگی آوارہ او ساخت

دایہ نے زلیخا کی تشفی کی۔ ادھر مصریوں نے یوسف کی خریداری میں اپنی

قدردانیوں کا ثبوت دینا شروع کیا جو آتا تھا مول بڑھاتا تھا۔ زلیخا کو بھی دم دم کی خبر ملتی تھی۔ اور وہ ہر مرتبہ قیمتوں کو دوگنا کردیتی تھی۔ یہاں تک کہ کوئی خریدار اس کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکا۔ مگر عزیز مصر کے پاس اتنی دولت نہ تھی جو کچھ دفینہ اور زر وجواہرات اس کے خزانے میں تھا وہ اس قیمت کا نصف بھی نہ تھا۔ عزیز مصر نے یہی حیلہ پیش کیا۔ لیکن

زلیخا داشت درجے پرز گوہر
نہ درجے بلکہ برجے پرز اختر
بہائے ہر گہر زان در مکنون
خراج مصر بودی بلکہ افزون

عزیز نے جب دیکھا کہ یہ حیلہ کارگر نہیں ہوا، تو کہنے لگا کہ شاہ مصر اس غلام کو اپنے غلاموں کا سر دفتر بنانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ میری خریداری انھیں ناگوار گزرے گی اس کا زلیخا نے یوں جواب دیا۔

"بہ گفتار و سوئے شاہ جہاندار
حق خدمت گزاری را بجا آر
بگو بردل جز این بندے ندارم
کہ پیش دیدہ فرزندے نداریم
سر افرازی مرا زین احترامم
کہ آید زیر فرمان این غلامم
ببر جم اخترے تابندہ باتد
مرا فرزند شہ رابندہ باشد"

آخر عزیز نے لاجواب ہوکر زلیخا کو خریداری کی اجازت دے دی۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ زلیخا یوسف کو اپنا فرزند بنانے کی جرأت کیوں کر کرسکی۔ دونوں ہم سن تھے۔ زلیخا نے خواب میں جو صورت دیکھی تھی، وہ بچہ یوسف کی نہ تھی بلکہ یوسف جوان رعنا کی، ہاں یہ ممکن ہے کہ یوسف پر درجۂ نبوت رکھنے کے باعث زمانے کا کچھ اثر نہ ہوا ہو۔ زلیخا گوہر مراد پاکر شاد کام ہوگئی اور پرائے چندے اس کی زندگی بڑے

لطف سے گزری۔ کہتی ہے۔

''چو بودم ماہی در ماتم آب
طپان بر ریگ تفتال از غم آب
در آمد سیلے از ابر کرامت
بدریا برد ازاں ریگم سلامت
کہ بودم گمرہے درظلمت شب
رسیدہ جان ز گمراہیم برلب
بر آمد از افق رخشندہ ماہے
بکوئے دولتم بنمود راہے

زلیخا کو اب بجز یوسف کی خدمت گزاری اور خاطر داری کے اور کوئی کام نہ تھا۔

چو تاج زر بفرقش نہادے
نہاران بوسہ اش بر فرق دادے
چو پیراہن کشیدے برتن او
شدے ہمراز با پیراہن او
کمر چون چست کردی برمیانش
گذشتے این تمنا بر زبانش
کہ گردستم کمر بودے چہ بودے
زوصلش بہر در بودی چہ بودے
مسلسل گیسوش چوں شانہ کردے
مداوائے دل دیوانہ کردے
غمش خوردی و غمخوارلیش کردے
بہ خاتونی پرستاریش کردے

مگر چونکہ یوسف پیغمبر تھے اور پیغمبروں کے لیے گلہ بانی مخصوص مشغلہ ہے۔ اس عیش و طرب میں ان کی دل بستگی نہ ہوئی۔ زلیخا نے ان کا عندیہ دیکھا تو از راہ رضاجوئی ان کے لیے گلہ بانی کے لوازمات مہیا کیے۔ ریشم کی رسیاں بنوائیں۔ جواہر

نگار عصا تیار کرایا، اور حضرت یوسف شبانی کرنے لگے۔ مگر عشق کی نیرنگیاں نرالی ہیں۔

امید کامرانی نیست در عشق
صفائے زندگی نیست در عشق
زلیخا بود یوسف را ندیده
بہ خوابے او خیالے آرمیده
بہ جز دیدارش ازہر جست جوئے
نمیدانست خد را آرزوے
چوشد از دیدن او بہر مندی
زویدن خواوست طبع او بلندی
زلعل او ببوسہ کام گیرد
زسروش باکنار آرام گیرد
بلے نظارگی کامد سوئے باغ
ز سوش گل چو لالہ سینہ برداغ
نخست از روپے گل دیدن شو و مست
زگل دیدن بہ گل چیدن بر دوست

جب تک زلیخا نے یوسف کو نہ دیکھا تھا صرف دیدار کی آرزو تھی۔ اب شوق وصال پیدا ہوا مگر

زلیخا بہریک دیدن ہمی سوخت
ولے یوسف زدیدن دیده میدوخت
زبیم فتنہ سوئے او نمیدید
بہ چشم فتنہ روئے او نمیدید

یوسف کی اس سرد مہری اور بے اعتنائی نے زلیخا کو پھر گرداب غم و الم میں ڈالا۔ مزاج میں وحشت ازسرنو عود کر آئی۔ اور طبیعت شانہ و سرمہ سے نفور ہونے لگی۔ مہربان دایہ نے از راہ درد مندی اس کاہش جانی کا سبب پوچھا۔ زلیخا نے اپنی داستان حسرت ویاس اس سے کہہ سنائی۔ اور اسے یوسف کے پاس پیغام وصال دے کر بھیجا۔ مگر ان

کا قدم راہ راست سے نہ ڈگا۔ فرمایا:

زلیخا را غلام زر خریدم
بسا ازوے عنایتہا کہ دیدم
گل و آبم عمارت کردۂ اوست
دل و جانم وفا پرورده اوست
اگر عمرے کنم نعمت شماری
نیارم کردن اور راحق گزاری
بفرزند عزیزم نام بردست
امین خانہ خویشم سپردست
نیم جز مرغ آب دانہ او
خیانت چوں کنم در خانہ او

جب دایہ کی فسوں سازی سے کچھ کام نہ چلا تو زلیخا خود صورت سوال نبی ہوئی یوسف کے پاس آئی اور نظر التفات کی داعی ہوئی، مگر یوسف نے اسے بھی پہلے کی طرح دانشمندی سے بھرا ہوا جواب دیا۔

خداوندی مجو از بندۂ خویش
بدین لطفم مکن شرمندہ خویش
کیم من تارا دمساز گردم
درین خوان باعزیز انباز گردم
بباید بادشہ آن بندہ را کشت
کہ زو بایک نمک دان بادے انگشت

یوسف کا جواب صاف اور اصلیت سے مملو تھا۔ شرم دار عورت کے ڈوب مرنے کے لیے اتنا اشارہ کافی تھا۔ مگر عشق نے زلیخا کو بالکل اندھا کردیا تھا۔ اس نے جب یوسف کو اخلاق کے پردے میں چھپتے دیکھا تو اس پردے کو ہٹانے کی فکر کرنی شروع کی۔ اس کے پاس ایک باغ تھا، اسے خوب آراستہ و پیراستہ کرکے متعدد گل اندام کنیزیں وہاں بھیجیں اور یوسف کو بھی سیر کرنے کے لیے بھیجا۔ کنیزوں سے تاکید کردی

کہ یوسف کو اپنے اوپر مائل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھنا اور یوسف کو یہ دوستانہ صلاح دی۔

اگر من پیش تو بر تو حرام
و زین معنی بغایت تلخ کام
"بسوئے ہر کہ خواہی کام بردار
زوصل ہر کہ خواہی کام بردار"

ان بندشوں کا ماحصل صرف یہ تھا کہ جب یوسف ان کنیزوں میں سے کسی کی طرف مخاطب ہوں تو زلیخا

نشاند خویش را پنہاں بہ جائش
خورد برا زنہال دلربائش

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زلیخا کی عشق شہوانیت کا دوسرا نام تھا۔ مگر اس کی کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی۔ یوسف نے ان کنیزوں کو کلمہ وحدت کا ایسا مزہ چکھایا کہ وہ شربت وصال کی آرزو سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ زلیخا جب وصل کی آرزو لیے وہاں پہنچی تو کنیزوں کو خدا کا سجدہ کرتے پایا۔ مایوس ہوکر وہاں سے واپس ہوئی اور دایہ سے رو رو کر اپنا درد دل سنانے لگی۔ دایہ نے سمجھایا کہ خدا کے فضل سے آپ بھی حسن و جمال میں یکتا ہیں۔ آپ اپنے عشوۂ و ناز سے یوسف کو رام کرسکتی ہیں۔ زلیخا نے جواب دیا یہ تو صحیح ہے۔ مگر وہ ظالم میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے تو۔ وہ تو میری طرف تاکتا ہی نہیں۔ نگاہیں چار ہوں تب تو مروت پیدا ہو۔

نہ تنہا آفتم زیبائی اوست
بلائے من زنا پردائی اوست

آخر جب تجربہ سے ثابت ہوگیا کہ ان چھوٹی چھوٹی چالوں سے کام نہ چلے گا تو دایہ نے ایک بڑی چال چلی۔ مال و دولت کی کمی تھی ہی نہیں۔ ایک بڑی عالیشان عمارت بنوائی گئی جس میں سات حصے تھے اور اس ہفت خانہ کو استاد زریں دست نے ایسا مرصع کیا کہ ہر ایک خانہ پہلے والے سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ اور ساتواں خانہ تو چرخ ہفتم کا نمونہ تھا۔ ہیرے و جواہرات مشک وعنبر اشجار گر انبار، غرض دنیا کی ساری

نعمتیں وہاں جلوہ افروز تھیں۔ اس کی ہوا دلوں پر نشہ پیدا کرتی تھی۔ اس کی آرائش بھی نرالی تھی۔

دراں خانہ مصور ساخت ہر جا
مثال یوسف و نقش زلیخا
بہم بہ نشستہ چوں معشوق و عاشق
زمہر جان و دل باہم موافق
بیک جا ایں لب آن بوسہ دادہ
بیک جا آن میاں این کشادہ

جب یہ ہفت خانہ بہمہ وجوہ سج گیا تو زلیخا نے اپنے تئیں بھی خوب دل کھول کر سجایا اور جاکر پہلے طبق میں بیٹھی۔ یوسف بھی بلائے گئے، انھیں دیکھتے ہی زلیخا بیقرار ہوگئی۔ صبر ہاتھ سے جاتا رہا، یوسف کا ہاتھ ایک انداز سے پکڑ کر ادھر ادھر کی سیر کرانے لگی۔ یہاں بجز عاشق و معشوق کے اور کوئی مخل ہونے والا تھا زلیخا بار بار عشق کی گرمی جتاتی تھی۔ مگر یوسف دین اور اخلاق کے دلیلوں سے اسے خاموش کردیتے تھے۔ سوال و جواب ملاحظہ ہو۔

یوسف

مرا از بند غم آزاد گرداں
بہ آزادی دلم را شاد گرداں
مرا خوش نیست کاینجا باتو باشم
پس ایں پردہ تنہا باتو باشم

زلیخا

تہی کردم خزائن در بیایت
متاع عقل و دین کردم فدایت
بہ آں نیت کہ در مانم تو باشی
رہین طوق فرمانم تو باشی

بگفتا در گنہ فرماں بری نیست

بہ عصیاں زیستن خدمت گری نیست

زلیخا ہر ایک خانہ سے نکلتے وقت اس کے دروازے پر قفل آہنی لگا دیتی تھی تاکہ یوسف بھاگ نہ جائیں۔ عشق نے اس کی عقل کو ایسا مغلوب کردیا تھا کہ وہ اس نتیجے کو جو دل کے لگاؤ ہی سے ممکن ہے جبراً حاصل کرنا چاہتی تھی۔ منزل ہفتم میں پہنچ کر زلیخا نے منت و سماجت کرتے کرتے گو یا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔ مگر یوسف کا دل نہ پسیجا۔ آخر جب اس کا اشتیاق حد اعتدال سے بڑھا تو یوسف نے یوں اس کی تسکین کی کہ عجلت سے نقصان ہوگا۔ زلیخا یوں جواب دیتی ہے۔

زشوقم جان رسیدہ بر لب امروز

نیارم صبر کردن تا شب امروز

کے آں طاقت مرا آید پدیدار

کہ با وقت و گرا اندازم این کار

زلیخا اشتیاق وصال کے نشہ میں متوالی ہو رہی ہے۔ اور جب یوسف کہتے ہیں کہ اس میں دو امور میرے مانع ہیں ایک تو خوف خدا، اور دوسرے خوف عزیز مصر تو وہ ان دونوں امور کے دفعیہ کی تدبیر بتلاتی ہے۔ یعنی عزیز مصر کو

دہم جامے کہ جابانش ستیزد

زمستی تا قیامت بر نہ خیزد

اور خدا سے عفو گناہ کے لیے اپنا سارا خزانہ غرباء و فقراء کو تقسیم کردوں گی۔ اس پر یوسف فرماتے ہیں کہ نہ تو میرا خدا رشوت خوار ہے اور نہ میں ایسا احسان فراموش ہوں کہ اپنے ہی آقا کو قتل کرنے کی صلاح دوں۔ آخر جب زلیخا کی ایک بھی نہ چلی تو اس نے ایک تیغ براں ہاتھ میں لے کر خودکشی پر آمادہ ہوئی۔

چو یوسف آن بدیدار جائے برجست

چو زریں مار بگرفتش سر دست

کزین تندی بیارام اے زلیخا

و زین روبازکش کام اے زلیخا

زلیخا نے جب یوسف کو ذرا نرم ہوتے دیکھا تو ان کی گردن میں ہاتھ ڈال کر لپٹ گئی اور ایسی پیش قدمیاں کرنے لگی جو ایک دو شیزہ کے لیے شایاں نہیں۔ شاید اس موقع پر حضرت یوسف بھی باوجود درجہ نبوت رکھنے کے جادۂ راستی سے ڈگمگا گئے تھے۔ مگر اسی خلوت کی حالت میں ان کی نگاہ ایک زرنگار پردے پر پڑی جو سامنے لگا ہوا تھا۔ زلیخا سے پوچھا یہ پردہ کیوں پڑا ہوا ہے۔ بولی اس کے اندر میرا معبود ہے میں نے اس کے اوپر پردہ ڈال دیا ہے کہ اس کی نگاہ مجھ پر نہ پڑسکے۔ زلیخا کا اتنا کہنا قہر ہوگیا، یوسف بولے تو ایک پتھر کی مورت کا اتنا پاس کرتی ہے اور میں اپنے حاضر و ناظر خدا سے ذرا بھی خوف نہ کھاؤں۔ یہ کہہ کر فوراً وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر کی طرف چلے۔ خدا کی قدرت بھی کچھ ایسی ہوئی کہ ہر دروازے پر پہنچتے ہی قفل آہنی خود بخود کھلتے گئے۔ زلیخا نے جب یوسف کو راہ فرار اختیار کرتے دیکھا تو جھلاکر۔

پئے باز آمدن دامن کشیدش
زسوئے پشت پیراہن بریدش
بردن رفت از کف آن غم رسیدہ
بسان غنچہ پیراہن دردیدہ

یوسف اس ہفت خانہ سے نکل ہی رہے تھے کہ عزیز مصر آتے دکھائی دیے۔ انھوں نے یوسف کا ہاتھ فرط شفقت سے پکڑ لیا اور پھر مکان میں داخل ہوئے۔ زلیخا نے جب یوسف کو عزیز کے ساتھ دیکھا تو سمجھی اس نے میری شکایت کی ہے۔ فوراً تریا چرتر کھیلی۔ بولی کہ آج میں اس کمرے میں سوتی تھی تو یہ غلام جسے میں نے اپنی فرزندی میں لیا ہے دبے پاؤں میری خواب گاہ میں آیا اور میری چادر عصمت چاک کیا چاہتا تھا۔ اتنے میں میں جاگ پڑی اور یہ بھاگ نکلا۔ عزیز نے یہ داستان سنی تو یوسف کی خوب لعن طعن کی کہ میں نے تجھے بیٹے کی طرح پالا پوسا۔ اور تو ایسا خبیث النفس نکلا تب یوسف نے مجبور ہوکر سارا کچا چٹھا کہہ سنایا۔ مگر زلیخا کی گریہ و زاری نے عزیز کو پگھلا دیا۔ اور حضرت یوسف قید خانے میں داخل ہوئے۔ یہاں درگاہ خدا میں ان کی فریاد یہاں تک مقبول ہوئی کہ زلیخا کی پیش خدمتوں میں سے ایک کے شیر خوار بچے نے یوسف کی بے گناہی کا اعتراف کیا۔ عزیز مصر کو اب شک کی کوئی گنجائش باقی

نہ رہی۔ اس نے یوسف کو رہا کردیا اور زلیخا معتوب ہوئی۔

مگر جب یہ قصہ عام ہوگیا اور لوگ زلیخا کو مطعون کرنے لگے تو اس نے اپنے شوہر سے کہا میں اس غلام کے پیچھے بدنام ہو رہی ہوں، آپ اسے میری نظروں سے دور کردیجیے۔ چنانچہ عزیز نے یوسف کو دوبارہ قید کیا۔ مگر

چہ مشکل زان تبر بر عاشق زار
کہ بے دلدار بیند جاء دلدار
چو خالی دید از گل گلشن خویش
چو غنچہ چاک رو پیراہن خویش

اپنے کرتوت پر دست افسوس ملنے لگی

کہ این کارے کہ من کردم کہ کرداست؟
چنیں زہرے کہ من خوردم کہ خورد است؟
زغم کوہ بہ پشت خویش بستم
بزیر کوہ پشت خود شکستم

جب فراق یار کا صدمہ برداشت نہ ہوسکتا تو چھپ کر دایہ کے ساتھ قید خانہ میں جاتی اور یوسف کو دیکھ آتی۔ ادھر یوسف نے جیل خانے میں خوابوں کی تعبیر کہنے میں شہرت حاصل کی۔ خواب سنتے ہی اس کی سچی تعبیر کردیتے۔ انھیں دنوں بادشاہ مصر نے خواب دیکھا تھا کہ میرے مکان میں پہلے سات فربہ گائیں آئیں۔ ان کے بعد سات لاغر گائیں آئیں۔ اور ان فربہ گایوں کو گندم خشک کی طرح کھا گئیں۔ اس خواب کی تعبیر کسی سے نہ ہوئی تھی۔ یوسف کی تعبیر گوئی کی شہرت بادشاہ تک پہنچ چکی تھی۔ بادشاہ نے اسے دربار میں طلب کیا۔ اور یوسف نے تعبیر کی کہ پہلے مصر میں سات برسوں تک خوب فصل پیدا ہوگی۔ لوگ فارغ البال رہیں گے اس کے بعد سات سال قحط اور گرانی کے آئیں گے۔ اور اس زمانے میں رعایا کو سخت تکلیف کا سامنا ہوگا۔ بادشاہ اس تعبیر سے بہت خوش ہوا، اور اسی وقت سے یوسف اس کے منظور نظر ہوگئے۔ عزت اور رتبہ بڑھنے لگا مگر جوں جوں ان کا رتبہ بڑھتا گیا عزیز مصر کا رتبہ کم ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اسی غم میں وہ راہی عدم ہوگیا۔

عزیز مصر کے مرتے ہی زلیخا کے بھی برے دن آئے۔ آخر یہ حالت ہوگئی کہ یوسف کے گزرگاہ پر ایک چھوٹی سی منڈیا بناکر

بہ حسرت بر سر راہش نشستے
خروشان برگزرگاہش نشستے

لڑکے آتے، اسے چھیڑتے، عشق نے دیوانگی کا درجہ اختیار کرلیا، کیسی حسرت ناک تصویر ہے۔ وہی محلوں والی زلیخا ہے جو آج اس حالت کو پہنچی ہے۔

جب اس حالت دیوانگی میں عرصہ گزر گیا تو ایک روز یاس و ناکامی سے جھلا کر زلیخا نے اپنے معبود کو چور چور کر ڈالا۔ اور اسی عالم خود رفتگی میں حضرت یوسف کے پاس پہنچی۔ یوسف نے متحیر ہوکر نام و نشان پوچھا۔ زلیخا کو پہچان نہ سکے بولی۔

بہ گفت آنم کہ چوں روے تو دیدم
ترا از جملہ عالم گر گزیدم
فشاندم گنج و گوہر در بہایت
دل و جان وقف کردم در ہوایت
جوانی در غمت برباد دادم
برین روزے کہ می بینی فتادم

یہ سن کر یوسف کو بہت قلق ہوا۔ آبدیدہ ہوگئے، قصہ مختصر یہ کہ ان کی دعاؤں نے زلیخا کو دوبارہ حسن شباب عطا کیا، اور تب خدا کی اجازت سے انھوں نے زلیخا سے نکاح کرلیا۔

یہ ہے زلیخا کا مشہو ر ومعروف قصہ۔ زلیخا کسی معنی میں اخلاق کا نمونہ نہیں کہی جاسکتی۔ اس کے عشق کا معیار بہت ہی ادنیٰ ہے۔ وہ ایک پرزور جذبات اور خیالات کی عورت ہے، اورنفس پر ایمان اور سب کچھ قربان کرسکتی ہے۔ جن حالات میں جو کچھ اس نے کیا وہی ہر ایک معمولی عورت کرے گی۔ اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ زلیخا ایک حد تک واقعیت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ حضرت جامی کا غالبًا یہ منشا ہوگا کہ اس کی کمزوریاں دکھا کر یوسف کے فضائل کی وقعت بڑھائیں اور اس ارادے میں وہ بیشک کامیاب ہوئے ہیں۔

''زمانہ'' اگست ۱۹۰۹ء

جون آف آرک

جن لوگوں نے فرقہ اناث کو فضول و ناکارہ عنصر خیال کر رکھا ہے وہ در حقیقت سخت غلطی پر ہیں۔ کوئی زمانہ ایسا تھا جس وقت انھوں نے اپنی عظمت و فضیلت کا سکہ عوام الناس کے دلوں پر نہ جمایا ہو، تاریخ شاہد ہے کہ میدان جنگ میں بھی انھوں نے شجاعت و دلیری کے وہ وہ حیرت انگیز سین پیش کیے ہیں جن کو پڑھ کر اور سن کر آج خلقت دنگ و ششدر رہ جاتی ہے۔ یہ اوصاف حمیدہ واطوار پسندیدہ کی مجسم دیویاں جس وقت علم و ہنر فضل و کمال کی طرف رخ کرتی ہیں تو لیلاوَتی سے لاینحل معمے پیش نظر آجاتے ہیں اور اگر وہ تیر و تبر سے آراستہ ہوکر غنیم کے مقابل میدان میں آتی ہیں تو صف کی صف اور پرے کے پرے صاف کرتی چلی جاتی ہیں۔ وہ مردوں سے کسی بات میں کم نہیں۔ ان کا سچا جوش، حب الوطنی، خود داری، صداقت ہمدردی اور دیگر اوصاف قابل پرستش ہیں۔ تمام ہندوستان اور خصوصاً راجپوتانہ میں ان سے ایسے واقعات پیش آئے ہیں جن سے پتہ لگتا ہے کہ ان ہندوستانی دیویوں نے اپنے وطن اور اپنی عصمت و عفت پر جانیں قربان کردی ہیں اور جل کر خاک ہوگئی ہیں۔ لیکن اپنے دھرم اور جنم بھومی پر مرتے دم تک آنچ نہ آنے دی۔ اہلیا بائی، رانی پدمنی، رضیہ بیگم، چاند بی بی، نور جہاں، اور متعدد مثالیں ان شہیدان قوم کی ملیں گی۔ جن کے نام صفحہ ہستی پر چاند سورج کی طرح ٹپکا کریں گے۔ انھیں دیویوں کے قدوم میمنت لزوم کی برکت تھی جس سے ہمارا ہندوستان جنت نشان ہو رہا تھا۔ آج ہمارے قومی تنزل کا بڑا باعث یہی ہے کہ ہم نے ان کو اپنا غلام بنا کر ان کو اپنے پاؤں کی جوتی سمجھ کر اور دماغی کمالات میں اپنے سے کم خیال کرکے علم وہنر کے خزانے سے بے بہرہ کردیا ہے۔ تعلیم کا دروازہ ان پر بند کردیا۔ نتیجہ یہ ہے جو آج ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ کسی ملک کی ترقی و سرسبزی کا انحصار اس کے ان نوعمر بچوں پر ہے جن کو مرد نہیں

بلکہ ماتائیں بناتی ہیں۔ ہم نے ان کو پردے اور غفلت میں رکھ کر آزادی کی جھلک اور زمانے کی روشنی کی شعاؤں سے محروم کردیا۔ وہ جسماً و دماغاً نحیف وکمزور ہوتی گئیں اور وہی کمزوری، ناطاقتی، بے علمی اور جہالت ہماری وراثت میں آئی۔ ماتائیں ہی ہم کو جوانمرد اور اعلیٰ انسان بنایا کرتی ہیں اور آئندہ کی بہتری اور برتری کی بنیاد ان کی گود میں رکھی جاتی ہے۔ قومی عمارت کے معمار ماتاؤں کی دلیری ان کی ہمت اور ثابت قدمی ہی سے مسالے حاصل کرتے ہیں۔ جہاں کے گذشتہ و موجودہ موجد ومخترع، عالم و فاضل، علیم وفہیم، حکیم و دانشمند ماتاؤں کے اوصاف حسنہ کا گلدستہ ہیں۔ یہ اوصاف ماتائیں اپنے بچوں میں عالم طفلی ہی میں کوٹ کوٹ کر بھردیتی ہیں جو آئندہ قوم میں نوع انسان پر جان قربان کرنا بازیچۂ اطفال سمجھتے ہیں۔ اب گزشتہ عظمت پر ہمارا ناز کرنا گو ریت کے بلند ٹیلے پر کھڑا ہونا ہے جس کا ایک دم کا بھی اعتبار نہیں کہ کس وقت وہ بادِ مخالف سے ٹکرا کر پاش پاش ہوجائے اور پریشان و پراگندہ ہوکر گر پڑے۔ روس، جاپان، انگلستان، فرانس اٹلی غرض کسی سلطنت کو لیجیے اس ملک کی ظفر مندی، ترقی، فارغ البالی، آزادی اور اس کے انتظام و استحکام کی تہہ میں آپ کو اس ملک کی عالی حوصلہ عورتیں نظر آئیں گی۔ آج میں آپ کو فرانس کے ایک کم بضاعت مگر شریف خاندان کی لڑکی کا حال سناتا ہوں جس نے حب الوطنی کے جام سے سرشار ہوکر کس طرح اپنے پیارے ملک کی خاطر، اپنے آپ کو مصائب و خطرات کی جلتی ہوئی آگ میں جھونک دیا اور اس کی نذر ہوگئی۔ دنیا میں ایسے قدسی صفات نفوس جو دوسروں کی منفعت کی خاطر جان ومال کی پروا نہ کریں بہت ہی کم ہیں۔ ہاں اپنی نجات کے طالب شہرت کے خواہاں، اپنی بزرگی و خیر خواہی کے دلدادہ آپ کو بہت سے ملیں گے۔ لیکن دوسروں کی بلا کسی غرض اور مقصد کے خدمت کرنے والے قوم کے سچے بہی خواہ جاں نثار خال خال نظر آئیں گے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ان کو اس امر سے آگاہ کیا جائے کہ خدمت خلق ہی وصل خدا ہے تو دوزخ کے خوفناک و جان گداز نظارے بہشت کی راحت جاودانی اور نشاط کامرانی سے بدل جائیں۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ ؎

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں تبوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

☆

ملول از ہمرہان بودن طریق کار رائی نیست
بکش دشواری منزل بیاد عہد آسانی

آج قومیں اسی سوال کے حل کرنے میں مشغول ہیں کہ عورتوں کی موجودہ حالت قابل غور ہے۔ امریکہ کے پریسیڈنٹ روزولٹ نے اپنی تقریر کے دوران میں ایک جگہ کہا کہ ''عورتیں ہی ملک کی جائداد ہیں ان کی بہتری قوم کی بہتری ہے اگر وہ کمزور ہیں تو قوم کمزور ہے'' آج مدبران ملک اس عقدے کے واکرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

جس وقت فرانس و انگلستان اس صد سالہ جنگ میں مصروف تھے جو ایدورڈ سویم کے عہد میں ۱۳۲۸ء میں شروع ہوئی اور جس کا خاتمہ ۱۴۵۲ء میں ہنری ششم کے عہد میں ہوا تو یاوری اقبال و بلندی طالع سے اس وقت انگریز آئے دن شہر پر شہر فتح کرتے جاتے اور بڑے بڑے صوبوں اور شہروں پر قابض ہوچکے تھے۔ تمام بندرگاہیں اور قلعے ان کے ہاتھ میں آگئے تھے پورٹسمتھ، کریسی کے لیے پوسٹرز، پیرس، رون پاسٹس، سب انگریزوں کی ریاست میں شامل ہوچکے تھے۔ دوسرے لفظوں میں گویا وہ تمام فرانس کے ملک بن گئے تھے۔ اہل فرانس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ آئے دن کی شکستوں سے پریشان ہو رہے تھے۔ ہر لڑائی میں زک پر زک نصیب ہو رہی تھی۔ انگلستان کا عروج و اقتدار پایہ شہرت کو پہنچ گیا تھا۔ ان کا خوف دلوں پر طاری ہو رہا تھا۔ تمام یوروپ کی نظریں اس وقت اہل انگلستان پر لگی ہوئی تھیں۔ لیکن فتح کے ساتھ شکست گل میں خار کی طرح پیوستہ و نہفتہ ہوتی ہے کیونکہ ہر کمال کے بعد زوال لازمی ہے۔ جب فتح پر فتح کرتے ہوئے انھوں نے پانچ سال کے اندر قریب قریب تمام فرانس تسخیر کرلیا اور جب اورلینز کے محاصرے میں کامیاب ہونے ہی کو تھے کہ یکایک وہ حیرت انگیز واقعہ پیش آیا جو دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ جب فرانس کی ایسی نازک حالت تھی اور لوگ مصائب و تکلیفات کا مقابلہ کرتے کرتے تنگ آکر آخر کار مایوس ہوچکے تھے اور ملک غیر کے حملہ آوروں کی متواتر یورشوں سے تباہ و برباد ہوچکا تھا ملک سے امن و عافیت رخصت ہوچکے تھے۔ اس وقت جون آف آرک ایک فرشتے کی طرح نازل ہوئی جس کو ایشور نے فرانس کی نازک حالت پر رحم کھاکراس

کے بچاؤ اور مدد کے واسطے بھیجا تھا۔ وہ ڈوم ریمی واقع لورین کے ایک دیہاتی مزدور کی لڑکی تھی اس کے والدین بہت غریب تھے۔ اور جھوپڑے میں رہتے اور محنت و مشقت سے اپنا پیٹ پالا کرتے تھے۔ جون آف آرک اپنے خانگی کاموں اور سینے پرونے سے فارغ ہوکر کھیتوں میں بھیڑیں اور دیگرمویشی چرایا کرتی تھی۔ اس وقت انگریزوں کا خوف گھر گھر غالب تھا۔ لوگ اپنے جان و مال کی حفاظت مشکل سے کرسکتے تھے۔ پرانی پیشین گوئیاں ہر شخص کی زبان پر تھیں۔وہ زمانہ نحوست و بدبختی کا زمانہ خیال کیاجاتا ہے۔ برنس نامے ایک فرانسیسی شاعر نے پیشین گوئی کی تھی کہ لورین کے مالوت کے جنگلوں میں ایک لڑکی پیدا ہوگی اور خوش قسمتی سے بالوت کے جنگل ڈوم ریمی کی پہاڑیوں ہی میں تھے لوگ اکثر کہاکرتے تھے کہ ''فرانس جس کو ایک عورت[1] نے اپنے ہاتھ سے کھویا ہے ایک لڑکی کی بدولت آزاد ہوگا۔'' اور یہ بھی مشہور تھا کہ لورین کی دلولوں کی ایک لڑکی فرانس کو آزادی کی روشنی بخشے گی۔ ان کہاوتوں اور افسانوں نے اس سیزدہ سالہ لڑکی کے نرم دل پر غضب کا اثر کیا ایک روز اس نے یہ خواب دیکھا کہ فرشتہ مقرب جبرئیل اس کو دھرم آتما، دیندار، فدائی قوم اور پارسا بننے کی نصیحت کر رہے ہیں اس کے بعد سینٹ کیتھیرائین اور مارگریٹ نمودار ہوئیں اور اس کو اپدیش دے کر غائب ہوگئیں، روحی نازل ہونے اور دیگر عام تذکروں کے باوجود جب اس نے فرانس کی ایسی پست اور ردی حالت دیکھی کہ اس کا پیاراملک فاتح حملہ آروں کی یورشوں سے تباہ ہوچکا ہے ، لوگوں کی ہمتیں ٹوٹ گئی ہیں اور حوصلے پست ہوگئے ہیں ہر کس وناکس اپنی کمزوری اور مفلسی کے ہاتھوں گریاں و نالاں ہے۔ غنیم سے تاب مقاومت لانا آسان کام نہ تھا تب ملک کی حکومت اور نقصان و خرابی سے آگاہ ہوکر وہ غریق رنج وغم و کشتہ تیغ ستم کانپ گئی اور دوسری طرف جب اس نے اپنی بے کسی و بے سروسامانی پر غور کیا تو بے اختیار آنسو بھر لائی اور کہنے لگی۔

کیا ہاتھ اٹھاؤں بہر دعا سوئے آسماں
جو آئے جو کبھی وہ مری آرزو نہیں

لیکن پھر اس نے اپنے مغموم دل کو ڈھارس دی اور ایک برقی لہر سی اس کے

---

[1] مراد ملکہ اسبیلا سے ہے۔

بدن سے گزر گئی۔ قومی آزادی کا نام سن کر اس کا خون جوش مارنے لگا اس نے قومی غلامی کے ننگ کو محسوس کیا اس کا دل بھر آیا اور اس راز مخفی اور آواز غیبی کی یاد نے اس کے مجروح دل پر نشتر کا کام کیا۔ وہ بیراگن غریق حب وطن ایک سچے سنیاسی کی طرح ایک درخت کے نیچے اپنے پرم پتا کی گود میں بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھایا اور بائیں میں تلوار لی اور بڑے عجز و نیاز سے دست بدعا ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپ ٹپ ٹپک رہے تھے۔ اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل رہے تھے کہ اے حاضر و ناظر خالق مطلق، اے مالک دوجہاں و عالم الغیب میرے ملک کی حالت پر رحم کر۔ میرے پیارے ہم وطنوں کو موجودہ تباہی اور بربادی سے رہائی دے، مجھے طاقت دے کہ میں دیش کی سیوا کرسکوں۔ مجھ میں دیش بھکتی اور وطن پرستی کی قوت عطا فرما۔ اپنے مادری ملک سے الفت کرنے کی ہمت دے۔ میرے بھائیوں کو غیر ملک کی حکومت سے بچا۔ جبر و ستم ، جور و ظلم کامقابلہ کرنے کا حوصلہ دے۔ میرا جسم ملک کی جان و مال پر قربان ہے، اے پرم پتا میری اس عاجزانہ پرارتھنا و آرزو کو پورا کر۔ اس کی دعا بارگاہ الٰہی میں مقبول ہوئی اور جب اس نے یہ آواز سنی تو اس کا افسردہ دل گلاب کے پھول کس طرح کھل گیا۔ اس کے وجود میں وہ مقناطیسی قوت جذب ہوگئی جو بعد میں اس کی زندگی کا جزو اعظم ثابت ہوئی۔ کہتے ہیں اس کے کلام میں غضب کا اثر تھا اور اس کی موجودگی انسان میں ایک تروتازگی اور زندہ دلی کی روح پھونکتی تھی۔ اس کے چہرے سے وہ شرافت اور رعب و داب ٹپکتا تھا جو انسانوں کے دلوں کو مسخر کرلیتا ہے۔ اس دعا سے اس کے دل کو تقویت حاصل ہوئی۔ اس نے تلوار ہاتھ میں سنبھالی اس کو چوما اور آسمان کی طرف دیکھ کر عہد کیا کہ میں آج سے اپنے جسم و جان کو وطن کی نذر کرتی ہوں۔ ایک مصور نے جون کی اس طرح تصویر کھینچی ہے جس میں وہ یہ کہتی ہوئی دکھائی دیتی ہے کہ جب تلوار ہاتھ میں ہے تو فرانس کا چھڑانا اور آزاد کرنا کتنی بڑی بات ہے۔ اس کے بعد وہ گاؤں کے پادریوں اور لوگوں کے کہنے کے خلاف کپتان کے پاس گئی اور اس سے کہا کہ مجھے کیمپ میں لے چلو وہ وانکولیور میں گئی پھر چنیان میں اور اپنے مشن کو بیان کیا کہ میں ایک جاہل لڑکی ہوں، لیکن آسمانی باپ نے مجھے حکم دیا ہے کہ آرکنیز کو

انگریزوں کے ہاتھ سے بچاؤں اور شاہ فرانس کو تخت پر بٹھاؤں۔ مجھ کو ''نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پروا'' نہ دشمن کا خوف نہ غنیم کا ڈر، میں صرف مشیت ربانی اور حکم یزدانی کے پورا کرنے کو آئی ہوں۔ الحمیس کے لاٹ پادری نے ان الہام و انکشاف کے تذکروں کا حال سن کر شاہ چارلس کو نصیحت کی کہ وہ اس وقت اس کی مدد سے فائدہ اٹھائے۔ شاہ فرانس نے جس کی مایوسی امید سے بدل گئی اس موقع کو غنیمت جان کر اس کو اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کی اجازت دے دی۔ پھر وہ جان سے ہاتھ دھو، سپہ سالار بن، گھوڑے پر سوار ہو، زرہ بکتر پہن، سر پر خود رکھ کے، فرانس کا شاہی جھنڈا ہاتھ میں لے، لڑائی کے میدان میں موت کی ہنسی اڑانے کو کود پڑی۔ وہ دشمن کی فوج میں دس ہزار مسلح جوانوں کے ساتھ اس طرح جھپٹی جس طرح کوئی شہباز اپنے شکار پر بے اختیار گرتا ہے۔ گو اس معرکہ میں اس کے زخم شدید پہنچے لیکن اس نے آرلینز کا محاصرہ اٹھوا دیا۔ انگریز خوف زدہ ہوگئے، فرانسیسیوں نے اس کو رحمت کا فرشتہ خیال کیا۔وہ فرانسیسی جرنیلوں کی پروا نہ کرکے جو سوائے پر لڑنا پسند کرتے تھے۔ فتح و نصرت کے شادیانے بجاتی مبارک سلامت کی صدائیں سنتی۔ ۱۴/جولائی ۱۴۲۹ء کو ریمس میں داخل ہوئی اور جو سامنے آتا گیا فتح کرتی گئی۔ اور وہاں پہنچ کر دوسرے دن ۱۷/جولائی کو اس نے بڑے گرجے میں چارلس شاہ فرانس کی تاج پوشی کی رسم ادا کی۔

اس کے بعد پیرس و کمپیگن کے محاصرے ہوتے رہے جہاں اس کی جان نثار و سرگرم فوج نے عظیم الشان کارہائے نمایاں کیے۔ لیکن آخری شہر کی حفاظت کے وقت وہ ڈیوک آف برگنڈی کے ہاتھ سے گرفتار ہوگئی۔ جس نے اس کو قید کرلیا اور بعد میں انگریزوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ اس وقت کا نظارہ جب اسے میدان جنگ سے قید خانے میں لے گئے ہیں نہایت ہی رقت آمیز ہے۔ سخت امتحان کاموقع تھا اور وہ گرفتار اجل زبان حال سے یوں پکارپکار کر کہہ رہی تھی کہ وطن کی محبت میں جو کچھ بھی اس سر پر گزرے کم ہے۔

''پھر کھلا در عدالت ناز'' ۳/جنوری ۱۴۳۱ء کو اس کو حکام عدالت کے سپرد کیا گیا جہاں چھ روز تک اس کی روبکاری ہوتی رہی۔ ۲۴/مارچ کو اس پر کافر و ساحرہ کا فتویٰ لگایا گیا اور ۳۰/مئی ۱۴۳۱ء کو مقام اون میں وہ جادو گرنی کی حیثیت سے زندہ جلتے

شعلوں کے حوالے کردی گئی۔ اور وہ پاک روح ان جھوٹے دوستوں سے جو محبت کا دم بھرتے تھے اور ان بے رحم و قاتل دشمنوں سے جو ظالمانہ سلوک روا رکھتے تھے ہمیشہ کے لیے اس جگہ پر واز کرگئی جہاں شریر النفس انسان کی برائی اور دغابازی کچھ کام نہیں دیتی۔ اور جہاں تھکے ماندوں کو ابدی راحت و آرام نصیب ہوتا ہے۔ نتیجہ بالآخر ایک شرم کی کہانی ہی۔ اہل فرانس کے واسطے جن کے بچانے کے لیے اس نے جام شہادت خوشی خوشی پیا اور جنھوں نے اپنے نجات دہندہ کے بچانے کی ذرا کوشش نہ کی۔ اور انگریزوں کے لیے جو اس کی بہادری پر حیران تھے اور اس کی شجاعت کالوہا مان چکے تھے، مگر جنھوں نے اپنے دشمن کے نیک اوصاف کی قدر نہ کی۔

لڑائی پھر بھی جاری رہی لیکن اس کے بعد انگریزوں کے قدم ایسے اکھڑے کہ پھر نہ جمے۔ کامیابی کی امید منقطع ہوگئی کیوں کہ ڈیوک آف برگنڈی شاہ فرانس کی طرف مل گیا۔ اس کے بعد طرفین میں صلح ہوگئی۔ لیکن چارلس ہشتم نے پھر نارمنڈی کو فتح کرلیا اور چار سال کے اندر ہی اندر وہ گائن اور بوڑدو کامالک بن گیا۔ اور اسی طرح ۱۴۵۳ء میں صد سالہ جنگ کا خاتمہ ہوا، لیکن اس وقت صرف ایک شہر کیلیے انگریزوں کے قبضے میں باقی رہ گیا تھا۔

جون کے چال چلن میں بہادری، مردانگی ، دلیری، برقی طاقت ، پارسائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جسمانی و دماغی لحاظ سے وہ نہایت ہی تندرست و مضبوط تھی جیسا کہ اس کی شکل و صورت سے نور برستا تھا ویسا ہی اس کے جسم سے جاہ و جلال ٹپکتا تھا۔ ایک نقاش نے جون کی اس طرح سے تصویر کھینچی ہے جس سے اس کی روحانیت دینداری خوبصورتی سادگی اور دیگر اوصاف، صاف صاف عیاں ہیں جو اس کی زندگی کا جزو اعظم تھے۔

جون کی سرگذشت میں شجاعت اور درویشانہ خوبیاں موجود تھیں جو بچپن ہی سے روز روشن کی طرح ظاہر تھیں اس میں کارہائے عظیم کرنے کی بے انتہا طاقت تھی۔ وہ ہر وقت مشکلات و مصائب کا مقابلہ کرنے کے واسطے تیار رہتی تھی۔ اس میں انسانوں میں روح پھونکنے کی طاقت غضب کی تھی۔ ایک شاہد حال نے جس نے اس کی تمام فتوحات اور جانبازی و شہادت کے کارنامے بچشم خود دیکھے ہیں۔ یوں حرف زن ہے کہ میں نے

ان تمام واقعات میں جو میں نے دیکھی سنی اور میرے روبرو پیش آئی اس کو خدا دوست پاک اور بے لوث پایا۔

''زمانہ''جولائی ۱۹۰۹ء

گالیاں

ہر ایک قوم کا طرز کلام اس کی اخلاقی حالت کا پتہ دیتا ہے۔ اگراس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہندوستان روئے زمین کی تمام قوموں میں‌سب سے نیچے نظر آئے گا۔ طرز کلام کی متانت اور شستگی، قومی عظمت اور اخلاقی پاکیزگی ظاہر کرتی ہے۔ اور بد زبانی اخلاقی سیاہی اور قومی پستی کا پختہ ثبوت ہے۔ جتنے گندے الفاظ ہماری زبان سے نکلتے ہیں شاید ہی کسی مہذب قوم کی زبان سے نکلتے ہوں۔ ہماری زبان سے گالیاں ایسی بے تکلفی سے نکلتی ہیں گویا ان کا زبان پر آنا ایک ضروری امر ہے۔ ہم بات بات پر گالیاں بکتے ہیں۔ اور ہماری گالیاں ساری دنیا کی گالیوں سے نرالی ، مکروہ اور ناپاک ہوتی ہیں کہ ایک دوسرے کے منہ سے ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کے متعلق گندہ ترین گالیاں سنتے ہیں اور پیترے بدل کر رہ جاتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات اس کا احساس بھی نہیں‌ہوتا کہ ہماری کچھ تحقیر ہوئی ہے۔ جن گالیوں کا جواب کسی دوسری قوم کا آدمی شمشیر اور پستول سے دے گا اس سے بدرجہا مکروہ اور نفرت انگیز گالیاں ہم اس کان سے سن کر اس کان اڑا دیتے ہیں۔ ہماری گالیوں سے ماں، بہن، بیوی، بھائی، غرض کوئی نہیں بچتا۔ ہم اپنی ناپاک زبانوں سے ان پاک رشتوں کو ناپاک کرتے رہتے ہیں۔

یوں تو گالیاں بکنا ہمارا سنگار ہے۔ مگر بالخصوص عالم غیظ و غضب میں‌ہماری زبان جولانی پر ہوتی ہے۔ غصہ کی گھٹا سر پر منڈلائی اور منہ سے گالیاں موسلا دھار مینہہ کی طرح برسنے لگتی ہیں۔ اپنے رقیب یا مخالف کو دور سے صلواتیں سنا رہے ہیں۔ آستینیں چڑھاتے ہیں پینترے بدلتے ہیں۔ آنکھیں لال پیلی کرتے ہیں اور سارا جوش چندناپاک گالیوں پر ختم ہوجاتا ہے۔ حریف کے ہفتاد پشت کو زبانی نجاست میں لت

پت کردیتے ہیں علیٰ ہٰذا فریق مخالف بھی دور ہی سے کھڑا ہماری گالیوں کا ترکی بہ ترکی جواب دے رہا ہے۔ اسی طرح یکساں طور پر فحش مذاق کانشانہ ہے جو ہوتا ہے اپنے حسب حیثیت اسے گالیاں دیتا ہے۔ اس کی بہنیں اور اس کے گھر کی بڑی بوڑھیاں ایک بھی اس بھیڑیا دھسان حملہ سے بے داغ نہیں رہنے پاتیں۔ اس غریب کوفحش سنانا ہر شخص کا فرض منصبی ہے۔ اسے فحش الفاظ سے پکارنا، اسے للچائی نظروں سے دیکھنا ہر بڑے بوڑھے کا مجازی فعل ہے۔ علیٰ ہذا جب کوئی شخص اپنے سسرال جاتا ہے تو سارا محلہ اسے گالیاں سناتا ہے۔ جوان لوگ خواہ مخواہ اس کی بہن سے بیاہ کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں اور بوڑھے اس کی ماں سے رشتہ موانست ملاتے ہیں۔ اور یہ بیہودہ گفتگو زندہ دلی میں داخل سمجھی جاتی ہے۔ شادیوں میں دولہے کے ساتھ سسرال میں قدم قدم پر زبانی اور عملی مذاق کیے جاتے ہیں۔ سالیاں، سلہجیں، ساس سبھی اسے گالیاں دینے اور اس کے منہ سے گالیاں سننے کی تمنا رکھتی ہیں۔ دیور بھاوج کی نوک جھونک کون نہیں جانتا، بھاوج کے ساتھ ہر قسم کی دل لگی جائز ہے۔ اور وہ دل لگی کیا ہے؟ گالیاں، ہمارے یہاں گالیوں کا ذرا کم مکروہ نام دل لگی ہے۔

ہمارے ملک میں گالیاں صرف نثر ہی میں نہیں نظم میں بھی دی جاتی ہیں۔ ہم گالیاں گاتے ہیں، اور وہ بھی خوشی کے موقع پر، اگر ماتم کے موقع پر گالیاں گائی جائیں تو شاید اس کی یہ تشریح کی جاسکے کہ ہم چرخ ناہنجار یا تقدیر غدار کو کوس رہے ہیں۔ لیکن مسرت کے جلسوں میں گالیوں کا گانا انوکھی بات ہے۔ ہاں ان گالیوں میں وہ شیطنت وہ خونخواری اور وہ دل آزادی نہیں ہوتی جو عالم غصہ کی گالیوں میں پائی جاتی ہے۔ تاہم ان گیتوں کا ایک ایک لفظ دلوں میں ناپاک خیالات اور فحش جذبات ابھارتا ہے اس کی تشریح بجز اس کے اور کیا کی جاسکتی ہے کہ ہماری مغلوب النفس طبیعتیں شہوت خیز گالیاں سن کر خوش ہوتی ہیں۔ بارات دروازہ پر آئی اور گالیوں سے اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ بعد ازاں ویسا اس کی خاطر و مدارات میں مصروف ہوئے، لیکن جوں ہی کھانے کا وقت آیا لوگ ہاتھ پاؤں دھو دھو کر پتلوں پر کڑھی بھات کھانے بیٹھے کہ چاروں طرف سے گالیوں کی بوچھار ہونے لگی۔ اور گالیاں بھی ایسی ویسی نہیں پیچ میل کہ شیطان سنے تو دوزخ سے نکل بھاگے۔ لوگ سپر سپر بھات کھا رہے ہیں، ڈھول مجیرا

بج رہے ہیں۔ واہ واہ مچی ہوئی ہے اور گالیاں گائی جا رہی ہیں۔ گویا پیٹ بھرنے کے لیے بھات کے علاوہ گالیاں کھانی بھی ضروری ہیں۔ اور ہے بھی ایسا ہی لوگ ایسے شوق سے گالیاں سنتے ہیں کہ شاید رامائن مہا بھارت اور ست کتھائیں بھی نہ سنی ہوں گی، مسکراتے ہیں، عالم وجد میں آ کر گردن ہلاتے ہیں اور ایک دوسرے کا نام غلاظت میں لتھاڑے جانے کے لیے پیش کرتے ہیں۔ جن اصحاب کے نام یوں پیش ہوتے ہیں وہ اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں اور دعوت ختم ہونے کے بعد کتنے ہی ایسے حضرات بچ رہتے ہیں جن کے دل میں گالیاں کھانے کی ہوس باقی رہتی ہے۔ مبارک ہے وہ شخص جو اس وقت گالیاں کھاتا ہے ساری برادری کی آنکھیں اس کی طرف اٹھتی ہیں۔ باوجود اس قدر ومنزلت کے وہ غریب فرط انکسار سے گردن جھکائے ہوئے ہے کہیں کہیں گھر کی عورتیں یہ فرض ادا کرتی ہیں۔ لیکن بیشتر مقامات میں ڈومنیاں یہ پاک رسم ادا کرنے کے لیے بلائی جاتی ہیں۔ نہیں معلوم یہ گیت کس نے بنائے ہیں، بعض بعض گیتوں میں شاعری کا رنگ پایا جاتا ہے۔ کیا عجب ہے کسی طبع وقار نے اسی رنگ میں کمال فن دکھایا ہو۔ اس گانے کے لیے گانے والوں کو انعام دینا پڑتا ہے۔ دنیا میں ہندوؤں کے سوا اور کون ایسی قوم ہے جو گالیاں کھائے اور گرہ سے روپے خرچ کرے، اس میدان میں کایستھ لوگ سبھی فرقوں سے بازی لے گئے ہیں۔ ان کے یہاں بہت زمانہ نہیں گزرا کہ محفلوں میں گالیاں بک بک کر علمی لیاقت دکھائی جاتی تھی۔ دوسری قومیں شاسترارتھ اور علمی مباحثے کرتی ہیں۔ اور کایستھ حضرات مغلظات بکنے میں جودت فکر دکھاتے ہیں۔ کیا الٹی عقل ہے! شکر ہے کہ یہ رواج اب کم ہوتا جاتا ہے ورنہ گاؤں میں کسی لڑکے یا لڑکی کی نسبت ٹھہری۔ اور گاؤں بھر کے نو عمر اور ہونہار لڑکے گالیوں کی غزلیں یاد کرنے لگتے تھے۔ ہفتوں اور مہینوں تک بجز گالیوں کو درد زباں کرنے کے انھیں اور کوئی شغل نہ تھا۔ گھر کے بڑے بوڑھے شام کو دفتر یا کچہری سے لوٹتے تو لڑکوں سے یہ غلیظ غزلیں سبق یک طرح سنتے اور لب و لہجہ درست کرتے جب بچوں کو گالیاں ماں کے دودھ کے ساتھ پالے جائیں تو قوم میں اخلاقی قوت کیوں کر آ سکتی ہے۔

غصہ میں ہم گالی نہ کہیں دل لگی میں ہم گالی بکیں گالیاں بک کر زور لیاقت ہم دکھائیں، گیت میں گالی ہم گائیں، زندگی کا کوئی کام اس سے خالی نہیں۔ حتی کہ مذہبی

معاملات میں بھی ہمارے یہاں گالی بکنے کی ضرورت ہے دیگر صوبجات کا ہمیں تجربہ نہیں مگر ممالک متحدہ کے بعض حصے میں دیوالی کے دو دن بعد دوج کے دن گالی بکنے والی پوجا ہوتی ہے۔ سارے گاؤں یا محلّہ کی عورتوں نہا دھوکر جمع ہوتی ہیں۔ زمین گوبر کا یک پتلا بنایا جاتا ہے۔ اس پتلے کے ارد گرد عورتیں بیٹھتی ہیں۔ اور کچھ پان پھول چڑھانے کے بعد گالی بکنا شروع کرتی ہیں۔ یہ تہوار اسی لیے بنایا گیا ہے۔ آج کے دن ہر عورت کا فرض ہے کہ وہ اپنی پیاروں کو گالیاں دے جو آج کے دن گالیوں سے بچ جائے گا اسے سال بھر کے اندر ضرور جمراج گھسیٹ لے جائیں گے۔ گویا جمراج سے بچنے کے لیے گالیوں کی یہ فصیل اٹھائی گئی ہے۔ ہم نے کال سے لڑنے کے لیے کیسا ہتھیار نکالا ہے۔ کہیں کہیں یہ رواج ہے کہ دوج کے دن بجائے اپنے عزیزوں کے دشمنوں کو گالیاں دی جاتی ہیں اور گوبر کا پتلا فرضی دشمن سمجھا جاتا ہے۔ دشمن کو خوب جی بھر کوسنے کے بعد عورتیں اس پتلے کے سینہ پر اینٹ کا ایک ٹکڑا رکھ دیتی ہیں اور پھر اسے موسل سے کوٹنا شروع کرتی ہیں۔ اس طرح دشمن کا نشان گویا صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ گالیوں سے صرف مذہب خالی تھا وہ کسر بھی پوری ہوگئی۔

ہمارا مذاق ایسا رکیک ہوگیاہے کہ ہم میں سے کتنے ہی شوقین رنگین مزاج حضرات ایسے نکلیں گے جو حسینوں کے منہ سے گالیاں سننا برکت عظمیٰ سمجھتے ہیں۔ بدزبانی بھی گویا حسینوں کے غمزے میں داخل ہے۔ عشاق کا یہ فرقہ اس حسینہ کو ہرگز معشوق نہ کہے گا جس کی زبان میں شوخی و تندی نہیں۔ زبان کا شوخ ہونا معشوقیت کا جزواعظم سمجھا جاتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ زبان کی شوخی کا مفہوم کچھ اور ہی خیال کیاجاتا ہے اگر معشوق بذلہ سنج ہو تب تو گویا چار چاند لگ گئے۔ مگر ہمارے یہاں زبان کی شوخی گالی بکنے کا دوسرا نام ہے۔ میاں مجنوں لیلیٰ سے زکوٰۃ حسن طلب کرتے ہیں۔ لیلیٰ تیور بدل کر گالی دے بیٹھتی ہے۔ میاں مجنوں ذرا اور سرگرم ہوتے ہیں، تو لیلیٰ ان کے میت دیکھنے کی تمنا ظاہر کرنے لگتی ہیں۔ اس گالی گلوج کا شمار معشوقانہ شوخی میں داخل ہے۔ جس عالم میں زبان سے اخلاص اور یگانگت میں ڈوبے ہوئے الفاظ نکلنے چاہیے، اس عالم میں ہمارے یہاں گالی گلوج ہونے لگتا ہے اور بسا اوقات نہایت فحش، مگر ہمارے ملک جنت نشاں میں ایسے لوگ بھی ہیں جنھیں ان گالیوں میں محبت کی دو آتشہ شراب

کا مزہ آتا ہے اور جن کی صحبتیں بلا اس زبانی تیزی کے سونی اور بے رونق رہتی ہیں۔ ہماری تہذیب کا باوا آدم نرالا ہے، اسی اخلاقی پستی نے ہندوستان کو آج ایسی بے حمیت اور بے حرمت قوم بنارکھا ہے۔ ولایت میں بلنگس گیٹ نام کا ایک بازار ہے وہاں کی بد زبانی سارے انگلستان میں مشہور اور کتابوں میں اس کی نظیر دی جاتی ہے مگر ہمارے ہندوستان کی معمولی بول چال بھی بلنگس گیٹ کے ملاحتوں پر خجالت کی سرخی پیدا کردے گی۔

گالی ہمارا قومی خمیر ہوگئی ہے۔ کسی یکہ پر بیٹھ جاییے اور سنیے کہ یکہ بان اپنے گھوڑوں کو کیسی گالیاں دیتا ہے۔ ایسی فحش کہ طبیعت مالش کرنے لگے۔ اس غریب گھوڑے کی ذات خاص اور اس کی مادر مہربان،اور اس کے پدر بزرگوار اور اس کے جدنانجار سب اس نیک بخت اولاد کی بدولت گالیاں پاتے ہیں۔ ہندوستان ہی تو ہے یہاں کے جانوروں کو بھی گالیوں سے لگاؤ ہے۔ بیل گاڑی والا بھی اپنے بیلوں کو ایسی ہی فرمائشی گالیاں دیتا ہے اور تو تھا ہی سرکارفیض مدار نے آج کل گالیاں بکنے کے لیے ایک محکمہ قائم کرر کھا ہے۔ اس محکمہ میں شریف زادے اور رئیس زادے ہی جاتے ہیں۔ انھیں بیش قرار مشاہرے دیے جاتے ہیں اور رعایا کے امن و امان کا بار ان پر رکھا جاتا ہے۔ اس محکمہ کے لوگ گالیوں سے بات کرتے ہیں، ان کے منہ سے جو بات نکلتی ہے مغلظ، نجاست میں ڈوبی ہوئی، یہ لوگ گالیاں بکنا حکومت کی علامت اور اپنے منصب کی شان سمجھتے ہیں۔ یہ بھی ہماری کج فہمی کی ایک مثال ہے کہ ہم گالی بکنے کو امارت کی شان خیال کرتے ہیں۔ اور ملکوں میں زبان کی پاکیزگی اور شیریں بیانی، بشرہ کی متانت اور بردباری شرافت اور ریاست کے ارکان سمجھے جاتے ہیں۔ اور بھارت ورش میں زبان کی غلاظت اور بشرہ کا جھلا پن حکومت کا جزو خیال کیا جاتا ہے۔ دیکھیے فربہ اندام زمیندار اپنے اسامی کو کیسی گالیاں دیتا ہے۔ جناب تحصیل دار صاحب اپنے باورچی کو کیسی صلواتیں سنا رہے ہیں۔ اور سیٹھ جی اپنے کہار پر کن نجس الفاظ میں گرم ہوتے ہیں۔ غصہ سے نہیں صرف شان تحکم جتانے کے لیے گالی بکنا ہمارے یہاں ریاست اور شرافت میں داخل ہے۔ واہ رے ہم!

ان پھکل گالیوں سے طبیعت آسودہ نہ ہوتی دیکھ کر ہمارے بزرگوں نے ہولی نام

کا ایک تہوار نکالا کہ ایک ہفتہ تک ہر خاص و عام خوب دل کھول کر گالیاں دیتے ہیں۔ یہ تہوار ہماری زندہ دلی کا تہوار ہے۔ ہولی کے دنوں میں ہماری طبیعتیں خوب جولانی پر ہوتی ہیں اور ہفتہ بھر تک زبانی نجاست کا ایک غبار سا ہمارے دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے۔ جس نے ہولی کے دن دو چار کبیر نہ گائے اور دو چار درجن مغلظات زبان سے نہ نکالے وہ بھی کہے گا کہ ہم آدمی ہیں! زندگی تو زندہ دلی کا نام ہے۔ لکھنؤ میں ایک زندہ دل اخبار ہے، وہ بھی ہولی میں مست ہوجاتا ہے اور جلی حروف میں پکارتا ہے:

آئی ہولی آئی ہولی۔ ہم نے اپنی دھوتی کھولی

یہ اس زندہ دل اخبار کی زندہ دلی ہے، وہ مہذب اور شستہ مذاق کا موید سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جس ملک میں گالیوں کا ایسا رواج ہو وہاں اسی کا شستہ مذاق میں شمار ہے۔ بعض ہندی اخبارات کی زندہ دلی ان دنوں اتھاہ ہوجاتی ہے۔ مسلسل کبیریں چھپتی ہیں۔ اور اکثر کبیریں صنعت لفظی کے پردے میں گالیوں سے پر ہوتی ہیں۔ اگر کسی غیر قوم کا آدمی ان دو ہفتوں کے ہندی اخبارات اٹھا کر دیکھے تو شاید دوبارہ ان کی صورت دیکھنے کا نام نہ لے گا۔ ہماری قومی اخبارات کی یہ حالت ہوجاتی ہے۔

سخن تکیہ کے طور پر بھی گالیاں بکنے کا رواج ہے۔ اور اس مرض میں زیادہ تر نیم تعلیم یافتہ لوگ گرفتار پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ کوئی منتخب گالی چن لیتے ہیں اور دوران گفتگو میں اسے استعمال کرنا شروع کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ان کا سخن تکیہ ہوجاتی ہے اور بسا اوقات ان کے منہ سے بے اختیاری طور پر نکل پڑتی ہے۔ یہ نہایت شرم ناک عادت ہے، اس سے اخلاقی کمزوری کا پتہ چلتا ہے، اور اس سے گفتگو کی متانت بالکل خاک میں مل جاتی ہے۔ جن لوگوں کی ایسی عادت پڑ گئی ہو انھیں طبیعت پر زور ڈال کر زبان میں پاکیزگی پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

القصہ ہم چاہے کسی اور بات میں شیر نہ ہوں بد زبانی میں ہم یگانہ روزگار ہیں۔ کوئی قوم اس میدان میں ہم کو نیچا نہیں دکھا سکتی۔ یہ ہم مانتے ہیں کہ ہم میں سے کتنے ہی ایسے اصحاب ہیں جن کی زبان کی پاکیزگی پر کوئی حرف نہیں رکھا جاسکتا۔ مگر قومی حیثیت سے ہم زبردست کمزوری کا شکار ہو رہے ہیں۔ قوم کی پستی یا بلندی چند منتخب

افراد قوم کی ذاتی کمالات پر منحصر نہیں ہوسکتی۔ حق تو یہ ہے کہ ابھی تک ہمارے رہنماؤں نے اس وباو عام کی بیخ کنی کرنے کی سرگرم کوشش نہیں کی۔ تعلیم کی سست رفتار پر اس کی اصلاح چھوڑ دی اور عام تعلیم جیسی کچھ ترقی کر رہی ہے۔ اظہر من الشمس ہے، اس امر کے اعادہ کی ضرورت نہیں کہ گالیوں کا اثر ہمارے اخلاق پر بہت خراب پڑتا ہے۔ گالیاں ہمارے نفس کو مشتعل کرتی ہیں اور خود داری و پاس عزت کا احساس دلوں سے کم کرتی ہیں جو ہم کو دوسری قوموں کی نگاہوں میں وقیع بنانے کے لیے ضروری ہیں۔

''زمانہ'' دسمبر ۱۹۰۹ء

کلام اکبر پر ایک نظر

ولؔی اور میؔر سے لے کر امیؔر و داغؔ تک اردو زبان نے جو رنگ بدلے ہیں وہ ایشیائی شاعری کے ماہرین سے مخفی نہیں ہیں۔ بیشک تخیلات شاعری میں بجز غالب کے کوئی جدید روش نہیں اختیار کی گئی۔ تاہم محاورات بندش، اور اسلوب بیان میں مختلف شعرا میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ ولؔی نے جن خیالات کو لیا ہے وہ ہیں تو بہت بلند لیکن ان کی ترکیبوں اور اس زمانے کی ترکیبوں میں بڑا فرق ہے۔ میؔر و سوؔدا اور انشا کا رنگ بھی الگ الگ ہے۔ لیکن رفتار خیال کی شاہراہ ایک ہی ہے یعنی اکثر خیالات بھاشا اور فارسی سے ملتے ہوئے ہیں اور ایسے خیالات بھی ہیں جو فارسی سے مقتبس نہیں کہے جاسکتے۔ صدہا محاورات اور ترکیبیں فارسی سے جدا ہیں۔ تمام مشاہیر اساتذہ اردو نے درسیات فارسی اور کتب متداولہ عربی پڑھی ہیں اور عربی میں اگر تبحر نہیں حاصل کیا ہے تو کم سے کم فارسی اور صرف نحو پڑھی ہے کیوں کہ بغیر اس قدر تحصیل کے مذاق سلیم اور ادارک صحیح نہیں ہوسکتا اور بعضے شعرا اردو تو فاضلانہ قابلیت رکھتے تھے۔ مگر یہ سب خیال بندی اور معانی آفرینی میں فارسی شعرا کے مقلد تھے اور گذشتہ اساتذہ اردو کا طرز معاشرت بھی قدیم اور اس زمانے سے بالکل الگ تھا اور داغؔ و امیؔر نے جس زمانے میں نام حاصل کیا گو اس زمانے کی تہذیب، میؔر وغیرہ کے زمانے سے ہٹ گئی تھی لیکن وہ اس سے متاثر نہیں ہوئے اور اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ وہ نہ خود انگریز تھے اور نہ ان کی سرکاریں انگریزی مذاق رکھتی تھیں۔ اس وجہ سے ان کا کلام قدیم رنگ پر تھا۔ لیکن جناب اکبر قدیم علوم کے علاوہ انگریزی زبان کے بھی ماہر ہیں اور اسی مناسبت سے جناب اکبر نے اپنے کلام میں جابجا انگریزی زبان کے الفاظ کو بھی کھپایا ہے اور کہیں کہیں یہ ترکیب نہایت دل آویز ہے۔ ظریفانہ رنگ کے اشعار میں یہ

ترکیبیں سونے میں سہاگہ ہوگئی ہیں لیکن زیادہ تر غزلیں بہ پابندی تخیل قدیم کہی گئی ہیں۔ اکثر اشعار میرؔ و مرزاؔ اور غالبؔ کے رنگ کے ہیں۔ کچھ غزلیں جناب اکبرؔ نے اپنے خاص رنگ میں کہی ہیں جو ناظرین آگے چل کر ملاحظہ فرمائیں گے

زمانۂ حال کی اردو شاعری ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے۔ انگریزی تعلیم کا خیالات پر ایسا مقناطیسی اثر ہوا ہے کہ لوگ پرانی باتوں سے بیزار ہوگئے ہیں۔ نظم اردو میں بھی یہی کیفیت نمایاں ہے۔ اور شعرا حال کی صاف صاف دو جماعتیں ہوگئی ہیں۔ داغؔ اور حالیؔ کے طفیل میں شعرائے اردو کے ایک دوسرے سے متضاد دو اسکول قائم ہوئے جو کئی لحاظ سے ''درباری'' اور ''گورنمنٹی'' یا ''اسکولی'' کے نام سے نامزد ہوسکتے ہیں۔ ان دونوں طبقوں میں بعد المشرقین ہے۔ ایک نے قدامت پرستی کی قسم کھالی ہے اور دوسرے ہیں کہ جدت پسندی اور آزادی پر مٹے ہوئے ہیں۔ اقلیم سخن میں ان دونوں متضاد جماعتوں کی بدولت ایک طرح کا تہلکہ مچا ہوا ہے، ملک میں ایک طرف تو دربار سخن ہے ان کے نکالنے کی فکر ہو رہی ہے۔ کلمۂ تکفیر پڑھا جارہا ہے اور دوسری جانب ان کے حقوق شاعرانہ پر جھگڑا برپا ہے۔ عام شائقین سخن ان دونوں کو ضرورت سے زیادہ جوشیلا پاتے ہیں اور اعتدال پسند کرتے ہیں۔ یہی ہر دل عزیز ہوتا بھی ہے، اس میں شک نہیں کہ پرانے قصوں، اور استعاروں اور تشبیہوں کے محض دہرانے سے موجودہ زمانے کے لوگ مسرور کیا مطمئن بھی نہیں ہوسکتے، دل شاعری سے لفظوں کے الٹ پھیر کے سوا کچھ اور کی بھی توقع رکھتا ہے۔ ساتھ ہی اس کے ابھی بالکل آزادی بھی مناسب نہیں جو نظم کی اشد ضروری قیود کا بھی لحاظ نہ رکھا جائے، نرے وعظ خشک قبول خاطر نہیں ہوتے۔ نظم سے لوگ ظاہری فائدے کے بہ نسبت مسرت کی زیادہ امید رکھتے ہیں۔ مگر اس پہلو کو بالکل نظر انداز کرنا بھی خلاف مصلحت ہے۔

شکر ہے کہ ان دونوں جماعتوں کے بین بین چند ایسے شعرا بھی ہیں جنھوں نے زبان اور نظم پر قادر الکلام ہونے کے ساتھ ساتھ ضروریات زمانہ کو بھی بخوبی محسوس کرلیا ہے اور ان میں ہم جناب خان بہادر سید اکبر حسین صاحب جج الٰہ آباد کا درجہ بہت اونچا پاتے ہیں۔ آپ نے زمانے کے خیالات اور ضروریات کا صحیح اندازہ کرلیا ہے۔ ان کے کلام میں دونوں رنگ اعتدال کے ساتھ موجود ہیں اور اسی وجہ سے آپ کی شاعری اس

درجہ مقبول خاص و عام ہے۔ آپ کو دلچسپی اور دلفریبی کے لحاظ سے پرانے طرز سخن کا بھی پاس ہے اور اس کے ساتھ ہی خیالات میں اس کے تنگ حدود کی پابندی منظور نہیں۔ اسی وجہ سے آپ کا کلام موجودہ معیار شاعری کے مطابق ہے، اس میں ایشیائی انداز بیان میں مغربی خیالات کے اعلیٰ ترین نمونے ملتے ہیں۔ موجودہ زندگی کے مختلف مسائل پر بھی خاطر خواہ ہدایت اور ہمدردی ہوتی ہے۔ جذبات انسانی کی بھی جھلک رہتی ہے اور کیا عجب ہے کہ کچھ دنوں میں ملک کے مختلف اثرات آپ کے انداز سخن پر مستقل طور سے قائم ہوجائیں۔ اور اس طرح میدان نظم کے موجودہ فریق مل کر ایک ہوجائیں۔

مگر فی الحال کشمکش جاری ہے اور اس کو جناب اکبرؔ نے ایک نہایت لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔

قدیم وضع پر قائم رہوں اگر اکبرؔ تو صاف کہتے ہیں ''سید'' یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں خود اپنی قوم مچاتی ہے شور و واویلا
جو اعتدال کی کہیے تو وہ ادھر نہ ادھر زیادہ حد سے دیے سب نے پاؤں میں پھیلا
ادھر یہ ضد ہے کہ لمنڈ بھی چھو نہیں سکتے ادھر یہ دھن ہے کہ ''ساقی سراحی مے'' لا
ادھر ہے دفتر تدبیر و مصلحت ناپاک ادھر ہے وحی ولایت کی ڈاک کا تھیلا
غرض دو گونہ غذا بست جان مجنوں را بلائے صحبت لیلیٰ و فرقت لیلیٰ

مگر اس مشکل کو اکبرؔ نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ آسان کر دکھایا ہے اور ہر شخص اپنے اپنے مذاق کے موافق آپ کے کلام سے اشعار کا انتخاب کرسکتا ہے۔ عشق و محبت کے جن جذبات کو آپ نے موزوں کیا ہے وہ نہایت خوبی سے نظم کیے گئے ہیں۔ تغزل کا رنگ ایسا پیارا ہے کہ عاشق مزاج سخن فہم آپ کا کلام پڑھ کر بے چین ہوسکتا ہے۔ کلام میں بے ساختگی ہی وہ شے ہے جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ جناب اکبرؔ کے دیوان میں اکثر اشعار تیر و نشتر کا کام دینے والے ہیں۔ اشعار کا مفہوم قرین قیاس ہے اور مبالغہ بھی بالکل دوراز قیاس نہیں بلکہ خوش آیند۔ وہ تمام خوبیاں جو ایک کہنہ مشق اور خوش فکر شاعر کے کلام میں ہونا چاہیے۔ آپ کی کلیات میں موجود ہیں۔ آپ کا کلیات چالیس سال کی محنت کا نتیجہ ہے۔ غزلیں، رباعیات، قطعات و مثنویات ظریفانہ اور متفرق اشعار کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کلیات

باعتبار ترتیب اس قابل ہے کہ طبع ثانی میں اس کی اصلاح کردی جائے لیکن اس بات کو نفس مطلب سے زیادہ تعلق نہیں ہے۔ مبصر اور نقاد سخن تو کلام کی خوبیوں کو دیکھتا ہے اور اس لحاظ سے یہ کلیات بہت ہی قابل قدر ہے۔ اس کی اشاعت سے ایشیائی شاعری میں موجودہ زمانے کے موافق معقول اضافہ ہوا ہے کچھ مختصر انتخاب ملاحظہ ہو۔

مری حقیقت ہستی یہ مشت خاک نہیں
بجا ہے مجھ سے جو پوچھے کوئی پتا میرا

درحقیقت یہ شعر اپنے مفہوم کے اعتبار سے بہت بلیغ ہے۔ واقعی انسان کی ہستی فقط مشت خاک ہی نہیں عارف مشت خاک کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے اور اسی واسطے ایک اسلامی لیڈر (پیشوا) نے کہا ہے من عرفہ نفسہ فقد عرفہ ربہ یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ مصرعہ ثانی صاف ہے اور طالب حقیقت کو چاہتے ہیں کہ کاش وہ اس رمز کو دریافت کرے۔ ایک اردو شعر میں یہ نازک خیالی معمولی بات نہیں ہے۔

پیغمبر اسلام صلعم کی نعت میں یہ اشعار خوب کہے ہیں ؎

در فشانی نے تری قطروں کو دریا کردیا
دل کو روشن کردیا آنکھوں کو بینا کردیا
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کردیا

ہمراز

دل مرا جس سے بہلتا ہے کوئی ایسا نہ ملا
بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا

وارفتگی عشق

وہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے
کردیا کعبے کو گم اور کلیسا نہ ملا

اسی زمیں میں دو ظرافت آمیز شعر ہیں ؎

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھو لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسا نہ ملا

اگر یہ شعر غزل سے الگ کسی نظم میں شامل کیے جاتے تو دلچسپی بڑھ جاتی مگر جناب اکبر کی بے تکلف طبیعت نے اس کا خیال نہیں کیا۔

عاشقانہ رنگ میں یہ اشعار قابل داد ہیں اور خوبی یہ کہ ان میں تصوف کی جھلک بھی موجود ہے۔

غنچہ دل کو نسیم عشق نے وا کردیا
میں مریض ہوش تھا مستی نے اچھا کردیا
دین سے اتنی الگ حد فنا سے یوں قریب
اس قدر دلچسپ کیوں پھر رنگ دنیا کردیا
سب کے سب ماہر ہوئے وہم و خرد ہوش و تمیز
خانہ دل میں تم آؤ ہم نے پردا کردیا

توحید

تصور اس کا جب بندھا تو پھر نظر میں کیا رہا
نہ بحث این و آں رہی نہ شور ماسوا رہا

آزادانہ

جو مل گیا وہ کھانا داتا کا نام جپنا
اس کے سوا بتاؤں کیا تم سے کام اپنا

عاشقانہ

عقل کو کچھ نہ ملا علم میں حیرت کے سوا
دل کو بھایا نہ کوئی رنگ محبت کے سوا
بڑھنے تو ذرا دو اثر جذبہ دل کو
قائم نہیں رہنے کا یہ انکار تمھارا
باعث تسکین نہ تھا باغ جہاں کا کوئی رنگ
جس روش پر میں چلا آخر پریشاں ہوگیا

جناب اکبر نے یہ شعر خوب کہا ہے اور گویا غالب کے مضمون کو دوسرے پیرایہ سے نظم کیا ہے۔ ؎

بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

درازیٔ عمر کی شکایت

بس یہی دولت مجھے دی تونے اے عمر عزیز
سینہ اک گنجینہ داغ عزیزاں ہوگیا

ہے غضب جلوہ دیر فانی کا
پوچھنا کیا ہے اس کے بانی کا
ہوش بھی بار ہے طبیعت پر
کیا کہوں حال ناتوانی کا

معرفت

نسیم مستانہ چل رہی ہے چمن میں پھر رت بدل رہی ہے
صدا یہ دل سے نکل رہی ہے وہی ہے یہ گل کھلانے والا

ترک تعلق

خودی گم کرچکا ہوں اب خوشی و غم سے کیا مطلب
تعلق ہوش سے چھوڑا تو پھر عالم سے کیا مطلب

جسے مرنا نہ ہو وہ حشر تک کی فکر میں الجھے
بدلتی ہے اگر دنیا تو بدلے ہم سے کیا مطلب
مری فطرت میں مستی ہے حقیقت میں ہے دل میرا
مجھے ساقی کی کیا حاجت ہے جام جم سے کیا مطلب

دل ہو وفا پسند نظر ہو حیا پسند
جس حسن میں یہ وصف ہو وہ ہے خدا پسند

توڑوں پہ تیرے جھومنے لگتی ہے شاخ گل
بے حد ہے تیرا ناچ مجھے اے صبا پسند

اردو کے سلسلے میں بعض فارسی غزلیں بھی درج کردی گئی ہیں اور انصاف یہ ہے کہ جناب اکبر فارسی میں بھی ایک زبان داں کی حیثیت سے کہتے ہیں۔ دو ایک شعر ملاحظہ ہوں۔

وقت بہار گل دلم از ہوش دور بود
موج نسیم دشمن شمع شعور بود
یک جلوہ گردد صورت پروانہ سوختم
آری ہمیں علاج دل ناصبور بود
خوش بود آں زماں خودی از خود خبر نداشت
ہوشم بخواب بود دلم از حضور بود

اردو

موقوف کچھ نہیں ہے فقط مے پرست پر زاہد کو بھی ہے وجد تری چشم مست پر
اس باوفا کو حشر کا دن ہوگا روز وصل قائم رہا جو دہر میں عہد الست پر

جدید ترکیب اور ظریفانہ رنگ میں یہ مطلع ملاحظہ ہو:

میل نظر ہے زلف مس کج کلاہ پر سونا چڑھا رہا ہوں میں تار نگاہ پر

عاشقی اور امید

طبع کرتی ہے ترے عشق کی تائید ہنوز ان جفاؤں پہ بھی ٹوٹی نہیں امید ہنوز

دوسرا شعر اکثر ہندوستانیوں کے حسب حال ہے ۔

نہ خوشی ہوتی ہے دل کو نہ طبیعت کو ابھار
پھر بھی سالانہ کیے جاتے ہیں ہم عید ہنوز

شب فراق کا منظر

شب فراق کی خیالی تصویر شعرا نے مختلف انداز سے اتاری ہے، غالب نے اس خیال کو یوں نظم کیا ہے۔

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
ایک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

جناب اکبر نے بھی اس خیال کو اثر انداز لہجے سے موزوں کیا ہے۔ ؎

نہیں کوئی شب تار فراق میں دل سوز
خموش شمع ہے خود جل رہے ہیں شام سے ہم
نگاہ پیر مغاں کہتی ہے مریدوں سے
رہ سلوک میں واقف ہیں ہر مقام سے ہم

جناب اکبر کا یہ شعر حافظ شیرازی کے اس شعر کے مفہوم کے قریب قریب ہے۔ ؎

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر ہو نبود زراہ درسم منزلہا

انقلاب زمانہ

فلک کے دور میں ہارے ہیں بازی اقبال
اگرچہ شاہ تھے بدتر ہیں اب غلام سے ہم

نازک خیالی

مری بے تابیاں بھی جود ہیں اک میری ہستی کی
یہ ظاہر ہے کہ موجیں خارج از دریا نہیں ہوتیں

افسردہ دلی

ہوا ہوں اس قدر افسردہ رنگ باغ ہستی سے
ہوائیں فصل گل کی بھی نشاط افزا نہیں ہوتیں
قضا کے سامنے بیکار ہوتے ہیں حواس اکبر
کھلی ہوتی ہیں گو آنکھیں مگر بینا نہیں ہوتیں

آزادی کے لالے

اتنی آزادی بھی غنیمت ہے
سانس لیتا ہوں بات کرتا ہوں

مشکلات حق شناسی

معرفت خالق کی عالم میں بہت دشوار ہے
شہر تن میں جبکہ خود اپنا پتا ملتا نہیں

دوستوں کی یاد

زندگانی کا مزا ملتا تھا جن کی بزم میں
ان کی قبروں کا بھی اب مجھ کو پتا ملتا نہیں

دشت غربت کی بے کسی

بے کسی میری نہ پوچھ اے جادۂ راہ طلب
کارواں کیسا کہ کوئی نقش پا ملتا نہیں
یوں کہو مل آؤں ان سے لیکن اکبر سچ یہ ہے
دل نہیں ملتا تو ملنے کا مزا ملتا نہیں

عاشقانہ زندگی

دل زیست ہے بیزار ہے معلوم نہیں کیوں   سینہ پہ نفس بار ہے معلوم نہیں کیوں
جس سے دل رنجور کو پہنچی ہے اذیت   پھر اس کا طلبگار ہے معلوم نہیں کیوں
انداز تو عشاق کے پائے نہیں جاتے   اکبر جگر افکار ہے معلوم نہیں کیوں

ذیل کی طرح میں آپ نے ایک طولانی غزل لکھی ہے اور خوب خوب شعر نکالے ہیں۔ غالبًا یہ غزل مشاعرہ (مقام پریانواں) میں کہی ہے۔ یہ ساری غزل مرصع ہے۔ دو تین شعر ملاحظہ ہوں:

ہجر کی رات یوں ہوں میں حسرت قد یار میں   جیسے لحد میں ہو کوئی حشر کے انتظار میں
رنگ جہاں کے ساتھ کاش میری بھی یوں ہی ہو بسر   جیسے گل ونسیم کی نبھ گئی چاہ پیار میں
آنکھ کی ناتوانیاں حسن کی لن ترانیاں   پھر بھی ہیں جانفشانیاں کوچۂ انتظار میں

ترغیب درستی اخلاق

آئینہ رکھ دے بہار غفلت افزا ہوچکی   دل سنوار اپنا جوانی بھی خود آرا ہوچکی
خانہ تن کی خرابی پر بھی لازم ہے نظر   زینت آرائش قصر معلیٰ ہوچکی

بیخودی کی دیکھ لذت کرکے ترک آرزو   ہوچکی حد ہوسؔ مشق تمنا ہوچکی

چل بسے یاران ہمدم اٹھ گیے پیارے عزیز
آخرت کی اب کر اکبر فکر دنیا ہوچکی

عیادت کو آئے شفا ہوگئی   علالت ہماری شفا ہوگئی
پڑھی یاد رُخ میں جو میں نے نماز   عجب حسن کے ساتھ ادا ہوگئی
بتوں نے بھلایا جو دل سے مجھے   مرے ساتھ یاد خدا ہوگئی
مریض محبت ترا مرگیا   خدا کی طرف سے دوا ہوگئی
نہ تھا منزل عافیت کا پتہ   قناعت مری رہنما ہوگئی
اشارہ کیا بیٹھنے کا مجھے   عنایت کی آج انتہا ہوگئی
دوا کیا کہ وقت دعا بھی نہیں   تری حالت اکبر یہ کیا ہوگئی

حقیقت عالم

دو عالم کی بنا کیا جانے کیا ہے   نشان ماسوا کیا جانے کیا ہے

توحید

مری نظروں میں ہے اللہ ہی اللہ   دلیل ماسوا کیا جانے کیا ہے

☆☆

جنون عشق میں ہم کاش مبتلا ہوتے   خدا نے عقل جو دی تھی تو باخدا ہوتے

لطف زباں

یہ خاکسار بھی کچھ عرض حال کرلیتا
حضور اگر متوجہ ادھر ذرا ہوتے
یہ ان کی بے خبری ظلم سے بھی افزوں ہے
اب آرزو ہے کہ وہ مائل جفا ہوتے

بے ثباتی عالم

دو ہی دن میں رُخ گل زرد ہوا جاتا ہے
چمن دہرے دل سرد ہوا جاتا ہے

رقابت

میرے حواس عشق میں کیا کم ہیں منتشر
مجنوں کا نام ہوگیا قسمت کی بات ہے

تعلقات حسن عشق

سو رنگ تصور میں ہم اے جان در آئے
ہر رنگ میں تم آفت ایمان نظر آئے

عاشقانہ

دم لبوں پر تھا دل زار کے گھبرانے سے
آ گئی جان میں جان آپ کے آجانے سے

انقلاب زمانہ اور فقدان اتفاق

کل تک محبتوں کے چمن کھلے ہوئے
دو دل بھی آج مل نہیں سکتے ملے ہوئے

☆☆

تمھیں سے ہوئی مجھ کو الفت کچھ ایسی
نہ تھی ورنہ میری طبیعت کچھ ایسی
گرے میری نظروں سے خوبان عالم
پسند آ گئی تیری صورت کچھ ایسی

ذیل کی غزل میں قافیہ و ردیف کس قدر چسپاں ہے۔ نازک خیالی کے ساتھ تغزل کی شان بھی دیکھنے کے قابل ہے۔

یہ درد دل بھی نہ تھا سوزش جگر بھی نہ تھی
ان آفتوں کی تو الفت میں کچھ خبر بھی نہ تھی
زمانہ سازی ہے اب یہ کہ منتظر تھا میں
ہمارے آنے کی تم کو تو کچھ خبر بھی نہ تھی
لپٹ گئے وہ گلے سے مرے تو حیرت کیا
وہ سنگ دل بھی نہ تھے آہ بے اثر بھی نہ تھی

شہید جلوہ مستانہ ہوگیا شب وصل
خوشی نصیب میں عاشق کے رات بھر بھی نہ تھی

یہاں تک جو کچھ انتخاب کیا گیا وہ قدیم رنگ تغزل کو لیے ہوئے ہے۔ اکبر نے حسن و عشق، شوخی اور ضد معشوقانہ وغیرہ سب مضامین پر خوب خوب طبع آزمائیاں کی ہیں۔ مگر ہم بخوف طوالت اس صنف میں اسی قدر انتخاب کو کافی سمجھتے ہیں اور اب آپ کی شاعری کی اس امتیازی خصوصیت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جس نے آپ کو سرآمد شعرائے روزگار بنا دیا ہے اور جس نے آپ کے کلام کو ایک نرالی اور بہت مرغوب شان عطا کی ہے۔ ہماری مراد آپ کے خداداد ظریفانہ رنگ سخن سے ہے جو آپ کے تمام کلام میں موجود ہے۔ اور جس سے آپ کی نصیحت دل پزیر اور موثر اور آپ کی نصیحت دلنشیں اور کامیاب ہوتی ہے۔ حسن اتفاق سے کہیے یا مصلحت ایزدی سے آپ کا وجود قوم کے دماغی نشو ونما کے لحاظ سے تاریخ ہند کے ایک نازک زمانے میں ہوا ہے جس میں دو عظیم الشان تہذیبوں کی کشمکش درپیش ہے۔ ایک طرف مغربی تہذیب کا سکہ پھر رہا ہے دوسری جانب مشرقی تہذیب دلوں پر تسلط جمائے ہوئے ہے۔ خیالات اور معاشرت غرض زندگی کے ہر پہلو میں تغیر و تبدل کا زمانہ اور افراط و تفریط کا عہد ہے۔ ابھی تک کسی حالت پر قرار کی صورت پیدا نہیں ہوسکی ہے۔ اور اس لیے مختلف قسم کی خرابیاں ظاہر ہو رہی ہیں۔ اور افراد قوم کے خیال و مقال، علم اور عمل، مذہب اور معاشرت، جذبات اور محسوسات میں عجب اختلاف اور نیرنگیاں اور طرح طرح کی ایک دوسرے سے متضاد بدعملیاں نمایاں ہو رہی ہیں۔ ایسی حالت میں ایک ناصح شفیق مذاق اور مضحکہ سے جو کام لے سکتا ہے وہ پندو نصیحت سے ممکن نہیں ہے۔ اور یہی جناب اکبر کی ظرافت کی علت غائی ہے۔ اس رنگ میں ان کی شاعری نے جو کمال حاصل کیا ہے وہ اردو میں آج تک کسی کو نصیب ہی نہیں ہوا۔ ایک لفظ ایک فقرے میں آپ وہ بات پیدا کردیتے ہیں۔[1] جو دوسروں سے صفحوں کے صفحے رنگ

---

[1] مثلاً جب لارڈ کرزن نے کلکتہ یونیورسٹی میں عموماً ایشیائی قوموں اور خصوصاً ہندوستانیوں پر دروغ گوئی کا الزام عائد کیا تو آپ نے زمانہ میں کیا خوب لکھا تھا کہ

بے ڈھپ یہ جھوٹ سچ کی چھڑی بحث ہند میں   جھوٹے ہیں ہم تو آپ ہیں جھوٹوں کے بادشاہ

ڈالنے پر بھی ممکن نہیں۔ بعض اشعار تو بالکل کشت زعفراں ہیں۔ پولیٹیکل واقعات کا بھی آپ نے مضحکہ اڑایا ہے۔

کرزن و کچنر کی حالت پر جو کل وہ صنم تشریح کا طالب ہوا
کہہ دیا میں نے کہ ہے یہ صاف بات دیکھ لو تم زن پہ نر غالب ہوا

مناسبت وقت

شیخ صاحب یہ تو اپنے اپنے موقع کی ہے بات
آپ قبلہ بن گئے میں اسکوائر ہوگیا

اس زمانے کے نوجوانوں کے حسب حال یہ شعر بھی خوب کہا ہے ؎

پری کی زلف میں الجھا نہ ریش واعظ میں دلِ غریب ہوا لقمہ امتحانوں کا
وہ حافظہ جو مناسب تھا ایشیا کے لیے خزانہ بن گیا یورپ کی داستانوں کا

☆☆

آسائش عمر کے لیے کافی ہے
بی بی راضی ہوں اور کلکٹر صاحب

پردہ اور ہندوستانی

پردے میں ضرور ہے طوالت بیحد
انصاف پسند کو نہیں چاہیے ہٹ
تشبیہ بری نہیں اگر میں یہ کہوں
بیگم صاحبہ پیچواں لیڈی سگرٹ
ہر رنگ کی باتوں کا مرے دل میں ہے جھرمٹ
اجمیر میں کلچا ہوں علی گڑھ میں ہوں بسکٹ
پابند کسی مشرب وملت کا نہیں ہوں
گھوڑا مری آزادی کا اب جاتا ہے بگ ٹٹ
بی شیخانی بھی ہیں بہت ذی ہوش
کہتی ہیں شیخ سے بجوش و خروش
خواہ لنگی ہو خواہ ہو تہمد

در عمل کوش ہرچہ خواہی پوش
شمع سے تشبیہ پاسکتے ہیں یہ عیاش امیر
رات بھر پگھلا کریں دن بھر رہیں بالائے طاق
میرے منصوبے ترقی کے ہوئے سب پائماں
بیج مغرب نے جو بویا وہ اگا اور پھل گیا
بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضمون لکھا
ملک میں مضمون نہ پھیلا اور جوتا چل گیا
☆☆
کوٹھی میں جمع ہے نہ ڈپازٹ ہے بینکس میں
قلاش کر دیا مجھے دو چار تھینکس میں
☆☆
پانیر کے صفحہ اول میں جس کا نام ہو
میں ولی سمجھوں جو اس کو عاقبت کی فکر ہو
☆☆
جال دنیا سے بے خبر ہیں آپ
گو تقدس مآب بے شک ہیں
شیخ جی پر یہ قول صادق ہے
چاہ زمزم کے آپ مینڈک ہیں
☆☆
ماشاء اللہ وہ ڈنر کھاتے ہیں
بنگالی بھائی ان کا سر کھاتے ہیں
بس ہم ہیں خدا کے نیک بندے اکبر
ان کی گاتے ہیں اپنے گھر کھاتے ہیں
☆☆
مول چھٹے ان کے پنجے سے سب
تو بس قوم مرحوم کے سر ہوئے

پپیہے پکارا کیے پی کہاں
مگر وہ پلیڈر سے لیڈر ہوئے

☆☆

شو میکری شروع جو کی ایک عزیز نے
جو سلسلہ ملاتے تھے بہرام گور سے
پوچھا کہ بھائی تم تو تھے تلوار کے دھنی
مورث تمھارے آئے تھے غزنی وغور سے
کہنے لگے ہے اس میں بھی اک بات نوک کی
روٹی اب ہم کماتے ہیں جوتی کے زور سے

☆☆

اپنے بھائی کے مقابل کبر سے تن جایئے
غیر کا جب سامنا ہو بس قلی بن جایئے
چندے کی مجلس میں پڑھیے رو کے قرآن مجید
مذہبی محفل میں لیکن مثل دشمن جایئے
آپ کی انجمن کی ہے کیا بات
آہ چھپتی ہے واہ چھپتی ہے
اپنی گرہ سے کچھ نہ مجھے آپ دیجیے
اخبار میں تو نام میرا چھاپ دیجیے

☆☆

محتاج اور وکیل و مختار ہیں آپ
سارے عملوں کے ناز بردار ہیں آپ
آوارۂ و منتشر ہیں مانند غبار
معلوم ہوا مجھے زمیندار ہیں آپ

ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ اکبر نے ظرافت اور مذاق میں بھی کیسی خوبیاں پیدا کی ہیں اور دراصل موجودہ تہذیب اور طرز معاشرت کا خاکہ کھینچ دیا ہے۔ اس رنگ میں

صدہا اشعار لکھے ہیں۔ اس جدید ظریفانہ رنگ میں آپ کو بڑی جگر کاری کرنا پڑی ہوگی۔ اس لیے کہ یہ رنگ ظرافت بالکل نیا ہے۔

اقتباس بالا سے ناظرین کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ حضرت اکبر پولیٹیکل نکات بھی کس خوبی اور مذاق کے پیرائے میں ادا فرماتے ہیں۔ آپ کے خیالات بالکل آزاد ہیں۔ ملکی معاملات میں بے جا جوش کو برا سمجھتے ہیں۔ ساتھ ہی اس کے خوشامد اور تملق سازی کی پالیسی بھی پسند نہیں فرماتے۔ بقول اپنے ؎

میرے نزدیک یہ پنجاب کا بلوا بھی برا
ساتھ ہی اس کے علی گڑھ کو حلوا بھی برا
آپ اظہار وفا کیجیے تمکین کے ساتھ
لیٹ جانا بھی برا ناز کا جلوا بھی برا

☆☆

نہ نرے اونٹ ہو نہ ہو بلڈاگ
نہ تو مٹی ہی ہو نہ ہو تم آگ
چال ہے اعتدال کی اچھی
ساز حکمت کا جوڑھے یہ راگ

مگر اس اعتدال پسندی کا یہ مطلب نہیں کہ صورت حال صحیح طور پر محسوس نہ کی جائے یا حقیقت سے آنکھ بند کرلی جائے۔ آپ نے کیا خوب کہا ہے :

یہ بات غلط دارالسلام ہے ہند یہ جھوٹ کہ ملک لچھمن و رام ہے ہند
ہم سب ہیں مطیع و خیر خواہ انگلش یورپ کے لیے بس ایک گودام ہے ہند

☆☆

دل اس بت فرنگ سے ملنے کی شکل کیا
میری زبان اور ہے اس کی زبان اور

بنگالی ہاتھ میں قلم لے تو کیا مسلم جو مثال بزم جم لے تو کیا
ہندی کی نجات ہے نہایت مشکل سو مرتبہ مر کے وہ جنم لے تو کیا

☆☆

یا اسٹیشن کے بدلے دودھ چائے اور کھانڈلے
یا ایجیٹیشن کے بدلے تو چلا جا مانڈلے

☆☆

بحث ملکی میں تو پڑنا ہے تیری دیوانگی
پالیسی ان کی رہے قائم ہماری دل لگی

☆☆

دلچسپ ہوائیں سوئے گلشن پہنچیں
زلفیں شملے سے تا بہ دامن پہنچیں
درگا بائی سے راجہ جی جب روٹھے
صدقے ہونے کو بی نصیبن پہنچیں

آپ ہندو مسلمانوں کے اتفاق کی اشد ضرورت محسوس کرتے ہیں اور اس پر نہایت لطیف اور موثر پیرائے میں جابجا زور دیتے ہیں۔ اور افسوس کرتے ہیں کہ۔

وہ لطف اب ہندو ومسلماں میں کہاں اغیار ان پر گزرتے ہیں خندہ زناں
جھگڑا کبھی گائے کا زباں کی کبھی بحث ہے سخت مضر یہ نسخہ گاؤ زباں

پھر کہتے ہیں کہ ۔

ہندو مسلم ایک ہیں دونوں یعنی یہ دونوں ایشیائی ہیں
ہم وطن ہم زباں و ہم قسمت کیوں نہ کہہ دوں کہ بھائی بھائی ہیں

ایک مدبر وقت کی حیثیت سے آپ باہمی جھگڑوں اور دونوں کی کمزوریوں کو سمجھتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ آئے دن کی رقابتیں اور سرگوشیاں دلوں کو ایک دوسرے سے پھیر رہی ہیں۔ دونوں ۔

چغلیاں اک دوسرے کی وقت پر جڑتے بھی ہیں
ناگہاں غصہ جو آجاتا ہے لڑ پڑتے بھی ہیں
ہندو مسلم ہیں پھر بھی ایک اور کہتے ہیں سچ
ہیں نظر آپس کی ہم ملتے بھی ہیں لڑتے بھی ہیں

☆☆

کہتا ہوں میں ہندو ومسلماں سے یہی   اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ   موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

آپ ایک جگہ مذاق آمیز پیرائے میں یہاں تک کہتے ہیں کہ ایک کو اپنی ہزل چھوڑ کر دوسرے کے زٹل تک میں شریک ہوجانا چاہیے۔ اس میں یہ ضرور ہوگا کہ ''نہ لاٹ صاحب خطاب دیں گے نہ راجہ جی سے ملے گا ہاتھی'' لیکن ''یہ تو کوئی نہ کہہ سکے گا تمھارے دشمن کہاں بغل میں۔''

آپ سمجھتے ہیں اور کس خوبی سے اس کا اظہار کرتے ہیں کہ قوم اپنے ہی قوت بازو سے ابھر سکتی ہے کیونکہ ؂

دنیا میں ضرورت زور کی ہے اور آپ میں مطلق زور نہیں
یہ صورت حال رہی قائم تو امن کی جا جز گور نہیں
اے بھائیو بابو صاحب سے کھنچنے کا نہیں ہے کوئی محل
کونسل علاء الدین میں ہو مسکن تو تمھارے غور میں

ایک دوسرے پولٹیکل مسئلے کو کیسے شاعرانہ استعارات میں ادا فرمایا ہے:

اونٹ نے گاؤں کی ضد پر شیر کو ساجھی کیا
پھر تو مینڈک سے بھی بدتر سب نے پایا اونٹ کو
جس پہ رکھا چاہتے ہو باقی اپنی دسترس
منہ میں ہاتھی کے کبھی اے بھائی وہ گنا نہ دو

ملکی ترقی کی تمام معقول تحریکوں کے ساتھ آپ کو پوری ہمدردی ہے۔ آپ کے کلام میں ایسے اشعار اکثر ملتے ہیں جو ملکی کام کرنے والوں کے لیے چراغ ہدایت ہیں۔ قابل مضحکہ باتوں کا خاکہ اڑانے کے ساتھ ساتھ اچھی تحریکوں کی حمایت میں آپ دل بھی کس طرح بڑھاتے ہیں۔ تحریک سودیشی پر کیا خوب کہا ہے کہ ؂

داخل مری دانست میں یہ کام ہے پن میں
پہنچائے گا قوت شجر ملک کے بن میں
تحریک سودیشی پہ مجھے وجد ہے اکبر
کیا خوب یہ نغمہ ہے چھڑا دیس کے دھن میں

موجودہ تہذیب کے قابل مضحکہ پہلوؤں پر ہم حضرت اکبر کے خیالات ظاہر کر چکے ہیں۔ فی زمانہ چندوں کی بھرمار اور عملی اور اصلی کام کی کمی اس نئی تہذیب کی ایک مضحکہ خیز شان ہے۔ روپے کا زور، روپے کا وقت بے وقت ذکر، اس کے وصول کرنے کی مختلف تدبیریں، غرض ان سب باتوں پر آپ نے خوب لے دے کی ہے۔ آپ بانیان علی گڑھ کالج کے دوستوں میں ہیں۔ مگر کسی کے مقلد نہیں بلکہ بالکل آزاد خیال ہیں اور جس میں جو کمزوری دیکھتے ہیں اس طرح کہہ دیتے ہیں کہ کسی کو گراں نہ گزرے اور سب کے کان بھی ہو جائیں۔

علی گڑھ کالج کے نامور بانی کی آپ نے اکثر موقعوں پر نہایت گرم جوشی سے تعریف کی ہے۔ مگر قابل گرفت باتوں پر مضحکہ بھی خوب اڑایا ہے۔ یہاں پر ہم صرف چند باتوں پر آپ کے ہنسا دینے والے ریمارک اور پھبتیاں ضیافت طبع کے لیے درج کرتے ہیں۔

کیجیے ثابت خوش اخلاقی سے اپنی خوبیاں
یہ نمود جبہ و دستار رہنے دیجیے
ظالمانہ مشوروں میں میں نہیں ہوں گا شریک
غیر ہی کو محرم اسرار رہنے دیجیے
کھل گیا مجھ پر بہت ہیں آپ میرے خیر خواہ
خیر چندہ لیجیے طومار رہنے دیجیے
اسیر دام زلف پالیسی مدت سے بندہ ہے
فصاحت نذر لکچر ہے ریاست نذر چندہ ہے

☆☆

جزیے کو سدھارے ہوئے مدت ہوئی اکبر
البتہ علی گڑھ کی لگی ایک یہ پخ ہے

☆☆

اب کہاں تک بتکدے میں صرف ایماں کیجیے
تاکجا عشق بتان سست پیماں کیجیے

ہے یہی بہتر علی گڑھ جاکے سید سے کہوں
مجھ سے چندہ لیجیے مجھ کو مسلماں کیجیے

☆☆

جیب خالی پھرا کیا بندہ
لے گئے احباب اس قدر چندہ

☆☆

ایمان بیچنے پر ہیں اب سب تلے ہوئے
لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے

☆☆

شیخ صاحب چل بسے کالج کے لوگ ابھرے ہیں اب
اونٹ رخصت ہوگئے پولو کے گھوڑے رہ گئے

غرض کہاں تک انتخاب کیجیے۔ اس لسان العصر نے زندگی کے ہر پہلو پر غائرنظر ڈالی ہے اور مذاق مذاق میں سب کچھ دلنشیں کردیا ہے۔ ذاتی حالات کی بھی کہیں کہیں جھلک مل جاتی ہے۔ حضرت اکبر نے اپنے کلیات سے سوانح عمری کا کام نہیں لیا ہے۔تاہم کہیں کہیں پر دلی جذبات کے ساتھ ایک آدھ ذاتی خیالات بھی شامل ہوگئے ہیں۔ کئی سال سے آپ کو آنکھوں کی سخت شکایت ہے۔

کونسل سے ہر طرح کا قانون آرہا ہے
مطبع سے ہر طرح کا مضمون آرہا ہے
لیکن پڑھوں میں کیوں کر آنکھوں کی ہے یہ حالت
اشک آرہے تھے پہلے اب خون آرہا ہے
بصارت نے کمی کی انحطاط عمر میں اکبر
بصیرت ہے تو آنکھیں مجھ سے اب آنکھیں چراتی ہیں

ایک عرصہ دراز تک آپ کے صاحبزادے لندن میں اور آپ یہاں مدت مجوزہ کے بعد ان کی جلد واپسی کے لیے بے قرار تھے۔ اکثر مقامات پر یہ بے قراری ظاہر ہوگئی ہے۔

ہند میں میں ہوں مرا نور نظر لندن میں ہے
سینہ پر غم ہے یہاں لخت جگر لندن میں ہے
دفتر تدبیر تو کھولا گیا ہے ہند میں
فیصلہ قسمت ہے اے اکبرؔ مگر لندن میں ہے

اب ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ آپ کا کلام بہت سی خوبیوں کا مجموعہ ہے اور اس معیار شاعری پر جو آپ نے شعر ذیل میں مقرر کیا ہے، پورا اترتا ہے۔[1]

'زمانہ' ۱۹۰۹ء

[1] مضمون میں یہ شعر شامل نہیں

رہنمایانِ ہند

رہنمایانِ ہند کا تذکرہ کرتے ہوئے مجھ کو وہ ازمنہ قدیم یاد آتے ہیں جن کی یادگاریں تاریخ نے نہیں قائم کیں۔ اور روایتیں سلف کے تاریک پردہ سے واقعات کو باہر لانے کی کوشش کرتی ہیں اور کامیاب نہیں ہوتیں۔ ایسے بزرگوں کی تعداد ہمارے ملک میں بے شمار ہے۔ کیونکہ مدت ہائے دراز سے ہمارے دیس کی خاک پاک سے اہل کمال پیدا ہوتے چلے آئے ہیں۔ اس لیے آج میں ان میں سے چند ایسے ممتاز مہاتماؤں کے حالات بیان کروں گا جنھوں نے وقت کے صفحہ پر اپنی مہریں ثبت کردی ہیں۔ سب سے پہلے مجھے اپنی قدیم کتابوں کے متعلق چند باتیں کہنا ہیں۔ ہماری کتابوں میں صداقت کے دو معیار پائے جاتے ہیں۔ اول وہ جسے ازلی کہتے ہیں اور جو زمان اور مکان کی قید سے آزاد ہے۔ اور دوسرا اگرچہ ایسا اہم نہیں ہے۔ مگر خاص خاص حالتوں، مکانوں اور زمانوں میں ویسا ہی حکم رکھتا ہے۔ قسم اول کی صداقتیں جو روح اور پرماتما کی ماہیت، اور آتما اور پرماتما کے درمیان تعلقات سے بحث کرتی ہیں وہ سرتیوں میں درج ہیں، جنہیں وید کہتے ہیں۔ قسم دویم کو سمرتی کہتے ہیں۔ جس کی تفصیل منو، یاگ بلک اور دوسرے رشیوں کی تصانیف میں پائی جاتی ہے۔ حیات انسانی کے مقاصد و انجام کے بنیادی اصول ویدوں میں بیان کردئے گئے ہیں۔ اور ان کی تشریح و تفصیل سمرتیوں اور پرانوں کے لیے چھوڑ دی گئی ہے۔ زندگی کے لیے عام اصول سمرتیوں میں کافی طور پر موجود ہیں۔ روحانیت کے متعلق نہ اس سے زیادہ کوئی کہہ سکتا ہے اور نہ جان سکتا ہے۔ وہ تمام ہدایتیں جو روح کو عرفان تک پہچانے کے لیے لازم ہیں سرتیوں میں تکمیل کو پہنچا دی گئی ہیں۔ صرف تفصیلیں باقی رہ گئی تھیں۔ اور یہ کمی وقتاً فوقتاً سمرتیوں کے ذات سے پوری ہوتی رہتی ہے۔ دوسری خصوصیت

سمرتیوں کی یہ ہے کہ جن ارباب کمال نے اسے جامہ وجود پہنایا ان کا اس میں کہیں ذکر نہیں آتا۔ ان میں سے بیشتر مرد اور بعض عورتیں بھی ہیں۔ مگر ان کی ذاتیات۔ ان کی پیدائش اور سوانح پردہ خفا میں مستور ہیں لیکن ان کے بہترین گوہرخیالات، ان کی بہترین تحقیقاتیں سب ہمارے مقدس ویدوں میں محفوظ ہیں۔ اس کے برعکس سمرتیوں میں شخصیتیں زیادہ نمایاں ہیں۔ بڑے بڑے اہل کمال جو اپنی طاقت سے دنیا کو ہلا سکتے تھے۔ اور قوانین فطرت کو بھی پلٹ دیتے تھے۔ وہ پہلی بار ہماری نگاہوں کے سامنے آتے ہیں۔ ان کے ذاتی فضائل بعض اوقات ان کی تلقینات پر بھی غالب آجاتے ہیں۔

ہمارے مذہب میں نرگن پرماتما اور سکن پرماتما کی یکساں تعلیم دی گئی ہے۔ لیکن سرتیاں جو ہمارے مذہب کی دیواریں ہیں شخصیت سے پاک ہیں۔ یعنی وہ نرگن پر ماتما کی تعلیم دیتی ہیں۔ دیوتا اور اوتار اور رشی ہم کو سمرتیوں اور پرانوں ہی میں نظر آتے ہیں۔ اور یہ بھی واضح رہے کہ سوا ہمارے مذہب کے دنیا کے کل دیگر مذاہب اپنے بانی یا بانیوں کی ذات اور شخصیت پر قائم ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان مذاہب میں ان کے بانیوں کے ذاتیات اور سوانحات کے متعلق تاریخی شہادتوں پر خوب حجتیں ہوتی ہیں۔ اگر کسی وقت یہ تاریخی شہادتیں کمزور پڑ جائیں تو ان مذاہب کی ساری عمارت معرض خطر میں آجائے گی۔ ہم ان خطروں سے آزاد ہیں۔ ہمارا راستہ ان خندقوں اور غاروں سے پاک ہے۔ کیونکہ ہمارا مذہب شخصوں پر نہیں بلکہ اصولوں پر قائم ہے۔ ہم اپنے مذہب کی پیروی اس لیے نہیں کرتے کہ اس کا بانی کوئی رشی یا کوئی اوتار ہے۔ سری کرشن ویدوں کی سند نہیں ہیں بلکہ وید ہی ان کی سندیں ہیں۔ ان کی عظمت صرف اس لیے ہے کہ وہ وید کی تعلیم دینے والے تمام رشیوں میں سب سے زیادہ مفخر اور ممتاز ہیں۔ دوسرے اوتاروں اور رشیوں کا بھی یہی حال ہے۔ ہمارا پہلا اصول یہ ہے کہ انسان کی تکمیل اور تزئین اور حصول نجات کے لیے جن ہدایات کی ضرورت ہے وہ سب ویدوں میں موجود ہیں۔ ان پر ایزاد یا اضافہ کرنا ہمارے امکان سے باہر ہے۔ مذہبی تعلیم اسی وقت درجہ انتہا کو پہنچ گئی جب ویدوں نے مسئلہ ”تت توم اسی“ پر روشنی ڈالی۔ اب صرف انسان کو وقتاً فوقتاً زمان و مکان حالات اور اتفاقات کے مطابق رہنمائی کرنے کی ضرورت باقی رہ گئی۔ یہ بڑے بڑے صاحب کمال رشی اسی لیے

مبعوث ہوئے کہ انسان کو قدیم راستہ سے منحرف نہ ہونے دیں اور بھولے بھٹکوں کو سیدھے راستے پر لگائیں۔ اسی نکتہ کو سری کرشن بھگوان نے گیتا میں بڑی صفائی سے بیان فرمایا ہے۔

''جب نیکی کا زوال ہوتا ہے۔ اور بدی غالب آجاتی ہے تو میں
نیکی کی محافظت کے لیے اوتار لیتا ہوں۔''

پس ایک طرف تو یہ ازلی اصول ہیں جن کی بنیادیں پہاڑوں سے زیادہ مستحکم ہیں۔ اور جنھیں کسی رشی کی خواہ وہ کیسا ہی کامل ہو یا کسی اوتار کی خواہ وہ کیسا ہی عظیم الشان ہو سہارے کی مطلق ضرورت نہیں۔ حتیٰ کہ وہ دلیل اور مباحث کے قیود سے بھی آزاد ہیں۔ اسی بنیاد پر ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ صرف ویدانت ہی دنیا کا عام مذہب ہوسکتا ہے۔ بلکہ اس وقت بھی اسے یہ شرف حاصل ہے۔ کیونکہ وہ اصولوں کی تعلیم دیتا ہے نہ کہ شخصوں کی۔ کوئی مذہب جس کی جڑ شخصیت پر قائم ہو کل اقوام دنیا میں مقبول نہیں ہوسکتا۔ تجربہ شاہد ہے کہ ایک ہی شہر کے باشندے وہاں کے سربرآوردگان میں مختلف اشخاص سے عقیدت رکھتے ہیں پھر کیوں کر ممکن ہے کہ ایک ہی شخص یا ایک ہی پیمبر کے ساتھ ساری دنیا کو عقیدت ہوجائے۔ یہی نہیں بلکہ اخلاق اور روحانیت اور معاشرت پر اسی ایک شخص کا قول سند سمجھا جاوے۔ ہمارے ویدانت مت کے لیے ایسے شخصی شہادت کی مطلق ضرورت نہیں۔ اس کی سند انسان کی فطرت ہے۔ اور اس کے اخلاقی اصول انسان کی روحانی حقیقت پر مبنی ہیں۔

مگر اس کے ساتھ ہی زمانہ قدیم سے ہمارے رشیوں پر یہ امر روشن تھا کہ نبی نوع انسان کے ایک معتد بہ حصہ کے لیے شخصیت کی ضرورت ہے۔ ان کے لیے کسی نہ کسی صورت میں سگن پرماتما کا ہونا ضروری ہے۔ خود بدھ بھگوان کو جنھوں نے سگن پرماتما کے وجود سے انکار کردیا تھا ان کے عقیدت مندوں نے ان کی وفات کے پچاس ہی برس بعد سگن ایشور مان لیا۔ اس سے واضح ہوا کہ دنیا میں سگن پرماتما کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ مگر ایسے پرماتما کا خیالی معیار قائم کرنا انسان کے دائرہ تخیل سے بہت ارفع ہے۔ ہاں کبھی کبھی اسی دنیا میں ایسی پاک روحیں پیدا ہوجاتی ہیں جن کی عظمت کو پہنچنا ہمارے خیالی معیاروں کے لیے غیر ممکن ہے۔ یہ لوگ بمقابلہ کسی فرضی یا خیالی

پرماتما کے جسے ہمارے تخیل نے بنایا ہو بدرجہا قابل پرستش ہوتے ہیں۔ سری کرشن بھگوان پرماتما کے اس خیالی معیار سے کہیں زیادہ بزرگ اور برتر ہیں جو ہم یا آپ قائم کرسکتے ہیں۔ بدھ بھگوان ان بلندیوں سے بدرجہا عالی اور برتر ہیں جہاں تک ہمارا طائر فکر پہنچ سکتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان بزرگوں کے روبرو ساری دنیا سر عقیدت خم کرتی ہے۔ ہمارے رشیوں کو یہ خاصہ انسانی معلوم تھا اور اسی لیے انھوں نے ہم کو ان پاک روحوں کی پرستش کرنے کی پوری آزادی دے دی، کرشن بھگوان خود فرماتے ہیں۔

''جب کبھی کسی آدمی میں غیر معمولی روحانی طاقت کا جلوہ دیکھو تو یقین کرلو کہ میں وہاں موجود ہوں۔ وہ طاقت میرے ہی وجود کا مظہر ہے۔''

اس لحاظ سے ہندو دنیا کے سب اوتاروں کی پرستش کرنے کے لیے آزاد ہیں۔ ہندو دنیا کے ہر ایک نبی اور ہر ایک پیغمبر کی پرستش کرسکتا ہے۔ ہمارا مذہب عام ہے۔ وہ اس قدر جامع اور وسیع ہے کہ اس میں عظمت کے سبھی معیار شامل ہیں۔ویدانت کے سینہ بے پایاں میں دنیا کے تمام موجودہ مذہب کے لیے جگہ موجود ہے اور آئندہ بھی جو مذاہب وجود پذیر ہوں گے انھیں بھی اپنا جزو بنانے کے لیے ویدانت تیار رہے گا۔

دنیا کی ارواح عالیہ، یا پرماتما کے اوتاروں کے متعلق میرے یہی خیال ہیں۔ ان اوتاروں کے علاوہ درجہ دویم کے بزرگ بھی ہوتے آئے ہیں۔ انھیں رشی کہتے ہیں۔ ہم کو ویدوں میں لفظ ''رشی'' باربار ملتا ہے اور آج کل یہ بہت ہی عام لفظ ہوگیا ہے۔ رشی کے معنی ہیں خیالات کا جاننے والا، روشن ضمیر، عالم اسباب ہم کو روح اور پرماتما کے وجود، حیات ابدی، مقصد زندگی اور ایسے ہی دیگر مسائل کے متعلق کچھ نہیں بتلاسکتا۔ وہ ہمیشہ حالت تغیر میں رہتا ہے۔ وہ محدود اور اجزا میں منتشر ہے۔ پس وہ غیر فانی، ازلی پرماتما سے کیونکر بحث کرسکتا ہے۔ یہ امر ناممکن ہے۔ ایسی حالت میں وہ ست گیان جس سے وید لبریز ہو رہے ہیں کیونکر پیدا ہوا۔ جواب یہ ہے کہ رشیوں کی برکت اور وسیلے سے۔ یہ گیان حواس ظاہر میں مضمر نہیں ہے۔ بلکہ وجود انسانی کی علت نمائی ہے حواس ظاہر ہرگز انسان کا جوہر نہیں۔ ہماری ہی زندگی میں جب ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارا کوئی عزیز اس جہان سے اٹھ جاتا ہے۔ یا جب ہمارے دل پر اور کوئی

آفت نازل ہوتی ہے تو ہماورے دلوں پر ایک عالم سکون طاری ہوجاتا ہے۔ ایسے ہی اور بھی موقع آتے ہیں جبکہ ہمارا دل ایک لمحہ کے لیے اپنی حقیقت محسوس کرتا ہے۔ اور اسے نور تجلی کی ایک جھلک سی نظر آجاتی ہے۔ رشی کا درجہ حاصل کرنے کے لیے انھیں محسوسات کے تزکیہ اور تکمیل کی ضرورت ہے۔ ہندوؤں کو زمانہ قدیم سے معلوم تھا کہ روح حواس ظاہر یا ادراک کے احاطہ میں محدود نہیں۔ ادراک ہمارے وجود کے سلسلہ بے پایاں کی ایک کڑی ہے۔ اور اک ہماری ہستی کا ایک جزو ضعیف ہے۔ ارباب کمال میدان ادراک سے آگے بڑھنے کے لیے کمر ہمت باندھتے ہیں۔ ادراک تو حواس ظاہر کے حلقہ میں گھرا ہوا ہے۔ انسان کو حقائق معرفت کا گیان حاصل کرنے کے لیے اس عالم ادراک، اس احاطہ حواس سے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے اور ہند میں آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو حواس کے گھیرے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ انھیں کو رشی کہتے ہیں کیونکہ وہ روحانی حقائق کو نگاہ باطن سے دیکھتے ہیں۔

ہندوستان کی خاک سے بڑے بڑے رشی اور پرماتما کے اوتار، اٹھ چکے ہیں، جن میں بالخصوص دو اوتاروں کی گھر گھر پرستش کی جاتی ہے۔ رام اور کرشن۔ رام جو صداقت اور اخلاق مجسم تھے۔ جو بیٹے شوہر باپ اور فرماں روائے قوم کے اعلیٰ نمونہ اور بہترین مثال تھے۔ ان کے گن رشی والمیک نے گائے ہیں۔ اس سے زیادہ پاکیزہ اور روشن، فصیح اور سلیس کوئی انداز بیان نہیں ہوسکتا جو اس فخر شعرائے روزگار نے سری رام کے بھینٹ کیا ہے اور مہارانی سیتا کا کن الفاظ میں ذکر کیا جائے۔ساری دنیا کی داستان ہائے پارینہ کا مطالعہ کر جاؤ۔ مگر تمھیں دوسری سیتا ہرگز نہ ملے گی۔ اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ آنے والے زمانہ میں بھی شعرا کے دماغ اور قلم تمھارے سامنے کوئی ایسی مثال ہرگز نہ پیش کرسکیں گے۔ سیتا یگانہ روزگار ہے۔ رام شاید کئی ہوگزرے ہیں۔ مگر سیتا واحد ہے۔ اس کا کوئی جواب نہیں۔ ایک کامل ہندوستانی عورت میں جو اوصاف ہونے چاہئیں، وہ سب سیتا کی ذات میں مجتمع ہوگئے ہیں اور سارے بھارت ورش میں آج ہزاروں برسوں سے اس دیوی کی ہر مرد و زن اور بچہ پرستش کرتا چلا آتا ہے۔ یہ شاندار سیتا یہ پاکیزگی سے بھی زیادہ پاک سیتا، یہ صبر اور حلم کی مورت ہمیشہ ہماری دیوی بنی رہے گی۔ وہ جس نے زندگی کی کڑی مصیبتیں جھیلیں اور چہرہ پر میل نہ آنے

دیا وہ عفت اور عصمت کی تصویر، وہ خلق اللہ کی دیوی وہ دیوتاؤں کی ماتا، اسے ہم ابدتک اپنی قومی دیوی مانتے رہیں گے۔ ان کے کمالات سے ہم سب واقف ہیں اور ان کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ ہماری تمام پرانی کتابیں ہٹ جائیں، ہماری وید صفحہ ہستی سے معدوم ہوجائیں اور سنسکرت زبان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے۔ لیکن جب تک دنیا میں پانچ ذی روح بھی ہندوؤں کے نام لیوا باقی رہیں گے اس وقت تک مہارانی سیتا کا نام برقرار رہے گا۔

اب ہم اس مہاتما کا ذکر کرتے ہیں جس کی اپاسنا مختلف صورتوں میں کی جاتی ہے۔ جو ہر مرد و زن اور برنا و پیر کا پیارا دیوتا ہے۔ میرا مطلب اس بزرگ سے ہے جس کی نسبت سری بیاس جی فرماتے ہیں۔ ''دوسرے اوتاروں میں پرماتما کے کچھ انش پائے جاتے ہیں۔ مگر مہاراج سری کرشن شاکشات ایشور تھے۔'' ان کے کمالات کی وسعت ہماری عقل کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ وہ اعلیٰ درجہ کے سنیاسی اور اسی کے ساتھ اپنے فرائض کے پابند گرہست بھی تھے۔ ان کی ذات میں بے انتہا مادی قوت کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز ترک اور استغنا کا اتصال ہوگیا تھا۔ ان کے حالات کی حقیقت ہماری سمجھ میں نہیں آسکتی تاوقتیکہ ہم بھگوت گیتا کے رموز و نکات کو بخوبی نہ سمجھ جائیں۔ کیونکہ وہ اپنی ہی تلقینات کی شکل مجسم تھے۔ انھیں اپنی ہدایات کا زندہ مثال کہہ سکتے ہیں۔ ترک کی اس سے اعلیٰ مثال نہیں مل سکتی۔ کیسا غنی دل ہے۔ دوسروں کو تخت اور تاج بانٹتا پھرتا ہے۔ مگر خود اس کی مطلق ہوس نہیں۔ وہ جس کے ابرو کے اشارے سے سلطنتیں بنتی اور بگڑتی تھیں خود وہی آزاد، بے لوث اور غریب کرشن ہیں جو گوپیوں سے بہار کیا کرتے تھے۔ غور کیجیے، ان کی زندگی کا کیسا حیرت انگیز پہلو ہے۔ جہاں ہم ضعیف انسانوں کی سمجھ نہیں پہنچ سکتی اور جسے سمجھنے کی کوشش کرنا ہمارے لیے بالکل بیکار ہے۔ جب تک کہ ہم کامل طور پر پاک اور صاف نہ ہوجائیں۔ وہ محیط کل محبت کی کتھا اور وسیع پریم کی کہانی وہ بندرابن کی گلیوں اور لب جمنا کے کنجوں اور سایہ دار درختوں کے جمگھٹے ہماری سمجھ میں نہیں آسکتے جب تک کہ ہم شراب محبت سے متوالے نہ ہوجائیں۔ کون گوپیوں کے ہجر و مفارقت کے صدمہ کا اندازہ کرسکتا ہے۔ محبت ان کی جان و ایمان تھی۔ وہ محبت جو کسی چیز کی محتاج نہیں۔ وہ محبت جو بہشت

کی بھی پروا نہیں کرتی۔ وہ محبت جو کونین کی نعمتوں سے مستغنی ہے انھیں اس کی مطلق پروا نہیں کہ کرشن خالق کونین ہیں۔ وہ صرف اتنا جانتی ہیں کہ ان کی ذات محبت بے پایاں ہے۔ وہ کرشن کو بندرابن کے کھلاڑی کرشن کے سوا اور کچھ نہیں سمجھتیں۔ وہ کرشن جو راجوں کے مہاراجہ اور فوجوں کے سردار تھے۔ وہ گوپیوں کی نگاہ میں سدا گوالے ہی بنے رہے۔ یہ محبت کا اعلیٰ معیار۔ محبت صرف محبت کی غرض سے۔ کام صرف کام کی غرض سے۔ فرض صرف فرض کی غرض سے۔ پہلی بار ایشور کے سب سے بڑے اوتار مہاراج کرشن کی زبان سے سرزمین ہند میں پیدا ہوا اور اسے دنیا کی تاریخ مذاہب میں ایک قابل یادگار واقعہ سمجھنا چاہئے۔ اس معیار نے خوف اور دھمکیوں کے مذہب کا خاتمہ کردیا۔ کیسی عالمگیر۔ کیسی محیط کل محبت ہے! میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ گوپیوں کی محبت کی تہ تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ اور ہم میں ایسے بے خبروں کی کمی نہیں ہے جو اس حیرت انگیز داستان الفت کے معنی اور اسرار سمجھنے سے قاصر ہیں۔ بلکہ ہم میں کچھ ایسی پلید روحیں بھی ہیں جو اس میں کچھ اور ہی معنی پہنا کر اپنی روحانی غلاظت کا ثبوت دیتی ہیں۔ ان لوگوں سے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ پہلے اپنے نفس کو پاک کرو۔ اور یاد رکھو کہ جس نے یہ پریم کہانی لکھی ہے وہ بیاس رشی کا فرزند سکھ دیو ہے۔ جس کی ذات دنیا کی تحریصات سے پاک تھی اور جس کے دل پر گناہ کا کبھی اثر نہیں ہوا۔ جب تک کہ تمہارے دل میں غرض کی بو موجود ہے تم ہر ماتما سے لو نہیں لگا سکتے۔ غرض مندانہ عبادت تو لین دین ہے۔ جب تک ہمارے دل میں غرض مندانہ خیالات بھرے ہوں کیوں کر ممکن ہے کہ ہم گوپیوں کی دیوانگی اور مدہوشی کے معنی سمجھ سکیں۔ پیارو! پہلے مال و زر، نام و نمود اور دنیا کا خیال دل سے نکال ڈالو۔ تب گوپیوں کا عشق تمہارے سمجھ میں آئے گا۔ وہ عشق اس قدر لطیف تھا کہ تم بغیر دنیا سے دل ہٹائے اس کا لطف نہیں اٹھا سکتے۔ اور ایسا پاکیزہ کہ جب تک آئینہ دل پاک نہ ہوجائے خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ حیف ہے کہ وہ لوگ جن کے دل حرص اور ہوس کے تختہ مشق بنے ہوئے ہیں گوپیوں کے پریم کو سمجھنے اور اس میں معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی پریم کرشن کے اوتار کا زیور اور سنگار ہے۔ اس مدہوشی کے مقابلہ میں گیتا کی تلقینات بھی نہیں ٹھہرتیں۔ گیتا میں جگیا سو کو منزل مقصود تک پہنچنے کا راستہ

بتلایا گیا ہے۔ لیکن وہ مدہوشی وہ محبت کی دیوانگی، جہاں گرو اور شش، عالم اور علم سب ایک ہوجاتے ہیں۔ بجائے خود منزل مقصود ہے۔ جہاں عذاب و ثواب نیک و بد کسی کا وجود نہیں باقی رہتا۔ سب حس و خیال مٹ جاتا ہے اور صرف بیخبری باقی رہ جاتی ہے۔جب عاشق پر یہ مستی اور خود فراموشی کی کیفیت آجاتی ہے تب اسے ہر چہار طرف کرشن ہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اس کی صورت کرشن سے مل جاتی ہے اور اس کی آتما کرشن کے رنگ میں رنگ جاتی ہے۔ یہ مہاتما کرشن کی عظمت ہے۔ ذرا ذرا سی باتوں پر تضیع اوقات مت کرو، بلکہ زندگی کے اصول اور اس کے جوہر باطنی پر نگاہ رکھو۔

ممکن ہے کہ کرشن کے حالات میں ہم کو بہت سی باتیں قرین قیاس نہ معلوم ہوں۔ اور شاید تاریخی شبہات بھی کہیں کہیں پیدا ہوں۔ مگر مذہب اور زندگی کے اس نئے معیار کی کوئی نہ کوئی بنیاد ضرور ہوگی۔ کسی دوسرے پیغمبر یا نبی کی زندگی کا مطالعہ کیجیے۔ وہ اپنے زمانہ کے خیالات و تمدن کا مظہر نظر آتا ہے۔ اور انھیں خیالات کی اشاعت کرتا ہے جو اس کے ملک میں اس وقت عوام کے دلوں میں پیدا ہونے لگے تھے۔حتی کہ اس نبی یا پیغمبر کے وجود پر بھی شک کرنے والے لوگ نکل آتے ہیں۔ لیکن کون ایسا شخص ہے جو انکار کرسکے کہ زندگی اور مذہب کا یہ رفیع معیار یعنی کام کام کی غرض سے۔ محبت محبت کی غرض سے۔ فرض فرض کی غرض سے۔ کرشن کی ذات پاک سے وجود میں نہیں آئے۔ ان کا موجد ضرور کوئی نہ کوئی ہوگا۔ کرشن کے زمانہ طفولیت تک یہ معیار زندگی صفحہ دنیا پر معدوم تھا۔ مہاراج کرشن نے پہلی بار ان کی تلقین کی۔ اور ان کے شاگرد بیاس رشی نے ان خیالات کو دنیا پر روشن کردیا۔ بندرابن کے گوال بنس والے کرشن گوپیوں کے ساتھ بچرنے والے کرشن اس اوتار کی روح ہیں۔ جب وہ بیخبری ہم پر طاری ہوجائے گی۔ جب ہم مبارک گوپیوں کے راز الفت سمجھ جائیں گے۔ تب محبت کی حقیقت ہم پر روشن ہوگی۔ جب تمھاری نظروں میں ساری دنیا مٹ جائے گی۔ جب تمھارا باطن صاف اور بے غرض ہوجائے گا۔حتی کہ تم کو تلاش حقیقت کی بھی خبر نہ رہے گی۔ تب اور تب ہی تم پر اس محبت کی دیوانگی کا غلبہ ہوگا۔

اب اس سے کمتر درجہ کے گیتا والے کرشن کو لیجیے۔ ہم میں سے اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کرشن کا گوپیوں کے عشق میں سرشار ہونا کسی قدر معیوب سا معلوم ہوتا ہے

اور علمائے یورپ اسے پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے۔ ڈاکٹر فلاں اور فلاں نے اس پر اعتراض کیا ہے۔ اس لیے گوپیوں کا ذکر نہ کیجیے۔ بغیر یوروپین علما کی سند کے ہم اس واقعہ کو کیوں کر صحیح تسلیم کرسکتے ہیں۔ مہا بھارت میں بجز دو ایک موقعوں کے گوپیوں کا ذکر کہیں نہیں آیا اور وہ بھی واضح طور پر نہیں۔ دروپدی کی پرارتھنا میں چند الفاظ میں بندرابن کا ذکر آ گیا ہے۔ اور سسپال کی تقریر میں بھی ایک جگہ بندرابن کا نام ملتا ہے۔ مگر یقیناً یہ سب حریفوں کی کارستانیاں ہیں۔ جو فضلا یوروپ نہیں مانتے۔ اس کی قطع و برید کردینا چاہئے۔ حیف ہے کہ ایسے لوگ جو بیوپار میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ جن کا معیار مذہب بھی تجارت کے اثر سے محفوظ نہیں ہے۔ جو اس دنیا میں نیک کام کرکے بہشت میں جانے کی آرزو رکھتے ہیں وہ گوپیوں کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس محبت کل کرشن سے قطع نظر کرکے ہم گیتا کے مصنف کرشن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس حیثیت میں بھی وہ ذات عالی انتہائے کمال پر پہنچی ہوئی ہے۔ گیتا سے بہتر اسرار حقیقت کی تصنیف نہیں کی گئی اور نہ کی جاسکتی ہے۔ سرتیوں اور اپنشدوں کے مفسر اس کثرت سے گزرے ہیں کہ پردۂ ابر میں ماہتاب تک نگاہ کا پہنچنا غیر ممکن سا ہوگیا ہے۔ ہر مفسر اپنے ہی خیالات کے موافق تفسیر کرتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ ذات برحق جس سے سرتیوں کا وجود ہوا خود گیتا کے معلم کی حیثیت سے دنیا میں جنم لیتا ہے اور اصلی معنی ہم پر روشن کرتا ہے۔ تعجب ہے کہ زمانہ مابعد کے مفسر بھی گیتا کی تشریح کرنے میں اکثر اس کے مفہوم اور موضوع تک نہیں پہنچ سکتے۔ گیتا میں کچھ اور لکھا ہے اور یہ زمانہ حال کے ٹیکا کار کچھ اور کہتے ہیں ۔ ایک ''اوویت'' مت کا پیرو کسی اپنشد کی تشریح کرنے بیٹھتا ہے۔ اور اسے جتنے اشلوک ''دویت'' خیال کے ملتے ہیں۔ ان سبھوں کو توڑ مروڑ کر اپنے ہی خیال کے موافق معنی لگا لیتا ہے۔ علی ہٰذا ''دوّیت'' عقیدہ کا عالم ادویت خیال کے اشلوکوں کو مسخ کرکے اپنے رنگ میں ڈھال لیتا ہے۔ مگر گیتا میں سارے نکتے آئینے کی طرح روشن کردئے گئے ہیں اور اس کا لب لباب چند الفاظ میں یہ ہے کہ روح انسانی بتدریج قدم بہ قدم کثیف سے لطیف اور لطیف سے لطیف تر مدارج پر پہنچتی ہوئی۔ بالآخر ذات مطلق میں وصل ہوجاتی ہے۔ کرم

کانڈ سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اور ثابت کیا گیا ہے کہ بلا خلوص قلب کے وہ ذریعہ نجات نہیں ہوسکتا۔ مورتی پوجن اور مراسم دینی جائز تسلیم کیے گئے ہیں۔ صرف صفائی قلب درکار ہے۔ عبادت اسی حالت میں وسیلہ نجات ہوسکتی ہے جبکہ باطن صداقت سے معمور اور دل کی کثافت سے دور ہو۔ عبارت کے مختلف طریقے۔ مختلف اپاسنائیں بھی ضروری ہیں۔ ورنہ ان کا وجود ہی نہ ہوتا۔ ہماری نئی روشنی کے اکثر نوجوان خیال کرتے ہیں کہ یہ مختلف فرقے اور مذاہب غرض مندوں اور مکاروں نے دنیا کمانے کے لیے بنا رکھے ہیں۔ ان کا یہ خیال بادی النظر میں کیسا ہی صحیح نظر آتا ہو مگر واقعیت کے برعکس ہے۔ فرقے اور مذاہب کی ابتدا یوں نہیں ہوئی وہ سب روح انسانی کے رجحانات کے نتیجے ہیں۔ وہ سب دنیا کے مختلف طبائع کی تسکین وتشفی کرنے والے ہیں اور تمھیں ان میں عیب ڈھونڈھنے کی ہرگز کوشش نہ کرنی چاہئے۔ جس دن ان کی ضرورت باقی نہ رہے گی وہ خود بخود صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گے۔ مگر جب تک ان کی ضرورت رہے گی وہ ضرور قائم رہیں گے۔ خواہ تم ان کی کتنی ہی مخالفت کرو اور کتنے ہی عیوب نکالو۔ توپیں اور بندوقیں منہ سے آگ برسائیں، تلواروں سے خون کی ندیاں بہیں مگر جب تک ان مورتیوں اور فرقوں کی ضرورت موجود رہے گی انھیں کوئی مٹا نہیں سکتا اور بھگوان سری کرشن نے صاف صاف فرمایا ہے کہ ان کا قائم رہنا برحق اور لازم ہے۔

اب تاریخ ہند کا ایک افسوس ناک زمانہ آتا ہے۔ فرقوں کے عناد و فساد اور شور و شر کی آوازیں گیتا ہی میں آنے لگی تھیں۔ مہاراج کرشن کی وفات سے پہلے ہی عنصر فاسد نے پھر زور پکڑ لیا تھا۔ اور اب کی ملک پر جو طوفان آیا وہ مذہب کی بنیا دپر نہ تھا۔ بلکہ ذات پات کی تفریق پر برہمن اور چھتری جو ہندو سماج کے دو رکن اعظم ہیں۔ اپنے اپنے احاطہ سے قدم باہر نکالنے لگے اور نتیجہ وہی ہوا جو ایسی حالتوں میں اکثر ہوا کرتا ہے۔ تقریباً ایک ہزاور برس کے طوفان اور سیلاب کے بعد ایک اور بڑے مہاتما کا جنم ہوتا ہے۔ اور یہ گوتم شاکیہ منی ہیں۔ آپ لوگ ان کی تعلیم اور تلقین سے واقف ہیں۔ ہم ان کو ایشور کا اوتار مانتے ہیں۔ حسن اخلاق اور رحم کا جیسا اعلیٰ معیار انھوں نے قائم کیا وہ پردہ دنیا پر اور کہیں نظر نہیں آسکتا۔ ورہ زبردست کرم یوگی تھے۔ گویا خود مہاراج سری کرشن اپنے اصولوں پر عمل کرنے کے لیے اپنے ہی شاگرد بن کر

دنیا میں آئے۔ ایک بار پھر وہی پرزور، الوہیت سے لبریز آواز سنائی دی جس نے گیتا میں کہا تھا ''عورتیں اور ویش اور شودر سب اپنے اپنے کرموں کے مطابق نجات حاصل کرتے ہیں۔'' گویا گیتا کی تلقینات کی زندہ مثال پیش کرنے کے لیے گویا اسے عملی صورت میں لانے کے لیے۔ گرو نے نیا سروپ دھارن کیا۔ اور یہ شاکیہ منی تھے۔ جن کا مقصد پامال قوموں کو سدھارنا تھا۔ جنھوں نے دیوتاؤں کی زبان کو خیر باد کہہ دیا تاکہ عوام کی زبان میں تعلیم دے کر ان کے دلوں تک پہنچ سکیں۔ جنہوں نے درویشوں اور بینواؤں کے لیے شاہی تخت اور تاج کو ترک کردیا اور جو سری رامچندر کی طرح شودروں کو بھی چھاتی سے لگاتے تھے۔ آپ لوگ ان کے مہتم بالشان کام اور ان کے اوصاف بالغہ سے بخوبی واقف ہیں۔ لیکن ان کے مشن میں ایک نقص تھا۔ جس کا خمیازہ ہم اب تک اٹھا رہے ہیں۔ وہ ذات بابرکات اس نقص کے لیے جوابدہ نہیں کہی جاسکتی۔ مگر بدقسمتی سے وہ غیر مہذب اور نیم وحشی قومیں جواریوں کے حلقہ اثر میں آگئی تھیں مذہب کے ایسے اعلیٰ معیار پر عمل نہ کرسکیں۔ یہ قومیں جن کے توہمات اور عبادت کے طریقے جدا جدا تھے آریوں کے حلقہ میں اگر مل گئیں اور کچھ دنوں تک ایسا معلوم ہوا کہ ان کی خوبو تبدیل ہوگئی ہے۔ مگر ایک صدی بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ انھوں نے وہ بھوت اور پریت اور سانپ بچھو اور لکڑی پتھر پوجنے شروع کیے جو ان کے بزرگ پوجتے چلے آئے تھے۔ اور اس طرح سارا ہندوستان توہمات اور بطلان کے ایک سیلاب میں غرق ہوگیا۔ ابتدا بودھوں نے جیورکشا کے جوش میں ہون کی بھی ممانعت کردی تھی۔ اس وقت تک گھر گھر بخورات جلائے جاتے تھے۔ اگن کنڈ میں آگ جلتی رہتی تھی اور اس کے سوا پرستش کے اور لوازمات رائج نہ تھے۔ مگر بودھوں نے یہ رواج مٹاکر ان کی جگہ عالیسان منادر اور نمائشی طریق عبادت اور زاہدانہ طمطراق اور عالی شان خانقاہوں کا رسم پھیلایا۔ جن کے بچے کھچے اثرات اب بھی موجود ہیں۔ جب میں آج کل کے مصنفین کو جنھیں زیادہ تحقیق سے کام لینا چاہئے تھا یہ لکھتے ہوئے پاتا ہوں کہ بودھ نے برہمنوں کی بت پرستی کا خاتمہ کردیا تو مجھے ہنسی سی آتی ہے۔ انھیں اس کی مطلق خبر نہیں کہ بودھ مت ہی نے ہندوستان میں بت پرستی کی بنیاد ڈالی۔ جگن ناتھ کا مندر بودھوں کا ایک پرانا مندر ہے۔ ہم نے اس پر اور اس کے ساتھ اور بھی کتنے ہی

مندروں پر دوبارہ ہندو پن کی قلعی کی۔ خیر۔ باوجود اہنسا کی تعلیم کے باوجود رفیع اخلاقی معیار کے باوجود ان موشگافیوں کے جو پرماتما کے آدی، یا انادی ہونے کے متعلق ہوتی رہتی تھی۔ بودھ مت کی/عالیشان عمارت منہدم ہوگئی اور اس کے درودیوار شکستہ کی جیسی مٹی پلید ہوئی اس کا ذکر فضول ہے۔ انتہا درجہ کا کراہیت آمیز طریق پرستش۔ انتہا درجہ کی فحش کتابیں اور مذہب کے پردے میں انتہا درجہ کی غلیظ حرکتیں یہ سب بودھ مت کے زوال کے تبرکات ہیں۔

لیکن بھارت ورش کو دنیا میں ابدتک قائم رہنا تھا۔ اور ایشور نے پھر اوتار لیا وہ جس نے فرمایا تھا کہ ''جب کبھی نیکی کو زوال ہوتا ہے تو میں دنیا میں آتا ہوں۔'' پھر آیا اب کی بار یہ شرف جنوبی ہند کو حاصل ہوا۔ وہ نوجوان برہمن جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ سولھویں ہی سال میں اس کی تمام اعجاز نما تصنیفیں مکمل ہوگئی تھیں جنوبی افق سے آفتاب درخشاں بن کر نکلا۔ یہ تصنیفات آج تک عجائب روز گار ہیں۔ سری شنکر اچارج کا معیار یہ تھا کہ ہندوستان کو اس اخلاقی رتبہ پر پہنچائیں جہاں وہ ابتدا آفرینش میں تھا۔ خیال کیجیے کیسی نظر وسیع اور ہمت بلند تھی۔ میں نے اس وقت کی حالت کا چند لفظوں میں ذکر کیا ہے۔ یہ تمام نقائص تمدن اور معاشرت جنھیں آج ہم اور آپ دائرہ اصلاح میں لانا چاہتے ہیں اسی اخلاقی ادبار کے زمانہ کے آثار ہیں۔ بلوچی، تاتاری اور دنیا کی دوسری قومیں ہندوستان میں آئیں اور بودھ مذہب میں داخل ہوکر ہمارے ساتھ رہنے سہنے لگیں۔ ان کے مراسم اور معاشرت کا اثر ہمارے طرز تمدن پر اس حد تک پڑا کہ ہماری قومی زندگی مکروہ ترین حرکات و خیالات کا ایک صفحہ عظیم بن گئی۔ قوم کی یہ حالت گویا نوجوان شنکر کو بدھوں سے ترکہ میں ملی اور ویدانت آج تک اسی زمانہ کے بوئے ہوئے کانٹے کاٹ رہا ہے۔ شنکر نے اپنے زبردست فلسفہ کے زور سے ثابت کر دکھایا کہ ویدانت اور بودھ مت کی حقیقتوں میں بہت زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ لیکن شاگردوں نے استاد کا مطلب نہ سمجھا اور آتما و پرماتما کے وجود سے منکر ہوگئے۔ یہ تھا سری شنکر کی تعلیم کا ماحصل اور بودھ لوگ اپنے پرانے مت میں پھر آنے لگے۔

تب سری رامانج نے جنم لیا۔ شاید سری شنکر باوجود حیرت انگیز ذہنی قوتوں کے ایسی وسیع نگاہ نہ رکھتے تھے۔ رامانج کا دل زیادہ فراخ تھا۔ نیچ ذاتوں کے درد سے ان

کا سینہ لبریز تھا۔ انھوں نے طریق عبادت کے اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور حشو و زائد کو خارج کرکے ان کے بجائے نئے نئے مراسم جاری کیے۔ کیونکہ قوم کا جزواعظم بلا ظاہری مراسم کے نہ رہ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے روحانی عبادت کا دروازہ برہمن اور ملیچھ دونوں کے لیے یکساں طور پر کھول دیا۔ یہ تھا سری رامانج کا مشن اور اس مشن کا دائرہ وسیع ہوتے ہوتے شمال تک جا پہنچا۔ وہاں کے چند بزرگوں نے اس کی اعانت کی۔ اور رامانج کے زمانہ سے روحانیت کے معبد کو مرجع خاص و عام بنانے کی مسلسل کوششیں ہوتی آئی ہیں۔ جتنے اولیا اور رشی سری رامانج کے بعد آئے ان سبھوں نے یہی رویہ اختیار کیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شنکر پر کیوں نیچ ذاتوں کو علٰیحدہ رکھنے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ مجھے ان کی تمام تصانیف میں اس الزام کی تائید نہیں ملتی۔ غالبًا اس کا سبب یہ ہے کہ بدھ بھگوان کے پیروؤں کی طرح سری شنکر کے عقیدت مندوں نے بھی ان کا مطلب نہ سمجھا۔

اب میں شمالی ہندوستان کے اس تقدس مآب رشی چیتن کا تذکرہ کرکے تقریر کا خاتمہ کرتا ہوں جو سری رامانج کے پرزور حامی تھے۔ وہ خود ذات کے برہمن تھے۔ علما کے گھرانے میں پیدا ہوئے اور منطقی مباحث میں اپنا وقت صرف کرنے لگے۔ یہی ان کی زندگی کا شعار تھا مگر یکایک کسی رشی کی دعا نے ان کی زندگی کی رفتار پلٹ دی۔ انھوں نے لفظی مباحث سے کنارہ کیا اور بھگتی کے اعلٰی درجہ کے گرو بن گئے۔ انھیں لوگ دیوانہ چیتن کہا کرتے تھے۔ وہ گوپیوں کی دیوانگی کے عاشق تھے۔ ان کی بھگتی کی لہر بنگال میں شرق سے غرب تک پھیل گئی۔ ان کا جذبہ محبت وسیع تھا۔ اس کی کوئی انتہا نہ تھی۔ نیک اور بد۔ ہندو و مسلمان۔ اونچ اور نیچ سبھی ان کی محبت اور ہمدردی میں شریک تھے اور آج بھی اگرچہ ان کا مت دنیا کی ہر شے کی طرح ابتری کی حالت میں آ گیا ہے۔ تاہم ابھی تک کتنے ہی بے ذات ہندو قوم کے مظلوم آدمی ان کے نام لیوا باقی ہیں۔

سری شنکر اچارج کا دماغ وسیع تھا اور سری رامانج کا دل مگر اب ایک ایسے رشی کے جنم لینے کا وقت آ گیا جس کا دل و دماغ دونوں وسیع ہو۔ جو ایک ہی قالب میں شنکر کا دماغ اور چیتن کا غیر محدود دل رکھتا ہو۔ جو ہر ایک فرقہ میں ایک ہی پرماتما کی

قدرت کا جلوہ دیکھے۔ جس کی آنکھیں غربا اور مساکین مظلوم اور خستہ حال آدمیوں کی حالت پر آنسو بہائیں۔ جسے ہر فرد بشر سے خواہ ہندوستانی ہو یا غیر ہندوستانی یکساں ہمدردی ہو۔ اور جس کی طبع عالی ایسے بلند خیالات کا منبع ہو جو تمام متضاد فرقوں اور ذاتوں کو صلح اور محبت کے رشتہ میں منسلک کرے اور ایک ایسا مذہب وجود میں لائے جو دل و دماغ دونوں کے لیے باعث تقویت ہو۔ وہ نفس عالی ہندوستان کی خاک پاک سے اٹھا اور مجھے اس کی صحبت سے فیض اٹھانے کا عرصہ تک شرف حاصل رہا۔ اس کی زندگی کا کام ایک ایسی سرزمین پر شروع ہوا جو مغربی روش پر فریفتہ ہو رہی تھی۔ جہاں کا ہر شخص مغربی خیالات کے پیچھے دیوانہ بنا ہوا تھا۔ جن پر ہندوستان کے دوسرے شہروں کے مقابلہ میں یوروپ کا جادو زیادہ اثر کرگیا تھا۔ یہ مرد کامل امی محض تھا۔ اسے اپنا نام لکھنے کی بھی قابلیت نہ تھی مگر یونیورسٹی کے بڑے بڑے علما اور پروفیسر اس کی وسعت معلومات پر متحیر ہوجاتے تھے۔ وہ عجیب و غریب آدمی تھے۔ ان کے سوانح زندگی بہت طول ہیں۔ اور مجھے آج اتنی فرصت نہیں کہ ان کا ذکر کروں۔ سری رام کرشن کا نام آج آفتاب کی طرح چمک رہا ہے۔ اور غور کیجیے کہ کتنی زبردست روحانی طاقت ان کے ذریعہ سے اپنا کرشمہ دکھا رہی ہے۔ ایک مفلس پوجاری کا لڑکا جو ایک آبادی سے دور کے گاؤں میں پیدا ہوا آج یوروپ اور امریکہ میں ہزاروں آدمیوں کا معبود بنا ہوا ہے۔ اور کل لاکھوں اس کے نام پر عقیدت سے سر جھکائیں گے۔ اگر وقت آیا اور موقع ملا تو میں اپنے مرشد کا تذکرہ آپ لوگوں سے زیادہ تفصیل کے ساتھ کروں گا۔ اس وقت صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اگر میری زبان سے ایک لفظ بھی صداقت کا نکلا ہے تو اسی ذات پاک کی فیضان محبت کا اثر ہے۔

''ادیب'' فروری ۱۹۱۰ء

ہندوستانی مصوری

ہندوستان کی قومی بیداری کا سب سے اہم اور مبارک نتیجہ وہ بینک اور کارخانے نہیں ہیں جو گذشتہ چند سالوں میں قائم ہوئے اور ہوتے جاتے ہیں۔ نہ وہ تعلیم گاہیں جو ملک کے ہر ایک حصہ میں وجود پذیر ہوتی جاتی ہیں۔ بلکہ وہ فخر جو ہمیں اپنے قدیم صنعت و حرفت اور علم ادب پر ہونے لگا ہے اور وہ احترام جس سے ہم اپنے ملک کے قدیم صنعتی یادگاروں کو دیکھنے لگے ہیں۔ ہم اب ہومر اور ملٹن کو اقلیم سخن کا بادشاہ نہیں مانتے۔ بلکہ سعدی اور کالیداس کو یہی خود داری ہر ایک صیغہ میں نمایاں ہے۔ ہمارا قدیم فن تعمیر اور نقاشی کبھی قدردانی کا محتاج نہیں رہا۔ وہ اب بھی دنیا میں حیرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس کے جو کچھ آثار دستبرد روزگار سے بچ رہے ہیں وہ اس فن میں ہم کو ہمیشہ بے عدیل ثابت کرتے رہیں گے۔ مگر ہمارا قدیم فن تصویر عرصہ درراز سے قعر گمنامی میں پڑا رہا اور نہ صرف یورپ کے محققین نے یہ نتیجہ نکال لیا تھا کہ ہندوستان میں اس فن کو کبھی فروغ نہیں حاصل ہوا۔ بلکہ ہندوستانی بھی اس خیال میں ان کے شریک ہوگئے تھے۔ مگر اس قومی بیداری نے ہمارا خیال اس فن کی طرف رجوع کردیا ہے اور جہاں چند سال پہلے ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو یقین کے ساتھ کہہ سکے کہ ہندوستان نے اس فن میں بھی کمال حاصل کیا تھا وہاں آج ہزاروں ہندوستانی ایسے ہیں جو اپنے قدیم فن تصویر کی قدر کرنے لگے ہیں۔ اور وہ آسانی سے اس بات کو ہرگز تسلیم نہ کریں گے کہ اس فن لطیف کو کمال پر پہنچانے کا سہرا اطالیہ کے سر ہے۔ جس دماغ نے فن شعر اور تعمیر میں معجزے دکھائے وہ فن تصویر میں کیوں کرقاصر رہ سکتا ہے۔ یہ تینوں فنون باہم اس قدر مربوط ہیں کہ ایک کا فروغ پانا اور دوسرے کا وجود میں نہ آنا غیر ممکن ہے۔ گویہ ممکن ہے کہ فن شعر کے مقابلے میں نقاشی اور تصویر نگاری

کی نشو و نما زیادہ دنوں میں ہو۔ شکر ہے کہ اتنے دنوں کی بے خبری کے بعد ہمارے دلوں میں اس فن کی قدر کرنے کا احساس پیدا ہوا ہے۔ اور اس کے لیے ہم کو کلکتہ کے باکمال مصور بابو رونددر ناتھ ٹھاکر کا مشکور ہونا چاہیے انھوں نے طرز قدیم پر رنگ جدید کا روغن دے کر ہندوستان کے جدید فن تصویر کی بنیاد ڈال دی ہے اور یوروپین مصوروں کی نقالی کی ذلت سے اس فن کو بچا لیا ہے۔ ان کے کئی شاگرد جن میں سے بعضوں کی تصویریں یورپ اور ہندوستان میں بڑے اعزاز کی نگاہوں سے دیکھی گئی ہیں۔ انھیں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ اس اسکول کا اخلاقی معیار بہت رفیع ہے اور وہ اپنی تصاویر پر قوم کے بہترین خیالات اور جذبات کا عکس پیدا کردیتا ہے جو ہر ایک ملک کے فن تصویر کی جان ہے۔ بابو صاحب ممدوح کی تصاویر زیادہ تر تاریخی اور مذہبی ہوتی ہیں ۔ کالیداس کے رپ سنگھار کے بھی کئی مناظر آپ نے اپنے زور قلم سے کھینچے ہیں۔ مگر یہ تصویریں خواہ ادبی ہوں یا تاریخی ان کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ قومیت کے جذبہ سے مالامال ہوتی ہیں۔ سیلون کے مشہور مبصر ڈاکٹر آنند کمار سوامی نے بھی ہمارے فن تصویر کو گوشۂ تاریک سے نکالنے میں زبردست کوشش کی ہے۔

گذشتہ تین چار سال سے آپ نے اسی مبحث پر ہندوستان اور یورپ کے نامی رسالوں میں متعدد پرزور مضامین لکھے ہیں اور قدیم فن تصویر کے کتنے ہی ایسے نمونے پیش کردیے ہیں جن سے یہ خیال جم جاتا ہے کہ اس فن میں کبھی ہم کو بھی کمال تھا۔ یہ انھیں کی پرزور تنقیدوں کا اثر ہے کہ یورپ میں ہمارے فن تصویر کا کچھ کچھ چرچا ہونے لگا ہے اور شاید اس مبحث پر آیندہ جو کتاب لکھی جائے گی اس کا مصنف ہندوستانی فن تصویر کو اتنی حقارت سے نہ دیکھ سکے گا کہ اس کا ذکر ہی نہ کرے۔ انھیں حضرات کے تحریک اور اثر سے لندن کے چند نامور مصوروں اور مبصروں نے ایک انجمن قائم کی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہندوستانی فن تصویر کی تحقیقات اور یورپی مصورانہ مذاق میں ہندوستانی تصاویر اور جذبات کے سمجھنے کی قابلیت پیدا کرے۔ اور ہماری قدیم تصاویر کو جمع اور شائع کرنے کا انتظام کرے۔ ابھی حال ہی میں میجر برڈووڈ صاحب نے ہندوستانی فن تصویر کو نشانہ ملامت بنایا تھا اور اس سرزمین کو نشو و نما کمال کے لیے مضر قرار دیا تھا۔ یہ حضرت بہت عرصہ تک ہندوستانی صنعت اور حرفت

کے مدح خواں رہے ہیں اور کئی مستند کتابیں اسی مبحث پر لکھی ہیں۔ مگر جب آپ کی زبان سے یہ خیالات نکلے تو لوگوں کی آنکھیں کھلیں۔ لیکن ان کی عملی تردید اسی انجمن کے اراکین نے کی۔ انھوں نے انگریزی اخباروں میں ایک تحریر شائع کی جس میں برڈووڈ کے بے گانگی مذاق کا پردہ فاش کیا گیا تھا۔ افسوس ہے کہ یہ تحریر جتنے اصحاب کے نام سے شائع ہوئی ان میں صرف دو ہندوستانی نام نظر آتے تھے باقی سب انگریز تھے۔ایسی انجمن کا لندن میں قائم ہونا اس امر کی زبردست دلیل ہے کہ ہندوستانی فن تصویر کی محاسن کے قدردان جتنے انگریز ہیں، اتنے ہندوستانی نہیں۔ ہمارے تعلیم یافتہ ہم وطن اپنے ذاتی مشاغل میں اس حد تک منہمک ہیں کہ انھیں ان مسائل کی طرف متوجہ ہونے کی مطلق فرصت نہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارا نصاب تعلیم تزئین اور تربیت مذاق کے ذرائع سے بالکل عاری ہے اور ہماری طبیعتوں میں وہ احساس نہیں جو اپنے کارنامہ ہائے سلف پر زندہ دلانہ فخر کرے۔ کیا یہ عبرت کا مقام نہیں ہے کہ یورپ اور امریکہ کے سیاح جو چند ہفتوں کے لیے ہندوستان آئیں اور اجنتا اور سانچی کی زیارت کرنا اپنا فرض سمجھیں اور ہندوستانیوں کو اپنے اجداد کے ان صنعتی معجزات کے ملاحظہ کرنے کی فرصت اور توفیق نہ ہو۔

ہندوستانی فن تصویر تاریخی حیثیت سے تین قرنوں میں منقسم ہوتا ہے ۔ متقدم، متوسط اور جدید۔ پہلا دور سنہ عیسوی کے دو سال قبل سے عیسیٰ کی ساتویں صدی تک ختم ہوتاہے۔ یہ زمانہ بودھوں کے عروج کا تھا بودھوں نے نقاشی اور تعمیر کے فنون کو جس کمال تک پہنچایا اس پر آج ساری دنیا کے لوگ حیرت کرتے ہیں۔ مگر وہ مزاولت جو فن تصویر میں انھیں حاصل تھی عام طور پر معلوم نہیں اور نہ اس زمانہ کی تصاویر اتنی تعداد میں موجود ہیں جن سے ان کے کمال کا عام طور پر اندازہ کیا جاسکے۔ اس دور کی سب سے قابل قدر اور مشہور یادگار غار اجنتا کی تصاویر ہیں۔ یہ غار جو تعداد میں انیس ہیں غالبًا دوسری اور ساتویں صدی کے درمیان تعمیر ہوئے اور انھیں بودھوں کے نقاشی، معماری اور مصوری کے ابتدائے بلوغیت اور کمال کی تاریخ سمجھنا چاہیے۔ یہ عام طور پر لوگ جانتے ہیں کہ یہ غار سلطنت نظام کے جنوبی حصہ میں واقع ہیں۔ اس زمانہ کے مصوروں اور نقاشوں نے اس غار کی سقف اور دیواروں کو اپنے کمال کے نمونوں سے

آراستہ کیا تھا۔ مورتیں اور گلکاریاں اب تک اچھی حالت میں ہیں۔ مگر اکثر تصویریں سرد مہری روزگار سے مٹ گئیں۔ تاہم بعض اب تک قائم ہیں۔ یہ تصاویر اس زمانے کے طرز معاشرت آداب اور اخلاق اور رسم و رواج کی مبسوط تاریخ ہیں۔ ان تصاویر میں اعضا کا تناسب، انداز کی بے تکلفی اور جذبات کی واقعیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ یورپ کے مبصران فن نے ان تصاویر کی دل کھول کر داد دی ہے۔ اور انھیں اطالیہ کے چودھویں صدی کی تصاویر کا مدمقابل ٹھہرایا ہے۔ ان تصاویر کا مضمون زیادہ تر بودھ مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر کہیں کہیں اہم تاریخی اور تمدنی حالات بھی بڑی خوبی سے دکھائے گئے ہیں۔ اس دور کی ایک حیرت ناک خصوصیت یہ ہے کہ جہاں کہیں اس زمانہ کی تصویریں موجود ہیں، ان سبھوں میں ایک خاص امتیازی یکسانیت اور ہم رنگی پائی جاتی ہے گویا سب ایک ہی اسکول کے صناعوں کا کام ہے اور یہ یکسانیت صرف ہندوستان تک محدود نہیں۔ مقام سگریا میں جو جزیرہ سیلون میں واقع ہے۔ چھٹی اور ساتویں صدی کی تصویریں پائی گئی ہیں۔ وہ اجنتا کی تصویروں سے بہت مشابہ ہیں۔ جزیرہ جاورا میں اس دور کی تصاویر کا سراغ ملا ہے اور ان میں بھی وہی یک رنگی اور خصوصیت پائی گئی ہے۔ اکثر نقادان فن کا خیال ہے کہ یہ مشابہت اس سے ذرا بھی کم نہیں ہے جو فی زمانہ یورپین فن تصویر میں پائی جاتی ہے۔ یورپ کی یک رنگی مذاق کا راز سمجھ میں آجاتا ہے کیونکہ اس کے بے شمار ذرائع موجود ہیں۔ مگر اس دور قدیم میں مذاق کا یکساں ہونا جن امور پر مبنی تھا، ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے چونکہ بودھ فن معماری اور تصویر کا گہوارہ بہار تھا۔ ضرور ہے کہ بہار کے کاریگر ہندوستان کے ہر ایک خطہ میں گئے ہوں گے اور سارے ملک میں ایک ہی رنگ کا رواج پیدا ہوا ہوگا جو صدیوں تک تدریجی ترقی کے ساتھ جاری رہا۔ مگر یہ صرف ایک معمولی قیاس ہے جس کی تصدیق کرنے کا کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے۔ ساتویں صدی کے بعد ہندوستانی فن تصویر کے رخ زیبا پر ایک تاریک پردہ سا پڑ جاتا ہے اور شاہان مغلیہ کے عہد تک اس کا کچھ حال نہیں معلوم ہوتا۔ نہ اس درمیانی دور کی تصویریں ملتی ہیں جو زبان حال سے اپنا کچھ قصہ سنائیں۔ اس درمیان میں ملک کی بالکل کایا پلٹ ہوگئی۔ بودھ مذہب بیخ و بن سے اکھڑ گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کی معماری، نقاشی اور تصویر نگاری نے بھی

ہندوستان کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ ملک کے شمالی حصہ میں اسلامی حملہ آوروں نے قدم جمالیے ہیں اور بالآخر ملک کا بڑا حصہ ان کے زیر نگیں ہوگیا ہے۔ ان انقلاباتِ عظیم پر طرہ یہ کہ ہندوستان کے ان نئے تاجداروں کو تصویر نگاری سے نفرت تھی۔ جسے مجتہد لوگ کفر خیال کرتے تھے۔ ایسی حالت میں تصویر نگاری کا فروغ پانا تو درکنار زندہ رہنا محال تھا۔ کچھ تو ان کی سخت گیریوں اور کچھ اس بے اطمینانی اور ہلچل سے جو ایسے ملکی انقلابات کا لازمی نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ ہندوستانی فن تصویر اگر مطلقاً مٹ نہیں گیا تو مٹنے کے قریب ضرور ہوگیا۔

شہنشاہ اکبر کے زمانہ تک ہم کو اس فن کے نشو ونما کی مطلق خبر نہیں ہوتی۔ مگر اکبر کا زمانہ ہمہ گیر ترقیوں کا زمانہ تھا۔ فن تصویر نے بھی اس میں نمایاں حصہ لیا۔ اکبر گو خود علم سے بے بہرہ تھا مگر اس کو قدرت نے وہ قابلیتیں عطا کی تھیں جن پر کتابی علم کوئی اضافہ نہیں کرسکتا۔ اس کو موسیقی اور نقاشی تاریخ اور ادب تصویر اور معماری سے یکساں شغف تھا۔ فتح پور سکری میں اس نے جو عمارتیں بنوائیں ان میں ہندو اور مسلمان طرز تعمیر کو اس نفاست سے ملایا ہے کہ اس کی معمارانہ نگاہ پر حیرت ہوتی ہے۔ ہندو مصوروں کی اس نے بڑی قدر کی۔ ایک موقع پر اس نے ان کی نسبت کہا تھا: ”ان کی تصویریں ہمارے تخیلات سے بالاتر ہوتی ہیں۔“ اس سے واضح ہوتا ہے کہ تاوقتیکہ ہندو مصوروں کے فن میں خاص اوصاف نہ ہوتے۔ اکبر جیسا باریک بیں شخص جو فارس کے مصورانہ کمال سے واقف تھا۔ ہرگز ایسا نہ کہتا۔ اس کی سچی مصورانہ قدر دانی کا ثبوت ان الفاظ سے ملتا ہے۔

> ”ایسے بہت سے لوگ ہیں جو مصوری سے نفرت رکھتے ہیں۔ میری نگاہ میں ایسے آدمیوں کی کچھ وقعت نہیں مجھے ایسا گمان ہوتا ہے کہ مصور کو معرفت حق کے خاص مواقع حاصل ہیں۔ کیونکہ جب مصور جانداروں کی شبیہیں اتارتا اور ان کے اعضا کی ترتیت کرتا ہے تو اس کے دل میں یہ خیال ضرور آتا ہے کہ میں قالب میں جان نہیں ڈال سکتا اور اس طرح خدا کی عظمت اور قدرت اس کے دل میں جاگزیں ہوجاتی ہے اور وہ عارف کے رتبہ کو پہنچ

جاتا ہے۔"

فتح پور سیکری کے بعض محلوں کی دیواروں پر، بالخصوص اکبر کی خواب گاہ میں اس زمانہ کے تصاویر کے کچھ مٹے ہوئے آثار باقی ہیں۔ مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اس دور کی سب سے بیش بہا یادگار کتابی تصویریں ہیں۔ ناظرین کو اوپر معلوم ہوا ہوگا کہ بودھوں کے زمانہ میں تصویریں دیواروں پر بنائی جاتی تھیں۔ کاغذ پر تصویر کھینچ کر چوکھٹوں سے آراستہ کر کے انھیں دیواروں پر لٹکانے کا رواج اس وقت کیا اکبر کے زمانہ تک نہیں تھا۔ یہ رواج یورپ سے آیا ہے۔ عہد مغلیہ تک دیواروں پر تصویر بنانے کا رواج کم و بیش باقی تھا۔ مگر اس کا زوال اسی زمانہ میں شروع ہوگیا۔ چنانچہ اس دور کی سب تصاویر کتابوں کی شکل میں ہیں۔ مگر اس رواج قدیم کا ہندوستان میں اب تک کچھ کچھ نشان باقی ہے اور اب بھی بعض بعض پرانے وضع کے مکانات کی دیواروں پر ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، مچھلی، سپاہی، پیادے وغیرہ کی رنگین تصویریں نظر آجاتی ہیں۔ ہاں اب یہ فن بہت بدمذاق ہاتھوں میں آگیا ہے اور اس کے قدرداں اب معدودے چند ہیں۔ دور مغلیہ کی تصاویر کا ذکر کرتے ہوئے یورپ کا ایک پختہ مغز نقاد لکھتا ہے:

> "ان کی فطرت نگاریوں میں وہ پرشوق ولولہ موجود ہے جو اس نئے زمانے کی تصاویر مناظر قدرت میں نظر آتا ہے اور دھوپ چھاؤں کی جانفزا کیفیات دکھانے کا انھیں خاص ملکہ تھا۔ جہاں مصور نے انسانی شبیہیں اتاریں وہاں اس کے جسد انسانی کے پر غور مطالعہ کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کی باریک نگاہی، اس کے مشاہدے کی صفائی اس کا کمال خط کشی اور اس کے چہرے سے جذبات دل کے اظہار کی قابلیت نے باہم مل کر ایسی تصویریں بنائی ہیں جو مغرب کے چھوٹے پیمانے کی بہترین تصاویر سے آنکھ ملا سکتی ہے۔"

مگر اکبر کا زمانہ تصویر کے انتہائے عروج کا زمانہ نہیں تھا۔ یہ فخر شاہ جہانی عہد کو حاصل ہے۔شاہ جہاں اس فن کا پرجوش قدرداں تھا۔ مغلیہ خاندان کے زوال اور خاتمہ کے ساتھ فن تصاویر کا بھی زوال اور خاتمہ ہوگیا ۔ وہ ملوک گردی جو اس خاندان کے

زوال کے بعد ملک پر مسلط ہوئی فن تصویر کے حق میں جانگزا ثابت ہوئی۔ اٹھارہویں صدی کے آخر تک اس فن کی حالت ردی ہوتی گئی۔ آخر انیسویں صدی میں مغربی تہذیب اور فن کی کورانہ غلامی نے ہمارے اس فن کا قصہ تمام کردیا۔

عہد مغلیہ کے دفاتر تصاویر بالعموم غیرمذہبی ہیں۔ ان میں تاریخ دنیا کے ایک معرکتہ الآرا زمانے کی معاشرت اور اخلاق کا عکس کھنچا ہوا نظر آتا ہے۔ کہیں مصور عشق اور محبت کا فسانہ اور رزم و بزم کی داستان سناتا ہوا نظر آتا ہے۔ کہیں امرا دربار اور ان کے معشوقوں کی شبیہیں اور ان کی پرلطف صحبتوں کا جلوہ دکھاتا ہے۔ کبھی کبھی اس کی نگاہ تخلیہ کے ان مواقع پر جا پہنچتی ہے جہاں عام آنکھوں کی رسائی نہیں۔ کہیں پہلوانوں کے خم ٹھونکنے کی آواز کانوں میں آتی ہے۔ اور کہیں شکار گاہ کا نظارہ پیش نظر ہوجاتا ہے۔ میکشان حقیقت اور ان کے شیشہ و جام کے نظارے بھی خال خال دکھائی دیے جاتے ہیں۔ الغرض اس دور کا فن تصویر اول سے آخر تک شاہی دربار کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ جس کا مقصد شوقین امرا کی نفاست پسند طبیعتوں کو خوش کرنا ہے۔ ان تصاویر میں اکثر واقعہ نگاری کی انتہا کی حدیں کھنچ گئی ہیں۔ مصور واقعات پر ایسی اصلیت کا رنگ چڑھاتا ہے اور ایسی امتیازی نفاست کے ساتھ کہ کہیں نغمہ مجلس کی دلکش صدا کانوں میں آنے لگتی ہے۔ کہیں ان رشک فردوس باغچوں کی ہوائے جانفزا اور پھولوں کی فرحت بخش خوشبو دل و دماغ کو تازہ کردیتی ہے۔ جہاں پرستان کی پریاں باریک ریشمی لباس زیب بر کیے نغمہ دستار کا لطف اٹھا رہی ہیں۔

ان تصاویر میں ایک اور خصوصیت ان کے حاشیہ کی نفیس مرصع کاری ہے۔ اکثر نہایت خوش رنگ خوبصورت پھول بنائے جاتے تھے۔ جو اس زمانہ کی سنگ مرمر کی گلکاریوں سے بہت ہی مشابہ ہیں۔

رنگ آمیزی میں اس دور کے مصوروں کو کمال تھا۔ وہ بالعموم آبی رنگ استعمال کرتے تھے۔ اس زمانہ میں رنگوں کی ترکیب اہل فن خود کرلیتے تھے۔ بسا اوقات وہ رنگ آمیزی کے لیے مثلاً برش وغیرہ حتی کہ مطلوبہ کاغذ بھی خود ہی بنا لیتے تھے۔ زمین عموماً سفید چینی مٹی سے تیار کی جاتی تھی۔ بعض نمونوں میں صرف خاکوں ہی پر اکتفا کی گئی ہے۔

اس موقع پر عہد مغلیہ کی صرف تین تصویریں دی جاتی ہیں۔[1] پہلی تصویر ایک تاریخی واقعہ کی ہے۔ جہانگیر کا زمانہ ہے۔ فارس سے سفارت آئی ہے۔ اس زمانہ کے رواج کے مطابق سفیر بادشاہ کے لیے بیش قیمت گھوڑے اور بیش بہا تحائف ساتھ لائے ہیں۔ بادشاہ سلامت ابھی نمودار نہیں ہوئے۔ دونوں سفیران خاص انتظار میں سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔ ان کے چہرہ سے ادب اور احترام نمایاں ہے۔ نوبت خانہ میں شاہی خیر مقدم کا راگ الاپا جا رہا ہے۔ صحن دربار میں اراکین سلطنت مودبانہ طرز سے ایستادہ ہیں۔ اس عکسی نقل سے اصل تصویر کے کمال کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ مگر تصویر کے دیکھنے سے دل پر شاہی رعب اور جلال کا احساس ہوتا ہے۔ نوبت خانہ کا سین مصور کا جز نگاہی کی پرزور دلیل ہے۔

دوسری تصویر جہانگیر یا شاہ جہاں کے زمانہ کے کسی متصدی یا منشی کی ہے۔ اس تصویر میں مصور نے شبیہ نگاری کو کمال پر پہنچا دیا ہے۔ دھوپ اور چھاؤں ایسے استادانہ انداز سے ملائے گئے ہیں کہ تصویر میں ایک پیکر سنگ کی شان آ گئی ہے۔ چہرہ کی متانت بہت موزوں ہے۔ اور شانوں کا جھکاؤ کہے دیتا ہے کہ کاغذوں کی بوجھ نے میری یہ گت بنا رکھی ہے۔ جن لوگوں کو یورپ کے مشہور چہرہ نگار مثلاً رمبرانٹ کی تصاویر کے عکسی نقلوں کے دیکھنے کا موقع ملا ہے وہ خود فیصلہ کرسکتے ہیں کہ اس تصویر کا ان کے مقابلہ میں کیا پایہ ہے۔

تیسری تصویر ہند و مذہبی رنگ میں ہے۔ یہ دور اکبری کے ہندو مصوروں کے کمال کا نمونہ ہے۔ رات کا وقت ہے تصویر میں دل آویز متانت اور راحت بخش سکون موجود ہے۔

اما[2] اپنی دو سکھیوں کے ساتھ شیو کی پرستش کے لیے آئی ہیں۔ داہنے جانب شیو جی کی مورت جلوہ افروز ہے۔ اوپر سے پانی کی ایک پتلی دھار مورتی کے اوپر گرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہ گنگا ہیں جو پہلے شیو جی کے فرق مبارک سے گزر کر زمین پر

---

[1] اس مضمون کے ساتھ زمانہ کے اس شمارہ میں یہ تین رنگین تصویریں بھی شائع ہوئی تھیں۔

[2] اما راجہ وکش پرجا کی لڑکی تھی۔ شیو جی سے انھیں عشق تھا۔ ان کی عقیدت سے بالآخر شیو جی خوش ہوگئے اور ان کی مراد بر آئی۔

آتی ہیں۔ اما کے چہرہ سے ناقابل بیان عقیدت کا اظہار ہو رہا ہے اور تصویر مجموعی طور پر ناظر کے دل پر ایک پاک پراطمینان اثر پیدا کرتی ہے۔

افسوس ہے کہ عہد مغلیہ اور قرون وسطیٰ کے ہندوستانی فن تصویر کی اب تک اہل یورپ اور نیز ہندوستان نے وہ قدر نہیں کی جس کی وہ مستحق ہیں۔ ان کے جمع کرنے اور ان کے کمالات ظاہر کرنے کی اب تک کوئی باقاعدہ اور وسیع کوشش نہیں کی گئی۔ مگر اس کا سبب یہ ہرگز نہیں کہ اس زمانہ کی تصویریں معدوم ہیں۔ بلکہ جن کے آباو اجداد کے خیال اور معاشرت کے وہ مخازن ہیں وہ خود ان کے محاسن اور اہمیت سے بے خبر ہیں۔ ہندوستانی فن تصویر پر اس وقت تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں وہ سب اہل یورپ نے لکھی ہیں۔ اور یہ قدرتی بات ہے کہ وہ یورپین فن تصویر کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کے فن کو ہیچ سمجھیں یہ بہت قابل شرم مگر واقعی امر ہے کہ ہندوستانی فن کے قدرداں ہندوستان میں اتنے نہیں ہیں جتنے یورپ میں ۔ اور شاید اہل ہند اس پر غور کرنا اس وقت تک نہ سیکھیں گے جب تک کہ اہل یورپ اس کی سفارش نہ کریں گے۔

''زمانہ'' اکتوبر ۱۹۱۰ء

رنجیت سنگھ

ہندوستان کے فرماں روایان سلف میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جس پر یورپین مورخوں اور محققوں نے اس قدر شرح و بسط سے بحث کی ہو جس قدر پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ پر۔ ان کے عادات و اخلاق، ان کی انصاف پروری ان کی دلاوری، ان کے حسن انتظام، ان کی پرجوش مہمان نوازی اور ایسے ہی دیگر صفات کے متعلق روزانہ اتنی روایتیں مشہور ہوتی رہتی تھیں کہ یورپ کے منچلے مصنفوں اور سیاحوں کے دل میں خود بخود ایک جوش پیدا ہوتا تھا کہ چل کر ایسے عجیب اور باکمال شخص کو دیکھنا چاہیے۔ ان میں سے جو آتا وہ مہاراج کے اوصاف حمیدہ کا ایسا گہرا اثر دل پر لے کر جاتا جو دفتر کے دفتر تعریفوں سے رنگنے پر بھی ختم نہ ہوتا تھا۔ یورپ میں سراج الدولہ، میر جعفر، اور شاہان اودھ کے حالات پڑھ پڑھ کر یہ عام خیال ہوگیا تھا کہ ہندوستان میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ اعلیٰ رتبہ کا مدبر اور منتظم پیدا کرسکے۔ زیادہ سے زیادہ وہاں کبھی کبھی لوٹیرے سپاہی البتہ نکل کھڑے ہوتے ہیں اور بس ۔ مگر مہاراج کی ذات نے اس عام خیال کی بڑے زور کے ساتھ تردید کردی اور اہل یورپ کو دکھا دیا کہ نامور اشخاص پیدا کرنا کسی خاص ملک یا قوم کا حصہ نہیں ہے بلکہ ایسے نفوس بابرکات ہر قوم اور ہر زمانہ میں وجود پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اور باوجودیکہ رنجیب سنگھ کے اکثر سوانح نگاروں پر اس عام متعصبانہ خیال کا اثر باقی ہے اور ان کا مطالعہ کرنے میں وہ اس خیال کو علیٰحدہ نہیں کرسکے۔ تاہم جو کچھ مہاراج کی ذاتی خوبیوں نے ان کے قلم سے بزور لکھوالیا ہے وہ اس امر کو پایہ ثبوت تک پہنچا دیتاہے کہ اٹھارہویں صدی میں ایسا انسان بجز نپولین بونا پارٹ کے اور کوئی نہیں پیدا ہوا۔ بلکہ ان حالات اور واقعات کو دیکھتے ہوئے جن کے دائرہ میں رنجیت سنگھ کو کام کرنا پڑا یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاید

نپولین میں بھی وہ قابلیتیں نہ تھیں جو مہاراج کی ذات میں مجتمع ہوگئی تھیں۔ فرانس ایک آزاد اور خود مختار ملک تھا وہاں کے فلاسفروں نے عوام میں جمہوری خیالات پھیلا دیے تھے۔ نپولین کو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کرنا پڑا کہ موجودہ اور تیار مصالحہ کو مجتمع کر کے ان سے ایک عمارت کھڑی کرلی۔ اس کے برعکس ہندوستان صدیوں سے پامال ہو رہا تھا اور رنجیت سنگھ کو ان لوگوں سے سابقہ پڑا جو مدت ہائے دراز تک ہندوستان کی قسمتوں کے مالک رہ چکے تھے۔ بیشک بہ حیثیت ایک فوجی سپہ سالار کے نپولین کا رتبہ اعلیٰ تر ہے۔ مگر ملکی انتظام و انصرام کی قابلیتوں میں مہاراج رنجیت سنگھ اس سے بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان کی قائم کردہ سلطنت ان کے بعد زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی تو اس میں ان کا کچھ قصور نہیں۔ اس کی جوابدہ وہ باہمی نفاق وہ آپس کی پھوٹ ہے جس نے ہمیشہ ہندوستان کو ذلیل وخوار کیا اور جسے مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی دلوں سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔

رنجیت سنگھ کی پیدائش اور طفولیت کا زمانہ بڑی ہلچل اور حرکت کا زمانہ تھا وہ سکھ قوم جو گرو گووند سنگھ کے دل و دماغ سے نکلی تھی، اور جسے کئی شہیدوں نے بیش بہا خون سے سینچ کر جوان کیا تھا دلاوری اور سپہ گری کے میدان میں اپنے پھریرے لہرا چکی تھی۔

۱۸۶۲ء سے جب کہ سکھوں نے سرہند کا قلعہ جیتا۔ اور جسے احمد شاہ ابدالی بھی ان سے نہ چھین سکا سکھوں کا اختیار اور اقتدار رو بہ عروج تھا۔ مگر وہ قومیت کا جذبہ جو چند دنوں کے لیے سکھوں میں موجزن ہوگیا تھا، رخصت ہوچکا تھا۔ فرقہ بندیوں کی گرم بازاری تھی متعدد مسلین قائم ہوگئی تھیں اور ان میں شب و روز خون ریزیاں ہوتی رہتی تھیں جس خاص مشن کو لے کر سکھ قوم پیدا ہوئی تھی، وہ مشن اگرچہ کسی حد تک پورا ضرور ہوا تھا، مگر قبل اس کے کہ مشن میں پوری کامیابی ہو سکھوں میں خود منتشر و متفرق کرنے والی طاقتوں نے زور پکڑ لیا۔ اور ان کا خاص مشن نظر انداز ہوگیا۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں حالت بہت نازک ہو رہی تھی۔ خود سری اور سرکشی کا راج تھا۔ جس شخص نے اپنے گرد لوٹیرے سپاہیوں کی ایک جماعت قائم کرلی وہ اپنے کسی کمزور پڑوسی سردار کو نیچا دکھا کر اپنی چند روزہ طاقت کی بنیاد ڈال دیتا تھا اور

جلد یا دیر میں اسے خود کسی اپنے سے زیادہ طاقتور شخص کے لیے جگہ خالی کرنا پڑتی تھی، نہ کوئی قانون تھا، نہ کوئی باقاعدہ انتظام، امن و امان یتیم بچوں کی طرح جائے پناہ ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ ہر ایک گاؤں کا راجہ جدا، قانون جدا، اور دنیا جدی تھی، اخوت سکھ مذہب کی ایک نمایاں صفت ہے اور نہ صرف سکھ مذہب کی بلکہ ہر ایک مذہب میں انسانی اخوت کی تعلیم موجود ہے، یہ اعلیٰ اور پاک تعلیم ہے، کسی انسان کو کیا حق ہے کہ وہ دوسروں کو اپنا محکوم بنائے۔ اور ان کے وجود سے خود فائدہ اٹھالے، دنیا کی برکات میں ہر شخص کا حصہ برابر ہے۔ جس وقت تک سکھ قوم نے اس اخوت کی قدر کی، اسے برتا اور اس پر عمل کیا۔ اس وقت تک ان کی طاقت زور پکڑتی گئی۔ مگر جب غرور اور نفسانیت طمع اور نمود نے ان کے دلوں میں گھر کرلیا۔ دولت اور اختیار کی چاٹ پڑی تو اخوت کو ناقابل برداشت صدمہ پہنچا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہتیں قائم ہوگئیں اور بھائیوں میں خونریزیاں ہونے لگیں۔ گرو گووند سنگھ نے اخوت کا جوش پیدا کیا۔ مگر اس باہمی ہمدردی کا جوش نہ پیدا کرسکے جو اخوت کے لیے محافظ جان کا کام کرتی۔

رنجیت سنگھ ۱۷۸۰ء میں بمقام گوجرانوالہ پیدا ہوئے یہ عام خیال ہے کہ ان کے والد ایک مفلس زمیندار تھے۔ مگر یہ خیال درست نہیں ان کے والد سردار مہان سنگھ سکر چکیا مسل کے سردار اور بڑے مقتدر شخص تھے ان کا ۲۷ ہی سال کے سن میں انتقال ہوگیا۔ رنجیت سنگھ اس وقت کل ۱۰ سال کے تھے۔ اور اسی سن میں ان کے سر پر خطرناک ذمہ داریوں کا بوجھ آپڑا۔ مگر اکبر کی طرح رنجیت سنگھ بھی انصرام و انتظام کی قابلیت ماں کے پیٹ سے لے کر نکلے تھے اور اسی سن میں اپنے والد کے ساتھ کئی مہموں میں شریک بھی رہ چکے تھے۔ ایک روز ایک خونریز لڑائی میں وہ بال بال بچ گئے۔ گویا ان کی طفولیت میدان جنگ ہی میں گزری، اور اسی محاربات کے مدرسہ میں ان کی تعلیم ہوئی۔ آٹھ دس سال کا بچہ اس کی آنکھوں سے روز کشت و خون کے نظارے گزرتے ہوں گے۔ اپنے کنبہ کے بڑے بوڑھے آدمیوں کو چوپال میں بیٹھ کر کسی پڑوسی سردار پر حملہ کرنے کے منصوبے باندھتے۔ یا کسی طاقتور حملہ سے بچنے کی تدبیریں سوچتے دیکھتا ہوگا اور یہ مشاہدات اس کے اثر پذیر دل پر کیا کچھ نقش نہ

ہوجاتے ہوں گے۔ بعد کے واقعات نے ثابت کردیا کہ یہ کمسن لڑکا ذہین اور طباع تھا۔ اسے جو کچھ سبق ملے وہ اس کے وجود کا جزو بن گئے، اس نے جو کچھ دیکھا سبق گیر نگاہوں سے دیکھا، ۱۲ سال کی عمر میں وہ سکر چکیا مسل کے سردار قرار دیے گئے۔ اور بیسویں سال میں کچھ اپنی جوانمردی اور کچھ شطرنج بازی سے لاہور کے راجہ بن بیٹھے اس کی کیفیت دلچسپی سے خالی نہیں ۱۷۹۸ء میں احمد شاہ ابدالی کا پوتا اپنے جد بزرگوار کے فتوحات پر تصرف کرنے کے ارادہ سے ہندوستان پر چڑھا۔ اور لاہور تک چلا آیا۔ اس کا قصد تھا کہ یہاں مقیم ہوکر ملحق مقامات سے خراج وصول کرے۔ مگر اسی اثنا میں اسے اپنے وطن میں شورش پیدا ہونے کی خبر ملی ۔ وہ گھبرا کر لوٹا۔ جھیلم طغیانی پر تھا، بار برداری کا انتظام خراب، اس کی کئی توپیں اس کے ساتھ نہ جاسکیں ۔ حسن اتفاق سے رنجیب سنگھ کہیں قریب ہی تھے۔ شاہ زماں سے ملے تو اس نے کہا اگر تم میری توپیں فارس بھجوادو تو اس کے صلہ میں تمھیں لاہور دے دوں رنجیت سنگھ نے یہ شرط بڑی خوشی سے منظور کرلی۔ حالانکہ شاہ زماں کا یہ وعدہ مہمل تھا۔ اور اگر رنجیت سنگھ خود طاقتور نہ ہوتے تو اس سے مطلق فائدہ نہ اٹھا سکتے مگر اس کے ذاتی وقار اور اثر پر شاہ زماں کا یہ وعدہ قند مکرر ہوگیا۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد رنجیت سنگھ نے امرتسر پر بھی قبضہ کرلیا اور اب اس کی شوکت اور طاقت کے آگے سب سکھ مسلیں ماند پڑ گئیں۔

رنجیت سنگھ پر یورپین سوانح نگاروں نے خود غرضی، دغا، بے رحمی اور بیوفائی کے فتوے صادر کیے ہیں کسی حد تک ان کے فتوے درست ہیں۔ ملکی معاملات میں بزرگان سلف نے بھی کسی حد تک شطرنج بازی اور سختی کی اجازت دی ہے جسے دوسرے الفاظ میں بیوفائی اور بے رحمی کہہ سکتے ہیں بلا ان تدابیر کے سلطنت کا نیا پودھا کبھی جڑ نہیں پکڑ سکتا۔ رہی خود غرضی یہ الزام ہر فرد بشر پر بالعموم اور ہر ایک راجہ پر بالخصوص عائد ہوسکتا ہے۔

آج تک کسی قوم میں کوئی ایسا بادشاہ نہیں ہوا اور شاید مستقبل میں بھی نہ ہوسکے جس نے کسی قوم پر محض نیک نیتی، فلاح انسانی یا رفاہ عام کے خیال سے حکومت کی ہو۔ بلکہ ہمیں اس کے ماننے میں بھی تامل ہے کہ آیا یہ نیک نیتی خود غرضی پر غالب

بھی تھی۔ خود غرضی حکومت کے مفہوم میں شامل ہے یہ بھی خیال رہے کہ رنجیت سنگھ کے قول و فعل اور طرز سیاست کو موجودہ معیار سے پرکھنا انصاف سے بعید ہے۔ سو برس گزرے جبکہ رنجیت سنگھ نے لاہوری دربار کے اسٹیج پر اپنے پارٹ کھیلے اور ان سوسالوں میں تہذیب و روشنی اخلاقی اور حسن معاشرت نے بڑی تیزی سے قدم بڑھائے ہیں۔ ہر ایک زمانہ میں معیار اخلاق تبدیل ہوتا رہتا ہے وہ فعل جو آج سے سو برس پہلے جائز سمجھا جاتا تھا، آج ناجائز ہے اور ممکن ہے کہ اکثر افعال جنھیں ہم آج بے جھجک کرتے ہیں آج کے سو سال بعد شرمناک خیال کیے جانے لگیں۔ سو سال کا زمانہ تو بہت ہوتا ہے۔ ابھی پچیس سال سے زیادہ نہیں گزرے کہ ہولی کے دنوں میں ہر ایک شہر کے عشرت پسند رؤسا کو طائفوں کے ساتھ۔ نشہ میں مست۔ گلیوں کی سیر کرتے ہوئے دیکھنا ایک معمولی نظارہ تھا، مگر اب یہ شرمناک خیال کیا جاتا ہے بلکہ کوئی شریف آدمی آج شراب پیکر پبلک میں نکلنے کی جرأت نہ کرے گا۔ ان قیود کو مدنظر رکھ کر اگر رنجیت سنگھ کے قول و فعل کو جانچیں تو ہم یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ فرماں روایانہ معیار سے دیکھتے ہوئے ان سے بہت کم فعل ایسے سرزد ہوئے جن پر انھیں نادم ہونا پڑے۔ مگر فرماں روایانہ معیار کی شرط ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ اعلیٰ درجہ کے مستقل مزاج، جفاکش اور مآل اندیش شخص تھے۔ ان کی ہمتوں نے ہار ماننا سیکھا ہی نہ تھا۔ جفا کشی کا یہ عالم کہ اکثر ان کے دن گھوڑے پر سوار گزر جاتے۔ ذہانت کا مادہ ان میں بڑا زبردست تھا، اگرچہ کتابی علم سے بالکل بے بہرہ تھے۔ مگر مکالمہ اور مشاہدے سے اپنی استعداد یہاں تک بڑھالی تھی کہ یورپ کے سیاحوں کو بھی ان کی وسعت معلومات پر حیرت ہوتی تھی۔ مردانگی ان کی سرشت میں داخل تھی۔ اور مردانگی کے تذکرے بالخصوص سیاحانہ مردانگی کے واقعات انھیں بہت مرغوب تھے۔ یورپ کی نئی ایجادوں اور تحقیقاتوں سے واقف رہنے کی انھیں جستجو رہتی تھی۔ ان کا لباس بہت سادہ اور مصنوعات سے خالی ہوتا تھا اور گو خود حسین نہ تھے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ کریہ منظر تھے۔ اور قد و قامت کے لحاظ سے بھی بہت خوش نصیب آدمیوں میں نہ تھے مگر ان کے حسن صفات نے ان ظاہری عیوب کو ڈھک لیا تھا۔ ان کے چہرہ پر چیچک کے بدنما داغ تھے۔ اور ایک آنکھ بھی اسی کے نذر

ہو چکی تھی۔ مگر باوجود اس کے ان کے چہرہ پر ایک جلال برسا کرتا تھا۔ فقیر عزیز الدین دربار لاہور میں وزارت خارجیہ کے عہدہ پر مامور تھے۔ ایک بار وہ سفارت لے کر لارڈ بنٹنگ کی خدمت میں آئے تھے۔ دوران گفتگو میں لارڈ ممدوح نے فقیر سے پوچھا کہ مہاراج کی کون سی آنکھ جاتی رہی ہے۔ فقیر نے اس کے جواب میں کہا "جناب! میرے آقا نامدار کے چہرہ پر وہ جلال ہے کہ ہم میں سے کسی کو اتنی جرأت ہی نہیں ہوئی کہ ان کی طرف آنکھ اٹھا سکے۔" جواب اگرچہ مبالغہ سے خالی نہیں ہے۔ تاہم اس سے اس رعب کا پتہ چلتا ہے جو اراکین دربار کے دلوں پر چھایا ہوا تھا۔

رنجیت سنگھ مادر زاد منتظم تھے۔ ان میں کوئی ایسی صفت، کوئی ایسی طاقت، کوئی ایسی کشش تھی جو بڑے بڑے سرکش اور خود پسند آدمیوں کو بھی ان کی اطاعت پر مجبور کردیتی تھی۔

انسان کو پرکھنے کا ان میں بڑا زبردست ملکہ تھا اور ان کی کامیابی بڑی حد تک اسی خاصہ پر مبنی تھی۔ کون شخص کس کام کو بوجوہ احسن انجام دے سکتا ہے اس کا تصفیہ کرنا معمولی کام نہیں ہے۔ شاہجہاں، جہانگیر اورنگ زیب بڑے بڑے بادشاہ تھے۔ مگر ان کی سلطنت میں آئے دن بغاوتیں اور سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔ اور صوبہ داروں کی تہدید کے لیے اکثر دہلی سے فوجیں روانہ کرنا پڑتی تھیں۔ رنجیت سنگھ کے عہد سلطنت میں ایسے واقعات شاذ و نادر ہوتے تھے۔ یہ حیرت انگیز ہے کہ اس خانہ بر انداز زمانہ میں بھی ان کے ملازمین کتنی وفاداری سے ان کی خدمت کرتے تھے۔ مہاراج مذہبی بے تعصبی کی زندہ مثال تھے اور بالخصوص ملازمین شاہی کے انتخاب میں وہ تعصب کو مطلق دخل نہ دیتے تھے۔ اس پالیسی میں وہ اکبر سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔ سکھوں کو مسلمانوں سے کوئی فیض نہ پہنچا تھا، بلکہ مسلمانوں نے ان کا وجود مٹانے میں کوئی کوشش باقی نہیں رکھی تھی۔ مگر رنجیت سنگھ ان تنگ خیالیوں سے بالکل پاک تھے۔ ان کے دربار میں کئی معزز عہدوں پر مسلمان مامور تھے۔ فقیر عزیز الدین نور الدین، امام الدین سب کے سب اونچے عہدوں پر تھے۔ برہمن کھتری، راجپوت غرض ہر ایک فرقے سے انھوں نے انصرام سلطنت میں مدد لی۔ انسانی جوہر انھیں جہاں نظر آیا اس کی قدر کی۔ راجہ دینا ناتھ، دیوان حکم چند، رام پال مصر، دیوان سانول مل یہ دربار لاہور کے اراکین

خاص میں تھے اور بڑی بڑی مہموں پر مامور تھے، رنجیت سنگھ کی دقیقہ رس نگاہوں نے تاڑ لیا تھا کہ اگر انصاف اور سلامت روی کے ساتھ حکومت کرنی ہے تو بلا ان فرقوں کی امداد کے کام نہ چلے گا جو مدت ہائے دراز سے انتظام سلطنت میں حصہ لیتی آئی ہیں۔ اس وقت تک سکھوں نے بجز میدان جنگ کے انصرام سلطنت میں اپنی قابلیتوں کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ چنانچہ فوجی عہدے زیادہ تر سکھوں کے ہاتھ میں تھے اور دیوانی اور مال کے مسلمانوں، برہمنوں، کھتریوں اور کایستھوں کے ہاتھ میں تھے۔ مگر جنگی مہمات کے سپہ سالار اکثر متذکرۂ بالا اراکین ہی قرار دیئے جاتے تھے۔ اس وقت سے اب تک سکھ راجاؤں نے اس بے تعصبی کو نبھانا اپنا اصول قائم کر رکھا ہے، بالخصوص، نابھا، پٹیالہ، کپور تھلہ اور جھنڈ میں جو سکھوں کی سب سے بڑی ریاستیں ہیں یہ وسیع خیال نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ البتہ اسلامی ریاستوں میں کیفیت اس کے برعکس ہے، بہ استثناء حیدرآباد دکن کے جہاں عہدہ وزارت پر ایک ہندو صاحب مامور ہیں اور شاید کوئی ایسی ریاست نہیں ہے جہاں اس مذہبی وسیع الخیالی سے کام لیا گیا ہو۔ ہندوؤں کو متعصب اور تنگ خیال کہنا آسان ہے مگر واقعات اس کے بالکل مخالف ہیں، ابھی حال ہی میں مہاراج جے پور نے عہدہ وزارت پر ایک مسلمان صاحب کو مشرف کیا ہے، کیا یہ ہندوؤں کی تنگ خیالی ہے۔

اس زمانہ میں اکثر کم نگاہ فرماں رواؤں کا یہ قاعدہ تھا کہ جب حریف پر غالب آجاتے تو یا تو اسے خاک میں ملا دیتے۔ یا اس کے ساتھ ایسی ملتحیان کرتے جس سے اس کے دل میں انتقام اور حسد کی آگ بھڑکتی رہتی تھی۔ رنجیت سنگھ کی پالیسی اس معاملہ میں انسانیت اور شرافت کی پالیسی تھی جو اگرچہ موجودہ رواج کے مطابق معمولی طرز عمل ہے۔ مگر اس پرآشوب زمانہ کا خیال کرتے ہوئے بہت ہی غیر معمولی بات تھی، وہ اپنے حریف پر غالب آنے کے بعد اس کے ساتھ ایسے حسن سلوک اور خاطر داری سے پیش آتے کہ وہ ان کی دوستی کا دم بھرنے لگتا تھا اور سختیوں کے بجائے اسے مراعات اور الطاف کی زنجیر میں باندھتے تھے۔ ملتان پر جب کئی محاصرہ کے بعد ان کا قبضہ ہوا۔ اور نواب مظفر خاں اپنے پانچ بیٹوں اور تین سو عزیزوں کے ساتھ قلعہ کے دروازہ پر مارا گیا تو رنجیت سنگھ نے نواب کے دو باقی لڑکوں کو دربار میں بلا لیا

ان کے وظیفے مقرر کردئے، اور دربار میں ان کے لیے اعزاز کی جگہ مخصوص کردی۔ اسی طرح محمد یار خان تیوانہ اور دیگر فرقوں کے مغلوب سرداروں کے ساتھ بھی انھوں نے شرافت کا برتاؤ قائم رکھا۔ ایسا شاید ہی کبھی ہوا ہو کہ دشمن پر غالب آنے کے بعد رنجیب سنگھ نے اسے زندہ دیوار میں چنوا دیا ہو، بر سر عام تہ تیغ کرادیا ہو۔ یا اس سے کینے کا بخار نکالا ہو۔ بسا اوقات انھیں مغلوبوں پر راجہ کی نظر عنایت زیادہ ہوتی تھی۔ جنھوں نے ان کا مردانہ اور جانبازانہ مقابلہ کیا ہو، وہ خود دلیر تھے اور دلیروں کی قدر کرتے تھے، جودھ سنگھ وزیر آباد کا ایک سکھ سردار تھا۔ راجہ کسی وجہ سے اس پر ناراض تھے اور اس کی سرزنش کرنی چاہتے تھے مگر یہ منظور نہ تھا کہ اس کے لیے ایک فوج بھیجی جائے، پس راجہ نے جودھ سنگھ کو حیلہ سے دربار میں بلایا، اور اسے گرفتار کرنا چاہا جودھ سنگھ نے فوراً تلوار کھینچ لی اور مرنے مارنے کے لیے تیار ہوگیا۔ راجہ اس کی مردانگی پر اس قدر خوش ہوئے کہ اسی جگہ اس سے بغل گیر ہوگئے اور جب تک جودھ سنگھ زندہ رہا اس سے شرط وفا نباہی۔

رنجیت سنگھ سے قبل سکھوں کی فوج بیشتر سواروں کی ہوتی تھی اور پیدل حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اس کے برعکس یورپ میں جنگ کا دارومدار پیادہ فوج پر تھا اور ہے۔ انگریزی پیدل کو ہندوستانی سواروں کے مقابلہ میں بارہا نمایاں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر راجہ نے بھی اپنی فوج کی کایا پلٹ کردی، سواروں کے بجائے پیدل فوجیں ترتیب دینی شروع کیں اور ان کی ترتیب کے لیے فرانس اور اٹلی کے آزمودہ کار جنرل مامور کیے جن میں سے کئی افسر نپولین بونا پارٹ کے طلسمی محاربات میں شریک رہ چکے تھے جنرل ونچور ان میں سب سے زیادہ ہوشیار تھا۔ ان افسروں کی تعلیم نے سکھ پیدل کو یورپ کی بہترین فوجوں کا مقابل بنا دیا تھا۔ پنجاب کے منتخب جوان پیادوں میں بھرتی کیے جاتے تھے اور راجہ کی یہ کوشش رہتی تھی کہ اس صیغہ کو زیادہ مقبول بنایا جائے۔ سکھ پیدل کی جفاکشی کا یہ حال تھا کہ مہینوں تک متواتر بیس میل منزلیں روزانہ طے کرسکتی تھی۔ راجہ کی کل فوج تقریباً ایک لاکھ تھی اور جاگیر داروں کی ملاکر سوا لاکھ۔

رنجیت سنگھ کے ممالک محروسہ پنجاب خاص و درمیان ستلج و اندس کشمیر، ملتان ڈیرہ

جات، پیشاور اور سرحدی اضلاع شامل تھے اگرچہ سلطنت بہت وسیع نہ تھی۔ مگر اس میں ہندوستان کے وہ خطے شامل تھے جو طبعی کیفیات کے لحاظ سے دشوار گزار تھے اور جہاں کی آبادی دلیر سرکش اور دغا باز ہے، یہ خطہ ہندوستان کے بادشاہوں کے لیے ہمیشہ پریشانیوں اور مشکلات کا مخزن ثابت ہوا ہے، مغل بادشاہوں کے زمانہ میں اکثر مہمیں بھیجنی پڑتی تھیں جو نتائج کے لحاظ سے بہت ہی ناقابل قدر، مگر مصارف اور خونریزیوں کے لحاظ سے معرکۃ الآرا ہوتی تھیں۔ یہ خطہ متعصب اور جاہل مسلمان فرقوں سے آباد ہے جو تعلیم اور تہذیب سے بالکل بے بہرہ ہیں اور جن کی زندگی کا ماحصل، چوری، ڈاکہ اور لوٹ ہے اور باوجودیکہ اس خطہ پر پچاس سالوں سے انگریزی سلطنت کی خوش آیند برکتیں پھیلی ہوئی ہیں مگر وہ ابھی تک جہالت اور تاریکی کے اسی غار میں ڈوبا ہوا ہے اور جب کبھی موقع پاتا ہے سرحد کے ہندوؤں کو اور اگر ہندو نہ ملے تو مسلمانوں کو اپنے وحشیانہ جذبات کا نشانہ بناتا ہے۔ رنجیت سنگھ کو ان فرقوں سے بہت نقصانات اٹھانے پڑے۔ آزمودہ کار افسر اور منتخب فوجیں اکثر انھیں سرحدی مناقشات کے نذر ہوجاتی تھیں، یوں تو چھیڑ چھاڑ بارہوں ماس ہوتی رہتی تھی مگر تحصیل لگان کا زمانہ دیگر الفاظ میں جنگ و جدل کا زمانہ ہوتا تھا۔ رنجیت سنگھ کو اگر جنوب میں توسیع سلطنت کے وسائل ہاتھ آتے تو شاید وہ ان سرحدی مقامات کی طرف متوجہ نہ ہوتے۔ کیونکہ ان پر حکومت کرنا درد سر مول لینا ہے۔ مگر دکن میں برٹش گورنمنٹ نے ان کے فتوحات کی حد کھینچ دی تھی اور پٹیالہ، نابھا، جند وغیرہ ریاستوں کو اپنے زیر اثر بنالیا تھا۔ فنون لطیفہ اور ترقی علوم کے لحاظ سے رنجیت سنگھ کا عہد سلطنت قابل ذکر نہیں۔ ان کی زندگی استحکام سلطنت کی کوششوں ہی میں صرف ہوگئی۔ فن تعمیر اور سنگ تراشی کی وہ یادگاریں جن سے عہد مغلیہ کا نشان اب تک قائم ہے۔ وجود پذیر نہ ہوسکیں کیونکہ یہ پودے باغ امن میں اگتے اور سرسبز ہوتے ہیں۔ جنھوں

رنجیت سنگھ کی خانگی زندگی، قابل رشک نہیں کہی جاسکتی۔ اس لحاظ سے انھوں نے ان کمزوریوں میں حصہ وافر پایا تھا۔ جو اس زمانہ تک رؤسا اور شرفا کے لیے تمغہ افتخار سمجھی جاتی تھیں اور جن سے رئیسوں کا طبقہ اب بھی پاک نہیں ہے ان کے نو منکوحہ رانیاں تھیں اور نو مدخولہ، کنیزوں کی تعداد صدہا تک پہنچی تھی۔ منکوحہ رانیاں اکثر ذی اثر

سکھ خاندانوں کی بیٹیاں تھیں جنھیں ان کے والدین نے اپنا پولیٹیکل وقار بڑھانے کے لیے حرم میں داخل کیا تھا۔ اس لیے حرم سرا میں اکثر سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔ مے نوشی بھی اس وقت سکھ رؤسا کی ایک عام کمزوری تھی اور راجہ بلا کے مے نوش تھے۔ ان کی شراب غایت درجہ کی تیز ہوتی تھی۔ اسی کثرت شراب سے وہ کئی بار فالج کے شکار ہوئے اور آخری حملہ مہلک ثابت ہوا۔ یہ حملہ ۱۸۳۰ء کے موسم سرما میں شروع ہوا اور سال بھر کے بعد آخر جاں ہی لے کر گیا۔ مگر اس مہلک مرض میں مبتلا ہوکر بھی مہاراج سلطنت کے ضروری فرائض انجام دیتے رہے اس شیر کا جس کا للکار سے پنجاب اور افغانستان کانپ اٹھتا تھا۔ اب ایک سکھپال میں سوار ہوکر فوجوں کے قواعد دیکھنے کے لیے جانا نہایت درد ناک نظارہ تھا ہزاروں آدمی ان کے دیدار کے لیے دو رویہ سڑکوں پر جمع ہوجاتے۔ اور انھیں اس حالت میں دیکھ کرغم اور مایوسی کے اشک بہاتے آخر پیغام مرگ آپہنچا۔ ۲۷رجون ۱۸۳۹ء کو مہاراج نے شہزادہ کھرگ سنگھ کو بلاکر اپنا جانشین اور راجاہ دھیان سنگھ کو وزیر قرار دیا۔ ۲۵ لاکھ روپے غربا اور مساکین کوتقسیم کیا اور شام کے وقت جب رنواس میں چراغ روشن ہو رہے تھے مہاراج کی شمع حیات بجھ گئی۔ دھیان سنگھ کو وزارت پر مامور کرنا ان کی آخری اور زبردست غلطی تھی۔ شاید اس وقت دیگر جسمانی قواء کی طرح قوت تمیز بھی ضعیف ہوگئی تھی۔ مہاراج کی وفات کے بعد چھ سال تک طوفان اور طوائف الملوکی کا زمانہ تھا۔ کھرگ سنگھ اور اس کا لڑکا نونہال سنگھ دونوں قتل کردے گئے پھر شیر سنگھ گدی پر آیا۔ اس کا بھی یہی حشر ہوا، اور آخری سکھ فرماں روا انگریزی سرکار کا وظیفہ خوار ہوگیا۔ اور وہ عالی شان عمارت جو رنجیت سنگھ نے کھڑی کی تھی چھ ہی سالوں میں منہدم ومنتشر ہوگئی۔

''زمانہ'' مئی ۱۹۱۱ء

ہندو فنِ حکمت

(ماخوذ از ''ہندو سوپیریارٹی'' مصنفہ پنڈت ہر بلاس ساردا)

ہندو قوم نے دیگر علوم مثل ہیآت، ریاضی اور صرف و نحو کی طرح فن طبابت کو بھی درجہ کمال تک پہنچا دیا تھا۔ ان میں قوت مشاہدہ بہت زبردست تھی۔ استقلال، ریاضت شاقہ، اور غور و خوض میں وہ بے عدیل تھے۔ ان قابلیتوں نے ہندوستان جیسے ملک میں جہاں انواع و اقسام کی جڑی بوٹیاں کثرت سے پیدا ہوتی ہیں، انھیں علم حکمت کی تحقیق و تدقیق اور نشو و نما میں ایک خاص حیثیت دے رکھی تھی۔ مگر سنسکرت لٹریچر کے ایک بڑے حصہ کے تلف ہوجانے کے باعث ہندوؤں کے طبی کمال کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ فلسفہ اور ادب میں اب تک زمانہ قدیم کی تصانیف موجود ہیں۔ مگر فن حکمت چونکہ عملی سائنس ہے اور مختلف اسباب نے عرصہ دراز سے اسے کوے گمنامی میں پڑا رہنے دیا اس لیے اس فن کی بے شمار تصانیف زائل ہوگئیں۔ تاہم جو چند کتب اب تک موجود ہیں وہ بھی اس ترقی کا پتہ دیتی ہیں جس سے زمانہ حال کی ترقیاں سبقت لے جانے کا دعویٰ نہیں کرسکتیں۔ ان کے مطالعہ سے یہ حقیقت روشن ہوجاتی ہے کہ دیگر علوم کی طرح یہ علم بھی ہندوؤں کے دماغ سے پیدا ہوا۔ اور دنیا کی دیگر قومیں اس لحاظ سے بھی ہماری ممنون منت ہیں۔

لارڈ ایمپتھل نے جو چند سال گزرے صوبۂ مدراس کے گورنر تھے اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا:

> ''اب ہم پر یہ حقیقت کھلنے لگی ہے کہ ہندو شاستروں میں بھی قوانین صحت موجود ہیں۔ جو زمانہ حال کے قوانین کی طرح پختہ

اصولوں پر مبنی ہیں اور ہندو قوم کا شیرازہ بند منو، حفظان صحت کے اصول و قواعد کا بہت بڑا عالم تھا۔"

پروفیسر ولسن فرماتے ہیں:

"زمانہ قدیم کے ہندوؤں نے علم حکمت اور جراحی میں بہت دستگاہ حاصل کی تھی اور یہ ایک قدرتی بات تھی۔ کیونکہ ان کی طبعی فراست و ذکاوت اور صبر آمیز محویت نے ان کی قوت مشاہدہ کو بہت تیز کردیا تھا، اور ان کے ملک کی وسعت اور زرخیزی نے ان کے مطالعہ اور تحقیقات کے لیے گوناں گوں اسباب مہیا کردئے تھے۔ وہ تشخیص امراض، اور علامات کی تمیز، بہت صحت کے ساتھ کرتے تھے اور ان کا طبی مبلغ علم بہت وسیع تھا۔"

ہندوستان کا مشہور انگریز مورخ سر ولیم ہنٹر لکھتا ہے:

"ہندوؤں نے فن حکمت کی پوری وسعت کا احاطہ کرلیا تھا۔ ان کی قدیم تصانیف میں اجسام کی ترکیب، اعضا، اعصاب، رگ وریشے، اور شرائیں کا تحقیق کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔ ہندو ادویات میں بیشمار اجزا شامل ہیں جو موالید ثلاثہ کے ہر ایک رکن سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اور جن میں سے اکثر ادویات اب یورپین اطبا بھی استعمال کرنے لگے ہیں۔ ان تصانیف میں مرکبات تیار کرنے کے بہت جدت آمیز طریقے بتلائے گئے ہیں اور خوراک اور مقدار کے متعلق جامع ہدایتیں کی گئی ہیں۔"

دھنونتری ہندوؤں کے فن طبابت کا آفتاب تھا۔ اس نے اپنے شاگرد سسرت کو اس فن کی تعلیم دی۔ چرک کہتا ہے کہ مجھے اگنویس رشی نے یہ فن سکھایا۔ سسرت اور چرک یہ دونوں ہندو حکمت کی زندہ جاوید تصانیف ہیں جو اپنے مصنفین کے نام سے مشہور ہیں۔

یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں نے ممکن ہے فن ادویہ میں دسترس بہم پہنچایا ہو۔ مگر فن جراحی یورپین ڈاکٹروں کا حصہ ہے مگر ذیل کے اقتباسات سے واضح ہوجائے گا کہ

جراحی اور تشریح بدنی میں بھی ہندؤں نے وہ قدرت حاصل کی تھی جو موجودہ فن جراحی کے لیے حقارت نہیں بلکہ رشک کا باعث ہے۔

مسٹر ویر رقمطراز ہیں:

فن جراحی میں بھی ہندوؤں نے مہارت تامہ حاصل کرلی تھی۔ اس صیغہ میں یورپین جراحی اور ڈاکٹر اس زمانہ میں بھی ان سے کچھ استفادہ کرسکتے ہیں۔ اور فی الواقع انھوں نے ناک اور کان بنانے کا ڈھنگ ہندؤں ہی سے سیکھا ہے۔

مشہور انگریزی مورخ الفنسٹن لکھتا ہے۔

ہندوؤں کا فن جراحی اتنا ہی مکمل ہے جتنا کہ ان کا فن طب۔

مسز مینگ جو سنسکرت لٹریچر سے کامل واقفیت رکھتی ہیں فرماتی ہیں ''ہندؤں کے آلات جراحی بہت تیز اور باریک ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ بال کو طولاً چیر سکتے تھے۔''

ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر فرماتے ہیں:

ہندو فن جراحی میں حسن عمل اور جدت دونوں باتیں موجود تھیں۔ وہ بلا خون ضائع کیے ہوئے اعضا کی قطع برید کرسکتے تھے۔ معدہ اور فم معدہ میں نشتر لگا سکتے تھے۔ بواسیر کو دور کرسکتے تھے۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑ سکتے تھے۔ اور جسم سے خارجی مادات کو نکالنے میں ہوشیار تھے۔ جراحی کا ایک خاص صیغہ ناک اور کان کے لیے وقف تھا۔ وہ بدنما، بھدے کان اور ناک کی اصلاح کرتے تھے اور بسا اوقات نئی ناک اور نئے کان بنا دیتے تھے جو یورپین جراحوں نے اب ان سے سیکھا ہے۔ شقیقہ کا علاج آج کل ابرو کے اوپر کی پانچویں رگ کو کاٹ کر کیا جاتا ہے۔ قدیم ہندوؤں نے بھی اس ترکیب کا ذکر کیا ہے۔ وہ جراحی کے آلات بنانے میں بہت صفائی سے کام لیتے تھے۔ اور طلبا کو جراحی کا عملی تجربہ کرانے کے لیے موم کو میز پر پھیلاکر، یا نباتات کے ریشوں سے یا مردہ جانوروں کے جسم سے کام لیا جاتا تھا۔ ہندو جراح فن

دایہ گری کے استاد تھے اور نہایت پیچیدہ اور نازک عملیات کو سر انجام دیتے تھے۔ جانوروں کے علاج میں انھوں نے بڑی ترقی حاصل کی تھی اور ہاتھی گھوڑے وغیرہ جانوروں کے علاج کے متعلق اب تک تصانیف موجود ہیں۔''

لارڈ ایمپتھل فرماتے ہیں:

''یہ شاید عام طور پر معلوم نہیں ہے کہ علم طبابت نے ہندوستان ہی میں جنم لیا۔ بیشک یہ فخر ہندوستان کو حاصل ہے۔ یہ علم اول یہاں سے عرب پہنچا اور عرب سے یورپ میں داخل ہوا، سترہویں صدی کے آخر تک یورپین اطبا اس فن کو عرب کے طبی تصانیف سے حاصل کرتے تھے۔ مگر عرب کے حکما نے ہزاروں برس پہلے یہ فن ہندوستان کے مشہور حکما مثلاً دھنونتری، چرک اور سسرت کے تصانیف سے حاصل کیا تھا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ دنیا کی ترقی کا مرکز مشرق سے مغرب کی سمت چلا اور ایسا غائب ہوا کہ مشرق میں اپنے وجود سابقہ کے نشانات تک نہ باقی رکھے۔''

سر ولیم ہنٹر لکھتے ہیں:

''عربی فن علاج سنسکرت تصانیف کے تراجم پر قائم کیا گیا ہے جو خلفا بغداد کے زمانہ میں کیے گئے۔ یورپ کے حکما سترہویں صدی کے آخر تک عربی حکمت کے دست نگر رہے اور ابوسینا اور ابو سرابی کے تصانیف میں چرک کا نام بار بار واقع ہوتا ہے۔''

ممکن ہے اشتباہ پیدا ہو کہ اہل عرب اپنے فن حکمت کے لیے ہندوؤں کے ممنون نہیں۔ ذیل کی تاریخی شہادتوں سے غالبًا یہ شک رفع ہوجائے گا۔

خلیفہ المنصور نے ۷۵۳ء اور ۷۷۴ء کے درمیان دمشق کو چھوڑ کر بغداد کو اپنا مستقر بنایا۔ اس نے سنسکرت کے طبی اور علمی تصانیف کے ترجمے کرائے۔ جن میں ایک نسخہ ''زہر'' کے متعلق شنک (یعنی چرک) کا لکھا ہوا اور ایک کتاب حکمت کی سرود

(یعنی سسرت) کی لکھی ہوئی موجود ہیں۔

مسٹر رائل اپنی کتاب ''ہندوؤں کا قدیم فن حکمت'' میں لکھتے ہیں ''ابو سراآبی نے جو عرب کا مشہور حکیم تھا چرک کا ذکر کیا ہے اور اسے اس فن میں سند مانا ہے۔''

ابو رازی نے جو ابو سراآبی سے فن حکمت میں سبقت لے گیا تھا اور المنصور کے دربار کا ایک رکن تھا دو موقعوں پر ''ہندو چرک، کو اپنے بیانات کی تائید میں بطور سند کے پیش کیا ہے۔

شیخ الرئیس بوعلی سینا حکما عرب کا سرتاج تھا۔ جونکوں، کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے سسرت کی بتلائی ہوئی چھ قسموں کا اعادہ کیا ہے۔ حتیٰ کہ نام بھی وہی رکھ دیے ہیں۔

میکس مولر صاحب لکھتے ہیں: ''فیروز شاہ نے نگر کوٹ فتح کرنے کے بعد سنسکرت طبی تصانیف کو ایاز الدین خالد سے عربی میں ترجمہ کرایا۔''

خلیفہ ہارون الرشید کے عہد سلطنت میں اہل عرب ہندو ادویات کو صرف استعمال ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ہندو حکما بغداد میں مدعو کیے جاتے تھے اور دربارشاہی میں اعزاز کی جگہ پاتے تھے۔ ابو عسیبہ بیان کرتا ہے کہ 'منکا' ایک ہندو تھا جو فن حکمت میں ماہر اور سنسکرت زبان کا عالم تھا۔ وہ ہندوستان سے عراق آیا۔ خلیفہ ہارون رشید کو ایک مرض سے نجات دی۔ 'زہر' کے متعلق چرک کی ایک کتاب کو فارسی میں ترجمہ کیا۔ اسی زمانہ میں اور کئی ہندو حکیموں کے بغداد میں رہنے کا ذکر کیا گیا ہے۔''

ہندو کیمسٹری کا عالم مورخ لکھتا ہے۔ ''رس رتن سمچے ہندو فن حکمت اور ادویات کی ایک جامع تصنیف ہے۔ اس کے مضامین کی عالمانہ ترتیب، اور حسن اسلوب پر کسی زمانہ حال کی تصنیف کو بھی فخر ہوسکتا ہے۔''

ناگ ارجن بودھ زمانہ کا ایک بڑا مشہور علم کیمیا کا ماہر ہوگزرا ہے۔ اس صنف میں اس نے ایک بیش قدر تصنیف اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک ایسا مرکب تیار کیا تھا جس کے استعمال سے انسان کئی صدیوں تک زندہ رہ سکتا تھا۔ عمر کا دل و دماغ اور جسم پر کچھ اثر نہ ہوسکتا تھا۔ ڈاکٹر رائے فرماتے ہیں ''ہم نے جو شہادتیں پیش کی ہیں ان سے اس امر کے متعلق کوئی شک نہیں باقی رہ سکتا کہ پارہ

کو بطور دوا کے استعمال کرنے کی خصوصیت حاصل کرنے میں ہندو مقدم تھے۔ معدنیات کا اندرونی استعمال انھیں کی ذات سے عام ہوا۔ اور وہ اس لحاظ سے موجد کہلائے جانے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ چرک اور سسرت نے معدنیات کے فوائد خوب دل کھول کر بیان کیے ہیں۔"

یونان میں پلائنی کے زمانہ تک پارہ کا استعمال غیر معلوم تھا۔ پلائنی نے خود پارہ کو زہر بتلایا ہے۔ معدنیات میں معالجانہ خصوصیات کی تحقیق، اور ان کا استعمال ہندو کمال فن کی زبردست دلیل ہے۔

مورخ الفنسٹن لکھتا ہے "ہندو وہ پہلی قوم تھے جنھوں نے معدنیات کا اندرونی استعمال ایجاد کیا۔ وہ لوگ صرف پارہ ہی نہیں، بلکہ بعض حالتوں میں سنکھیا بھی تجویز کیا کرتے تھے۔ ان کی کتابوں میں ۱۲۷ آلات جراحی کے نام دیے گئے ہیں۔"

مسز اینی بی سنٹ نے جنوری ۱۹۰۶ء میں بمقام کلکتہ اپنی ایک تقریر میں فرمایا۔

> طبعی اور کیمیائی علوم میں تم لوگوں نے (یعنی ہندوؤں نے) بہت ترقی کی تھی۔ علم شفا میں تم نے اور بھی زیادہ کامیابی حاصل کی۔ ہندوستانی ادویات، خواہ وہ یونانی ہوں یا مصرانی، مغرب کے فن حکمت پر فضیلت رکھتی ہیں۔

ہندو فن حکمت کی داد جس کشادہ دلی سے لارڈ امپتھل نے دی ہے اس کا یہاں اعادہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

> اسلامی فتوحات کے ساتھ علم حکمت کا بہت کچھ حصہ ہندوستان میں واپس آیا جو صدیوں پہلے اس ملک سے نکل چکا تھا۔ اب انگریز لوگ اس علم کا اور بھی زیادہ حصہ واپس لا رہے ہیں۔ جب ہم آب رسانی کی تجویزیں کرتے ہیں، جب ہم شفا خانے قائم کرتے ہیں، اور طبی مدارس کھولتے ہیں، جب ہم پلیگ کے انسداد کے لیے قوانین بناتے ہیں اور جب ہم صحت عامہ کی نگرانی کے لیے حکام کو تاکید کرتے ہیں تو ہم کوئی نئی، کوئی انوکھی بات نہیں کرتے۔ ہم صرف وہی کرتے ہیں جو ہزاروں برس پہلے کیا جاتا

تھا۔ اور جسے اب بجز مورخ، اور ماہرین آثار قدیمہ کے اور سب لوگ فراموش کر بیٹھے ہیں۔

چیچک کے ٹیکا لگانے کا رواج یورپ میں ڈاکٹر جنر نے ڈالا۔ وہ اس کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس کا کافی ثبوت موجود ہے کہ ٹیکا لگانے کا رواج ہندوستان میں ہزارہا برس پہلے معلوم تھا۔ ہندو حکمت کے خدا دھنونتری نے صاف الفاظ میں لکھا ہے۔

گائے کے تھن پر کی پھنسیوں کا مواد ایک نشتر کے نوک پر لے لو اور اس نشتر کو کندھے اور کہنی کے درمیان بازو میں چبھا دو۔ یہاں تک کہ خون نکل آئے۔ تب اس مواد کے خون میں ملنے سے چیچک کا بخار آجائے گا۔

یہ اگر چیچک کا ٹیکا نہیں تو اور کیا ہے۔ اسی طرح اور کتنی ہی علمی اور عملی حقیقتیں جنھیں اہل یورپ اپنا ایجاد سمجھے بیٹھے ہیں فی الواقع بازیافت ہیں۔

لارڈ ممدوح نے اپنی اسی تقریر میں آگے چل کر فرمایا

میں یہاں ایک تازہ تحقیقات کا تذکرہ کرنے سے باز نہیں رہ سکتا اور وہ یہ ہے کہ طاعون کے زمانہ میں مکان کو خالی کردینا اور کیمیائی طریق سے اس کی صفائی کرانا ان ہدایتوں سے مطلق مختلف نہیں ہے جو ہندو شاستروں میں کی گئی ہیں۔

''ادیب'' مارچ ۱۹۱۲ء

کو بطور دوا کے استعمال کرنے کی خصوصیت حاصل کرنے میں ہندو مقدم تھے۔ معدنیات کا اندرونی استعمال انھیں کی ذات سے عام ہوا۔ اور وہ اس لحاظ سے موجد کہلائے جانے کا دعویٰ کرسکتے ہیں۔ چرک اور سسرت نے معدنیات کے فوائد خوب دل کھول کر بیان کیے ہیں۔"

یونان میں پلائنی کے زمانہ تک پارہ کا استعمال غیر معلوم تھا۔ پلائنی نے خود پارہ کو زہر بتلایا ہے۔ معدنیات میں معالجانہ خصوصیات کی تحقیق، اور ان کا استعمال ہندو کمال فن کی زبردست دلیل ہے۔

مورخ الفنسٹن لکھتا ہے "ہندو وہ پہلی قوم تھے جنھوں نے معدنیات کا اندرونی استعمال ایجاد کیا۔ وہ لوگ صرف پارہ ہی نہیں، بلکہ بعض حالتوں میں سنکھیا بھی تجویز کیا کرتے تھے۔ ان کی کتابوں میں ۱۲۷ آلات جراحی کے نام دیے گئے ہیں۔"

مسز اینی بی سنٹ نے جنوری ۱۹۰۶ء میں بمقام کلکتہ اپنی ایک تقریر میں فرمایا۔

> طبعی اور کیمیائی علوم میں تم لوگوں نے (یعنی ہندوؤں نے) بہت ترقی کی تھی۔ علم شفا میں تم نے اور بھی زیادہ کامیابی حاصل کی۔ ہندوستانی ادویات، خواہ وہ یونانی ہوں یا مصرانی، مغرب کے فن حکمت پر فضیلت رکھتی ہیں۔

ہندو فن حکمت کی داد جس کشادہ دلی سے لارڈ امپتھل نے دی ہے اس کا یہاں اعادہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

> اسلامی فتوحات کے ساتھ علم حکمت کا بہت کچھ حصہ ہندوستان میں واپس آیا جو صدیوں پہلے اس ملک سے نکل چکا تھا۔ اب انگریز لوگ اس علم کا اور بھی زیادہ حصہ واپس لا رہے ہیں۔ جب ہم آب رسانی کی تجویزیں کرتے ہیں، جب ہم شفا خانے قائم کرتے ہیں، اور طبی مدارس کھولتے ہیں، جب ہم پلیگ کے انسداد کے لیے قوانین بناتے ہیں اور جب ہم صحت عامہ کی نگرانی کے لیے حکام کو تاکید کرتے ہیں تو ہم کوئی نئی، کوئی انوکھی بات نہیں کرتے۔ ہم صرف وہی کرتے ہیں جو ہزاروں برس پہلے کیا جاتا

تھا۔ اور جسے اب بجز مورخ، اور ماہرین آثار قدیمہ کے اور سب
لوگ فراموش کر بیٹھے ہیں۔

چیچک کے ٹیکا لگانے کا رواج یورپ میں ڈاکٹر جنر نے ڈالا۔ وہ اس کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس کا کافی ثبوت موجود ہے کہ ٹیکا لگانے کا رواج ہندوستان میں ہزارہا برس پہلے معلوم تھا۔ ہندو حکمت کے خدا دھنونتری نے صاف الفاظ میں لکھا ہے۔

گائے کے تھن پر کی پھنسیوں کا مواد ایک نشتر کے نوک پر لے لو
اور اس نشتر کو کندھے اور کہنی کے درمیان بازو میں چبھا دو۔
یہاں تک کہ خون نکل آئے۔ تب اس مواد کے خون میں ملنے
سے چیچک کا بخار آجائے گا۔

یہ اگر چیچک کا ٹیکا نہیں تو اور کیا ہے۔ اسی طرح اور کتنی ہی علمی اور عملی حقیقتیں جنھیں اہل یورپ اپنا ایجاد سمجھے بیٹھے ہیں فی الواقع بازیافت ہیں۔

لارڈ ممدوح نے اپنی اسی تقریر میں آگے چل کر فرمایا

میں یہاں ایک تازہ تحقیقات کا تذکرہ کرنے سے باز نہیں رہ سکتا
اور وہ یہ ہے کہ طاعون کے زمانہ میں مکان کو خالی کردینا اور
کیمیائی طریق سے اس کی صفائی کرانا ان ہدایتوں سے مطلق
مختلف نہیں ہے جو ہندو شاستروں میں کی گئی ہیں۔

''ادیب'' مارچ ۱۹۱۲ء

ہندو تہذیب اور رفاہِ عام

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ عیسائی مذہب اور مغربی تہذیب سے زندگی کی خوشیوں اور دنیاوی برکتوں میں بہت کچھ اضافہ ہوا ہے۔ اور ان برکات کا شکریہ زبان دنیا کافی طور پر نہیں ادا کرسکتی۔ تعلیم عوارض جسمانی کا دفعیہ، بیکسوں کی دستگیری وغیرہ تحریکات کو مغربی تہذیب نے تقویت دی ہے۔ اس سے کوئی حق پسند شخص انکار نہیں کرسکتا۔ مگر جب یہ کہا جاتا ہے کہ عیسائی مذہب کے وجود پذیر ہونے سے پہلے یہ برکتیں ہر ایک غیر مذہب میں معدوم نہیں یا صرف برائے نام تھیں تو یہ تو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس غلط خیال کی مناسب اور مستند روایتوں اور دلیلوں سے تردید کی جائے۔ مادّی تکلفات اور آرائشات کے لحاظ سے ہندوؤں کی قدیم تہذیب کا پلہ ممکن ہے ہلکا نظر آئے۔ مگر روحانی اور اخلاقی عطیات اور ایثار و ہمدردی کی تحریکات میں ہندو قوم جس رفعت پر پہنچ گئی تھی ۔ وہاں تک کوئی مغربی قوم نہیں پہنچ سکی۔ اور نہ اس کی موجودہ روش سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ مستقبل میں بھی اس شاندار کامیابی کے نزدیک پہنچ سکے گی۔ وہ عیسائی قوم جو بے زبان اور بیکس جانوروں کے مارنے کو ضروریات زندگی میں داخل سمجھتی ہے۔ جس میں اقل درجہ پچانوے فیصدی آدمیوں کی خوراک گوشت ہے جس مغربی قوم نے حیوانات کے کتنے ہی جنسوں کو پردۂ دنیا سے مٹا دیا۔ اور افریقہ، اسٹریلیا اور امریکہ میں حبشیوں کے ساتھ ایسی نامردانہ شقاوت سے پیش آرہی ہے، اپنی قوت بازو، اپنے زور اور اقتدار اوردیگر مادی اکتسابات پر جس قدر چاہے ناز کرے۔ مگر جب وہ اس پر قناعت نہ کرکے آواز بلند سے پکارتی ہے کہ شفا خانے، مدرسے، جانوروں کے اسپتال وغیرہ عیسائی تہذیب کے جلو میں وجود پذیر ہوئے تو وہ واقعات کے دائرہ سے باہر ہوجاتی ہے۔ مادّیت مغربی تہذیب کی روح ہے۔ اپنی

ضروریات کو بڑھانا، اور تکلفات کے لیے ایجاد و اختراع کرنا اپنے نفع کے لیے دوسروں کے جان و مال کی پرواہ نہ کرنا۔ یہ مغربی تہذیب کی خصوصیات ہیں۔ زندگی کے ہر ایک شعبہ میں اصول تجارت کو داخل کرنا، اور نفع یا نقصان کے خیال کو ایک لمحہ کے لیے بھی نظر انداز نہ کرنا یہ مغربی تہذیب کی علامتیں ہیں۔ یہ تہذیب غرض اور فائدہ کو ایک دم کے لیے بھی فراموش نہیں کرسکتی۔ اگر وہ کبھی فیاضی کرتی ہے تو اس کی فیاضی الف لیلہ کے اس دیو کی فیاضی سے مشابہ ہوتی ہے جو آدمیوں کو پکڑ کر قید کرتا اور بادام کھلاتا تھا تاکہ ان کے بدن فربہ ہوں اور گوشت زیادہ مزے دار اور کثیر المقدار ہو۔ مگر ہندوؤں نے اپنے مذہبی اور روحانی معیاروں کو مادّیت سے دور رکھ کر محض خلاق اور روحانیت کی بنا پر عوام کی آسائش، خلق کی رفاہ اور انسانی تکالیف و مصائب کے دور کرنے میں جتنی کامیابیاں حاصل کی تھیں انھیں آج کی مغربی تہذیب رشک کی نگاہوں سے دیکھ سکتی ہے۔ ان کوششوں میں ہم ضرورت سے زیادہ سرگرم ہوگئے۔ اخلاقی قیود کی پابندیوں میں اپنے ذات اور غرض کی پرواہ نہ کی اور انھیں وجوہ نے ہم کو کمزور اور پامال کردیا۔ ورنہ ہم جہاں کہیں چوکے ہیں وہاں راستی کی جانب چوکے ہیں۔ ہم آج اس مفلس کی طرح ہیں جس نے اپنی ساری دولت کار خیر میں صرف کردی ہو۔ ایسے شخص کی دانشمندی پر ہم اعتراض کرسکتے ہیں۔ مگر اس کے اعلیٰ معیار اس کے بذل و ایثار اور اس کی علو ہمتی سے منکر نہیں ہوسکتے۔ لیکن مغربی علما اور مورخین کی کم نظری اور بیجا تفاخر قومی انھیں یہ نہیں تسلیم کرنے دیتی کہ زمانہ قدیم میں ہندوؤں نے انسان اور حیوان دونوں ہی کے جسمانی تکالیف رفع کرنے اور ان کے ساتھ ساتھ ہمدردانہ برتاؤ کرنے میں دنیا کے لیے ایک نظیر قائم کردی ہے۔ حال کی ایک انگریزی تصنیف میں جو یورپ میں بہت مقبول ہے۔ لائق مصنف لکھتا ہے۔ ''یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ہندوستان کی شاندار مذہبی جماعتیں، خواہ وہ ہندو، بودھ، یا مسلمان ہوں، ان مخیّرانہ، ہمدردانہ اور فیاضانہ تحریکات سے بے بہرہ تھیں جو عیسائیت کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ ان کے شفا خانے یتیم خانے اور دارا الادویات کہاں ہیں؟ جذام کے مریضوں، اندھوں، گونگوں اور بہروں کے لیے مساکن کہاں ہیں۔ ان عقائد کے نظام معاشرت میں ان تحریکوں کو دخل نہیں ہے۔'' اسی طرح انسائیکلوپیڈیا برٹینکا'' میں جو

ایک مستند اور معرکتہ الآرا تصنیف ہے اور جو یورپین معلومات کا مبلغ علم بننے کی مدعی ہے انھیں خیالات کا اعادہ کیا گیا ہے۔'' ممکن ہے زمانہ سلف میں مسافروں اور سیاحوں کی آسائش کے لیے سرائیں بنائی جاتی ہوں لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا اس زمانے میں مریضوں کی رفع تکلیف کے لیے ایسے خیراتی شفا خانے بھی تھے جو مسیحی مذہب کے قدم بہ قدم ظہور میں آئے۔'' ان دو اقتباسات سے یہ امر بخوبی واضح ہوگیا ہوگا کہ اس بارے میں یوروپین علما کے کیا خیالات ہیں۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ دولت اور ثروت کے انتہائی بلندیوں تک پہنچی ہوئی یوروپین قومیں کسی دوسری قوم کی جسے اب و دولت کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں۔ گذشتہ عظمت کا اعتراف نہ کریں اور اس خیال میں سرشار ہیں کہ دنیا میں جو کچھ تعلیم و تہذیب روشنی اور ترقی ہے وہ سب انھیں کے کوششوں کا ثمر ہے۔ اس لیے ان سے اس بارے میں بےتعصبی اور انصاف کی توقع کرنا بے سود ہے۔ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم بھی یوروپین دعوؤں کو ناواقفیت کے باعث آنکھ بند کرکے تسلیم کرلیتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی قوم کے گذشتہ کارناموں اور موجودہ خوبیوں پر صحت کے ساتھ کوئی رائے نہیں قائم کرتے بلکہ خود اپنی مذمت کرنے لگتے ہیں۔ سطور ذیل میں ناظرین کے روبرو وہ شہادتیں پیش کی جائیں گی جن سے اس یوروپین دعوے کی تردید ہوتی ہے اور جن سے یہ امر پایہ ثبوت اختیار کرلیتا ہے کہ وہ تمام وسائل اور تجویزات جو کہ مسیحی فیاضی کے بدولت یوروپ میں وجود پذیر ہیں وہ عیسائی مذہب کے جنم سے ہزاروں برس پہلے ہندوستان میں بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود تھیں۔ اور ہندو تمدن کا ایک جزو اعظم سمجھی جاتی تھیں۔ یہ شہادتیں ہم زیادہ تر سیلون کی تاریخ سے لیں گے جس نے نہ صرف ہندو تہذیب کو اختیار کرلیا تھا بلکہ اس کی خوب نشو و نما کی تھی۔ یہ امر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ یورپ میں رفاہ خلائق کی تحریکیں، باوجود اس کے کہ انجیل مقدس میں غربا کی امداد اور بیکسوں کی دستگیری پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا گیا ہے، دسویں صدی کے قبل بالکل معدوم تھیں۔ سولہویں صدی تک یہ کام مذہبی جماعت کے ہاتھ میں رہا اور اس وقت تک اس میں کچھ زیادہ ترقی نہیں ہوتی۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یورپ نے ان وسائل کے مہیا کرنے میں جو حیرت انگیز اور قابل داد کوششیں کی ہیں۔ وہ مذہبیت کے اثر سے نہیں بلکہ عام

تہذیب کے اثر سے۔ اور یہی وجہ ہے کہ پادریوں اور راہبوں کے ہاتھ میں اس کام کو فروغ نہیں ہوا۔

سیلون کی تاریخ شاہد ہے کہ قحط اور خشک سالی سے پیدا ہونے والی تکالیف کے دفعیہ کے لیے وہاں زمانہ قدیم میں۔ بڑے وسیع پیانہ پر انتظامات کیے گئے تھے۔ اس کے متعلق ابھی زبردست تاریخی اور بدیہی شہادتیں موجود ہیں کہ اس امر کے تسلیم کرنے میں قیل و قال کی گنجائش نہیں باقی رہتی کہ اس کارخیر میں ہندوؤں نے جو اجتماع اور انصرام کیا تھا وہ مغربی فیاضی کے دائرہ خیال سے بھی باہر ہے۔ ہزاروں جھیلیں ہزاروں تالاب بیس سے پچاس میل تک کی وسعت کے بنائے گئے تھے۔ جن میں اس قدر پانی بھرا رہتا تھا کہ اگر متواتر کئی سال تک بارش نہ ہو تب بھی مصیبت کا سامنا نہ کرنا پڑے یہ کوشش کی جاتی تھی کہ آسمان سے جس قدر پانی زمین پر آئے اس کا ایک قطرہ بھی بیکار سمندر میں نہ جانے پائے۔ سب پانی زمین پر مصنوعی ذرائع سے روک لیا جاتا تھا۔ اور یہ ساری کوششیں مذہب کے مخیرانہ تحریک کا نتیجہ تھیں۔ آج کل کے مغربی اقوام کی طرح وہ لوگ ان پاک کوششوں کو اضافہ اصل زمین یا کسی اور تاجرانہ خیال سے آلودہ نہیں کرتے تھے۔ سیلون کا مشہور مؤرخ مسٹر ٹنٹ اپنی تاریخ سیون میں لکھتا ہے کہ ''سیلون کے اگلے بادشاہوں نے آبپاشی کے لیے ایسے بڑے اور اتنے متعدد تالاب بنوائے تھے کہ آج ان پر اعتبار کرنا مشکل ہے'' آنریبل جارج ٹرنر نے جو سیلون سول سروس میں ایک معزز عہدے پر ممتاز تھے۔ سیلون کی ایک بیش قدر تاریخ لکھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ''سیلون کے بادشاہوں نے پانی کے ایسے مہتم بالشان خزائن اور آبپاشی کے ایسے وسیع وسائل مہیا کیے تھے کہ اگرچہ وہ اب حالت بیکسی میں پڑے ہوئے ہیں۔ مگر ان کی وسعت عرض اور طول دیکھ کر یوروپین سیاح حیرت سے انگشت بدنداں ہوجاتے ہیں۔ اور محض اتنا ہی نہیں افتادہ زمین کو قابل کاشت بنانے اور زراعت کو فروغ دینے میں بھی انھوں نے حیرت انگیز کوششیں کی تھیں۔ اور یہ سارا پاک کام مذہب کی تحریک پر مبنی تھا۔ ہندو مذہب نے فلاح دنیا اور تہذیب اخلاق، دین اور دنیا، دونوں کو اس قدر مربوط کر دیا ہے کہ ایک طرف قدم بڑھانا اور دوسرے پہلو کو نظر انداز کرنا غیر ممکن ہے۔ مسٹر ٹنٹ فرماتے ہیں'' کالا واپی تالاب کے منہدم

شدہ حصے ثابت کرتے ہیں کہ اس کا محیط چالیس میل سے کسی طرح کم نہ ہوگا۔ بارہ میل لمبا تو صرف باندھ تھا۔ یہ جھیل راجہ دھاتو سین نے چوتھی صدی میں بنوائی تھی۔'' سنگالی تاریخ ''راج رتناگر'' میں مورخ لکھتا ہے کہ راجہ مہاسین نے ''منہری'' نام کی جھیل تعمیر کی۔ اس کے پانی سے بیس ہزار دھان کے خطے سیراب ہوتے تھے۔ سیلون میں چاول کی پیدا وار بڑھانے کے لیے اس راجہ نے گل گامی سالورا، کالا، مہامنیا، سوکورم، رتمل، کادو، اور ان کے علاوہ پچیس اور بڑے بڑے تالا بنوائے ''الغرض آبپاشی کے ذرائع مہیا کرنے میں ہندو فیاضی نے جو کوششیں کیں اور جو نتائج حاصل کیے۔ ان کی مثال دنیا کے کسی دوسرے حصے میں ملنی دشوار ہے۔ مسٹر ٹنٹ کہتے ہیں ''راجہ پر اکرم باہو نے زراعت کو بہت نفع پہنچایا۔ اس نے ایک ہزار چار سو ستر تالاب سیلون کے مختلف حصص میں تعمیر کیے جن میں سے تین ایسے وسیع الحدود تھے کہ انھیں پر اکرم ساگر کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اس نے تین سو تالاب صرف سادھو سنتوں کے لیے بنوائے۔ ان کے علاوہ ندیوں کو باندھ کر اس نے چھوٹی بڑی ۵۳۴ نہریں نکالیں اور ۳۴۲۱ قدیم تالابوں کی مرمت کروائی۔'' ایسی تعمیرات کی یہ تعداد واقعی حیرت انگیز ہے۔ اس سے ان مساعی جمیلہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جو سیلون کے ہندو راجاؤں نے بارہویں صدی میں زراعت کو فروغ دینے کے لیے کی تھیں۔ کتنی آبادی کو ان وسائل سے نفع پہنچتا تھا۔ اور کتنی زمین ان سے سیراب ہوتی تھی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ہزاروں جھیلیں اب بھی زیر استعمال ہیں۔ حالانکہ شکستہ حال اور بے مرمت ہیں۔ منہدم شدہ جھیلوں کی تعداد بدرجہا زیادہ ہے۔ جہاں کسی زمانہ میں سنہری کھیتی لہراتی تھیں وہاں اب گھنا جنگل ہے اور پانچ ہزار سے زیادہ تالاب خشک پڑے ہیں۔

آنریبل الفرڈ ڈیکن جو اسٹریلین کامن ویلتھ کے وزیر اعظم تھے اور ہندوستان میں آبپاشی کے وسائل کی تحقیقات کے لیے تشریف لائے تھے اپنی کتاب ''ہندوستان کی آبپاشی'' میں جو ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی تھی فرماتے ہیں کہ سیلون میں آبپاشی کا رواج ہزارہا برس سے ہے۔ اور ایسے وسیع پیمانہ پر کہ اس جزیرہ کی وسعت اور پانی مہیا کرنے کی ''دقت کے لحاظ سے واقعی تعجب انگیز ہے۔ ان جھیلوں کی معمارانہ جدت اور بعید از قیاس وسعت زمانہ حال کے انجینئروں کے لیے ایک عقدہ لاینحل ہے۔ جب یہ

کوششیں سیلون میں اس درجے پر پہنچی ہوئی تھیں تو کوئی عجب نہیں کہ بقول مسٹر ڈیکن ممدوح صوبہ مدراس میں کنوؤں کے علاوہ ٦٠ ہزار سے زائد تالاب اور خزائن آب ہیں جہاں بارش کا پانی موسم گرما کی ضروریات کے لیے جمع کرلیا جاتا تھا۔ وہ مختلف وسعت کے ہیں اور اندازہ کیا گیا ہے کہ اگر صوبہ بھر کے تالابوں کے باندھ میں ایک قطار میں کھڑے کردیئے جائیں تو وہ کرہ زمین کے چاروں طرف ٦ فیٹ اونچی دیوار بنانے کے بعد بقدر نصف باقی رہ جائیں گے۔ ان معجزات کا منبع ہندوؤں کے مذہبی عقائد تھے۔ ان معتبر شہادتوں سے ناظرین پر بخوبی روشن ہوگیا ہوگا کہ آبپاشی کے لیے نہریں بنانے اور تالاب تعمیر کرنے میں ہندوؤں نے کیسے عظیم الشان اہتمام سے کام لیا تھا۔ مگر ہماری مراد ان تعمیرات کی وسعت اور تعداد پر زور دینا یا ہندوؤں کی انجینئروں اور فن تعمیر کی تعریف کرنا نہیں ہے۔ ہمارا منشا صرف یہ ہے کہ ہندو مذہب نے آبپاشی اور زراعت کو بھی، مغربی تہذیب کے برخلاف اپنے مخیّرانہ پروگرام کا ایک رکن اعظم سمجھ لیا تھا۔ اور ہے بھی ایسا ہی۔ کیونکہ فاقہ کشی اور بھوک کے مرض سے زیادہ تکلیف دہ اور کوئی مرض نہیں ہے۔

ہندوؤں کی فیاضی محض آبپاشی ہی تک محدود نہ تھی۔ امراض جسمانی کے دفعیہ کے لیے بھی خواہ وہ انسان ہوں یا حیوان، ہندوؤں نے اسی وسیع ہمدردی اور غیر محدود محبت سے کام لیا تھا۔ راجہ چندر گپت کے زمانے میں جبکہ بودھ مذہب بالکل عالم طفولیت میں تھا۔ اور ہندوستان اور سیلون دونوں ہی ملکوں میں برہمنی مذہب کا زور تھا۔ شفا خانوں کے قائم ہونے کا ثبوت ملتاہے۔ راجہ چندر گپت کا وزیر چانکیہ ایک بڑا فاضل اور دانا پنڈت تھا۔ اس نے ایک مبسوط کتاب آرتھ شاستر کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں اس نے راجہ چندر گپ کے دوران سلطنت کے انتظام و انصرام قواعد و قوانین، تمدن و معاشرت اور عام ملکی حالات سے بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ اس تصنیف سے اس زمانہ کی گھٹا ٹوپ تاریکی پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ وہ شہروں کی آبادی کے متعلق ہدایتیں کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

شمال کی طرف لوہار، بڑھئی، سنگتراش اور برہمنوں کو آباد کرنا چاہیے۔ مغرب کی طرف جولاہے، سوت کاتنے والے بانس کی چٹائیاں بنانے والے چرم فروش، اسلحہ ساز

اور شودر آباد کیے جائیں۔ جنوب کی طرف شہر کے انتظامی عمال، اہل حرفت و تجارت، شراب اور گوشت کا روزگار کرنے والے، ارباب عشرت اور ویش فرقہ کے لوگوں کے مکان بنائے جائیں۔ مشرق کی طرف عطر فروش، غلہ فروش اور چھتری فرقہ کے لوگ آباد ہوں، جنوب مشرق کی طرف خزانہ محسب کے دفاتر اور کارخانجات تعمیر کیے جائیں۔ شمال مغرب کی طرف دوکانیں اور شفا خانے قائم کیے جائیں۔ شمال مشرق کی طرف گئو شالے اور اصطبل وغیرہ بنائے جائیں۔ علیٰ ہٰذا۔"

اس اقتباس سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ اس قدیم زمانہ میں ہندو قوم حسن معاشرت کے کس رفیع درجہ پر پہنچی ہوئی تھی۔ اور حفظان صحت کے اصولوں کو کس دانائی سے پابندی کی جاتی تھی۔ اور شفا خانوں کے مروج ہونے کا ایک ایسا زبردست ثبوت مل جاتا ہے جس کی تردید نہیں کی جاسکتی۔ گویا شفا خانے ہر ایک آبادی کے جزوِ لاینفک سمجھے جاتے تھے۔ ایسی شہادتوں کے ہوتے ہوئے بھی یورپ میں یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ شفا خانے مغربی تہذیب کے نتائج ہیں۔ اور لارڈ کرزن جیسے ہمہ دان اور ہمہ گیر شخص نے اپنی ایک تقریر میں جو انھوں نے بہ حیثیت گلا سگو یونیورسٹی کے رکٹر کے حال میں کی ہے فرمایا کہ "غیرعیسائی مذاہب بہبود عام کے اعلیٰ جذبات سے عاری تھے" اسے بجز قومی تعصب اور کم نظری کے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

جیسا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں سیلون اپنی معیار تہذیب کے لیے ہمیشہ ہندوستان کا دست نگر رہا۔ چندر گپت عیسیٰ سے تقریباً پانچ سو برس پہلے ہوا اور فاضل چانکیہ نے صاف بتلا دیا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں شفا خانوں کا عام رواج تھا۔ اسی زمانے میں سیلون میں بھی شفا خانوں کے قائم ہونے کا ثبوت ملتاہے۔ مہاونس کے دسویں باب میں جو سیلون کے ازمنہ قدیم کی ایک مستند تاریخ ہے، سنگالی مورخ راجہ پنڈوک بھائی کے عہد سلطنت کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہے۔ "راجہ نے پانچ سو چنڈال (یعنی مہتر) شہر کی صفائی کے لیے مامور کیے، ڈیڑھ سو چنڈال لاوارثوں کی لاش اٹھانے کے لیے اور اسی قدر آدمی چتاؤں کی نگرانی اور صفائی کے لیے مقرر کئے۔ مختلف مذاہب کے پیروؤں کی آسائش کے لیے پانچ سو مکانات تعمیر کرائے اور اسی طرح مختلف اور متعدد مقامات میں راجہ نے دھرم سالے اور شفا خانے بنوائے۔"

یہ تو عیسیٰ سے پانچ سو برس پہلے کی بات ہوئی۔ اور اس وقت ہندو قوم روبہ انحطاط تھی۔ بودھ مذہب نے گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالا۔ مہاراجہ اشوک کے زمانے میں بودھ دھرم نے بڑی تیزی سے قدم بڑھائے اور مذہب کے ساتھ ساتھ بہبود اور رفاہ عام کے وسائل بھی نشو و نما پائے گئے۔ اشوک کے کتبات نمبر ۲ اور ۱۳ سے اس امر کا ثبوت ملتاہے کہ مہاراجہ اشوک کی زیر نگرانی اور زیر حکم ہندوستان، سیلون ہندوستان کے شمالی و مغربی سرحدی صوبجات مشرقی یورپ، مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے ممالک میں جہاں کے بادشاہوں سے مہاراجاؤں کے دوستانہ تعلقات تھے، انسان اور حیوان دونوں ہی کی رفع تکالیف کے لیے، دارالادویات اور شفا خانے بنوائے گئے۔ انسان اور حیوان دونوں ہی کو نفع پہنچانے والی بوٹیاں غیر مقامات سے منگا کر لگائی گئیں اور سڑکوں، مسافروں اور جانوروں کی آسائش کے لیے کنوئیں اور باؤلیاں بنوا دی گئیں اور درخت لگا دیے گئے۔"

مہاراجہ اشوک کے زمانہ میں سیلون کے راجہ نے بھی بودھ دھرم قبول کرلیا۔ اور تب سے تیرہویں صدی تک دارالشفاؤں کی تعمیر سڑکوں کی صفائی اور مرمت اپاہجوں کی پرورش اور دیگر فیاضانہ تحریکات کی طرف سرگرمی اور ارادت کی کمی نہیں رہی۔ اور مفت اور عام تعلیم کا ایسا چرچا رہا کہ کوئی بودھ مندر ایسا نہ تھا جہاں پاٹ شالہ نہ ہو۔ آج بھی برمھا اور سیلون میں خواندہ آدمیوں کی تعداد ہندوستان کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ ان امور کی متعدد تحریری اور مستند شہادتیں موجود ہیں۔ ہم ان میں سے چند ناظرین کے روبرو پیش کرتے ہیں۔

(۱) راجہ دت گامنی نے (۱۳۷-۱۶۱ قبل عیسیٰ) "اٹھارہ مقامات پر بالالتزام شفا خانے تعمیر کرائے۔ جہاں مریضوں کی خورش کا انتظام بھی کیا جاتا تھا۔

(۲) راجہ بدھ داس نے (۳۶۳-۳۴۱ء) "جزیرہ سنگلدیپ کے باشندوں پر نظر کرم کرکے متعدد شفا خانے قائم کیے۔ اور ہر ایک گاؤں کے لیے وید مقرر کیے۔"

(۳) راجہ اپاتی سونے (۴۱۰-۳۶۸ء) "حاملہ عورتوں اندھوں اور اپاہجوں کے لیے دارا لشفا بنوائے۔"

(۴) راجہ دھاتو سین نے (۴۵۹ء) اپاہجوں کے لیے شفا خانے تعمیر کرائے۔"

(۵) راجہ دیو لا دوم نے (۷۹۵ء) شفا خانے بنوائے اور طبی طلبا کے لیے ایک مدرسہ طبیات قائم کیا۔"

(۶) راجہ دیو لا سوم نے (۸۴۳ء) "لنگڑے اور اندھے آدمیوں کے لیے مختلف مقامات پر شفا خانے بنوائے۔"

(۷) راجہ کسّپ چہارم نے شہر میں وبائی امراض کے لیے دوا خانے کھلوائے۔"

(۸) راجہ مہندا چارم نے (۹۹۱ء) "خیرات خانے اور غربا کے لیے مساکن بنوائے۔ اس نے کل شفا خانوں میں ادویات اور پلنگ مہیا کیے۔"

(۹) راجہ پر اکرم باہو نے (۱۱۶۴-۱۱۹۷ء) "ایک درالصحت بنوایا جس میں کئی سو مریض رہ سکتے تھے۔ ہر ایک مریض کی خدمت کے لیے ایک دایہ اور ایک خادم تعینات کیا جو اسے ضروری خوراک دیں اور ادویات پلائیں۔ وہاں اس نے ایک انبار خانہ بھی تعمیر کیا جہاں غلہ اور انواع اقسام کی ادوایات اور معالجانہ ضروریات فراہم کی جاتی تھیں، اس نے ان حکما اور فضلا کے لیے معاش مہیا کی جو امراض کے اسباب کے اور ماہیت کی تحقیقات کرتے تھے۔"

ان تاریخی شہادتوں کے مقابلے میں کون حق پسند شخص کہہ سکتا ہے کہ عیسائی مذہب کے عالم وجود میں آنے سے پہلے ہندو اور بودھ مذاہب میں خلائق عام اور نیز بے زبان حیوانات کی رفع تکالیف کا اعلیٰ معیار نہیں قائم ہوا تھا۔ اس کے برعکس غالبًا یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ جس جوش ارادت اور خلوص نیت سے اس زمانہ میں یہ فیاضانہ اور ہمدردانہ کام کیا جاتا تھا وہ آج کل کے فیاضانہ تحریکات میں نہیں پایا جاتا۔ اور اس میں کسی کو حیرت کا مقام نہیں۔ ہندو فیاضی کا مبدا مذہبی عقیدہ تھا۔ ایشور نے ہم سب کو پیدا کیا۔ ہم سب بھائی ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ حتی الوسع اپنے بھائی کی امداد کریں۔ یہ جذبہ اور یہ عقیدت تھا جو ہندو قوم کے دلوں میں ایک زندہ بدیہی شکل اختیار کرکے انھیں فیاضی کے بہترین اور اعلیٰ ترین معیار کی طرف لے جاتا تھا۔ مغربی اقوام کی فیاضانہ کوششوں میں یہ مذہبی جوش شاذ پایا جاتا ہے۔ وہ ان تحریکات میں بھی ،

قومی پولیٹکل اور تاجرانہ اغراض مخفی رکھتے ہیں۔ وہ مغربی تہذیب جو حاملہ عورتوں اور کم سن لڑکوں کو کسب معاش پر مجبور کرتی ہے۔ جہاں بیواؤں اور بیکسوں کے لیے محتاج خانے کے سوا اور کوئی ٹھکانہ نہیں۔ وہ مغربی تہذیب جہاں آقا مزدور کے حقوق غصب کرنے کی تاک میں بیٹھا رہتا ہے۔ اور مزدور اس تاک میں رہتا ہے کہ آقا کی جیب سے روپے نکال لوں، وہ تہذیب جو مذہب کی اشاعت کو پولیٹکل مصلحت کا ذریعہ بناتی ہے، اور جہاں مشنری ہمیشہ فاتح کا علم بردار ثابت ہوتا ہے، وہ ہندو یا بودھ مذہب کو کبھی مشعل ہدایت نہیں دکھا سکتی۔ ملکی فتوحات اور شے ہیں، اعلیٰ تہذیب اور شے۔ اطالیہ نے باوجود ادنیٰ درجے کی تہذیب کے یونان کو فتح کرلیا جو اس زمانہ میں تہذیب کے انتہا و عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ تہذیب اور خونخوارانہ جذبات کا بیر ہے۔ وحشی قومیں مہذب اقوام کے مقابلے میں زیادہ جنگجو اور زیادہ جانباز ہوتی ہیں۔ مغربی تہذیب میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے وحشی اقوام کی خاصات کو تہذیب کے متین اثرات سے پامال نہیں ہونے دیا۔ خلاصہ یہ کہ ہندوستانی تہذیب کی عمارت دھرم اور نیکی کی بنیاد پر بھی تھی۔ اور مغربی تہذیب کی بنیاد نفع، تکلف اور حرص پر ہے۔ یہ پاک نظارہ ہندوستان کے سوا اور کہاں نظر آتا ہے کہ اگر ایک گھر میں دس بیوائیں ہیں تو دسوں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہیں۔ ہندوؤں نے ممکن ہے تہذیب کا یہ معیار قائم کرنے میں بہت سی غلطیاں کی ہوں، اور ضرور کیں۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے اغراض اعلیٰ فیاضی سے مملو تھے۔ اور عیسائیوں کا متذکرہ بالا دعویٰ لغو ہے۔

''ادیب'' مارچ ۱۹۱۳ء

رامائن اور مہا بھارت

یوں تو سنسکرت ادب میں منظوم فسانوں کی کمی نہیں ہے۔ مگر جیسا ہر شخص جانتا ہے رامائن اور مہا بھارت ہندوؤں کی خاص مثنویاں ہیں۔ ہندو قوم کو ان پر جتنا فخر و ناز ہو بجا ہے۔ اگر سنسکرت ادب میں صرف یہی دو کتابیں ہوتیں تو بھی کسی زبان کا لٹریچر سنسکرت سے آنکھیں نہ ملا سکتا۔ خیالات کی بلندی مضامین کی پاکیزگی، بیان کی لطافت اور کیرکٹروں کی اعلیٰ شرافت نے اسی زمانے سے جبکہ یہ کتابیں شاعر کے دماغ سے نکلیں، دنیا کو حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ رام چندر ضرور اعلیٰ انسانیت کا نمونہ تھے۔ اور سیتا عورتوں کے اطوار خجستہ کی ایک پاک تصویر ہیں، یدھشٹر ضرور انصاف مجسم تھے اور بھیشم پتامہ کی دلاوری اور ایثارنفسی تاریخ دنیا میں بے مثال ہے۔ کرشن ضرور عارف کامل اور انسان کے نورانی اوصاف کا مجموعہ تھے مگر یہ والمیکؔ اور ویاسؔ کا حسن بیان ہے جس نے ہماری نظروں میں ان کو انسانوں کے طبقہ سے اٹھا کر دیوتاؤں کی مجلس میں بٹھا دیا ہے۔ یہ انھیں شعرا کے قلم کا فیض ہے کہ آج ہر ایک ہندو ان کے نام کو متبرک سمجھتا ہے اور اس عقیدت اور تعظیم کی کوئی حد نہیں ہے جو ان بزرگوں کے متعلق ہر ایک ہندو بچہ کے دل میں متشکل صورت میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ رام اور کرشن کا نام بے شمار ہندوؤں کے لیے وسیلہ نجات بن گیا ہے۔ شاعر کو اپنے کلام کی بڑی سے بڑی جو داد مل سکتی ہے وہ ان شعرا نے حاصل کرلی ہے۔ یعنی ان کے کیرکٹروں کو ہم نے اپنا دیوتا، اور اپنا ایشور مان لیا اور ان شعرا کے محاسن کلام پر نظر ڈالتے ہوئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہم نے بیجا فیاضی سے کام لیا ہے۔ انھوں نے وہ کام کر دکھایا ہے جو دنیا کے کسی شاعر سے نہ ہوسکا۔ انھوں نے ہماری نگاہوں کے سامنے اس لیے کہ ہم انھیں اپنی زندگی کا نمونہ بنائیں مکمل انسان پیش کردئے ہیں جو محض مردہ، خاموش

تصویریں نہیں بلکہ جیتے بولتے کامل انسان ہیں۔ ایسے مکمل انسان شیکسپیئر اور ڈینٹی ہومر اور ورجل نظامی اور فردوسی کی دائرہ فکر سے بہت ہی اعلیٰ ہیں۔

پروفیسر مانیرولیمس فرماتے ہیں ''اگرچہ اہل یونان کی طرح ہندوؤں کے یہاں بھی خاص دو ہی مثنویاں ہیں۔ مگر رامائن اور مہا بھارت کا الیڈ اور اوڈیسے سے مقابلہ کرنا ویسا ہی ہے جیسا اندس اور گنگا کا۔ جو ہمالیہ کے برفستانی گھوارے سے نکلتی، اپنی معاون ندیوں سے گلے ملتی۔ کہیں بے انتہا وسیع، کہیں اتھاہ گہری، شان وشوکت کے ساتھ بہتی ہیں۔ آیٹکا اور تھسلی کے نالوں اور پہاڑی چشموں سے مقابلہ کرنا۔'' قطع نظر شاعرانہ محاسن کے ان کتابوں کی ضخامت اہل یورپ کو اور بھی حیرت میں ڈالتی ہے۔ یہاں اس کا دنیا کی دوسری مشہور مثنویوں سے موازانہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

مہا بھارت ـــ دو لاکھ بیس ہزار شلوک

رامائن ـــ ۴۸ ہزار شلوک

ہومر کالیڈ ـــ ۱۵۶۹۳ ، اشعار

ورجل کا انیڈ ـــ ۹۸۶۸، اشعار

جرمنی کا مشہور فلاسفر شلیگل لکھتا ہے رامائن دنیا کی سب سے اعلیٰ مثنوی ہے۔''

سرولیم جونس فرماتے ہیں ''رامائن میں رام کا قصہ لکھا گیا ہے جو تخیل کی بلندی اور حسن بیان کے لحاظ سے نالسن کے کلام سے بمراتب بڑھ کر ہے۔''

پروفیسر ہیرن، رامائن کا مختصر قصہ بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں ''یہ ہے چند لفظوں میں رامائن کی داستان اور اس سادہ بندش کی ترتیب اور تکمیل کا سر انجام ایسی خوبصورتی اور ندرت کے ساتھ کیا گیا ہے کہ دنیا کی بہترین شاعرانہ تصنیف کے مقابلہ میں اس کا پلہ بھاری رہے گا۔''

پروفیسر مانیر ولیمس فرماتے ہیں ''سنسکرت لٹریچر میں رامائن سے زیادہ دلفریب کوئی نظم نہیں اس کے طرز بیان کی سادگی اور صفائی اور انداز کی پختگی۔ سچے شاعرانہ جذبات کی نازک چٹکیاں، دلیرانہ واقعات کے صورت نگار تذکرے فطرت کے شاندار نظارے۔ انسانی دل کی نیرنگیوں اور نازک ترین احساسات سے کامل واقفیت۔ یہ سب خوبیاں اس تصنیف کو دنیا کی بہترین تصانیف میں جو خواہ کسی ملک اور کسی زمانہ میں لکھی گئی ہوں۔

ممتاز رتبہ پانے کا مستحق ٹھہراتی ہیں۔ یہ مثل ایک وسیع پرفضا باغچہ کے ہے جس میں پھول اور پھل کی بہتات ہے۔ فطرت کے زندہ جاوید چشمے جس کی آبیاری کرتے ہیں اور گو کہیں کہیں روئیدگی ضرورت سے زیادہ ہوگئی ہے۔ مگر وہاں بھی صاف اور خوش التزام روشیں موجود ہیں۔''

پرنسپل گریفتھ جنھوں نے رامائن کو انگریزی نظم کا بہت مقبول جامہ پہنایا ہے لکھتے ہیں:

''رامائن ہر ایک ملک، قوم اور زمانہ کے لٹریچر کو ایسی نظم پیش کرنے کی بہ آواز بلند دعوت دیتی ہے جس میں رام اور سیتا کے سے کامل انسان ہوں۔ شاعری اور اخلاق میں ایسا دلاویز اتحاد اور کہیں نظر نہیں آتا جیسا کہ اس فی الواقع مقدس کتاب میں۔''

امریکہ کے مشہور ڈاکٹر بیسلر مہا بھارت کا ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں۔ ''مجھے اپنی دوران زندگی میں کسی کتاب سے اتنی دلچسپی نہیں ہوئی جتنی ہندوستان قدیم کی اس اعلیٰ اور پاک تصنیف سے فی الواقع گذشتہ چند سالوں میں میں نے اس کتاب کا جتنی بار مطالعہ کیا ہے۔ اتنی بار کسی دوسری کتاب کا نہیں کیامہابھارت نے میری نگاہ باطن کے سامنے ایک نئی دنیا کھول دی ہے اور مجھے اس کے دانشمندانہ خیالات صداقت اظہار حق اور کمال علم پر بے انتہا حیرت ہے۔''

سلون لیوی جو پیرس کے مشہور عالم ہیں فرماتے ہیں ''مہا بھارت دنیا کی سب سے بڑی ہی نہیں بلکہ سب سے بہتر تصنیف ہے۔ اس میں اول سے آخر تک نظم کے خوشنما لباس میں اخلاق کے متین مسائل کی تعلیم دی گئی ہے۔

امریکہ کا مشہور ادیب جرمیا کرٹن لکھتا ہے ''میں خلوص دل سے کہتا ہوں کہ مجھے کسی دوسرے کتاب کے مطالعہ سے اتنا روحانی حظ نہیں حاصل ہوا ہے۔

سینٹ بارتھولومی جو یوروپ کے ایک جہان دیدہ فلاسفر ہیں رقم طراز ہیں۔ ''ایک صدی گزری جبکہ ولکسن نے مہا بھارت کے ایک حصہ کا ترجمہ شائع کیا تو دنیا اس کے شاعرانہ شکوہ کو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ ویاس جو مہا بھارت کا مصنف ہے ہومر سے بھی بڑا معلوم ہونے لگا اور لوگوں کو یہ تسلیم کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوئی کہ ہندوستان کو

یونان پر تفوق ہے۔

پروفیسر مانیر ولیمس فرماتے ہیں ''رامائن میں ایسے متعدد بیانات ہیں جو لطافت کے اعتبار سے ہومر پر بھی ترجیح رکھتے ہیں۔ ان کے اسلوب بیان زیادہ پسندیدہ، زیادہ لطیف اور زیادہ پختہ ہیں اور زبان بمقابلہ ہومر کے زیادہ ترقی یافتہ حالت میں ہے۔ خاندانی زندگی کی تصویریں دکھانے میں ہندو شاعروں کو یونان اور روم پر اور بھی زیادہ فضیلت ہے۔

'زمانہ' مئی ۱۹۱۲ء

قدیم ہندو علم ریاضی

دنیا کی تاریخی نگاہ جوں جوں وسیع ہو رہی ہے توں توں ہندو قوم کی عظمت کا راز کھلتا جاتا ہے۔ اور اب یہ حقیقت قریب قریب روشن ہوگئی ہے کہ یہ قدیم ہندوستان کی پاک سرزمین تھی جہاں تہذیب اور علم کا آفتاب طلوع ہوا۔ اور نہ صرف طلوع ہوا بلکہ نصف النہار تک پہنچ گیا۔ تہذیب کا ایسا کوئی شعبہ نہیں جس پر ہندوؤں نے اپنی ہمہ دانی کی مہر نہ ثبت کردی ہو۔ بلکہ یہ کہنا شاید راستی سے بہت دور نہ ہو کہ تہذیب اپنی اعلیٰ ترین صورتوں میں ہندوستان ہی میں نمودار ہوئی اور جس بلندی تک ہندوؤں نے اسے پہنچایا اس بلندی تک کوئی دوسری قوم اسے نہ پہنچا سکی۔ فلسفہ اور حکمت، علوم اور فنون سب اسی زرخیز خطہ میں اُگے اور یہاں کی موافق آب و ہوا نے ان میں ایسی کونپلیں نکالیں اور ان کی ایسی نشو و نما کی کہ گو اب اس درخت کے پتے جھڑ گئے ہیں اور وہ اب محض ایک ٹھونٹھ رہ گیا ہے۔ تاہم اس کی اونچائی اس کا پھیلاؤ اور اس کی تنومندی مورخین کے لیے نظارۂ حیرت بنی ہوئی ہے۔ علوم و فنون کی جو ندیاں آج بہہ رہی ہیں ان کا سر چشمہ از روئے تحقیقات اور تاریخی انکشافات ہندوستان ہے۔ بیشتر علوم جن پر آج دنیا کو ناز ہے۔ ہندوؤں کے دماغ سے نکلے، انھیں کی نگرانی میں پھلے، پھولے اور دو مغربی ایجادیں جو دنیا سے حال کو حیرت میں ڈال رہی ہیں فی الواقع ایجادیں نہیں بلکہ ہندوؤں کی روندی ہوئی منزلیں ہیں۔ ممالک یورپ کے صدہا وسیع النظر علما نے اس حقیقت کو تسلیم کرلیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ انھیں کی تحقیقات نے ہماری آنکھیں کھولیں ورنہ ہم تو اس حد تک نادار ہوگئے تھے کہ خیال بھی باقی نہ رہا تھا کہ کبھی ہمارے گھر میں بھی دولت تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے لیے اس دور زریں کی یاد پدرم سلطان بود کے مصداق ہے۔ اور اب ان تذکروں سے کوئی عملی فائدہ

نہیں بلکہ اس کے برعکس اپنی موجودہ نکبت اور ذلت پر افسوس ہوتا ہے۔ مگر ہم کو میدان ترقی میں بڑھانے کے لیے جتنی تحریکیں سرگرم کار ہیں ان میں ایک بھی ایسی مضبوط، ایسی حوصلہ افزا، اور ایسی پرتاثیر نہیں ہے جتنی کہ یہ داستان پارینہ، یہ روایات ہماری نگاہوں کے سامنے ترقی کے معیار ہیں۔ یہ روایات ماضیہ کے کھنڈر اگر کچھ کام نہ دے سکیں تو کم از کم اس کے اینٹ پتھر اور چولے سے ہم مینار ترقی پر چڑھنے کے لیے ایک زینہ تو ضرور ہی بنا سکتے ہیں۔

(ا) علم ہندسہ

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ علم ہندوؤں کی خاص ایجاد ہے۔ علما دنیا نے متفق ہوکر تسلیم کرلیا ہے کہ اعداد اور کسور عشاریہ ہند و قوم نے ایجاد کیے۔ جرمنی کا مشہور مورخ شلیگل لکھتا ہے ''اعداد اعشاریہ اور کسور اعشاریہ جو حروف تہجی کے بعد انسانی دماغ کی سب سے بڑی ایجادیں ہیں مورخین کی عام رائے کے مطابق ہندوؤں کی طباعی کا نتیجہ ہیں۔

پروفیسر میکڈانل لکھتے ہیں ''سائنس میں بھی یورپ ہندوستان کے احسانات سے گرانبار ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہندوؤں نے وہ اعداد اختراع کیے جو آج روئے زمین پر مستعمل ہیں اور ان اعداد نے نہ صرف ریاضی پر بلکہ عام تہذیب پر جو اثر ڈالا ہے اس کا اندازہ امکان سے باہر ہے۔ آٹھویں اور نویں صدی میں اہل عرب نے ہندوؤں سے یہ علم سیکھا اور ان کے ذریعہ سے یہ علم اقوام یورپ تک پہنچا۔''

اہل روم اور یونان نے بھی اعداد ایجاد کرنے کی کوششیں کیں۔ مگر ان کی ایجادوں میں اتنی خامیاں اور پیچیدگیاں تھیں کہ وہ مقبول عام نہ ہوسکے۔ ہندو اعداد کی سب سے بڑی صفت ''صفر'' ہے۔ اعداد کی مقامی قیمت ہی وہ وصف ہے جس سے بڑی سے بڑی قیمت چند اعداد میں ظاہر کی جاسکتی ہے۔

پروفیسر ویبر لکھتے ہیں ''ہم اعداد کی حیرت انگیز ایجاد کے لیے ہندوقوم کے ممنون ہیں۔''

پروفیسر ویلس جو مشہور انگریز عالم ہیں فرماتے ہیں ''لیلاوتی میں جو اصول اور

قاعدے مذکور ہیں وہ اتنے ہی صحیح اور اتنے ہی سہل العمل ہیں جتنے کہ موجودہ قواعد ہوسکتے ہیں۔"

جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ لیلاوتی ہند و علم حساب کی کوئی معرکتہ الآرا تصنیف نہیں ہے تو پروفیسر ممدوح کے اس قول کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوجاتی ہے۔

(۲) علم الخط

اس علم میں بھی ہندوؤں نے وہ کل مسائل حل کرلیے تھے جو آج سے دو صدی پہلے یورپ میں غیر معلوم تھے۔ یہ علم یونانی فلاسفر اقلیدس کے نام سے مشہور ہے۔ مگر اس کا ہندو نام ریکھا گنت ہے اور یہ سمجھنا واقعات کے خلاف ہوگا کہ اقلیدس اس علم کا موجد تھا۔ حضرت عیسیٰ سے دو ہزار برس قبل ہندوؤں نے سورج سدھانت تصنیف کیا تھا جو علم الزاویہ کی معرکتہ الآرا تصنیف ہے۔ اور اس لیے بقول مسٹر ویلس ہندوستان میں سورج سدھانت کی تصنیف سے ہزاروں برس پہلے علم الخط کا رائج ہونا ثابت ہوتا ہے۔"

مسٹر الفنسٹن فرماتے ہیں "سورج سدھانت میں علم الزاویہ کے ان اصولوں سے بحث کی گئی ہے جو نہ صرف اہل یونان کے مبلغ علم سے بہت آگے ہیں بلکہ اس میں ایسے مسائل حل کیے گئے ہیں جو دوسو برس پہلے تک یورپ میں بھی دریافت نہ ہوئے تھے۔"

پروفیسر ویلس رقمطراز ہیں "علما کی تحقیقات نے ہندوستان میں ان ہیاتی نقشوں کا سراغ لگا لیا ہے جو یقیناً علم الخط کے اصولوں کی مدد سے بنائے گئے ہوں گے۔ لیکن کس زمانہ میں وہ مرتب ہوئے اس کا اب تک تحقیقی طور پر پتہ نہیں چلا۔ بعض علما کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ سے تین برس قبل وہ مرتب کیے گئے ہوں گے۔ اگر یہ انداز صحیح ہوتو علم الخط ہندوستان میں اس زمانے سے بہت قبل رائج ہوگا جو یورپ میں اس کے وجود کی تاریخ مانی جاتی ہے اور یقیناً بہت سی شکلیں ہندوستان سے یونان گئی ہوں گی۔" آگے چل کر وہ پھر لکھتے ہیں "ہندوؤں کا علم الخط بہت زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔ اقلیدس کے مقالہ اول کی سینتالیسویں شکل جو نہایت مشہور شکل ہے اس قدیم زمانہ میں بھی حل کی ہوئی ملتی ہے۔ ایک اور شکل جو علما یونان کی معلومات سے باہر تھی ہندوؤں کی علم الخط میں موجود پائی جاتی ہے۔ یعنی کسی مثلث کے ضلعوں سے اس کا

رقبہ نکالنا۔"

اس سینتالیسویں شکل کو فیثا غورث کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ مگر حال کی تحقیقات سے ثابت ہوگیا ہے کہ فیثا غورث سے ہزاروں برس قبل اہل ہند اسے حل کر چکے تھے۔

مسٹر الفنسٹن فرماتے ہیں "علم الخط میں ہندوؤں کو جو دسترس تھی وہ ان ثبوتوں سے ظاہر ہے جو مثلث کی مختلف خاصیتوں کے متعلق انھوں نے دیے ہیں۔ بالخصوص اس ثبوت سے جس میں مثلث کے تین اضلاع کے معلوم ہونے پر رقبہ کے نکالنے سے بحث کی گئی ہے اور جو یورپ میں کلیویس کے پہلے معلوم نہ تھا۔

(۳) جبر مقابلہ

ریاضیات کی اس شق میں بھی ہندو قوم نے کمال حاصل کرلیا تھا۔ ہیاتی مسائل کے حل کرنے میں ہندوؤں نے جبر مقابلہ کے اصولوں کا آزادی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اور یہ ان کی دستگاہ کامل کا ثبوت ہے کیونکہ بقول پروفیسر ویلس "قبل اس کے کہ کوئی مصنف ہیأت میں الجبرا کا استعمال کرے یہ ضروری ہے کہ یہ دونوں علوم ترقی کے اس درجہ پر پہنچ گئے ہوں جو صدیوں کی تحقیق اور مطالعہ اور سیکڑوں علما کی کاوش اور تدقیق کا نتیجہ ہوتا ہے۔"

مسز مینگ فرماتی ہیں "اہل عرب جبر مقابلہ کے موجد نہیں زمانہ مابعد کی تحقیقات اور مطالعہ نے ثابت کردیا ہے کہ جس زمانہ میں اہل عرب نے یورپ میں اس علم کی تخم ریزی کی، اس سے ہزاروں برس قبل ہندوستان میں یہ علم ترقی کے بہت اونچے پایہ پر پہنچ چکا تھا۔" مشہور مورخ الفنسٹن نے بھی اسی خیال کی زور سے تائید کی ہے۔

سنسکرت زبان کے تبحر عالم پروفیسر مانیر ولیمس لکھتے ہیں "ہندوؤں کو جبر مقابلہ اور علم الخط کی ایجاد کا اور ان دونوں کو علم ہیئت میں استعمال کرنے کا فخر حاصل ہے۔"

مورخ الفنسٹن اہل یونان کا ہندوؤں کے ساتھ ریاضیات میں مقابلہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

> "اس امر میں زیادہ قیل و قال کی گنجائش نہیں کہ ہندوؤں نے اس علم میں یونانیوں سے زیادہ کمال حاصل کرلیا تھا۔ صرف یہی

نہیں کہ ہندوستان کا آریہ بھٹ یونان کے ڈایا فینسٹن سے گوے سبقت لے گیا ہے بلکہ ریاضیات کے ہندو علما اکثر ان علمایورپ کے دوش بدوش پہنچ گئے ہیں جو آخری صدی میں پیدا ہوئے اور ان کے نتائج زمانہ حال کی تحقیقاتوں سے بہت مشابہ ہیں۔''

برہم گپت نے جبر مقابلہ میں ایسے اصول اخذ کر دکھائے ہیں جو یورپ میں ڈی لاگر ینج کے زمانہ تک نہ معلوم تھے۔ یوکر اور ڈی لاگر ینج اٹھارہویں صدی کے آخر میں گزرے ہیں۔ اور ان کے نام سے متعدد ریاضی تحقیقاتیں وابستہ ہیں مگر بعض اوقات جن عقدوں کے حل کرنے میں ان کی فکر ناکام رہ جاتی ہے وہ قدیم ہندو تصانیف میں موجود پائے جاتے ہیں۔

مورّخ الفنسٹن آگے چل کر لکھتا ہے ''ہندوؤں کو ریاضی ایجادوں کے اعتبار سے اہل یونان پر جو فضیلت ہے وہ اس سے بدرجہا کمتر ہے جو انھیں اپنی علمیات کی صفائی اور سادگی کے اعتبار سے ان پر حاصل ہے۔

بھاسکر اچاریہ ریاضی کا جنید عالم ہو گزرا ہے۔ اس نے اپنی ریاضی تصانیف میں ڈفرنشل کیلکولس سے بحث کی ہے جسے اہل یورپ اپنی ایجاد سمجھتے ہیں۔ البتہ اس نے اس کا صرف خاکہ دے دیا ہے۔ تفصیل کے ساتھ اس سے بحث نہیں کی۔

مسٹر اسپانس ووڈ فرماتے ہیں ''یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ بھاسکر اچاریہ نے اپنی تحقیقاتوں میں جس جدت اور عمق کا ثبوت دیا ہے وہ عملیات اور اصولوں کے اعتبار سے بہت بڑی تعریف کا مستحق ہے اور اس کے نتائج نہ صرف یورپ کے نتائج سے بہت مشابہ ہیں بلکہ قریب قریب یکساں ہیں۔ علما یورپ ایسے قدیم زمانے کے کتب میں ایسی اعلیٰ پایہ کی تحقیقاتوں کو موجود پاکر حیرت سے انگشت بدنداں ہوجائیں گے۔''

(۴) علم ہیئت

ہندوؤں کا علم افلاک ریاضی کے دیگر شعبوں کی طرح عیسیٰ سے تقریباً تین ہزار برس پہلے متداول ہوچکا تھا وہ ہیاتی مسائل جن پر اہل یورپ زمانہ حال سے چند سال پہلے کوئی مستقل رائے نہ قائم کرسکتے تھے۔ اور جن میں سے بعض اب بھی ان کی تحقیقات کی دسترس سی باہر ہیں۔ انھیں ہندوؤں نے جس کمال صحت کے ساتھ حل کردیا

ہے وہ آج بھی اہل بصیرت کو حیرت میں ڈالے ہوئے ہے۔ شمس و قمر کے دوائر کو بروج اور حمل میں تقسیم کرنا سورج اور چندر گہن کے اسباب کی تحقیق اور ان کے اوقات کا تعین۔ زمین اور دیگر سیاروں کا اپنی دھری پر دورہ کرنا، نظام شمسی، زمین اور سیاروں کے درمیان کی دوری، ثوابت اور سیاروں کی تمیز۔منطقات، طول البلد، اور عرض البلد کا قائم کرنا۔ کرۂ ہوا کا عمق۔ شہاب ثاقب، دمدار ستارے، قوت کشش، ان جملہ مسائل کو ہندوؤں نے اپنے دائرۂ تحقیقات میں کھینچ لیا تھا۔ اہل یورپ ان میں سے بعض امور کے دریافت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مثلاً اسحاق نیوٹن قوت کشش کا دریافت کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ بارہویں صدی میں بھاسکر اچاریہ نے قانون کشش کی بڑی خوبی اور صفائی سے تشریح کی ہے۔ سدھانت شرومنی میں لکھا ہوا ہے۔

''زمین اپنی قوت کشش سے کل اجسام کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اسی لیے وہ سب زمین کی طرف گرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔''

مشہور جرمن عالم دیبر لکھتا ہے ''آٹھویں اور نویں صدی میں اہل عرب ہیئت میں ہندوؤں کے خوشہ چین تھے۔ انھوں نے اپنے بروج قمری ہندو ہیئت سے لیے ہیں۔''

سرولیم ہنٹر فرماتے ہیں ''اہل عرب نے آٹھویں صدی میں ہندوؤں کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور ان کے کئی سدھانتوں کو سند ہند، کے نام سے عربی زبان کا جامہ پہنایا۔''

پروفیسر ولسن فرماتے ہیں ''خلفائے بغداد ہندوٴ علمائے ہیئت کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ اور انھیں اکثر اپنے دربار میں مدعو کرتے تھے۔ اہل ہند کو عربوں کے استاد کہلانے کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا کہ اہل زبان کو۔

سورج سدھانت جو آریہ بھٹ کی مشہور تصنیف ہے یورپ کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوچکی ہے۔ اسی پایہ کی سات اور تصانیف موجود ہیں جو ہندو قوم کے کمال ہیئت کی قائل ہیں (۱) برہم سدھانت (۲) سوم سدھانت (۳) برہسپت سدھانت (۴) گارگ سدھانت (۵) نارو سدھانت (۶) پلست سدھانت اور ((۷) وسشٹ سدھانت۔ آریہ بھٹ کے زمانہ پر تحقیق کے ساتھ کوئی رائے نہیں قائم کی جاسکی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس نے وکرمادت سے بہت قبل باغ فلک کی سیر کی ہوگی۔ اہل یورپ کا

خیال ہے کہ اسی نے سب سے پہلے سورج اور چندر گہن کے صحیح اسباب اور نیز زمین کے اپنے محور پر گھومنے کا ذکر کیا ہے مگر باوجودیکہ ان نواقعات پر آریہ بھٹ نے تفصیل سے بحث کی ہے اس کے قبل کی تصانیف میں بھی ان کا ذکر موجود ہے۔ زمین کی گولائی، اس کا قوت کشش سے خلا میں قائم رہنا۔ زمین کا قطر اور محیط۔ مد وجزر کے اسباب، ان واقعات کا دیگر سدھانتوں میں بھی۔ حتیٰ کہ ویدوں میں ذکر موجود ہے۔ آریہ بھٹ سے ہندو علما ہیئت کا خاتمہ سا ہوجاتا ہے اس کے بعد رمل اور نجوم نے ہیئت کی جگہ لے لی۔ آریہ بھٹ خود ہی اس انحطاط کا بانی ہے۔ اس کا میلان نجوم کی جانب زیادہ تھا۔ اور نجوم میں اس نے ایک مشہور کتاب لکھی ہے۔

'زمانہ' مئی۔جون ۱۹۱۷ء

کلا بھون

عنوان بالا کے لفظی معنی ہیں کارخانہ صنعت، صنعت گاہ یا مدرسہ صنعت و حرفت سنسکرت میں کلا کہتے ہیں صنعت کو اور بھون کہتے ہیں مکان کو۔ کلا بھون اصل میں ایک صنعتی کالج کا نام ہے جس کو ریاست بڑودہ کے اولو العزم والی قائم کیا ہے۔ ذیل کے مفصل حالات کے لیے ہمیں منشی نواب رائے صاحب کا مشکور ہونا چاہیے۔ مہا راجہ بڑودہ کی روشن خیالی سچ پوچھو تو اور ریاستوں کے لیے قابل رشک و تقلید ہے بڑی بات یہ ہے کہ یہاں تعلیم دی جاتی ہے۔ بڑودہ کی مروجہ زبان یعنی گجراتی میں جو واقعی نہایت آسان زبان ہے۔ کمال یہ کیا ہے کہ اخراجات کم و آسائش کے سامان زیادہ ہیں۔ اکتساب کمال کے لیے اس سے بہتر ذریعہ طلبا کو اور کیا میسر آسکتا ہے۔ مکرمی منشی نواب رائے کا یہ خیال صحیح ہے کہ ہماری گورنمنٹ کے صنعتی کالجوں میں طلبا کو اس کالج سے کہیں زیادہ خرچ کرنے کی نوبت آجاتی ہے۔ ہمارے خیال میں تو یہی تفوق کافی ہے جس سے کلا بھون رفتہ رفتہ ملک میں ممتاز ہوجائے گا۔

ریاست بڑودہ نے صرف عام تعلیم اور معاشرتی مسائل ہی میں حیرت انگیز ترقی نہیں کی ہے بلکہ صنعتی معاملات پر بھی وہاں پوری توجہ صرف کی گئی ہے اور اس عقدہ کو حل کرنے میں اس دور بینی سے کام لیا گیا ہے جو ہندوستان کی دوسری ریاستوں کے لیے قابل تقلید ہے۔ مہاراجہ صاحب بڑودہ پختہ کار مدبر اور منتظم شخص سے یہ امر کیوں کر مخفی رہ سکتا ہے کہ کسی قوم کی ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ صنعت و حرفت ہے۔ کلا بھون جو بڑودہ کا خاص صنعتی کالج ہے ہنر یا مینس دور بینی کی زندہ مثال ہے کیا بہ لحاظ معیار تعلیم اور کیا بہ لحاظ تعداد طلبا یہ کالج سب ہندوستانی ریاستوں کے کالجوں میں ممتاز ہے اور اس کے وجود سے صرف بڑودہ کے باشندے ہی نہیں فیضیاب ہوتے بلکہ

گجرات اور صوبہ بمبئی کے دیگر مقامات سے طلبا وہاں آتے ہیں چونکہ وہاں تعلیم ارزاں ہے اور بڑودہ میں انسان کفایت سے رہ سکتا ہے۔ اس لیے قرب و جوار کے طلبا اس میں بڑے شوق سے داخل ہوتے ہیں۔ اس کالج کی سب سے قابل وقعت تعلیمی خوبی یہ ہے کہ یہاں اصولی اور عملی ہر دو قسم کی تعلیم دی جاتی ہے بلکہ زیادہ تر وقت عملی کام ہی میں صرف ہوتا ہے۔ اصولی تعلیم میں کل وقت کے ایک ثلث سے زیادہ صرف کرنا غیر مناسب سمجھا جاتا ہے اور عملی تعلیم میں بھی صرف تجربات اور قیاسات پر قناعت نہیں کی جاتی بلکہ اسے تاجرانہ نگاہ سے دیکھنے اور برتنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وسیلہ تعلیم گجراتی زبان ہے۔ مہاراجہ صاحب بہادر نے یہ طرز عمل اس لیے اختیار کیا ہے کہ اس کالج سے پیشہ و رضاع اور مزدور اور دستکار بھی مستفید ہوسکیں جو بالعموم انگریزی سے نابلد ہوتے ہیں۔ گجراتی زبان بہت مشکل نہیں، ہر ایک طالب علم خواہ وہ مدراسی ہو یا بنگالی، نیپالی ہو یا پنجابی دو تین مہینوں میں اسے سمجھنے کی کافی لیاقت حاصل کرلیتا ہے۔ اور زبان کی بنا پر اسے کوئی شکایت نہیں باقی رہتی اگر کوئی طالب علم گجراتی زبان اچھی طرح سے نہ سمجھ سکے تو پروفیسر ہندی مرہٹی اور انگریزی سے بھی کام لیا کرتے ہیں۔ کالج میں اس وقت تیس پروفیسر ہیں اور سب کے سب اپنے صیغہ کو تعلیم دینے کی پوری لیاقت رکھتے ہیں۔

امتحانات: ہر ایک صیغہ کے لیے وحدت تعلیم تین سال رکھی گئی ہے۔ اس کے بعد امتحان ہوتا ہے ممتحن زیادہ تر ریاست کے وہ افسران ہوتے ہیں جو گورنمنٹ کی جانب سے صنعتی وزراعتی مشاغل میں مصروف ہیں اور جن میں سے اکثر یورپین یونیورسٹیوں کے سند یافتہ ہیں۔ کامیاب طلبا کو نصاب تعلیم کے لحاظ سے انجینئری کیمیا گری پارچہ بافی، فن تصویر اور زراعت کی اعلیٰ ڈگریاں دی جاتی ہیں۔ان مقامی امتحانات کے علاوہ کلا بھون کے طلبا کو بمبئی اور انگلستان کے بعض خاص صنعتی امتحانات میں شریک ہونے کا مجاز ہے۔ بمبئی کے جمشید جی آرٹ اسکول کے امتحانات اور لندن کے گلڈس اکزامنیشن میں کلا بھون کے طلبا سیکڑوں کی تعداد میں شریک اور کامیاب ہوتے ہیں۔ لیبوریٹریاں (تجربہ گاہ) کلا بھون کے طلبا کو ایک خاص سہولت یہ ہے کہ کلا بھون کی آزمائش گاہیں اور کارخانے بہت اعلیٰ پیمانہ پر قائم کیے گئے ہیں۔ ہندوستان کے کسی صنعتی کالج کو ایسی مکمل

لیبوریٹری رکھنے کا فخر حاصل نہیں ہے۔ اس کا کارخانہ انجینئری خاص طور پر قابل ذکر ہے جو موجودہ زمانہ کے تازہ ترین ایجادات سے آراستہ ہے۔ ان کارخانوں میں انجینئری، نجاری، آہنگری، رنگ ریزی وغیرہ کا کام کیا جاتا ہے۔ ہر ایک صیغہ کے لیے جدا جدا کارخانے قائم ہیں۔ یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ یہ کارخانہ محض تجربہ کی لیبوریٹریاں نہیں ہیں بلکہ انھیں تجارتی اصولوں پر چلایا جاتا ہے۔ ریاست کے ہر صیغہ کی ضروریات خواہ وہ محکمہ نہیں ہویا انجینئری و ڈاکٹر ہو یا تعلیمی، سب انھیں کارخانوں سے پوری ہوتی ہیں۔ ڈاکٹری کے باریک و نازک اور پیچیدہ اوزار طبیعات کی تحقیقات کے آلات انجینئری کی کلون اور محکمہ ڈاک و تار برقی کے اوزاروں کے بنانے کے لیے اعلیٰ درجہ کی علمی قابلیت کے ساتھ ساتھ ہنرمندی اور صفائی لازمی ہے۔ دولت برطانیہ ہند کو ان محکمہ جات کی ضروریات کے لیے انگلستان کا دست نگر بننا پڑتا ہے۔ مگر بڑودہ میں کلا بھون ان ضروریات کو بحسن تمام پورا کردیتا ہے۔ اس طرح گویا طلبا کو اصولی اور عملی تعلیم کے ساتھ اپنے معلومات کو تاجرانہ کاروبار میں صرف کرنے کا مادہ بھی پیدا ہوجاتا ہے کلا بھون کی کیمیکل لیبوریٹری (کیمیائی تجربہ گاہ) صوبہ بمبئی کے بہترین تجربہ گاہوں میں ہے رنگ سازی اور رنگ ریزی کے کارخانے جدا ہیں۔ کالج کے متعلق ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں سائنس اور صنعت کی تازہ ترین اور مستند کتابیں موجود رہتی ہیں۔

مصارف تعلیم: کلا بھون میں دوسری سہولت یہ ہے کہ یہاں کے مصارف بہت کم ہیں اور متوسط وسائل کا طالب علم بھی یہاں تحصیل علم کی جرات کرسکتا ہے۔ کیمیا گری پارچہ بافی، صیغہ تصویر، صیغہ تعمیر کے چار اسکولوں میں صرف ۱۲ روپیہ فیس سالانہ لی جاتی ہے۔ ایک روپیہ ماہوار فیس ہر شخص آسانی سے دے سکتا ہے بعض دیگر صیغوں میں فیس اس سے کچھ زائد ہے۔ مگر کسی صورت میں دو روپیہ ماہوار سے زیادہ نہیں ہے کتابیں اور آلات کے لیے تیس روپیہ سالانہ درکار ہوتا ہے۔ کلابھون کے متعلق ایک بورڈنگ ہاؤس بھی ہے جس میں فی الحال طلبا ٹھہر سکتے ہیں۔ یہاں دو وقت کی خوراک کا خرچ سات روپیہ ماہوار سے زیادہ نہیں ہے دیگر مصارف کے لیے آٹھ روپیہ ماہوار کافی ہوجاتے ہیں اس سے زیادہ خرچ کرنا طالب علم کی حیثیت پر منحصر ہے گویا کلا بھون میں اقل درجہ ۱۶ روپیہ ماہوار پر صنعتی اور زراعتی تعلیم حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس

کمی مصارف نے اس کالج کو بہت مقبول بنا دیا ہے بمبئی کے جمشید جی اسکول آف آرٹ اور پونا کے کالج آف سائنس میں اوسط ماہوار خرچ چالیس روپیہ سے کم نہیں پڑتا دیگر مدارس میں بھی کم و بیش یہی اوسط آتا ہے۔ اس لحاظ سے کلا بھون کو دوسرے مدارس پر ایک قابل رشک فضیلت حاصل ہے۔

وظائف: کلا بھون میں وظیفے بھی فیاضی سے دیے جاتے ہیں۔ ریاضت اور علمی سرگرمی کی داد وظائف کی شکل میں دی جاتی ہے اور اس طرح صدہا طلبا کے تعلیمی مصارف میں اور بھی تخفیف ہوجاتی ہے ریاست کے خاص خاص صوبوں کے لیے وظیفوں کی تعداد معین ہے اور یہ انھیں صوبوں کے طلباکو دیے جاتے ہیں۔ صوبہ متوسط کے سرشتہ تعلیم کی طرف سے دس روپے ماہوار کے گیارہ وظیفے قائم ہیں جو صوبہ مذکور کے طلبا کو ملتے ہیں۔ احاطہ بمبئی کی کئی ریاستوں اور کئی پبلک جماعتوں کی طرف سے بھی وظیفے متعین ہیں۔

قواعد داخلہ: کلا بھون کا تعلیمی سال دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا زمانہ ۲۱رنومبر سے شروع ہوتا ہے اور دوسرا ۶رمئی سے جماعت میں شریک کرنے سے پہلے داخلہ کا ایک خاص امتحان لیا جاتا ہے۔ داخلہ کی فیس ایک روپیہ مقرر ہے کامیاب طلبا میں سے بہترین امیدواروں کی ایک مخصوص تعداد ہر سال انتخاب کرلی جاتی ہے۔ جس شخص نے عام مضامین میں ورنیکولر مڈل تک تعلیم پائی ہو وہ داخلہ کے امتحان میں کامیاب ہوسکتا ہے اور اگر کچھ انگریزی شدبد جانتا ہو تو اور بھی بہتر ورنہ چنداں مضائقہ نہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ تعداد طلباکا محدود کردینا صدہا طلبا کی دل شکنی کا باعث ہوتا ہے مگر یہ انتخابی امتحان صرف اس غرض سے لیا جاتا ہے کہ کثرت طلبا سے تعلیم میں ہرج واقع نہ ہو۔ ۱۹۱۰ء میں کلا بھون میں تقریباً ۶۰۰ طلبا زیر تعلیم تھے۔ صیغہ دستکاری میں ۵۰ و صیغہ کیمیاوی میں ۴۰، صیغہ پارچہ بافی میں ۴۰، صیغہ تصویر میں ۵۰، صیغہ تعمیر میں ۴۵ اور صیغہ تجارت میں ۲۰ باقی طلبا دوسری جماعتوں میں شریک تھے۔

کلا بھون سے متعلق ریاست کا سالانہ خرچ

کلا بھون کے سالانہ مصارف ۸۰؍ ہزار سالانہ کے قریب ہیں۔ اس میں دو تین دستکاری کے چھوٹے چھوٹے مدرسے بھی شامل ہیں ایک ایسے وسیع صنعتی کالج کا ایسی

قلیل رقم میں کامیابی کے ساتھ چلنا حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ فیس اس قدر کم لی جاتی ہے فیس کی آمدنی کسی صورت میں دس ہزار سالانہ سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ دونوں دستکاری کے مدرسوں کی امداد بھی کم سے کم دس ہزار سالانہ ہوگی۔ ان رقوم کو خارج کردیجیے تو کلا بھون کا ماہوار خرچ چھ ہزار سے زیادہ نہیں آتا اس کا سب سے بڑا سبب غالبًا یہ ہے کہ اس کالج کے متعلق جتنے کارخانے ہیں وہ سب کے سب تجارتی اصولوں پر چلائے جانے کے باعث کالج کے لیے بجائے ایک بار کے باعث تقویت ہیں۔ وہ صرف اپنا خرچ ہی نہیں نکالتے بلکہ کالج کو بیس ہزار سالانہ فائدہ پہنچاتے ہیں۔ صنعتی کالجوں میں لیبوریٹری اور مشقی کارخانوں کا خرچ اس کے مصارف کو بڑھا دیا کرتا ہے کلا بھون کی کیفیت اس کے برعکس ہے۔ یہاں فی طالب علم ریاست کا دس روپے ماہوار صرف ہوتا ہے گویا اس کالج نے اس امر کی عملی مثال دے دی ہے کہ صنعتی کالج بمقابلہ آرٹ کالج کے زیادہ کفایت سے چلایا جاسکتا ہے اور کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اسی قدر سالانہ مصارف میں دوسرے مقامات میں صنعتی کالج کیوں نہ چلائے جاسکیں۔ حال میں گورنمنٹ آف انڈیا نے کانپور میں ایک صنعتی کالج قائم کرنے کی تجویز جناب سکریٹری صاحب بہادر ہند کی خدمت میں پیش کی تھی مگر وہ مصارف کثیر کی بنیاد پر عمل میں نہ لائی جاسکی۔

ہمارے ملک کو فی الحال تحقیقاتی کالجوں کی اتنی ضرورت نہیں جتنی مفید عام صنعتی کالجوں کی ہماری گورنمنٹ کے صنعتی کالجوں کا خرچ اسی رقم سے کئی گناہ زیادہ ہوجاتا ہے۔ شاید ہندوستان کے کسی دوسرے صنعتی کالج میں طلبا کو اپنے معلومات کے تاجرانہ پہلو کے پختہ کرنے کے ایسے موقع حاصل نہیں ہیں۔ اس کارخانہ کی سرسبزی کا ایک بڑا سبب ہمدردانہ تعلق ہے جو اس میں اور ریاست کے دیگر محکمہ جات کے درمیان قائم ہے۔ یہ سب محکمے اپنی ضروریات کلا بھون کے کارخانوں میں پیش کرتے ہیں۔ اور اس طرح ریاست کا جو روپیہ دوسرے کارخانوں میں صرف ہوجاتا اس سے کلا بھون مستفید ہوجاتا ہے مگر یہ خیال کرنا غلطی ہوگی کہ ریاست کی یہ طرف داری مربیانہ سرپرستی کے خیال پر مبنی ہی نہیں اس کا انحصار اس کی کفایت اور خوبی ہے جس سے کلا بھون ان ضروریات کو انجام دیتا ہے۔

کارخانے

کلا بھون میں پہلے کوئی کارخانہ نہ تھا لڑکوں کو دوسرے کالجوں کی طرح لیبوریٹری میں تجربات کرنا پڑتے تھے ریاست کے محکمہ تعمیر کی طرف سے ایک کارخانہ قائم تھا جو اس محکمہ کی ضروریات کو انجام دیا کرتا تھا۔ خانگی محکمہ کی طرف سے بھی ایک کارخانہ کھلا ہوا تھا (۱۸۹۲ء) میں مہاراجہ بڑودہ کی گورنمنٹ نے ان دونوں کارخانوں کو ملحق کردیا اور کلا بھون سے اس کا تعلق قائم کردیا۔ اس وقت یہاں ۲۷ کاریگر مستقل طور پر ملازم ہیں۔ اس کارخانہ کی پبلک نے کیا قدر کی ہے یہ ان تمغوں سے ثابت ہوتا جو اس نے مختلف نمائشوں میں پائے ہیں۔ ان میں ٦ طلائی تمغے ہیں جو احمد آباد اور بمبئی کی نمائشوں میں لکڑی اور لوہے کے کام کے لیے دیے گئے تھے۔ سات چاندی کے تمغے ہیں جو مدارس اور احمد آباد کی نمائشوں میں نقاشی چھینٹ سازی اور گھڑی سازی وغیرہ کاموں کے لیے ملے تھے۔ الٰہ آباد کی نمائش گاہ میں بھی بڑودہ کے کلا بھون سے کئی چیزیں آئی تھیں جو قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئیں۔ چونکہ فی الحال صوبہ متحدہ میں کوئی دستکاری اور صناعی کا کالج نہیں ہے اور کانپور کا مجوزہ کالج بنتے بنتے کہیں چار پانچ سال میں بن کر تیار ہوگا اس لیے جن طلبا کا رجحان صنعت کی طرف ہو ان کے لیے کلا بھون سے بڑھ کر اور کوئی دوسرا کالج نہیں ہے۔ ١٦ روپے ماہوار کے صرفہ اور تین سال کی تعلیم کے بعد وہ اس قابل ہوجائیں گے کہ مسئلہ کسب معاش کو آسانی سے حاصل کرسکیں۔

'ادیب' جنوری ۱۹۱۳ء

قیس

قیس فارسی اور عربی دنیائے عشق کا بادشاہ ہے مگر اس کی داستان پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اسے کیوں کر یہ درجہ حاصل ہوا۔ نہ کوئی دلچسپی ہے نہ کوئی واقعہ، بس وہ عاشق پیدا ہوا، عاشق جیا اور عاشق مرا، گویا اس کی زندگی ہی عشق تھی۔ اس سے بحث نہیں کہ تاریخ ہمیں اس کی کچھ خبر دیتی ہے یا نہیں۔ تاریخ حسن اور عشق کے تذکرے نہیں کرتی۔ ہاں اتنا ہر شخص جانتا ہے کہ تاریخ کے بڑے سے بڑے نامور بڑے سے بڑے فاتح کو وہ بقائے دوام نہیں۔ اس کے نام پر شاعر کا قلم وجد کرتا ہے، اس کے نام سے عشق کی ہستی قائم ہے ورنہ اب اس جنس کا وجود کہاں۔ وہ عشاق کے آہ و نالے، امید و یاس، دیوانگی و بیخودی کی زندہ تصویر ہے۔ وہ خود ایک شاعرانہ تخیل ہے۔ فارس اور عرب کے شعرا نے عاشق کے لیے جو معیار قائم کیا ہے، قیس اسی کا وجود ظاہر ہے وہاں کا عاشق ایک لمبا نحیف اور لاغر آدمی ہوتا ہے۔ اس کے ناخن اور بال بڑے بڑے ہوتے ہیں جسم پر لباس عریانی کے سوا اور کوئی لباس نہیں ہوتا۔ یا اگر ہوتا ہے تو گریبان سے دامن تک پھٹا ہوا، آنکھوں سے جوے اشک جاری، رخسارے زرد، ناخن سے جسم کو کھسوٹے ہوئے، زمین پر گرد و غبار میں لوٹتا ہوا، دیوانہ مدہوش، انتہا کا رقیق القلب بیخود ایسا کہ معشوق کو بھی نہ پہچانے کوہ و وادی میں آوارہ خاک بسر گھومنے والا نہ کچھ کھائے نہ پیئے۔ کھائے تو غم پیئے تو آنسو۔ ہوا پر زندگی کا دار ومدار یہ عاشقوں کے اوصاف ہیں اور مجنوں کی ذات میں یہ سب اوصاف کمال کو پہنچ گئے ہیں۔

زمانۂ قدیم کے ہیروؤں کا عام قاعدہ ہے کہ وہ اسی وقت عالم شہود میں آتے ہیں جب ان کے مایوس والدین اولیا اور فقرا کے آستانوں پر جبین سائی کرتے کرتے

بوڑھے ہوجاتے ہیں۔ قیس نے بھی یہی روش اختیار کی۔ آپ پیدا ہوئے تو پدر بزرگوار نے اپنا دفینہ اور خزانہ سب کچھ لٹا دیا۔ یہ بچہ ماں کے پیٹ سے عاشق پیدا ہوا۔ بوڑھی دایہ کے گود میں اسے چین نہ آتا، رو رو کر دنیا سر پر اٹھا لیتا۔ مگر جب کوئی مہوش نازنین گود میں لیتی تو آپ کھل جاتے

بادا یہ خود نمی شدی رام — بے ماہ رخ نداشت آرام
گر صورت خوشش بگوش رفتے — ان طفل دمے زہوش رفتے

موید نے جب اس عاشق تن لڑکے کا ستارہ دیکھا تو بولا کہ یہ عین عنفوان شباب میں دیوانہ عشق ہوجائے گا۔

کان طفل بسہل روزگارے — دیوانہ شود زبہر یارے
در عشق بتے فسانہ گردد — رسوا شدۂ زمانہ گردد
لیکن فتدش گہے جوانی — ورسر ہو سے چنانکہ دانی
از عشق بتے نترند گردد — دیوانہ و مستمند گردد

جب لڑکے کا سن تعلیم آیا والدین نے اسے ایک مکتب میں بٹھا دیا۔ اس مکتب میں چند لڑکیاں بھی پڑھتی تھیں۔ لیلیٰ ان کی رانی تھی، حسن و نزاکت میں فرد، عاشق تن مجنوں نے اسی کو چھانٹا۔ دونوں مکتب میں بیٹھے بیٹھے نظارہ بازی کیا کرتے۔ حضرت عشق ریشہ دوانیاں کرنے لگے۔ سمجھ دار لڑکے اور لڑکیوں کو ایک ہی مکتب میں پڑھانا مناسب ہے یا نہیں۔ اس مسئلہ پر رائے قائم کرنے میں یہ داستان پڑھنے والوں کو کوئی وقت نہیں ہوسکتی۔

آن گلشن حسن را بہ یکبار — شد قیس بہ نقد جان خریدار
لیلیٰ چو رفیق خویش دیدش — او نیز بمہر دل خریدش
عشق آمد و در دو سینہ جاکرد — خود را بد و یار آشنا کرد
در خانۂ صبر آتش افتاد — شد خرمن ننگ و نام برباد

رفتہ رفتہ یہ راز لڑکوں پر آشکارا ہوگیا، چرچا پھیلا، لیلیٰ کی ماں نے یہ کیفیت دیکھی تو لڑکی کو مکتب سے اٹھا لیا اور ساتھ ہی نصیحت کرنے لگی۔

گفتش کہ شنیدم از فلانے — کاشفتۂ تو شدہ جوانے

دین هم که تو نیز اسیر روئی	آزرده ز زخم تیره روئی
گیرم بودت ہزار عاشق	معشوقہ شدن زتو چہ لائق
دختر کہ بہ ایں و آں نشنید	جز رو سیہی دگر نہ بسیند
گل را شرف و لطافتے ہست	چندانکہ نگر و کسن بد و دست
آں کس کہ گرفت و گرد پوش	از دست بیفگند بہ کوئش
ترسم کہ چو گردد ایں خبر فاش	بدنام شوی میان اوباش
صوفی کہ رود بہ مجلس مے	وقتے بچکد پیالہ بروے
آں کس کہ مگس زکاسہ راند	ناخوردن و خورد نش نداند

مگر لیلیٰ پر اس فہمائش کا وہی اثر ہوا جو نصیحتوں کا عشاق پر ہمیشہ ہوا کرتا ہے۔ اس نے فوراً تجاہل جتایا۔ بھولی بھالی لڑکی بن گئی۔ اور کہنے لگی ''اماں! عشق ہے کیا!''

کاے مادر دہر عشق گو چیست	معشوق کدام و عاشقم کیست
آں عشق گلیست در بہارے	بانام دہے ست درد یارے
یا عشق زجنس خورد پنہاست	از بہر خدا بمن بگور است
ہرگز نشنیدہ ایم این نام	لفظے کے نیست در جہان عام

ماں بیچاری سیدھی سادی عورت تھی۔ لڑکی کی باتوں پر یقین آ گیا۔ ادھر عشق نے پاؤں نکالے۔ میاں قیس مدرسے جاتے، اور رو پیٹ کر گھر چلے آتے۔ آخر جب دیکھا کہ اس نالہ و زاری سے کام نہ چلے گا تو ایک روز آپ اندھے بن بیٹھے اور لیلے کے دروازہ پر جاکر راستہ پوچھا۔ لیلیٰ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر راستہ بتایا، راز و نیاز کی دو چار باتوں کا موقع مل گیا۔ اب تو آپ کو چسکا پڑ گیا۔ دوبارہ آپ فقیر بن کر لیلیٰ کے دروازہ پر پہنچے اور سوال کا نعرہ بلند کیا۔ لیلیٰ نے آواز پہچانی۔ خود صدقہ لے کر دروازہ پر آئی نظریں ملیں اور دل ٹھنڈے ہوئے۔

پھر تو میاں قیس روز ایک نہ ایک سوانگ لاتے۔ یہاں تک کہ بہروپ کھل گیا۔ لوگ مجنوں کی تاک میں رہنے لگے کہ موقع پائیں تو ہمیشہ کے لیے قضیہ مٹا دیں۔ یہ پانسہ بھی پٹ پڑا فراق نے مجنوں کو دیوانہ بنا دیا۔

دیوانہ عشق شد بیک بار	رسواء محلہ گشت و بازار

بوڑھے ہوجاتے ہیں۔ قیس نے بھی یہی روش اختیار کی۔ آپ پیدا ہوئے تو پدر بزرگوار نے اپنا دفینہ اور خزانہ سب کچھ لٹا دیا۔ یہ بچہ ماں کے پیٹ سے عاشق پیدا ہوا۔ بوڑھی دایہ کے گود میں اسے چین نہ آتا، رو رو کر دنیا سر پر اٹھا لیتا۔ مگر جب کوئی مہوش نازنین گود میں لیتی تو آپ کھل جاتے

بادا یہ خود نمی شدی رام　　بے ماہ رخ نداشت آرام
گر صورت خوشش بگوش رفتے　　ان طفل دمے زہوش رفتے

موید نے جب اس عاشق تن لڑکے کا ستارہ دیکھا تو بولا کہ یہ عین عنفوان شباب میں دیوانہ عشق ہوجائے گا۔

کان طفل بسہل روزگارے　　دیوانہ شود زبہر یارے
در عشق بتے فسانہ گردد　　رسوا شدۂ زمانہ گردد
لیکن فتدش گہے جوانی　　ورسر ہوسے چنانکہ دانی
از عشق بتے نثرند گردد　　دیوانہ و مستمند گردد

جب لڑکے کا سن تعلیم آیا والدین نے اسے ایک مکتب میں بٹھا دیا۔ اس مکتب میں چند لڑکیاں بھی پڑھتی تھیں۔ لیلیٰ ان کی رانی تھی، حسن و نزاکت میں فرد، عاشق تن مجنوں نے اسی کو چھانٹا۔ دونوں مکتب میں بیٹھے بیٹھے نظارہ بازی کیا کرتے۔ حضرت عشق ریشہ دوانیاں کرنے لگے۔ سمجھ دار لڑکے اور لڑکیوں کو ایک ہی مکتب میں پڑھانا مناسب ہے یا نہیں۔ اس مسئلہ پر رائے قائم کرنے میں یہ داستان پڑھنے والوں کو کوئی وقت نہیں ہوسکتی۔

آن گلشن حسن را بہ یکبار　　شد قیس بہ نقد جان خریدار
لیلیٰ چو رفیق خویش دیدش　　او نیز بمہر دل خریدش
عشق آمد و در دو سینہ جاکرد　　خود را بد و یار آشنا کرد
در خانۂ صبر آتش افتاد　　شد خرمن ننگ و نام برباد

رفتہ رفتہ یہ راز لڑکوں پر آشکارا ہوگیا، چرچا پھیلا، لیلیٰ کی ماں نے یہ کیفیت دیکھی تو لڑکی کو مکتب سے اٹھا لیا اور ساتھ ہی نصیحت کرنے لگی۔

گفتش کہ شنیدم از فلانے　　کاشفتۂ تو شدہ جوانے

دین ہم کہ تو نیز اسیر روئی　　　آزردہ ز زخم تیرہ روئی
گیرم بودت ہزار عاشق　　　معشوقہ شدن زتوچہ لائق
دختر کہ بہ ایں و آں نشنید　　　جز رو سیہی دگر نہ بسیند
گل را شرف و لطافتے ہست　　　چندانکہ نگر و کسن بد و دست
آں کس کہ گرفت و گرد پوش　　　از دست بیفکند بہ کوئش
ترسم کہ چو گردد ایں خبر فاش　　　بدنام شوی میان اوباش
صوفی کہ رود بہ مجلس مے　　　وقتے بچکد پیالہ بروے
آں کس کہ مگس زکاسہ راند　　　ناخوردن و خورد نش نداند

مگر لیلیٰ پر اس فہمائش کا وہی اثر ہوا جو نصیحتوں کا عشاق پر ہمیشہ ہوا کرتا ہے۔ اس نے فوراً تجاہل جتایا۔ بھولی بھالی لڑکی بن گئی۔ اور کہنے لگی ''اماں! عشق ہے کیا!''

کاے مادر دہر عشق گو چیست　　　معشوق کدام و عاشقم کیست
آں عشق گلیست در بہارے　　　بانام دہے ست درد یارے
یا عشق زجنس خورد پنہاست　　　از بہر خدا بمن بگور است
ہرگز نشنیدہ ایم این نام　　　لفظے کے نیست در جہان عام

ماں بیچاری سیدھی سادی عورت تھی۔ لڑکی کی باتوں پر یقین آ گیا۔ ادھر عشق نے اور پاؤں نکالے۔ میاں قیس مدرسے جاتے، اور رو پیٹ کر گھر چلے آتے۔ آخر جب دیکھا کہ اس نالہ و زاری سے کام نہ چلے گا تو ایک روز آپ اندھے بن بیٹھے اور لیلے کے دروازہ پر جاکر راستہ پوچھا۔ لیلیٰ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر راستہ بتایا، راز و نیاز کی دو چار باتوں کا موقع مل گیا۔ اب تو آپ کو چسکا پڑ گیا۔ دوبارہ آپ فقیر بن کر لیلیٰ کے دروازہ پر پہنچے اور سوال کا نعرہ بلند کیا۔ لیلیٰ نے آواز پہچانی۔ خود صدقہ لے کر دروازہ پر آئی نظریں ملیں اور دل ٹھنڈے ہوئے۔

پھر تو میاں قیس روز ایک نہ ایک سوانگ لاتے۔ یہاں تک کہ بہروپ کھل گیا۔ لوگ مجنوں کی تاک میں رہنے لگے کہ موقع پائیں تو ہمیشہ کے لیے قضیہ مٹا دیں۔ یہ پانسہ بھی پٹ پڑا فراق نے مجنوں کو دیوانہ بنا دیا۔

دیوانہ عشق شد بیک بار　　　رسواء محلہ گشت و بازار

گشتے سر و پا برہنہ پیوست　　طفلان قبیلہ سنگ در دست
در کو بفغان زسنگ ایشان　　در خانہ بجان زپند خویشان
ہر ہر سر کوہ فسانہ او　　در ہر محفل ترانۂ او

قیس کی یہ حالت زار دیکھی تو پدر بزرگوار کو تشویش پیدا ہوئی پہلے تو سمجھتے رہے کہ یہ سودا خام ہے۔ ہوش آئیں گے تو آپ ہی اتر جائے گا۔ مگر جب دیکھا کہ روز بروز رنگ گاڑھا ہوتا جاتا ہے تو ایک دن آپ نے مجنوں سے پوچھا تمھاری یہ کیا حالت ہے تمھیں کیا بیماری ہے کیا فکر ہے۔ اس وحشت کا کیا سبب ہے۔ اگر عشق نے ستایا ہے تو معشوق کون ہے۔

پروانۂ شعلۂ چہ شمعئی　　آشفتۂ گل رخ چہ جمعئی
آہوے کدام لالہ زارت　　کرد از نظرے چنین شکارت

مگر مجنوں پر بیخودی کا یہ عالم تھا کہ اپنے باپ کو بھی نہ پہچان سکا۔ پوچھنے لگا تم کون ہو کہاں سے آئے ہو اور جب معلوم ہوا کہ یہ والد محترم ہیں تو بولا۔

مجنوں گفتش بگو پدر چیست　　غیر از لیلیٰ کسے دگر کیست
نامد زمئے کہ عش وادش　　از مادر و از پدر بیادش

بیٹے کا تو یہ حال، بوڑھے باپ نے پند و نصائح کا دفتر کھول ہی دیا۔ دنیا کا نشیب و فراز سوجھایا تحصیل کمال کی تلقین کی اور اپنی طولانی اور بے مزہ تقریر عورتوں کی بیوفائی اور مکر سازی پر ختم کیا۔

زین شیفتگی و خام کاری　　بسیار کشی ز دہر خواری
خواہی چو سعادت گرامی　　دانش طلب و بلند نامی
اکنوں کہ جواں و ہوشمندی　　باید طلبیدن ارجمندی
فردا کہ شوی بسان من پیر　　افسوس خوری و نیست تدبیر
بااصل و نسب مباش مغرور　　کان ہست بسے زمردمی دور
کس مہر و وفا ززن تجوید　　کز شورہ زمین سمن نروید
چشمش کہ نظر بنا زکردہ　　ہر تو در فتنہ باز کردہ

مگر عاشقوں پر نصیحتوں کا اثر کب ہوا ہے۔ بالخصوص ایسی نصیحت کا جس میں

کیفیات قلب کا ذرا بھی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اور جس میں ہمدردی کا عنصر مطلق نہیں۔ مجنوں نے اس کے جواب میں اپنی معذوری اور بیکسی جتائی اور کسی قدر گستاخی کے ساتھ کہا۔ ''آپ اس کوچہ سے واقف نہیں آپ میرے درد کو کیا جانیں۔ مجھے میرے حال پر رہنے دیجیے۔

این شیفتگی بدست من نیست　　کس دشمن جان خویشتن نیست
خواہی زفراق او نہ نالم　　برخیز و برارش از خیالم
خجلت زدہٗ و سیاہ کارم　　و زکردہٗ خویشس شرمسارم
چوں نیست بدست اختیارم　　بگذار پدر مرا بہ کارم
آں بہ کہ نصیحتم نہ گوئی　　دست از من وکار من بشوئی
آں دیدہ کہ آمد از ازل کور　　از باری سرمہ کے دہد نور
پندم چہ دہی چہ جائے پندست　　پند تو مرا نہ سود مند است

اس جواب کا خاتمہ بہت پر معنی ہے۔ جو کسی قدر حقیقت کا پہلو لیے ہوئے ہے۔

اونے لیلیٰ و من نہ مجنوں　　یک تن شدہ ایم ہر دو اکنوں

ادھر لیلیٰ کی حالت بھی خراب تھی۔ شب و روز آہ و زاری کرتی تھی۔

میگفت کہ آہ چوں کنم چوں　　مجنوں شدہ ام زعشق مجنوں
اے باد صبا چو میتوانی　　کزمن خبرے بہ او رسانی
من ہم زتو کشتۂ فراقم　　جفتم بہ غمت گر از تو طاقم
اے دوست بیا دواء من کن　　فکر من و دروہائے من گن
مثلث نہ حریف رنج و در دم　　دانی کہ زنم نہ چوں تو مردم
زن زآتش عشق بیش سوزد　　خاشاک ضعیف پیش سوزد

مجنوں کے پدر بزرگوار نے جب دیکھا کہ خالی نصیحتوں اور تسلیوں سے کام نہ چلے گا، اور لڑکا بالکل دیوانہ ہوچکا ہے تو لیلیٰ کے باپ سے درخواست کی کہ مجنوں کو اپنی فرزندی میں قبول کیجیے۔ مگر لیلیٰ کے باپ نے بڑی ناہمدردی کے ساتھ ردسوال کیا۔ اور اپنے وجوہ کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا۔

فرزند تو دیوزشت خوی ست　　دیوانہ و تند دہرزہ گوی ست

اصلاح پذیر نیست مجنوں — از ورطۂ عقل مہست بیروں
بدنام ترے ازو نہ بینم — خود کام ترے ازو نہ بینم
دانی کہ مرا نہ باتو جنگ ست — نے از تو و خویشیٔ تو ننگ ست
ین کارولے نہ کار سہل ست — دیوانۂ تو نہ یار اہل ست
طوطی کہ بہ چغد ہم نفس کرد — بلبل کہ بہ زاغ در قفس کرد

پدر مجنوں نے ان الزامات کی زور کے ساتھ تردید کی اور کہا آپ کا یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے۔ مجنوں نہ تو زشت خو ہے نہ بدمست اسے صرف مرض عشق ہے جوں ہی اس مرض کی دوا ملے گی وہ ہوش میں آجائے گا۔ آپ خود اسے دیکھ لیں۔ اس کی سیرت کا امتحان کرلیں کسی کے کہنے سننے میں نہ آئیں۔ ارشاد ہو تو حاضر کروں۔ فریق ثانی اس شرط پر راضی ہوگیا اور حضرت مجنوں بلائے گئے۔ مگر قبل اس کے کہ کچھ سوال و جواب کی نوبت آئی شامت تقدیر سے لیلیٰ کا ایک کتا ادھر سے نکل پڑا۔ ''دیوانہ را ہوئے بس است'' مجنوں کو اب کہاں تاب، آپ اٹھے اور دوڑ کرکتے کو سینہ سے چمٹا لیا۔ کبھی اس کے ناخنوں کا بوسہ لیتے، کبھی اس کے منہ کو چومتے، اس کی تعریفوں میں رطب اللسان ہوگئے۔ پل باندھ دیے۔

برجست زجاء خویش آزاد — وزشوق بدست و پائش افتاد
مالید بہ پشت و پائے او روئے — کین پائے گذشتہ جست زان کوے
آور د بجر لتش در آغوش — خارید بہ ناخن آن سروگوش

پائش زکلوخ خار میرفت — و زپا سرش غبار میرفت
دامن بہ تہش فگندہ در خاک — میکرد بہ آستین سرش پاک
بوسید سرش بہ افق و آزرم — خارید تنش بہ ناخن نرم
گفت اے گلت از وفا سرشتہ — نقشت فلک از وفا سرشتہ
ہم نان کسان حلال خوردہ — ہم خوردہ خود حلال کردہ
صد روضہ خوش بزیر پایت — در روضۂ گہہ بہشت جایت
صد خون زبست چکیدہ در خاکی — وزلوث خباثت دہن پاکی

گر تو سگے از سرشت دوراں — نیک سگ تو منم بصد جاں

مجنوں کی گویائی نے اس وقت زور کمال دکھایا۔ یہ گویا اپنی امیدوں اور مرادوں کا مرثیہ تھا۔ مجنوں سے دامن چھڑا کے لیلیٰ کے باپ نے بیٹی کا ابن سلام سے عقد کردیا۔ لیلیٰ بہت آزردہ خاطر ہوئی جہاں تک شرم و حیا نے اجازت دی اپنی نارضا مندی ظاہر کی۔ مگر جب کچھ زور نہ چلا رو دھوکر خاموش ہوگئی۔ مجلس نشاط آراستہ ہوئی، قاضی صاحب تشریف لائے، عقد کے مراسم ادا کیے گئے۔ اور شب عروسی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ نوشہ بن ٹھن کے خلوت گاہ میں جلوہ افروز ہوا۔

آمد بسوئے عروس داماد — باخاطر خرم و دل شاد
در پہلو زن نگار بہ نشست — میخواست کہ سوء او بر دوست
بر روے زوش طمانچۂ سخت — زانگونہ در وفتاد از تخت
گفتش چہ خیال خام داری — گل بوئے مکن زکام داری
این تخت مقام تاجدار بست — وین خطبہ بہ نام شہر یاریست
(ہاتفی)

لیلیش چنان طپانچہ زد — کافتادہ چو مرد مردہ بیخود
(نظامی)

یہاں قصہ میں کچھ اختلاف بیان ہے۔ نظامی اور ہاتفی کہتے ہیں کہ لیلیٰ کی شادی ابن سلام سے ہوئی اور دونوں متفق ہیں کہ لیلیٰ نے اپنے بو الہوس شوہر کے منہ پر طمانچہ مارا۔ آخر وہ غریب چانٹا کھاکر مارے ندامت کے بھاگ کھڑا ہوا۔ اور طلاق کے سوا کوئی چارۂ نجات نظر نہ آیا۔ مگر خسرو فرماتے ہیں کہ مجنوں کی شادی نوفل کے لڑکی سے ہوئی۔ نوفل غالبًا مجنوں کے قبیلہ کا سردار تھا۔ اسے مجنوں کی خستہ حالی پر ترس آیا، مجنوں کی طرف سے لیلیٰ کے باپ کے پاس شادی کا پیغام بھیجا اور انکار کی حالت میں جنگ کی دھمکی دی۔ لیلیٰ کا قبیلہ بھی جنگ آوری میں فرد تھا۔ صف آرائیوں کی ٹھہری اور لیلیٰ کے باپ کو شکست ہوئی۔ مگر جب اسے قبیلہ والوں نے اس کشت و خون کا خاتمہ کرنے کے لیے لیلیٰ کو مار ڈالنا چاہا تو مجنوں بیتاب ہوگیا۔ اس نے نوفل سے التجا کی کہ برائے خدا اس شور و شر فرد کیجئے۔

آن تیر مزن بدشمنان پیش　　کزوے دل دوستان کنی ریش
چون جامہ بخت من کبودست　　از کوشش مردمان چہ سود است

نوفل نے اپنی فوج ہٹالی مگر اس کی دلیرانہ ہمدردی اسباب کی متقاضی ہوئی کہ وہ مجنوں کو اپنا داماد بنائے۔ مجنوں نے عزیزوں کے سمجھانے اور نیز نوفل کی حمیت سے متاثر ہوکر یہ عقد منظور کرلیا۔ دھوم دھام سے بیاہ ہوا۔ مگر

چوں شد گہ آں کہ خرم و شاد　　ہمخوا بہ شوند سرود شمشاد
از تخت شہی سبک فروجست　　بر روئے زمین چو خاک بہ نشست
مہ درپے آنکہ کے شود جفت　　دیوانہ زیادہ نوبر آشفت
از بسکہ گریست سینہ پرتاب　　شد نقش بساط شستہ زاں آب

لیلیٰ نے یہ خبر سنی تو ضبط ہاتھ سے جاتا رہا۔ اسی وقت ایک شکایت نامہ لکھا جو نازک جذبات سے لبریز ہے کہ میں تمھارے نام پر قسم کھائے بیٹھی رہوں تمھارے لیے روؤں تمھارے فراق میں جلوں اور اور گھر والوں کے طعنے سہوں اور تم شرط وفا کو اس سنگ دلی سے فراموش کرجاؤ۔

من بے تو چنیں بغم نشستہ　　از ہرچہ بخبر تو روئے بستہ
چوں سایہ رود براہ بامن　　فرقے نکنی ز سایہ تامن
دیدی کہ بہ معرض ہلاکم　　چوں باد بروشدی زخاکم
بیگانہ صفت خرام کردی　　بیگانگی تمام کردی
اکنوں بہ وصال خفتہ شاد　　ہمخوابۂ تو مبارکت باد
با ایں ہمہ دوستدار و یارم　　با یار تو نیز دوستدارم
آں یار کہ دوست داشت یارم　　دشمن بوم ار نہ دوستدارم
گر توبہ کنی بمہر یادم　　از تربیت غم تو شادم

مجنوں تو عاشق ہی تھے۔ اس کا ایک طولانی جواب لکھا۔ خوب روئے، گڑگڑائے، تسلیم کیا کہ میں نے شادی کی۔ مجبور تھا، معذور تھا، مگر میں نے اس معشوق کی صورت دیکھی ہو تو آنکھیں پھوٹ جائیں۔ کیسا نازک شعر ہے:

مرغ کہ پرش بریخت از تن　　بیہودہ بود قفس شکستن

یہ تو خسرو کی روایت ہے، مگر ہمارے خیال میں نظامی اور ہاتفی کی روایت زیادہ قرین قیاس ہے۔ مجنوں اپنے باپ کو کئی بار گستاخانہ جواب دے چکا تھا۔ اس موقع پر محض پاس ادب کے خیال سے ان کا رام ہوجانا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ برعکس اس کے لیلیٰ عورت تھی، اور اپنے پر بضد والدین کی زیادہ علانیہ مخالفت نہیں کرسکتی تھی۔ چنانچہ جب مجنوں کو معلوم ہوا کہ لیلیٰ کا ابن سلام سے عقد ہوگیا تو اس نے ایک پرزور گلہ نامہ لکھا۔ کھلی کھلی شکایتیں کیں، پیمان شکن ہو، دغا باز ہو، فریب دہ ہو۔

دانی بمنت چہ وعدہا بود　　　　ہرگز بتو ایں گماں کجا بود
اے کج سخن دروغ وعدہ　　　　دے دلبر بیفروغ وعدہ
گاہم بہ سخن فریب دادی　　　　با وعدہ گہے شکیب دادی

لیلیٰ نے اس کا بڑی متانت سے جواب دیا اور مجنوں کی بہت دلبستگی کی۔ آج کل کے اردو شاعری والے معشوقوں کی طرح خنجر بکف نہ رہتی تھی۔ شرط وفا اور آئین وفا سے واقف تھی۔

"افسانہ کس نکردہ ام گوش　　　　پس خوردۂ کس نکردہ ام نوش
دانی کہ مرا نبود بارے　　　　در بستن عقد اختیارے
چیزیکہ بہ اختیار من بود　　　　زاں مدعیت نہ گشتہ خوشنود
کم کن زعتاب شرمسارم　　　　من خود زتو انفعال دارم"

مرض عشق بڑھتا گیا، پہلے تو قیس ہی مجنوں تھے۔ اب لیلیٰ بھی مجنوں بنی، شرم و حیا کی روک تھام کم ہوئی۔ اس نے ایک دن خواب دیکھا کہ مجنوں آیا ہے۔ اور نہایت پردرد، دل شکن الفاظ میں اپنا قصہ غم سناتا ہے۔ روتا ہے اور اس کے تلووں سے آنکھیں ملتا ہے۔ یہ خواب دیکھتے ہی فرط اضطراب سے لیلیٰ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے ایک دلسوز آہ بھری اور صبح ہوتے ہی شرم و حیا کو پس پردہ ڈال۔ اپنے اونٹ پر سوار ہوکر اس نے نجد کی راہ لی۔ اور دیوانوں کی طرح مجنوں کو ڈھونڈنے لگی۔ آہ عشق! اس آگ نے مجنوں کو بالکل گھلا ڈالا تھا۔ ایسا نحیف و زار ہوگیا تھا کہ لیلیٰ اسے پہچان نہ سکی۔ زانو پر سر جھکائے، ایک چٹان کا تکیہ بنائے کھلے میدان میں جہاں نہ کوئی درخت نہ سایہ، وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی محبت کا یہ اثر تھا کہ جنگل کے وحشی خونخوار

جانور ہرنوں کے ساتھ اس کے ارد گرد حلقے کیے ہوئے تھے۔ اونٹ نے درندوں کو دیکھتے ہی بھاگا۔ مگر لیلیٰ پھرتی سے کود پڑی۔ حیوانوں کے بیچ میں سے بیخوب نکل کر مجنوں کے پاس کھڑی ہوگئی اور اس کی خدمت و خاطر داری کرنے لگی۔

آں سر کہ بہ خاک رہ فتادش — برزانوِ خویشتن نہادش
اشک از رخ آں غریب غمناک — میکرد بہ آستین خود پاک

مجنوں کو قرب یار نے بہت بیقرار کردیا۔ لیلیٰ اس کی بیقراری سے متاثر ہوکر بولی۔

"اے عاشق زار غم گسارم — مقصود تو چیست تا بر آرم
آں بہ کہ دہیم دست باہم — وانگہ بہ نہیم سر بعالم
یک لحظہ بہم جدا نہ باشیم — با ہیچکس آشنا نہ باشیم"

مگر مجنوں کو تو عاشقی اور گریہ و زاری سے کام تھا۔ غالبًا وصال اور اس کی تدابیر کی طرف اس کا خیال ہی نہیں گیا۔ تڑپنا اور جلنا اس کی طبیعت ہوگئی تھی۔ اس موقع پر شعرا میں کچھ اختلاف ہوگیا ہے۔ حضرت خسرو کہتے ہیں۔

آسودو ومرغ در یکے دام — وامیخت دوبادہ در یکے جام
در صبح بہم دمیدہ از دور — دو مشعلہ را یکے شدہ نور

مگر حضرت نظامی اور ہاتفی نے مجنوں کے عشق کا رتبہ بہت اونچا کردیا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر ہاتفی نے مجنوں کے دامن عصمت میں دھبہ نہیں لگایا۔ خیالی عشق کو عملی میدان میں قدم نہیں رکھنے دیا۔ مجنوں کو اس وقت لیلیٰ کی بدنامی کا خیال دامن گیر ہوا۔ ساری زندگی اسے بدنام کرنے میں صرف کی، خود بھی مطعون ہوئے اور اسے بھی انگشت نما کیا۔ مگر اس وقت دہن مخالفان کا خوف حائل ہوگیا۔ بولے:

آں بہ کہ نہان زایں و آنت — نزدیک پدر برم روانت
دستم ندہد اگر وصالت — قانع شوم از تو باخیالت
زیں پس منم و خیالت اے دوست — تا دست وہد وصالت اے دوست

لیلیٰ اپنے گھر لوٹ آئی۔ عاشق کی اس سے زیادہ اور کیا خاطر داری کرسکتی تھی۔ کچھ دنوں تک تو دونوں صرفِ غم رہے۔ مجنوں اب عاشقانہ اشعار کہہ کر اپنے دلکی آگ

بجھاتے تھے۔ اور ان کے اشعار میں درد اور سوز کا ایسا اثر ہوتا تھا کہ سننے والوں کے کلیجے منہ کو آجاتے تھے۔ عشق اپنے انتہا تک پہنچ چکا تھا وہ عشق جو خود اپنا منزل مقصود ہو، وہ عشق جو وصال کے حدود کا پابند نہ ہو، اس کا انجام ہی اور کیا ہوسکتا تھا۔ ہاتفی کہتا ہے، لیلیٰ نے خواب دیکھا کہ مجنوں مرگیا اور اسی دن فرط غم اور اضطراب سے اسے تپ آگیا۔ اس آتش تپ نے سوز نہانی کے ساتھ مل کر اس کا کام تمام کردیا۔

اس کے مقابلہ میں خسرو کی یہ روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ایک دن لیلیٰ بے چین ہوکر اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ ایک باغ کی طرف نکل گئی۔ گھر پر کسی طرح چین ہی نہ آتا تھا۔ باغ میں وہ زمین پر بیٹھی ہوئی اپنے درد وغم کی داستان سنا رہی تھی کہ اسی اثنا میں مجنوں کے ایک ہمدرد اور غمگسار ادھر سے آنکلے۔ نازنینوں کا یہ جمگھٹ دیکھا تو لیلیٰ کو پہچان گئے۔ اس نیت سے کہ دیکھیں مجنوں کی دیوانگی نے لیلیٰ کے دل پر بھی کچھ اثر کیا ہے۔ آپ نے مجنوں کی ایک پر درد غزل گانا شروع کی۔ لیلیٰ نے سنا تو جگر کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ ایک عالم بیخودی میں اٹھی اور اس مرد غزل سرا کے پیروں سے اپنا رخسارہ ملنے لگی۔ اور اس سے مجنوں کی خبر پوچھی۔

زان غم زدہ کیں ترانہ رانی مارا خبرے دہ ار توانی

وہ حضرت عشق و عاشقی کے رموز سے واقف نہ تھے اسی آزمائش کے دھن میں بولے کہ مجنوں تو چل بسے۔

دل را بتوداده بود آزاد جان نیز بہ بیدلی بتوداد
نازیست نظر بسوئے تو داشت چوں مردہم آرزوے تو داشت

لیلیٰ یہ دلدوز خبر سنتے ہی بچھاڑ کر گر پڑی اور مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگی۔ میاں غزل سرا بہت پشیمان ہوئے اور چاہا کہ اس زخم کو زیادہ خوش آیند خبروں سے بھردیں۔ مجنوں ابھی زندہ ہے۔ نجد میں اس کی پردرد آواز اسی وقت بھی سنائی دے رہی ہے۔ میں نے تو محض امتحاناً یہ کذاب اختراع کیا تھا۔ مگر ان باتوں کا لیلیٰ پر کچھ اثر نہ ہوا۔ روح کو ایسا صدمہ ہوا کہ جانبر نہ ہوسکی۔ گھر تک پہنچتے پہنچتے تپ آگیا۔ اور حالت ابتر ہوگئی اور موت کی علامتیں پیدا ہوگئیں۔ نزع کے عالم میں اس نے اپنی ماں کو بلایااور اس سے اپنی بیباکیوں اور سرکشیوں کی بہت معافی مانگنے کے بعد یوں وصیت کی۔

چون از پئے مرقدم نہانی | پوشی بہ لباس آنجہانی
''از دامن چاک یار دلسوز | نیک پارہ بیارو در کفن دوز
تابا خود ازاں مصاحب پاک | پیوند وفا برم نہہ خاک''
(خسرو)

روزیکہ بہ قصر جاودانی | رو آرم ازیں سرائے فانی
آوازدہ آہ اسیر مارا | وان کشتۂ زخم تیر مارا
احوال مرا چنانکہ دانی | گوئی بہ طریق ترجمانی
بر گوئی کہ شمع جانگدازاں | دے چشم و چراغ عشقیا زاں
لیلیٰ زغم تو رفت در خاک | پاک آمد و رفت ہمچناں پاک
سنگیش کہ بر سر مزاراست | از کوہ غم تو یادگارست''

مجنوں نے جب یہ مہلک خبر سنی تو سر کے بال نوچتا، روتا لیلیٰ کے مکان کی طرف دوڑا۔ اس (ہاتھی) وقت لیلیٰ کا جنازہ جا رہا تھا۔ عزیز و اقارب جنازہ کے پیچھے پیچھے آتے تھے۔ مجنوں جنازہ کے آگے آگے ہولیا۔ اور ہنستا غزلیں گاتا ہوا چلا۔ شادئ مرگ اسی کو کہتے ہیں۔

''عاشق کہ نظارۂ چناں دید | برداشت قدم کہ ہم عناں دید
در پیش جنازہ رفت خنداں | نے درد نہ داغ درد منداں
نظم ازسر وجد حال میخواند | خوش خوش غزل وصال میخواند''

اس انداز سے وہ لحد تک گیا۔ جب اہل میت نے لیلیٰ کی لاش قبر کے اندر رکھی تو مجنوں کود کر اندر جا گھسا۔ لوگ اس کی اس ناشائستہ حرکت پر آگ ہوگئے۔ تلواروں کے وار کیے کہ چھوڑ کر بھاگ جائے۔ مگر وہاں مجنوں کہا تھا۔ صرف اس کی خاک تھی۔ آخر ایک جہاں دیدہ بزرگ نے ان تنگ خیالوں کو سمجھایا۔

''کایں کار نہ شہوت و ہوائیست | سرے زخزینۂ خدائیست
ورنہ بہوس کسے نہ جوید | کزجان عزیز دست شوید
خوش وقت کسیکہ از دل پاک | در راہِ وفا چنیں شود خاک
گر عاشقی ایں مقام دارد | تقوئے بہ جہاں چہ نام دارد

تاہر دو نہ در مغاک بودند   زآلائش نفس پاک بودند
درہم کمیند حال زیشان   در گردن ما وبال ایشان

اس طرح عشق کی زندہ جاوید داستان ختم ہوتی ہے اس میں فسانہ نگاری کی نہ جدت ہے نہ بلند پروازی۔ مگر مجنوں کا کیریکٹر جیسا کہ کچھ شعرا نے کھینچا ہے باوجود خیالی ہونے کے دلچسپی سے خالی نہیں۔ نظامی نے تو ان دونوں عشاق کو مجلس اولیا میں بٹھایا ہے اور ان کا تذکرہ نہایت ادب اور احترام سے کرتے ہیں۔ ان کا مجنوں نہایت پاکیزہ اور رفیع الاخلاق شخص ہے۔ جس کا عشق بے لوث اور نفس کی تحریکوں سے بے داغ تھا۔ دیوانہ و بیخود تھا۔ مگر اس نے آئین تمدن کے دائرے سے قدم باہر نہیں رکھا۔ جب کبھی عاشق و معشوق ملے ہیں انھوں نے عصمت کے شرائط کی بڑی سختی سے پابندی کی ہے۔ البتہ خسرو سے اس کیریکٹر کو انسانی معیار کی طرف کھینچا ہے۔ اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ مجنوں عشق مجازی کی منزل طے کرکے حقیقت تک پہنچ گیا تھا جب میں اور تو کی تمیز نہیں رہتی۔

"آں سالک عشق کا ملے بود   دیوانہ نبود عاقلے بود
داغش نہ زآتش قتیلہ   دردش نہ زگلرخ قبیلہ
سرمست نہ از شراب انگور   در رقص نہ از صدائے طنبور
بیہوش زیادۂ و گربود   از جام مراد بے خبر بود
آں رفعت شان کہ داشت مجنوں   بود از درجات عقل بیروں

عشق ایک نہایت لطیف جذبہ ہے جو انسان کو رقیق القلب بنا دیتا ہے۔ جس وقت نوفل قبیل لیلیٰ کے ساتھ مصروف پیکار تھا۔ اور مجنوں نے کشت و خون کا بازار گرم دیکھا تو اس کا دل پسیج گیا۔ اس نے فوراً لڑائی کا خاتمہ کروادیا۔ ایک بار اس نے ایک باغبان کو سرد کا درخت کاٹتے دیکھا۔ اور اسے اپنی گراں بہا انگوٹھی دے کر درخت کو آرہ کی زد سے بچایا۔ اسی طرح ایک صیاد کو کئی ہرن دام میں پھنسائے ہوئے لاتے دیکھا۔ اور اسے اپنا گھوڑا دے کر ان بے زبانوں کی جان بچائی۔

"گردن مرنش کہ بیوفا نیست   در گردن اور سن روا نیست"

جب لیلیٰ ابن سلام کے عقد میں آچکی تھی۔ ایک روز مجنوں شوق دیدار سے

بیتاب ہو لیلیٰ کے مکان پر چلا آیا۔ لیلیٰ نے جھروکے سے اسے دیکھا تو بولی کہ تم اس طرح کیوں خواہ مخواہ اپنی جان کو معرض خطر میں ڈالتے ہو مجنوں اپنا دکھڑا رونے لگے کہ اتنے میں ابن سلام کو خبر ہوگئی۔ بھرا بیٹھا ہی تھا، شمشیر لیے گرجتا ہوا آ پہنچا۔ اور چاہا کہ ایک ہی وار میں سودے کے ساتھ سر کا بھی خاتمہ کردے، مگر اس کا ہاتھ اوپر ہی اٹھا رہ گیا۔ دوسرے ہاتھ میں تلوار لی اس کی بھی وہی گت ہوئی۔ نادم ہوکر مجنوں کے پیروں پر گر پڑا۔ اور معذرت کی کہ میری مدد کیجیے۔ میں تو کسی کام کا نہ رہا، مجنوں نے جواب دیا۔

آزار کسان مساز پیشہ   کازرد گیت رسد ہمیشہ

اور وہاں چلے آئے۔ بندش کے لحاظ سے یہ داستان زلیخا کی داستان سے زیادہ قابل قدر نہیں مگر اس کے عشق کا رتبہ بہت اونچا ہے۔ عشق ناکام شعرا فارس کا معیار ہے۔ اور مجنوں سے زیادہ مشہور اس کی کوئی مثال نہیں۔

''زمانہ'' جنوری ۱۹۱۳ء

بھارتندو بابو ہریش چندر

ہندی بھاشا کے شعرا میں بابو ہریش چندر کا رتبہ بہت ممتاز سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ انھیں تلسی، سور، بہاری، یا کیشو کی سی مقبولیت نہیں حاصل ہوئی مگر اس کا یہ سبب نہیں کہ وہ قابلیت میں ان شعراسے کم تر تھے۔ تلسی داس منظوم فسانہ نگاری کے بادشاہ تھے۔ سور نے معرفت اور بہاری نے حسن و عشق کو درجۂ کمال تک پہنچایا۔ کبیر نے فقر و بے ثباتی دنیا کا راگ گایا۔ مگر ہریش چندر نے کل اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی۔ وہ شاعرانہ زور جو کسی ایک صنف کو پایۂ کمال تک پہنچ سکتا تھا۔ منتشر ہوگیا۔ اس لیے یہ شعرا اگرچہ بلندی اور عمق میں ہریش چندر پر فضیلت رکھتے ہیں مگر وسعت کلام میں ہریش چندر کا درجہ بہت اونچا ہے۔ انھوں نے جامع طبیعت پائی تھی جو نظم ونثر پر یکساں قادر تھی۔ نثر میں تو انھیں پیش رو کا رتبہ حاصل ہے۔ ان کے قبل راجہ لکشمن سنگھ اور راجہ شیو پرشاد نے ہندی نثر میں شہرت حاصل کی تھی۔ مگر اول الذکر کی قابلیت زیادہ تر تراجم میں صرف ہوئی تھی۔ اور آخر الذکر کی ہندی میں اردو الفاظ کثرت سے مخلوط ہوتے تھے۔ پاکیزہ، خالص ہندی کی بنیاد بھارتندو ہی کے قلم نے ڈالی۔ اور اس زمانے سے اب تک گو ہندی نثر نے بہت کچھ ترقی حاصل کرلی مگر آج بھی ہریش چندر کے ہندی نثر کی بلاغت، شوخی اور پاکیزگی قابل داد ہے۔ ان کا سب سے قابل یادگار اور قائم رہنے والا ادبی سرمایہ ان کے ڈرامے ہیں۔ اس میدان میں کوئی ان کا رقیب نہیں۔ ہندی فن ڈراما کے وہ موجد ہیں۔ ان کے قبل ہندی زبان میں ڈراموں کا وجود نہ تھا۔ راجہ لکشمن سنگھ نے کالی داس کی شکنتلا کا ترجمہ ضرور کیا تھا مگر وہ صرف ترجمہ تھا۔ طبع زاد ڈرامے عنقا تھے۔ بابو ہریش چندر نے ہندی لٹریچر کی اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے چھوٹے بڑے اٹھارہ ڈرامے تصنیف کیے جن میں کچھ طبع زاد

اور کچھ ترجمے ہیں۔ طبع زاد ڈراموں میں ستیہ ہریش چندر'' اور ''چندراولی'' ایسی کتابیں ہیں جو دنیا کی کسی زبان کے لیے باعث افتخار ہوسکتی ہیں۔ اور ''مدرا راکشس'' اگرچہ ایک سنسکرت ناٹک کا ترجمہ ہے مگر اعلیٰ پایہ کی تصنیف کی ساری خوبیوں سے بھرپور۔ ان جملہ شاعرانہ مصروفیات پر نظر ڈال کر کہہ سکتے ہیں کہ ہریش چندر جیسا ہمہ گیر طبیعت کا شاعر ہندی زبان میں شاذ ہی پیدا ہوا ہوگا۔

بابو ہریش چندر ایک نامور باپ کے بیٹے تھے۔ ان کے والد بابو گوپال چندر بنارس کے ایک معزز رئیس تھے۔ وہ گردھو تخلص کرتے تھے۔ اخلاقی مضامین کے ادا کرنے میں انھیں ید طولیٰ تھا۔ ہریش چندر نے مال و دولت کے ساتھ شاعرانہ قابلیت بھی وراثت میں پائی تھی۔ اور اگرچہ دولت ان کے آزاد ہاتھوں میں بہت دن نہ رہی مگر شاعرانہ ترکہ میں انھوں نے سپوت بیٹے کی طرح بہت کچھ اضافہ کیا۔ وہ ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے۔ اور کچھ دنوں مکان پر ہندی اور فارسی پڑھنے کے بعد کوئنس کالج میں داخل ہوئے، مگر یہاں سلسلہ تعلیم زیادہ دنوں تک نہ جاری رہ سکا۔ یہ پانچ ہی سال کے تھے کہ ان کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ اور ۱۹۱۷ء میں جب ان کی عمر دس سال سے زائد نہ تھی۔ بابو گوپال داس نے رحلت کی، ان وجوہات سے ان کی تعلیم باقاعدہ نہ ہوئی اور صغر سنی ہی میں خانہ داری کا بار بھی سر پر آپڑا۔ پڑھنے لکھنے میں یوں ہی ان کی طبیعت نہ لگتی تھی۔ خانہ داری ایک حیلہ ہوگئی، پڑھنا چھوڑ بیٹھے مگر اس سن میں وہ شاعرانہ عطیات کا ثبوت دے چکے تھے۔ ذوق شعر خدا دادا تھا۔ پانچ ہی سال کی عمر میں انھوں نے ایک دوہرا کہہ کر اپنے خوش گو باپ کو حیرت میں ڈال دیا تھا اور جس وقت انھوں نے پڑھنا چھوڑا وہ اپنے سخن فہم دوستوں میں خاصی شہرت حاصل کرچکے تھے۔ اگرچہ ابتدائے سن میں انھوں نے تحصیل علم میں سرگرمی نہیں ظاہر کی مگر ذہن خدا داد کی بدولت اس خامی کو بہت جلد پورا کیا اور ہندوستان کے کل بھاشاؤں پر عبور حاصل کرلیا۔ ان کی انگریزی استعداد بہت اچھی تھی۔ یہ ان کے ''درلبھ بندھو'' سے ظاہر ہوتی ہے جو شیکسپیئر کے ''مرچنٹ آف وینس'' کا ترجمہ ہے۔ مرہٹی، گجراتی، بنگلہ، پنجابی، اردو متھیلی ان سب بھاشاؤں میں وہ صرف اظہار خیال ہی نہیں بلکہ شاعری بھی کرسکتے تھے۔ اس سے ان کے ہمہ گیر ذہن کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

بابو ہریش چندر کا خاندان بنارس کے متمول اور معزز گھرانوں میں تھا۔ انھیں کئی لاکھ کی جائداد ترکہ میں ملی تھی۔ مگر انھوں نے دولت کی قدر کرنا نہ سیکھا تھا۔ احباب کی ضیافت، عیش کے تکلفات، غربا کی امداد اور شعرا کی قدردانی میں وہ روپے پانی کی طرح بہاتے تھے۔ دیوالی کے دن تیل کی بجائے عطر کے چراغ جلاتے تھے۔ اور سر اور جسم میں تو وہ تیل کے بدلے بالعموم بیش قیمت عطر ہی ملا کرتے تھے۔ شاعرانہ قدردانی کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک دوہرے پر خوش ہوکر سینکڑوں روپیہ انعام دے دیتے۔ سائل کو جواب دینا ان کی سرشت ہی میں نہ تھا جیسا کہ قاعدۂ زمانہ ہے ایسے آزاد شعار آدمیوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے والے بھی بکثرت پیدا ہوجاتے ہیں۔ بابو ہریش چندر کی دولت ان کی نازبرداریوں میں خوب صرف ہوتی تھی۔ ان کی یہ مصرفانہ روش دیکھ کر ایک بار مہاراجہ بنارس نے ان سے کہا ''بابو جی گھر دیکھ کر کام کرو'' اس کا جواب آپ نے دیا ''مہاراج! یہ دولت میرے کتنے ہی بزرگوں کو نگل گئی ہے۔ اب میں اسے کھا جاؤں گا۔'' اس سے ان کے لاابالی پن کا ثبوت مل سکتا ہے۔

بھارتندو بڑے رنگیلے، بانکے، خوش رو، خوش وضع آدمی تھے۔ طبیعت بلا کی حسن پسند واقع ہوئی تھی۔ حسانت خود بخود ان کی نگاہ میں کھب جاتی تھی۔ اور شاعر میں یہ ایک خاص وصف ہے۔ تصاویر کا انھیں بہت شوق تھا۔ بڑی تلاش اور صرف سے ایک نادر مجموعہ فراہم کیا تھا۔ مگر ایک دوست کو بہت گرویدہ دیکھ کر ان کے نذر کردیا۔ حسن کی تعریف اور بیان سے ان کا کلام مالامال ہے اور اہل نظر کا خیال ہے کہ اس رنگ میں ان کی طبیعت غیر معمولی زور دکھا گئی ہے۔ قطع نظر ڈراموں کے ان کا شاعرانہ کلام حسن اور عشق کے جذبات سے لبریز ہے۔ ہر ایک شاعر خواہ اس نے کیسا ہی جامع ذہن کیوں نہ پایا ہو صرف ایک ہی میدان میں اپنے انتہائے عروج پر پہنچتا ہے۔ ہریش چندر نے رقت، سوز، مناظر قدرت، دلاوری، ویراگ، ظرافت، اخلاق وغیرہ رنگوں میں بھی اپنی قادر الکلامی کا جلوہ دکھایا ہے۔ مگر وہ حلاوت جو ان کے تذکرہ حسن میں پیدا ہوگئی ہے۔ دوسرے رنگوں میں مقابلتاً کم ہے۔

زندہ دلی بابو ہریش چندر کی سب سے نمایاں صفت تھی اور وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ظاہر ہوتی تھی۔ تصنیف و تالیف، حب قوم، معاشرت ان سب خدمات میں

انھوں نے نمایاں حصہ لیا۔ انھوں نے نظم ونثر کے کئی رسالے جاری کیے اور نقصان اٹھاکر چلائے۔ ترقی ادب کے لیے ایک انجمن قائم کی، کچھ دنوں تک ایک ریڈنگ کلب چلایا اور چو کھمبے میں ایک انگریزی مدرسہ قائم کیا۔ اس کے مصارف وہ بارہ سال تک خود ادا کرتے رہے۔ ان کا یہ تعلیمی پودا اب ایک تناور درخت ہوگیا ہے۔ اس میں اب اسکول لیونگ تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ مکان نیا بن گیا ہے اور تعداد طلبا چوگنی ہوگئی ہے۔ ان امور سے واضح ہوتا ہے کہ بابو ہریش چندر ضروریات اور رفتار زمانہ سے بے خبر نہ تھے۔ان کی زندہ دلی اکثر اوقات چھل اور خوش اور خوش فعلی میں صرف ہوتی تھی۔ ہولی کے دنوں میں ان کے یہاں عنبر اور گلال کا دریا بہتا تھا۔ وہ خود کمر میں ایک موٹا سا کنڈا باندھے مسخروں کا ایک طوفان بے تمیزی ساتھ لیے بڑی آزادی سے کبیرین گاتے نکلتے تھے۔ ان دنوں میں وہ پھکو، سوانگ، نقل، فحش کسی پر بند نہ ہوتے تھے۔ اپریل کی پہلی تاریخ انگریزوں کے یہاں دل لگی کا دن ہے۔ آج کے دن ہر ایک قسم کا مذاق جائز ہے۔ بابو ہریش چندر اس تاریخ کو اہل شہر کے دل بہلاؤ کے لیے ضرور کوئی نہ کوئی گل کھلاتے تھے۔ ایک بار اعلان کردیا کہ ایک مشہور استاد ہریش چندر اسکول میں مفت گانا سنائیں گے۔ جب ہزاروں آدمی جمع ہوگئے تو پردہ کھلا اور ایک شخص مسخروں کا بھیس بنائے الٹا طنبورہ ہاتھ میں لیے برآمد ہوا۔ اور بڑی بھیونڈی آواز سے رینگنے لگا۔ لوگ سمجھ گئے کہ یہ بھارتندو کی شگوفہ کاری ہے۔ شرمندہ ہوکر واپس گئے۔مگر باوجود اس آزادی اور بے فکری کے ان کے مزاج میں قناعت کا جوہر بھی تھا۔ وہ اپنی کمزوریوں پر کبھی کبھی ندامت کا اظہار کیا کرتے تھے، مگر نانی[1] نے ہریش چندر کے مزاج کی یہ کیفیت دیکھ کر ان کے چھوٹے بھائی کے نام ساری جائداد کا بیع نامہ کردیا۔ بعہ نامہ پر بابو ہریش چندر کے دستخط نہایت ضروری تھے مگر جب یہ کاغذ ان کے سامنے آیا تو انھوں نے بے دریغ اس پر دستخط کردیے۔ اور دو ڈھائی لاکھ کی جائداد کی مطلق پرواہ نہ کی۔ یہ ان کی دریا دلی اور استغنا کی بہت نادر مثالی ہے۔

بابو ہریش چندر کے ادبی مشاغل باقاعدہ طور پر اٹھارہویں سال سے شروع

---

[1] بابو ہریش چندر کی نانہال بہت متمول تھی۔ بابو ہریش چندر اور ان کے بھائی اس جائداد کے وارث



ہوئے۔ اور اگر انھوں نے عمر بہت کم پائی، انتقال ہوا تو ان کا سن کل ۳۶ سال کا تھا۔ تاہم انھیں اٹھارہ برسوں میں انھوں نے اپنے قلم کی برکات سے ہندی زبان کو مالا مال کردیا۔ ان کی تصنیفات تین حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں۔ ڈرامے، نظمیں اور متفرق نثری مضامین، ان میں سے ہر ایک شخص کا مجمل تذکرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

بابو ہریش چندر کے نام سے ١٦ مکمل ناٹک یادگار ہیں۔ مگر اکثر بہت مختصر ہیں جو چند صفحات پر ختم ہوگئے ہیں۔ان میں زیادہ تر سنسکرت ناٹکوں کے ترجمے یا تصرفات ہیں۔ طبع زاد ڈراموں کی تعداد پانچ سے زائد نہیں، ان میں بھی بجز ''چندراولی''، ''نیل دیوی'' اور ''ستیہ ہریش چندر'' پر ڈراما کا صحیح اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔ ''ویدک ہنسا'' ''اندھیر نگری'' ڈرامے نہیں بلکہ ملکی او رسوشل مسائل پر ظرافت آمیز چٹکلے ہیں جو بہ مقبول ہوئے اور بار بار کھیلے گئے۔ ''بھارت دردشا'' میں قوم کی اخلاقی اور تمدنی خامیاں بڑے موثر، پرمذاق اور کہیں کہیں درد ناک پیرایہ میں دکھائی گئی ہیں۔ ''چندراولی'' عشق اور رموز عشق کا ایک دفتر ہے جس سے شاعر کی معاملہ فہم اور معنی سنج طبیعت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ''نیل دیوی'' ایک تاریخی ناٹک ہے جس میں امیر عبدالشریف خاں اور مہاراج سورج دیو کے معرکے بیان کیے گئے ہیں اور حسن و عشق کے منچلے شاعر نے رزم کے میدان میں ایسی کاٹیں کی ہیں کہ اسے پڑھ کر دلوں میں مردانہ جذبات کی ایک لہر پیدا ہوجاتی ہے۔ ''مدرا راکشس'' اگرچہ سنسکرت کے مشہور و معروف ناٹک کا ترجمہ ہے مگر اس میں اصل کی سب خوبیاں موجود ہیں اور اسی لیے ترجمہ میں جابجا بے جا تصرف کا گمان ہوتا ہے۔ ہریش چندر کی غالباً سب سے مشہور و معروف تصنیف ''ستیہ ہریش چندر'' ہے۔ اس میں مہاراجہ ہریش چندر کے امتحان صداقت کا ذکر ہے۔ مہا بھارت میں اس کا مختصر تذکرہ آیا ہے جیسے کالی داس نے مہا بھارت سے ''وکرم اروسی'' اور ''شکنتلا'' کا پلاٹ لے کر ان کی بنیاد پر اپنے زندۂ جاوید ناٹکوں کی عمارت کھڑی کی ہے۔ اسی طرح بابو ہریش چندر نے بھی اس ناٹک میں مہا بھارت سے واقعہ لے لیا ہے۔ مہاراج ہریش چندر سورج بنسی خاندان کے ایک چکرورتی راجہ تھے۔ جو صداقت ، ایفائے عہد اور وفاداری میں اسی طرح ضرب المثل ہیں جس طرح

ہنومان دلاوری میں۔ استقلال میں راون، بدھشٹر انصاف میں اور بھیشم پتامہ علو ہمتی میں۔ اس ناٹک میں وشوا مترشی کا راجہ ہریش چندر کے امتحان کے لیے آنا، راجہ کا مبتلائے مصیبت ہوکر بنارس جانا، وہاں ایک ڈوم کے ہاتھ بکنا، پھر شمشان کی نگہ بانی پر مامور ہونا، رانی شیویا کا روہتاس کی لاش گود میں لے کر آنا، راجہ کا اس سے کفن طلب کرنا، یہ واقعات نہایت درد ناک، موثر اور استادانہ طرز سے دکھلائے گئے ہیں۔ ان کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں کیونکہ ایسے بہت کم تعلیم یافتہ آدمی ہوں گے جنھوں نے اس ناٹک کو نہ پڑھایا ادا ہوتے نہ دیکھا ہو۔ یہ واقعات بجائے خود انسان کی اخلاقی بلند پروازیوں کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان پر بابو ہریش چندر کی جادو بیانی قند مکرر ہوگئی ہے۔ ہم نے بارہا اس ناٹک کا کھیل دیکھا ہے جس وقت شیویا روہتاس کی لاش کو گود میں لے کر آتی ہے اس وقت ناظرین کی آنکھوں سے اشک کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ رقت کا سین اس سے زیادہ موثر اگر کسی ہندی شاعر نے کھینچا ہے تو وہ مہاراجہ رام چندر کا بن باس ہے۔ ایسا کوئی کالج، کوئی ہوسٹل، کوئی لٹریری سوسائٹی اور کوئی ڈرامیٹک کمپنی نہ ہوگی جس نے یہ کھیل نہ کیا ہو، مگر تلسی کے بن باس کی طرح ہریش چندر کا یہ بیان دلوں پر بغیر اثر کیے نہیں رہتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک ہندی بھاشا زندہ رہے گی یہ ناٹک مقبول خاص و عام رہے گا۔ لیکن اگر اس ڈراما کو جس کی پلاٹ کی ترتیب میں شاعر کو بہت زیادہ کاوش نہیں کرنا پڑی مستثنیٰ کردیا جائے تو بابو ہریش چندر کے طبع زاد ناٹکوں میں ایک خاص کمزوری نظر آتی ہے۔ وہ پلاٹ کی خامی ہے، یہ نقص ''چندراولی'' اور ''نیل دیوی'' میں نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ان میں زور بیان، جذبہ، مناظر نگاری سب موجود ہے، مگر پلاٹ کمزور ہے۔ اور اسی پلاٹ کی کمزوری نے اچھے کیرکٹروں کو وجود پذیر نہ ہونے دیا۔ ہریش چندر کے سوا ان کے باقی طبع زاد ناٹکوں میں کوئی کیرکٹر ایسا نہیں، یا ہیں تو بہت کم، جو انسان کی اعلیٰ زندگی کا نمونہ بن سکے اور اخلاق کی بلندیوں تک پہنچے۔ واقعات کی نوعیت پر کیرکٹروں کی پستی اور بلندی کا دار ومدار ہے۔ ثقل واقعات کی حالت میں اعلیٰ کیرکٹر کیوں کر پیدا ہوسکتے ہیں۔

بابو ہریش چندر کے شاعرانہ کلام میں اگرچہ ناٹکوں کی سی جدت نہیں کیونکہ یہ

پامال میدان ہے لیکن اس کا پایہ بہت عالی ہے۔ سخن فہموں نے اس کی بڑی قدر کی ہے اور ہندی کے اعلیٰ ترین شعرا میں ان کا شمار کیا ہے۔ اردو میں مثالوں کے ذریعہ سے ان کے کلام کے ساتھ مفصل بحث نہیں کی جاسکتی۔ صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ انھوں نے ہر رنگ کلام میں اپنے ذہن رسا اور جودت طبع کے جوہر دکھائے۔ حسن اور شجاعت کا میدان ان کے لیے اتنا ہی آسان تھا جتنا بزدلی اور نفرت کا۔ تاہم جیسا ہم اوپر لکھ چکے ہیں عشق کے رنگ میں ان کا کلام غیر معمولی طور پر زور دار، پراثر اور نیچرل ہے۔ معرفت اور ویراگ میں بھی ان کی طبیعت نے زور دکھایا ہے۔ اور جب یہ خیال کرو کہ یہ عیش پسند، شوقین، رسیلے شاعر کا کلام ہے تو واقعی تعجب ہوتا ہے۔ وہ اپنے زمانہ کے محض شاعر نہیں بلکہ قومی شاعر تھے اور زبان قوم کی حیثیت سے ہر ایک پبلک اور ملکی واقعہ پر انھوں نے حسب ضرورت مبارک باد، ماتم، خیر مقدم، الوداع وغیرہ نظمیں لکھی ہیں۔ مگر ان میں کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ شاعری سے اور اس کے اصلی مقصود سے ان کی طبیعت کیسی مانوس تھی اس سے بخوبی ظاہر ہوجاتا ہے کہ انھوں نے شاعری کے نو مسلمہ رنگوں میں چار کا اور اضافہ کیا اور سخن پروروں نے اس اصلاح کو متفق ہوکر تسلیم کرلیا۔

بابو ہریش چندر کے نثر مضامین مختلف موضوع پر ہیں۔ تاریخی، مذہبی، ملکی، اخلاقی، غرض اکثر مسائل پر انھوں نے رائے زنی کی ہے۔ مگر نہ ان میں خیالات کی تازگی ہے نہ تحقیق۔ ہاں زبان البتہ صاف اور شستہ ہے۔

ہندی کی دنیائے ادب نے بھارتندو کی اگرچہ اتنی عزت نہیں کی جس کے وہ مستحق ہیں تاہم تلسی اور کیشو جیسے شعرائے عالی مقام کو دیکھتے ہوئے بسا غنیمت ہے۔ تلسی کی کوئی مستند اور مکمل سوانح عمری نہیں۔ سور اور کیشو بھی کوچہ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ مگر بابو ہریش چندر کی کئی سوانح عمریاں شائع ہوچکی ہیں اور ان میں بہار کے بابو برج نٹڈن سہائے کی تصنیف کردہ ''حیات ہریش چندر'' بہت مبسوط اور دلچسپ ہے۔ ہندی میں اس کا وہی پایہ ہے جو اردو میں حالی کی ''حیات غالب'' کا۔ ان امور پر نظر ڈالتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انیسوی صدی میں ہندی بھاشا نے ہریش چندر جیسا قادر الکلام، وسیع الخیال اور زندہ دل شاعر نہیں پیدا کیا۔ اور گو اب بھاشا کا چرچا دن

بدن زیادہ ہو رہا ہے مگر ابھی بہت عرصہ گزرے گا جب ہم کو ہندی ادب کی مسند پر ہریش چندر کا کوئی جانشین نظر آئے گا۔

'زمانہ' جنوری ۱۹۱۳ء

ڈاکٹر سر رام کرشن بھنڈارکر

ڈاکٹر بھنڈارکر کے حالات زندگی ان لوگوں کے لیے خاص طور پر سبق آموز ہیں جن کا صیغۂ تعلیم سے تعلق ہے۔ ان کی زندگی سے ہم کو سب سے بڑا سبق یہ ملتا ہے کہ اپنے ارادے کا مضبوط اور دھن کا پورا آدمی خواہ کسی صیغہ میں کیوں نہ ہو عزت و نیک نامی کے اونچے سے اونچے مینار پر چڑھ سکتا ہے۔ ڈاکٹر بھنڈارکر کی ذات میں ذہنی اوصاف کے ساتھ مضبوط ارادہ اور سخت جفاکشی کا ایسا اتحاد ہوگیا ہے جو بہت کم دیکھنے میں آتا ہے اور جو کبھی ناکام نہیں رہ سکتا۔ تاریخی تلاش و تحقیقات میں کوئی ہندوستانی عالم اس وقت آپ کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ سنسکرت ادب اور صرف ونحو کے آپ ایسے جید عالم ہیں کہ یورپ اور امریکہ کے بڑے ماہر السنہ آپ کے سامنے فرق عقیدت خم کرتے ہیں۔ پراکرت زبانوں کا اس ملک میں اب نام بھی باقی نہیں۔ پالی، ماگدھی بھاشاؤں کا سمجھنے والا تو درکنار، ان کے حروف شناس بھی مشکل سے ملیں گے۔ اگر علمائے یورپ نے ادھر توجہ نہ کی ہوتی تو یقیناً ان بھاشاؤں کا دنیا میں وجود قائم نہ رہ سکتا۔ ڈاکٹر بھنڈارکر پراکرت زبانوں کے نہ صرف مسلم الثبوت ماہر ہیں بلکہ آپ نے ان میں کتنی ہی تحقیقاتیں بھی کی ہیں۔ تاریخ زباندانی اور علم الاسلاف کے ہر ایک صیغہ میں ڈاکٹر بھنڈارکر کو دستگاہ ہے۔ جرمنی کی مشہور گاٹنگن یونیورسٹی نے آپ کو ڈاکٹر کا خطاب دیا ہے اور گورنمنٹ نے آپ کو کے۔ سی۔ ایس۔ آئی اور سر کے خطاب سے عزت افزائی کرکے آپ کے کمالات کا اعتراف کیا ہے۔ آپ کا سن اس وقت ۷۶ سال ہے۔ مگر آپ کا علمی انہاک ابھی تک قائم ہے۔

ڈاکٹر بھنڈارکر کے والد ایک قلیل تنخواہ کے محرر تھے۔ اور اتنا مقدور نہ تھا کہ اپنے لڑکوں کو انگریزی تعلیم کے لیے کسی شہر میں بھیج سکتے۔ مگر حسن اتفاق سے ۱۸۴۷ء میں

ان کا تبادلہ رتناگری کو ہوا۔ یہاں ایک انگریزی اسکول کھلا ہوا تھا، بچہ رام کرشن نے اسی اسکول میں انگریزی شروع کی اور چھ سال میں یہاں کی تعلیم ختم کرکے الفنسٹن کالج میں شریک ہونے کے لیے بضد ہوئے۔ ان کے والد نے پہلے تو انھیں روکنا چاہا۔ کیونکہ ان کی آمدنی اتنی وافر نہ تھی کہ کالج کی تعلیم کے مصارف اٹھا سکتے۔ مگر لڑکے کو بیقرار دیکھا تو راضی ہوگئے اس وقت تک بمبئی یونیورسٹی قائم نہ ہوئی تھی۔ اور ڈگریاں بھی نہ دی جاتی تھیں۔ مسٹر دادا بھائی نوروجی اس وقت اس کالج میں پروفیسر تھے۔ رام کرشن نے اپنی ذہانت اور محنت سے بہت جلد طلبا میں ایک ممتاز جگہ حاصل کرلی۔ اورکالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اسی کالج میں پروفیسر ہوگئے۔ اسی زمانہ میں آپ کو سنسکرت کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ اور اوقات فرصت اس کی نذر کرنے لگے۔

اسی اثنامیں بمبئی یونیورسٹی قائم ہوئی اور پروفیسروں کو تاکید ہوئی کہ وہ بی۔اے کی ڈگری حاصل کریں، ورنہ اپنے عہدے سے معزول کیے جاویں گے۔ ڈاکٹر بھنڈارکر نے وقت معینہ کے اندر ایم۔ اے پاس کرلیا اور حیدر آباد سند کے ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوگئے۔ سال بھر کے بعد وہ اپنی پرانی تعلیم گاہ رتنا گری اسکول کی ہیڈ ماسٹری پر تبدیل کیے گئے۔ یہاں انھوں نے سنسکرت کی پہلی اور دوسری کتابیں تصنیف کیں۔ یہ کتابیں بہت مقبول ہوئیں، اس وقت تک ان کے بیسیوں ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ سنسکرت زبان کا مطالعہ ان کی بدولت مقابلۃً بہت آسان ہوگیا ہے۔ اور ان کا رواج ایسا عام ہے کہ کسی مبتدی کا جزودان ان سے خالی نظر نہ آئے گا۔ دس برس تک آپ الفنسٹن اور دکن کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۸۷۹ء میں ڈاکٹر کیل مارن کے مستعفی ہونے کے بعد آپ دکن کالج میں مستقل پروفیسر ہوگئے۔ اور تب سے پنشن لینے تک اسی عہدہ پر مامور رہے۔

ڈاکٹر بھنڈارکر نے آثار قدیمہ کی تحقیقات اور کھوج میں عالمگیر شہرت حاصل کرلی ہے۔ انھیں یہ شوق کیوں کر پیدا ہوا۔ اس کا تذکرہ بہت دلچسپ ہے، اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ جس کام میں ہاتھ لگاتے ہیں اسے ادھورا نہیں چھوڑتے۔ ۱۸۷۰ء میں ایک پارسی صاحب کو تانبے کی ایک لوح ہاتھ آگئی۔ یہ کسی پرانے کھندر میں دفن تھی اور اس پر زمانہ قدیم کی دیوناگری رسم الخط میں کچھ عبارت منقوش تھی۔ پارسی

صاحب نے لوح ڈاکٹر بھنڈارکر کو دی کہ شاید وہ کچھ عبارت کا مطلب نکال سکیں۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت تک قدیم حروف سے ناآشنا تھے۔ عبارت کو نہ پڑھ سکے۔ مگر پراکرت کے رسم الخط کا علم حاصل کرنے کی دھن پیدا ہوگئی۔ یورپین علما نے اس صیغہ تعلیم میں نہ صرف پیش رووں کا کام کیا بلکہ انھیں اس کا مسیح سمجھنا چاہیے۔ ڈاکٹر بھنڈارکر نے اس موضوع پر متعدد کتابیں جمع کیں۔ اور نہایت سرگرمی کے ساتھ تحصیل میں مصروف ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے سال بھر کے اندر اس لوح کی عبارت کو نہ صرف سمجھ لیا بلکہ اس پر مجلس علما میں ایک معرکے کی تقریر کی۔ محض اتنا ہی نہیں بلکہ اس شعبہ علم سے انھیں مناسبت پیدا ہوگئی۔ اور علمی تفتیش و تحقیقات کا کام شروع ہوگیا۔ آپ نے آثار قدیم اور قدیم تاریخی مسائل، پر متعدد مضامین لکھے۔ پراکرت اور قدیم تاریخی مسائل باہم اس قدر مخلوط ہیں کہ ایک کو جاننا اور دوسرے سے نابلد رہنا غیر ممکن ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر بھنڈارکر نے پراکرت میں بھی عالمانہ مزاولت حاصل کرلی۔ ۱۸۷۴ء میں لندن میں مستشرقین کی ایک کانگریس ہوئی، آپ بھی مدعو ہوئے۔ مگر خانگی وجوہات کے باعث شریک نہ ہوسکے۔ تاہم آپ نے ایک محققانہ مضمون لکھ کر بھیجا جس کی وسیع تحقیقات کی بہت تعریف کی گئی۔

۱۸۷۶ء میں السنہ قدیمہ کی ترویج کے خیال سے پروفیسر ولسن کی یادگار میں سالانہ تدریس و تقریر کے لیے ایک جگہ قائم کی گئی۔ اور اس عالمانہ منصب پر ڈاکٹر بھنڈارکر فائز ہوئے۔ انھیں کئی انگریز علما کے مقابلہ میں ترجیح دی گئی۔ ہندوستان میں اس منصب کے وہی مستحق تھے۔ اپنی خلقی سرگرمی یکسوئی کے ساتھ وہ اس کام میں مصروف ہوئے۔ اور سنسکرت پراکرت اور موجودہ بھاشاؤں پر انھوں نے جو لکچر دیے وہ کمال تحقیق اور تاریخی انکشافات کے لحاظ سے بہت عرصہ تک یادگار رہیں گے۔ ان کی تیاری میں ڈاکٹر بھنڈارکر کو ریاضت شاقہ کرنی پڑی۔ مگر ایسی خدمات کا جو کچھ بہترین صلہ مل سکتا ہے وہ ہاتھ آ گیا۔ علما نے بڑی کشادہ دلی سے داد دی اور گورنمنٹ کو بھی عملی طور پر قدردانی کرنے کا جلد موقع مل گیا۔ یہ تجویز کچھ عرصہ سے درپیش تھی کہ ہندوستان کے قدیم غیر مطبوع مسودات سنسکرت کی تلاش کی جائے اور ان کا مجموعہ تاریخی تحقیقات کے لیے علما کے روبرو رکھا جائے۔ کیونکہ مورخین کا خیال تھا کہ ہندوستان میں ازمنۂ قدیم کی

مستند تاریخ مدون کرنے کے مسالہ کی کمی نہیں۔ وہ جابجا کھنڈروں میں پرائیویٹ کتب خانوں میں حوادث روزگار سے جانیں بچا بچا کر چھپے پڑے ہوئے ہیں۔ اور ان کے مطالعہ سے اس زمانہ کی تاریخ پر بہت کچھ روشنی پڑ سکتی ہے۔ مگر ان کو ڈھونڈ نکالنا آسان کام نہ تھا۔ یہ اہم خدمت ڈاکٹر بھنڈارکر کو عطا ہوئی اور انھوں نے اس کام کو جس قابلیت سے انجام دیا وہ حسن تعریف سے مستغنی ہے۔ نہ صرف متعدد بیش بہا مسودے ڈھونڈ نکالے بلکہ ان پر محققانہ رپورٹ بھی تیار کی جو پانچ ضخیم جلدوں میں ختم ہوئی ہے۔ اس صیغہ میں ڈاکٹر بھنڈارکر نے پیش رو کا کام کیا ہے اور مزید تحقیقات کے لیے میدان صاف کردیا ہے۔ اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں کہ انھیں اس کام میں کبھی کبھی موانعات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ملک میں جس شخص کے قبضہ میں کوئی پرانی کتاب ہے، خواہ وہ حسن و عشق کا قصہ ہی کیوں نہ ہو، وہ اسے نسخہ کیمیا سمجھے ہوئے بیٹھا ہے۔ اور گوارا نہیں کرتا کہ کسی غیر کی پردہ شکن نگاہ اس پر پڑے۔ ایسے لوگوں کی تالیف قلب کرنا ڈاکٹر صاحب ہی کا کام تھا۔ آج یہ ضخیم رپورٹ علما و مورخین کے لیے نظارہ حیرت بنی ہوئی ہے اور شاید کچھ دنوں تک اسے لوگ دقیق مطالعہ صحیح امتیاز، اور مورخانہ تحقیق کا نمونہ سمجھتے رہیں گے۔

۱۸۸۶ء میں وائنا میں مستشرقین کی ایک کانگریس پھر منعقد ہوئی۔ اب کی بار ڈاکٹر بھنڈارکر نے دعوت منظور کرلی۔ اور یورپ کے حالات کا غائر نگاہوں سے مطالعہ کیا۔ اس کے ایک سال بعد گورنمنٹ آف انڈیا نے انھیں سی۔آئی۔ای کا خطاب عطا کر کے علم و فضیلت کی قدر دانی فرمائی۔ مطالعہ اور تحقیقات کا یہ شغل جاری رہا۔ یہاں تک کہ پنشن کا زمانہ آپہنچا۔ اور ڈاکٹر بھنڈارکر نے پونا میں سکونت اختیار کی مگر ملک کو ایسی ان کی خدمات کی ضرورت تھی۔ ۱۹۰۱ء میں آپ بمبئی یونیورسٹی کے وائس چانسلر مامور ہوئے۔ یہ ان کے مسلسل احسانات اور حسن خدمات کا اعتراف تھا۔

مُتذکرہ بالا علمی مشاغل کے علاوہ ڈاکٹر بھنڈار کرنے بمبئی گزیٹر کے لیے قدیم دکن کی ایک تاریخ لکھی جس پر ہر ایک صورت سے تاریخ کا صحیح اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ وہ نہ صرف واقعات کی ایک جامع فہرست ہے بلکہ اس سے اسلامی حملوں سے قبل کے طرز معاشرت، رسم و رواج، اور آئین و قوانین پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس

تاریخ کا مسالہ اِدھر اُدھر منتشر پڑا ہوا تھا۔ ان کو یکجا جمع کرنا، ان کی تقدیم و تاخیر کا تصفیہ اور ان بکھرے ہوئے سنگریزوں سے ایک عالیشان عمارت کھڑی کرنا دشوار کام تھا۔ حق یہ ہے کہ ڈاکٹر بھنڈارکر خلقتہً طالب علم واقع ہوئے ہیں۔ فطرت نے انھیں جانچ پڑتال کا زبردست ملکہ عطا کیا ہے۔ علم سے انھیں عشق ہے۔ ایک پیاس ہے جو کسی طرح نہیں بجھتی۔ وہ جب کسی طرح علمی مسئلہ کو ہاتھ میں لیتے ہیں تو اس کی تحقیق میں ہمہ تن محو ہوجاتے ہیں اور اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ سطحی معلومات سے ان کی تحقیق پسند طبیعت کو تسکین نہیں ہوئی۔ بیدلی اور کم توجہی سے انھوں نے کوئی کام نہیں شروع کیا۔ اور اپنے شاگردوں میں بھی اس عادت کو کبھی روا نہیں رکھا۔ مناظرہ و مجادلہ میں بھی انھیں کمال حاصل ہے وہ بہت تعمیم و توجیہ کے بعد علمی مسئلے قائم کرتے ہیں اور تنقید و تبصیر کے تیز ترین شعلے بھی ان کا بال بیکا نہیں کرسکتے۔ عالمانہ ضد سے بھی انھوں نے کافی حصہ پایا ہے اور جب اڑ جاتے ہیں تو کسی طرح نہیں ٹلتے۔ وہ ایک وقت ایک ہی مسئلے کی طرف رجوع ہوتے ہیں اور اپنے دماغ کی مجموعی قوت اس پر صرف کردیتے ہیں۔ اس لیے جب کبھی مباحثہ کی ضرورت ہوتی ہے تو استدلال اور تمثیل سے کامل طور پر مسلح ہوکر میدان میں اتر آتے ہیں۔

پروفیسر بھنڈارکر کا اپنے شاگردوں کے ساتھ ہمیشہ بہت شریفانہ اور ہمدردانہ برتاؤ رہتا ہے۔ ایک اچھے اتالیق کے فرائض یہ ہیں کہ وہ اپنے شاگردوں کا رہنما، دوست، مشیر کار ہو۔ ڈاکٹر بھنڈارکر نے اس معیار کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔ ہونہار لڑکوں کی آپ بقدر ضرورت مالی امداد بھی فرمایا کرتے تھے۔ ان کے طلبا کو ان پر کامل اعتماد تھا۔ اور اپنی ترددات و مشکلات میں وہ ڈاکٹر صاحب ہی سے مشورہ کرتے۔ اور اس پر کاربند ہوتے۔ بیشتر پروفیسروں کی طرح وہ اپنے ذمہ داریوں کو صرف لیکچر ہال تک محدود نہیں کرتے تھے۔

طلبا کے لیے ان کے مکان پر کسی وقت روک ٹوک نہ تھی۔ ایک زندہ مثال سے جو تعلیمی اور اخلاقی مقاصد پورے ہوسکتے ہیں وہ پندو نصائح کے دفتروں سے بھی نہیں ہوسکتے۔ ڈاکٹر بھنڈارکر اپنے طلبا کے لیے ہمدردی حسن اخلاق اور آزادی کی زندہ مثال تھے۔ اور چوں کہ یہ ان کے نمائشی نہیں بلکہ طبعی اور ارادی اوصاف تھے اس لیے طلبا

کے دلوں پر نقش ہوجاتے تھے۔ سنسکرت کے پروفیسروں کو اکثر یہ شکایت رہتی ہے کہ طلبا دیگر مضامین کے مقابلہ میں اس کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ حالانکہ سنسکرت ادب کی خوبیاں اور نازک خیالیاں ان کی ضیافت طبع کا کافی سامان مہیا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر بھنڈارکر کو کبھی یہ شکایت نہیں ہوئی۔ ان کے لیکچر ہمیشہ محویت سے سنے جاتے تھے۔ طلباکو وقت کی شکایت ذرا بھی محسوس نہ ہوتی۔ کچھ تو مضمون متعلقہ ان کی کاملانہ قدرت اور کچھ ان کی طبعی سرگرمی اور زندہ دلی توجہ اور خیال پر جادو کا اثر کردیتی۔ بمبئ میں انھوں نے سنسکرت کے مطالعہ کا شوق پیدا کرنے میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ آپ کے شاگردوں میں ایسے شاید ہی نکلیں گے جنھیں سنسکرت زبان کی لطافت کا چسکا نہ پڑ گیا ہو۔ انھوں نے ہمیشہ معاملات زندگی میں آزادانہ روش اختیار کی۔ تملق اور بیجا خوشامد سے انھوں نے اپنی زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ اور غالبًا کبھی اسباب خارجی سے دب کر اپنے اصول اور عمل میں ناموافقت نہیں ہونے دی۔ ان کی زندگی ترغیبات سے بے لوث رہی ہے۔ اتنی ہی جتنی کہ انسان کے امکان میں ہے۔ انھیں شاید کسی بات سے اتنا روحانی صدمہ نہیں جتنا کہ اپنے اخلاق پر بیجا حملے سے۔ انھوں نے مراعات و عنایات کی کبھی ہوس نہیں کی۔ شہرت وجاہ طلبی سے محترز رہے۔ یہ وہ کمزوریاں ہیں جو بعض اوقات بہترین انسانوں کو گمراہ کردیتی ہیں۔ آزاد اور بے لوث دلوں پر ان کا جادو نہیں چلتا۔ تاہم گورنمنٹ کی نظر الطاف ان کی مساعدت کرتی رہی۔ وہ اعلیٰ ترین اعزازات اور خطابات جن کے لیے لوگ ترستے ہیں انھیں بے مانگے مل گئے۔ سی۔آئی۔ای پہلے ہی ہوچکے تھے۔ جشن دربار کے موقع پر انھیں سی۔ایس۔آئی کا خطاب عطا ہوا۔ اگر ثبوت درکار ہو تو یہ اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ مورد عنایات ہونے کے لیے ہمیں اپنی خود داری اور حق پسندی کے خون کرنے کی مطلق ضرورت نہیں جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں اور ان کی تعداد بے تعداد ہے وہ نہ صرف اپنی کم نگاہی کا اظہار کرتے ہیں بلکہ گورنمنٹ کی نیت و انصاف اور دانائی کو بدنام کرتے ہیں۔ حالانکہ بہت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض اوقات گورنمنٹ کے آئین التفات اس خیال کی تصدیق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ آزادی اور حق پسندی اس کے لیے چنداں ضروری نہیں ہیں۔

ڈاکٹر بھنڈارکر میں ایک بڑا وصف یہ ہے کہ وہ عالمانہ تعصب سے پاک ہیں۔ دیگر علما کی طرح انھوں نے کبھی اپنے ہم عصروں کی ناقدری نہیں کی بلکہ شروع سے ان کا رویہ یہ رہا کہ دوسروں کے دل میں بھی تحقیق و تلاش کا شوق پیدا کریں ان کی حوصلہ افزائی کریں اور مشورہ اور ہدایت سے ان کے معاون ہوں تاکہ ان کے بعد اس شعبہ میں دلچسپی لینے والوں کا قحط نہ ہوجائے۔

الغرض ڈاکٹر بھنڈارکر کی ذات مبارک ہندوستان کے لیے مایہ ناز ہے۔ آپ نے ثابت کردیا ہے کہ ہندوستانی لوگ علم کے دقیق شعبوں میں بھی یورپین علما کے دوش بدوش گام زن ہوسکتے ہیں۔ جرمن، فرانس، انگلستان سبھی ملکوں کے علما آپ کے معتقد ہیں۔ اور ہم کو جو ان کے ہم وطن ہونے کا فخر رکھتے ہیں، ان کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ جس میں جلی حروف میں لکھا ہوا ہے کہ ''استقلال ، انتظام اور نگاہ کامیاب زندگی کے راز ہیں۔'' جسٹس چندر وارکر نے جن کو آپ سے فخر تلمذ حاصل ہے آپ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''سر بھنڈارکرنے، باوجود متعدد مشکلات کے، اپنے برتاوات میں لگاؤ نہیں رکھا اور کبھی شہرت کی فکر نہیں کی۔ انھوں نے ہمیشہ حق کی وکالت کی ہے۔'' مگر حق کو ملائم اور شیریں الفاظ میں چھپا کر ناحق پسندوں کی دلجوئی اور دلداری نہیں کی۔ آپ برہمو سماج کے پیرو ہیں اور ذات پات اور چھوت چھات کی تفریق کو قومیت کے منافی سمجھتے ہیں۔ بھگوت گیتا اور اپنشد آپ کی زندگی کے نور ہدایت ہیں۔ یہی آپ کی روحانی تشفی اور صفائی قلب کے ذریعے ہیں۔ مورتی پوجن، یا اصنام پرستی پر آپ کا اعتقاد نہیں آپ کو ویدوں اور اپنشدوں اور بھگوت گیتا میں مورتی پوجن کی کوئی سند نہیں ملتی۔ آپ نے بہت تحقیقات کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ رسم ہندوؤں نے جین اور بودھ فرقوں سے لیا ہے۔ اگرچہ جینیوں اور بودھوں کا خالق بالااوصاف پر عقیدہ نہیں تھا۔ مگر جب ان کے علما اور اولیا انتقال کرتے تو وہ ان کی یادگار میں بت اور پیکر نصب کیا کرتے تھے۔ ہندوؤں نے یہ رواج ان سے لیا اور اسی نے اب بت پرستی کی صورت اختیار کرلی ہے۔ باوجود اس کے اکثر تعلیم یافتہ ہندو مورتی پوجن کے ایسے گرویدہ ہیں اور اس پر ایسا پختہ اعتماد ہے گویا یہی ہندومت کی جان ہے۔ تمدنی معاملات میں آپ اصلاح کے

پیرو ہیں اور عملی طور پر اس کا اظہار کرچکے ہیں۔ مئی ۱۸۹۱ء میں آپ نے اپنی بدھوا لڑکی کی شادی کرکے اپنی اخلاقی جرأت کا ثبوت دے دیا۔ جو مدعیان اصلاح میں ایک کام یاب وصف ہے جس قوم میں ایسے نفس پاک پیداہوتے رہیں اس کے مستقبل کی نسبت کوئی شک نہیں کیا جاسکتا۔

'زمانہ' دسمبر ۱۹۱۳ء

ہندوستانی ریلوں کی ساٹھ سالہ تاریخ

ہندوستان میں پہلی ریلوے لائن ۱۸۵۴ء میں قائم ہوئی۔ اس وقت لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل تھے۔ کورٹ آف ڈائرکٹرس نے پہلے ہندوستان کے مختلف صوبجات کو ریلوے لائن کے ذریعہ سے ملا دینے کے خیال کو توہم آمیز سمجھا۔ ان کے خیال میں ملک کی جغرافی حالت اس تجویز کی مانع تھی۔ مگر لارڈ ڈلہوزی نے فوراً دیکھ لیا کہ یہ تجویزیں سراسر قابل عمل ہیں۔ انھوں نے ایک یادگاری مراسلہ میں ریلوے لائنوں کا ایک خاکہ پیش کیا۔ موجودہ شاندار ریلوں کا سلسلہ جو ۳۴۶۵۶ میل تک پھیلا ہوا ہے۔ لارڈ ممدوح ہی کی پالیسی کا مبارک نتیجہ ہے۔ ان لوگوں میں سے جنھوں نے ریل کی پہلی لائن کو جو ۱۸۵۴ء میں ہوڑا اور پانڈوا کے درمیان قائم ہوئی اور جس کا فاصلہ کل ساڑھے سینتیس میل تھا۔ دیکھا شاید بہت کم آدمیوں کو اس حیرت انگیز ترقی کا خیال ہوا ہوگا لیکن مسٹر ہنری ایسٹ نے جو گورنر جنرل کے پرائیویٹ سکریٹری تھے اور جنھوں نے عہد اسلام کی ایک جامع تاریخ تصنیف کی ہے ۔ اس کے بارے میں لکھا ہے کہ ''ریلوے ہندوستان کے لیے وہ کر دکھائے گی جو شاندار اکبر بھی نہ کرسکا۔ وہ ہندوستان کو ایک متحد قوم بنادے گی۔ نتائج بتلا رہے ہیں کہ سرہنری لیٹ کا خیال حق بجانب تھا۔

خاص گورنمنٹ کو ریلوے کی عملی فوائد کا بہت ہی جلد ثبوت ملا۔ ۱۸۵۷ء کے بغاوت میں فوجوں کی نقل و حرکت میں ریلوں سے بہت بڑی مدد ملی جس سے یہ غدر جلد ہی فرو ہوگیا۔

مختلف اسباب کے باعث ابتداءً ریلوے تعمیر میں مصارف بہت زیادہ ہوئے۔ اور گورنمنٹ کی ضمانت کے بغیر پہلے سرمایہ دار لوگ روپیہ لگانے میں تامل کرتے تھے۔

آخر گورنمنٹ کو نفع کی ایک مقررہ شرح کی ضمانت کرنا پڑی۔ مگر چونکہ ریلوں کی آمدنی سے یہ آمدنی پوری نہ ہوتی تھی۔ اس لیے گورنمنٹ کو ہمیشہ دوسرے ذرائع سے یہ نقصان پورا کرنا پڑتا تھا۔ حتیٰ کہ ۱۸۶۰ء میں یہ رقم ڈیڑھ کروڑ تک جا پہنچی تھی۔ اس کے ساتھ ہی خارجی تجارت نے بھی حیرت انگیز ترقی کی پہلی ریلوے لائن کھلنے کے تین سال کے اندر درآمد و برآمد کی مقدار ۳۲ سے ۸۹ کروڑ ہوگئی اور ۱۸۱۳ء میں اس کا تخمینہ ۴ ارب اور ۷۵ کروڑ تھا۔ تجارت کی اس شاندار ترقی نے عام محاصل میں بھی اضافہ کردیا ہے۔ موجودہ نفع گویا ان ابتدائی نقصانات کا معاوضہ ہے جو گورنمنٹ کو زر نفع کی طور پر دینا پڑے تھے۔ اس انتظام میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ جن لوگوں نے روپیہ لگائے تھے انھیں گورنمنٹ سے اپنا نفع مل جاتا تھا۔ اس لیے اخراجات میں تخفیف یا کفایت کی ضرورت ہی ان کو محسوس نہ ہوتی تھی بالآخر اس سلسلہ انتظام میں اتنی قباحتیں پیدا ہوئیں کہ گورنمنٹ نے خود اپنی ملکیت اور انتظام میں ریلوے لائن کو چلانے کی پالیسی اختیار کی۔ سرمایہ دار لوگ اب بھی بغیر گورنمنٹ کی ضمانت کے روپیہ نکالتے ہوئے ڈرتے تھے اس لیے ریلوں کی تعمیر کی رفتار سست رہی۔ آخر ۱۸۶۹ء میں گورنمنٹ نے ریلوں کو اپنی ملکیت بناکر اس قضیہ کا فیصلہ کردیا۔

اس کے چھ سال بعد ریل کا سالانہ صرفہ تعمیر چار کروڑ تک بڑھا دیا گیا۔ لیکن قحط اور جنگ نے ایک دوسرے ہی تدبیر کی ضرورت پیدا کی۔ پہلے ریلین ''نیرو گیج'' نمونہ کی تھیں۔ اب ان کے چوڑا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور ایک نیا انتظام جاری کیا گیا جس کے مطابق سرکاری لائنیں سوداگروں کے انتظام میں دے دی گئی۔ مگر اس نئے انتظام میں بھی وہی نقائص موجود تھے جو پہلے ضمانتی انتظام میں تھے۔ بجز اس کے کہ گورنمٹ کا ریلوں پر اختیار زیادہ تھا۔ ۱۸۷۴ء سے ریلوں کی تعمیر زیادہ سرگرمی سے ہونا شروع ہوئی کیونکہ گورنمنٹ کو ولایت میں قرضہ آسانی سے دستیاب ہوگیا۔ اس کے بعد ۲۵ سال کی مدت میں ریلوں کی توسیع جس سرعت سے ہوئی اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ۱۸۷۴ء میں ریلوے لائن ۶ ہزار میل سے بھی کم تھی۔ مگر بیسویں صدی کے آغاز میں بیس ہزار میل سے زائد تھی۔ ۱۸۷۰ء اور ۸۰ کے درمیان متواتر خشک سالیوں کی باعث ملک کی مالی حالت کچھ غیر مطمئن ہوگئی تھی۔ اس وقت

ہاؤس آف کامنس میں ایک کمیٹی نے ''ریل اور نہروں'' کے لیے سرمایہ پیدا کرنے کے مسئلہ پر غور کیا اور سفارش کی کہ یہ رقم اس حد تک رکھی جائے جو ہندوستان میں آسانی سے بہم ہوسکے۔ اور ریل کے لیے سالانہ دو کروڑ کا تعین کیا۔ باجگذار ریاستوں کو اپنے مقبوضات میں بغیر خارجی امداد کے ریلوں کے تعمیر کرنے کی ترغیب دی گئی۔ نظام اسٹیٹ ریلوے جو ۳۳۰ میل لمبی تھی اس پالیسی کا پہلا ثمر ہے۔ متواتر خشک سالیوں نے توسیع ریلوے کی ضرورت کو خوب ذہن نشین کردیا تھا۔ اور قحط کے امداد کا ایک حصہ ریلوں کی تعمیر میں صرف کیا گیا۔

گذشتہ دس بارہ سال سے ریلوں کی قابل اطمینان مالی حالت کا مقابلہ اس وقت سے کیا جائے جبکہ وہ ضمانتی انتظام میں تھی تو کتنا اختلاف نظر آتا ہے۔ ۱۸۹۳ء میں چاندی کی نرخ ارزاں ہوجانے کی باعث ایک بار پھر ریلوے لائنوں کو کمپنیوں کی زیر انتظام چلانے کی ناکام کوشش کی گئی۔ اب کی نفع کی ضمانت زرِ امداد کی صورت میں منتقل کردی گئی جو مختلف ترمیم و تغیر کے بعد اب سرمایہ پر ساڑھے تین فیصدی ہے۔ مگر یہ شرائط باوجود اس کے کہ انھیں دل پذیر بنانے میں کوئی کسر نہیں رکھی گئی ہے۔ تاجرانہ حوصلہ مندیوں کے ابھارنے میں کامیاب نہ ہوئیں۔ اب ریلوے تعمیرات کی موجودہ صورت یہ ہے کہ خالص مقامی لائنوں کی تعمیر کا بار ڈسٹرکٹ بورڈوں پر ہے جو ان کے منافع کی ضمانت پر سرمایہ پیدا کرتی ہیں۔ باجگذار ریاستیں ان ریلوے کے لیے جو ان کے ممالک میں بنتی ہیں یا ان کے ملک سے ہوکر گزرتی ہیں اپنے محاصل سے یا قرضہ سے روپیہ نکالتے ہیں۔ باقی ریلوے لائنوں کے لیے گورنمنٹ اپنے محاصل سے مقررہ سالانہ رقم مہیا کرتی ہے۔

ریلوے لائن اور نہروں کی تعمیر کے مسئلہ پر عرصہ سے مباحثہ ہوتے آئے ہیں اور اس کے متعلق بھی کچھ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایک فریق جس میں ہندوستانیوں کی تعداد غالب ہے۔ نہروں کو ریلوں کے مقابلہ میں زیادہ ضروری اور مفید سمجھتا ہے۔ سر آرتھر کاٹن کاویری اور گوداوری کے نہروں کے مشہور و معروف انجینئر تھے۔ انھوں نے اس مباحثہ کو بہت زندہ دلی سے نباہا۔ پارلیمنٹ کی ایک کمیٹی کے روبرو ۱۸۷۸ء میں انھوں نے کہا تھا کہ میرا منشا صرف یہ بتلا دینا ہے کہ ہندوستان کو آبی

راستوں کی ضرورت ہے۔ ریلوے بالکل ناکام ثابت ہوئی ہے وہ صرف گراں ہی نہیں بلکہ ناکافی ہے اور انھیں چلانے کے لیے ملک کو چار کروڑ روپے سالانہ صرف کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دخانی کشتیوں کا سلسلہ اس سرمایہ کے آٹھویں حصہ میں قائم ہوسکتا تھا۔ اس پر شرح ارزاں، رفتار تیز، گنجائش بے حد اسے خزانہ سے مدد کی ضرورت نہیں۔'' جان برائٹ، لارڈ لارنس، سرولیم میور اور دیگر ذی اثر حضرات نے انجینئر صاحب کی حمایت کی۔ سر آرتھر کاٹن کی تجویز تھی کہ ریلوں کی تعمیر بند کردی جائے اور ان کے بجائے جہاز رانی کے قابل نہریں بنوائی جائیں۔ جن کا صرفہ ۳ کروڑ پونڈ کہا جاتا ہے۔ مگر ولایت کی جمہور کو نہروں سے کچھ دلچسپی نہ تھی۔ ریلوے سے وہ مانوس تھے۔ نہریں ان کے لیے بالکل ایک نئی چیز تھیں۔ ریلوں پر دس کروڑ پونڈ لگ چکے تھے مگر اس میں ان کو کوئی شکایت نہ تھی۔ نہروں پر تین کروڑ کے صرفہ کی ضروریات ان کے سمجھ میں نہ آتی تھی۔ بالآخر سر آرتھر کاٹن کی تجویز ناقابل عمل سمجھی گئی۔

مگر اب بھی ہندوستان میں کتنے ہی ماہرین اقتصادیات ہیں جن کا خیال ہے کہ اگر سر آرتھر کاٹن کی تجویز پر عمل کیا جاتا اور ان کی تضحیک نہ کی جاتی تو گزشتہ صدی کے آخری سالوں کی خشک سالیوں سے ایسے تباہ کن نتائج نہ پیدا ہوتے۔ صوبہ مدراس میں ندیوں سے اَنہار نکالنے کی تجویز کو سر آرتھر کاٹن کی تعمیرات نے خود مفید اور قریب الامکان ثابت کردیا ہے۔ شمالی ہندوستان میں بھی نہریں موجود ہیں۔ ریلوں اور نہروں کے حقوق کے متعلق مسٹر رومیش دت مرحوم نے فرمایا ہے ''نہروں سے آغاز ہی میں نفع ہونے لگتا ہے۔ ریلوے سے کافی نفع نہیں ہوتا۔ نہریں گورنمنٹ کے محاصل کا ایک ذریعہ ہیں۔ ریلیں سال بہ سال نقصانات کا نہریں غلہ کی پیداوار میں اضافہ کرتی ہیں۔ مگر ریلیں صرف ایک سمت سے دوسرے سمت کو غلہ لے جاسکتی ہیں۔ ملک کی پیداوار پر ان کا کوئی اثر نہیں ہے۔''

ایسی حالت میں قدرتاً یہ سوال ہوتا ہے کہ باوجود ان نقصانات اور پریشانیوں کے گورنمنٹ نے کیوں ریل کو نہر پر ترجیح دیا۔ مگر اس کا جواب آسان ہے۔ انگریزوں کو نہروں کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ ریلوں کے فوائد سے وہ کامل طور پر واقف تھے، انگلستان کو ریلوں سے بے شمار فوائد حاصل ہوچکے تھے۔ انگلستان جیسے صنعتی ملک کے فوائد کو

ہندوستان جیسے زراعتی ملک کے فوائد سے ممیز نہ کرسکے۔ علاوہ بریں ولایت میں تاجروں کا ایک مقتدر گروہ ریلوں کی ضرورت پر ہمیشہ گورنمنٹ کو مخاطب کرتا رہتا تھا کیونکہ ریلوں کی توسیع سے اسے اپنے مصنوعات کی بکری اور خام پیداوار کے حاصل کرنے کا یقین تھا۔ اس لیے ریلوں کی اس ملک میں اس قدر ترقی ہوئی۔

فروری ۱۹۱۲ء میں وائسرائے کی کونسل میں آنریبل مسٹر گوکھلے کی سرکردگی میں اس مسئلہ پر ایک دلچسپ بحث شروع ہوئی تھی۔ مسٹر واچا نے اس وقت کئی قابلانہ مضامین میں گورنمنٹ کی ریلوے پالیسی سے بحث کی اور ثابت کیا کہ اب تک گورنمنٹ کو ریلوں سے چالیس کروڑ کا نقصان ہوچکا ہے۔ مسٹر واچا کا خیال ہے اگر آنے والے دس برسوں میں بھی ریلوں کا نفع اس نقصان کو پورا کردے تو ہم کو اپنے تئیں خوش نصیب سمجھنا چاہیے۔

'زمانہ' جنوری ۱۹۱۴

مقدمہ اکسیر سخن

کالی داس کے سوانحی حالات

یوں تو سنسکرت ادب کی آج تک تھاہ نہیں ملی۔ ایک ساگر ہے کہ جتنا ڈوبو اتنا ہی گہرا معلوم ہوتا ہے۔ مگر تین شعرا بہت مشہور و معروف ہیں۔ والمیکؔ، ویاسؔ، اور کالی داس۔ ان کی تصانیف ایک ایک دور کی جامع تاریخیں ہیں اور یہی ان کی شہرت کی بنیاد ہے۔ والمیکؔ سب سے متقدم تھے ان کے کلام میں فرض اور صداقت کا رنگ غالب ہے۔ ویاسؔ جو ان کے بعد ہوئے معرفت اور محبت کی طرف جھکے۔ اور کالی داس نے حسن اور عشق کو اپنی فکر کی جولا نگاہ بنایا۔ ''رامائن'' والمیک کی اور مہا بھارت ویاس کی مقبول عام کتابیں ہیں اور یہ دونوں ہندو دھرم کا جزو بن گئی ہیں۔ مگر کالی داس کو ہم کچھ بھول سا گئے تھے۔ اور اگر انگریز علما اور مصنفین نے ہماری رہنمائی نہ کی ہوتی تو شاید ہم اب تک اس زندہ جاوید شاعر کو گوشۂ بے قدری میں پڑا رہنے دیتے۔ کالی داس کا اس وقت جو کچھ چرچا ہے یہ انگریزی تعلیم کی برکت ہے۔ کئی صدیوں کے بعد کالی داس کا ستارہ چمکا ہے۔ اور آج اس کے حالات، زمانہ، اور تصانیف پر انگریزی اخبارات اور رسائل میں بہت باتحقیق اور عالمانہ مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ ہندوستان اور یورپ میں یکساں سرگرمی سے اس کے حالات کی تفتیش کی جا رہی ہے۔

کالی داس کا سن ولادت اب تک نہیں تحقیق کیا جاسکا اور نہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مولد کہاں تھا۔ یہ عام طور پر مشہور ہے کہ وہ کرمادت کی سبھا کے ایک رکن تھے۔ اور چونکہ وکرمادت کا زمانہ حضرت عیسیٰ سے ۵۷ برس قبل بتایا جاتا ہے اس لیے کالی داس کا زمانہ عیسیٰ کے قبل مان لیا گیا ہے۔ مگر مورخین کہتے ہیں کہ عیسیٰ کے ستاون برس قبل وکرمادت نام کا کوئی راجہ نہ تھا۔ اس کی انہیں کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی۔ ان کا خیال ہے کہ کالی داس جس وکرمادت کی سبھا کے رکن تھے وہ عیسی کی

پانچویں صدی میں ہوا۔ عیسیٰ کی تیسری صدی سے لے کر نصف چھٹی صدی تک پٹنہ میں گپت خاندان کے کئی چکرورتی راجہ ہوئے۔ ان میں سے چار راجاؤں نے وکرمادت کا لقب اختیار کیا۔ کالی داس انہیں وکرمادتوں میں سے کسی کے معاصر تھے۔ زیادہ تر محققین اس خیال پر متفق ہیں کہ وہ راجہ چندر گپت دوئم کی سبھا کی زینت تھے۔ اور یہی خیال قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ وراہ مِہر نے جو انہیں نورتنوں میں تھے اپنی ایک تصنیف ''پنچ سدھا منتکا'' میں صاف لکھا ہے کہ میں نے اسے تنک ۴۲۷ یعنی ۵۰۵ء میں ختم کیا۔ اس سے کالؔی داس کا عیسیٰ کی پانچویں صدی میں ہونا قابل تسلیم معلوم ہوتا ہے مگر جب تک کوئی معتبر اور مستند تاریخی یا تحریری ثبوت نہ مل جائے اس وقت تک محققین کے ساتھ اس کے زمانہ کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ اور مجبوراً قیاسات ہی پر قناعت کرنا پڑے گی۔ ان کے مولد و مسکن کی نسبت علما متفق ہیں کہ کشمیر کی پاک خاک کو یہ فخر حاصل ہے اور کالؔی داس کی منظر نگاریوں سے اس خیال کو کسی قدر تقویت پہنچتی ہے۔

کالؔی داس کے سوانحی حالات پر اب تک کچھ روشنی نہیں ڈالی جاسکی۔ یہ روایت کہ پہلے وہ ایک دہقان جاہل برہمن تھے۔ راجہ شرودانندن کی باکمال بیٹی ودیاوتی سے ان کی شادی ہوئی۔ راج کماری نے بہ ذلت تمام انہیں اپنے سامنے سے نکال دیا۔ اور کالؔی داس دوبارہ جب اس کی خدمت میں حاضر ہوئے تو سنسکرت کے بڑے پنڈت ہوگئے تھے۔ زیادہ سے زیادہ کسی خوش اعتقاد شاعر کی گڑھت کہی جاسکتی ہے۔ تاریخ سے اسے کوئی مناسبت نہیں۔ ہر ایک بڑے شاعر کے ساتھ اسی قسم کی ایک نہ ایک روایت مشہور ہے۔ تلسؔی داس اور سور داس حالانکہ دور اکبری میں پیدا ہوئے مگر عقیدت مندوں نے ان کے متعلق بھی روایتیں گڑھ ڈالیں۔ اور یہ کچھ ہندوستان ہی میں مخصوص نہیں۔ جہاں سوانح نگاری کا رجحان کم تھا وہاں ایسی باتیں عام تھیں۔ شیکسپیئر انگریزی ادب کا آفتاب ہے۔ مگر اس کے سوانح زندگی کو بھی غیر معمولی بنانے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ حتیٰ کہ انگریزی علما کا ایک زبردست گروہ شیکسپیئر کی ہستی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ حافؔظ اور سعدؔی بھی عقیدت مندوں کی ان عنایات سے کافی طور پر بہرہ ور ہوچکے ہیں۔ اور اگر ایسی روایتوں کو کسی شاعر کی عظمت اور حسن قبول کا معیار قرار دے

لیں تو غالباً بہت بڑی غلطی نہ ہوگی۔ فرق عادات کو عظمت سے خاص انس ہے جب کوئی انسان کوئی غیر معمولی کام کرتا ہے تو عوام خود بخود اس کے غیر معمولی اسباب گڑھ لیتے ہیں یہی سبب ہے کہ ہمارے اولیائے کرام، فقرا باکمال اور مرسلین کے ناموں کے ساتھ انواع و اقسام کی دور از قیاس کہانیاں منسوب کردی گئی ہیں جنہیں معجزہ کا نام دے دیا گیا ہے۔ کشمیر میں سنسکرت کا عام چرچا تھا۔ یقیناً کالؔی داس نے حد متداول تک مروجہ علم و ادب کی تحصیل کی ہوگی۔ اس نے مناظر قدرت او رکیفیات فطرت کا مطالعہ انتہا درجہ کی دقیق نگاہ سے کیا جو ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر کے لیے لازمی ہے۔ حسن و عشق کی صحبتیں بھی اس نے خوب دیکھیں جس کی شاہد اس کی دقیق اور نفیس جذبہ نگاریاں ہیں۔ او روہ ایسے بے بہا موتی ہیں جو کسی بحر حسن و عشق کے غواص ہی کو مل سکتے ہیں۔ اس نے ہیئت او رنجوم میں بھی اعلیٰ درجہ کی دستگاہ بہم پہنچائی۔ او رکتابی معلومات کو سیر و سیاحت سے پختہ کیا۔ وہ ہندو عروج کا زمانہ تھا۔ امر سنگھ جیسا ماہر اللسان، وراہ مہؔر جیسا ہیئت داں اور دھنونتری جیسا حکیم حاذق موجود تھے۔ کالؔی داس جیسا شاعر بھی اسی زمانے میں پیدا ہوسکتا تھا۔ وہ بلا کا حاضر جواب اور بذلہ سنج تھا۔ اور اس کے نام کے ساتھ متعدد ظرافت آمیز قصے اور لطیفے منسوب ہیں جو زبان زد خاص و عام ہیں۔ یہ تحقیق کا خیال ہے کہ اس کی سمادھی جزیرہ سیلون کے حصہ جنوب میں کرندی ندی کے کنارے موجود ہے۔ دونوں میں کون سا خیال زیادہ صحیح ہے اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ مگر ہم کو یقین ہے کہ جوں جوں ہندوؤں میں قومیت کے جذبات نشو و نما پائیں گے توں توں اس زندۂ جاوید شاعر کے کلام کی چرچا زیادہ ہوگی۔ اور ایک دن ضرور آئے گا جب اس کی سمادھی پر ایک عالی شان روضہ نظر آئے گا۔ اس کے نام پر ادب وعلم کی مجلسیں قائم ہوں گی اور مندر تعمیر ہوں گے۔ جہاں اہل عقیدت اس کے نام کی پرستش کریں گے کیونکہ وہ ایسا شاعر تھا جس کا ثانی مادر گیتی اب تک نہیں پیدا کرسکی۔

کالی داس کی شاعری

کالی داس کی شاعری چند لفظوں میں لطیف جذبات اور مرصع خیالات کی شاعری ہے۔ متقدم شعرا کے کلام میں ساری اور عمومیت کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ استعارے اور

تشبیہات عام جذبات سچے مگر سادہ، طرز بیان سلیس، اور یہی وجہ ہے کہ عوام میں متقدمین کو جو مقبولیت حاصل ہوتی ہے اس پر متاخرین ہمیشہ رشک کیا کرتے ہیں کیونکہ ان کا کلام جسے ضروریات مذاق اور حالات زمانہ رنگین، لطیف اور پیچیدہ بنا دیتے ہیں عوام کی سمجھ سے باہر ہوتا ہے۔ مگر متاخرین میں تقلید، تصنع اور افلاس مضامین کی جو عام کمزوری پائی جاتی ہے۔ اس سے کالی داس کا کلام بالکل پاک ہے۔ رنگینی اور لطافت کے ساتھ ان کے کلام میں وہی سلاست، وہی مضمون آفرینی اور وہی کثرت خیالات موجود ہے جو متقدم شعرا کے کلام میں پائی جاسکتی ہے۔ اس کا ذہن وقاد کسی خاص صنف یا رنگ میں قاصر نہیں۔ اس کی بزم آرائیاں نظامی کو شرمندہ کر دیتی ہیں۔ اور رزم کے میدان میں فردوسی کا اشہب فکر بھی ایسی جولانیاں نہیں دکھاتا، صرف میگھ دوت میں حسن و عشق،فرقت اور وصال کے جذبات اس قدر موجود ہیں جن پر کسی زبان کی مایۂ شاعری کو ناز ہوسکتا ہے۔ اس نظم کے ایک خیال پر اہل ذوق سلیم محو حیرت ہوجاتے ہیں پہلے دل و جگر پر ایک بامزہ اثر ہوتا ہے۔ اور پھر فوراً جذبات کی لطافت، خیال کی نوعیت، اور حسن بیان کو دیکھ کر حیرت ہوجاتی ہے۔ ہمارے اردو کے عشاق نے صبا کو نامہ بر بنایا۔ امیرؔ نے اولاً یہ خدمت صبا کو سونپی اور داغ کو بھی اس سے زیادہ تیز رو اور بے نیاز و زبان کوئی قاصد نظر نہ آیا۔ دو صدیوں تک صبا نے یہ خدمت انجام دی اور اب بھی اس کا گلا نہ چھوڑا۔ مگر کالی داس نے ایک نیا قاصد ڈھونڈ نکالا۔ وہ میگھ یعنی ابر کو اپنا حدیث غم سناتا ہے۔ ایسی ہی جدتوں سے اس کا کلام مالا مال ہے۔ سنسکرت شعرا کی یہ خاص صفت ہے کہ وہ اپنے کلام میں مناظر قدرت کی خوب چاشنی دیتے ہیں۔ ان کے شاعرانہ خیالات سدا بہار پھولوں اور پتیوں سے سجے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کالی داس میں یہ صفت حد کمال کو پہنچ گئی ہے۔ برگ و گل کا جس حسن اسلوب اور ندرت سے اس نے استعمال کیا ہے وہ سنسکرت میں بھی کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ اس کی تشبیہات نئی نئی کونپلیں ہیں اور استعارات مہکتے ہوئے خوش رنگ پھول۔ یہ صحیح ہے کہ اردو اور فارسی کے شعرا نے بیل بوٹوں کا استعمال کیا ہے۔ مگر ان کے پھول پتے مرجھائے ہوئے بے رنگ و بے مزہ ہیں۔ ان کی بلند پروازی انھیں آسمان پر اڑا لے گئی اور وہاں زحل اور عطارد، زہرہ اور مشتری سے ان کا تعارف کرا

دیا حتی کہ اب کسی فارسی قصیدہ کو سمجھنے کے لیے ہیئت اور فلکیات کا جاننا ضروری ہے۔ سنسکرت شاعری اس قدر بلند نہ اڑ سکی، مگر اس نے اسی دنیا کی ہر چیز کو خوب غور سے دیکھا بھالا۔ اور مطالعہ کیا وہ کسی مینار کی طرح بلند نہیں بلکہ ایک سبزہ زار کی طرح وسیع ہے جس میں ہرن کلولیں کرتے ہیں۔ خوش رنگ طیور چہچہاتے ہیں، سبزہ لہلہاتا ہے اور بلورین چشمے بہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ سنسکرت شاعری کو موجودات ثلاثہ سے یکساں دلچسپی ہے وہ جس دنیا میں پیدا ہوئی ہے اس دنیا کی ہر ایک شے سے مانوس ہے۔ اور یہ صرف شکنتلا ناٹک کا پہلا پارٹ پڑھنے سے اس خوبی سے واضح ہوجاتا ہے جو ضبط تحریر میں نہیں آسکتا۔ ہرن اور بھونرا، مادھوری اور کیتکی، کدم اور نیم، یہ سب ہمارے سامنے آتے ہیں بے جان اور بے حس چیزوں کی طرح نہیں۔ شاعر نے ان میں ایک جان ڈال دی ہے۔ وہ سب قدرت کی ہمدردی سے یکساں متصف معلوم ہوتے ہیں۔ اسی سین کو پڑھ کر مشہور شاعر گیتی پر وجد کا عالم ہوگیا تھا۔ اور وہ بھی محض انگریزی ترجمہ کے مطالعہ سے۔ اور اب اس امر کو واضح کرنے کے لیے زیادہ دلیلوں کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ سرور انگیز اثر جو سنسکرت شاعری ہمارے دلوں پر پیدا کرتی ہے۔ کسی دوسری زبان کی شاعری کے امکان سے باہر ہے۔ بالخصوص اردو شاعری کے جس کے مثال ان پودھوں سے دی جاسکتی ہے جو اکثر باغوں میں مصنوعی زندگی بسر کرتے نظر آتے ہیں۔ مرجھائے ہوئے پتے زرد رنگ سمٹی ہوئی شاخیں، نہ پھل نہ پھول، فارس کا پودا ہندوستان میں لگایا گیا۔ نہ وہ زمین، نہ وہ آب و ہوا، نہ دیکھنے سے آنکھوں کو تازگی ہوتی ہے نہ دل کو فرحت۔ جہاں تک تشبیہات اور منظر نگاری کا تعلق ہے اردو شاعری بڑی حد تک تصنع اور بے اصلیت کا ایک دفتر ہے۔ سنسکرت شعراء کے مناظر اور جذبات سب اسی سرزمین کی آب و گل سے خلق ہوئے ہیں۔ اور یہی ان کی تاثیر کا راز ہے۔ دیکھیے کالی داس برکھارت میں شہد کی مکھیوں کا شہد جمع کرنا کس لطافت سے دکھاتا ہے۔

تلاش شہد میں مکھیاں سبک پرواز
مگر مزاج میں یہ سادگی کے ہیں انداز
کہ ناچتے کہیں آتے ہیں جب نظر طاؤس
فضائے دشت میں پھیلائے بال و پر طاؤس

ترانے گاتی ہوئی جب قریب آتی ہے
کنول کے پھولوں کے دھوکے میں بیٹھ جاتی ہے
مہک رہی ہے ہوا کیتکی کے پھولوں سے
بسی ہوئی ہے صبا کیتکی کے پھولوں سے
ہر اک روش پہ ہے جمگھٹ پری جمالوں کا
عجب بناؤ ہے پھولوں کے گہنے والوں کا
چمن میں کرتی ہوئی صبح دم گل افشانی
لچک لچک کہ ہے پودوں کو دے رہی پانی
کہیں کدم کے درختوں پہ چھا رہی ہے بہار
ہرے ہرے کسی جانب ہیں نیم کے اشجار

سروسہی، شمشاد و صنوبر کے مقابلہ میں کدم اورنیم اور کیتکی کیسے مانوس معلوم ہوتے ہیں۔

قطع نظر ان شاعرانہ خوبیوں کے کالی داس نے فطرت انسانی کا بھی بڑی غائر اور دقیق نگاہوں سے مشاہدہ کیا تھا۔ انسانی طبائع کی نرنگیوں پر اسے پورا عبور تھا۔ کن حالات سے انسان کے دل میں کیسے جذبات اور خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اس نے حیرت انگیز واقعیت کے ساتھ دکھلائے ہیں۔ اس کے ڈرامے فطرت انسانی کے مرقع ہیں۔ جن کے اعضا کے تناسب رنگوں کی موزونیت اور خدوخال کی صفائی کی تعریف کافی طور پرنہیں کی جاسکتی۔ اور عشق کی گھاتیں اور محبت کے اشارے و کنائے تو اس نے ایسی نزاکت سے دکھائے ہیں جو وجدان صحیح کو بیخود اور سرشار کردیتے ہیں۔ اس رنگ میں نہ کوئی اس کا رقیب ہے نہ ہمسر وہ اس رنگ کا استاد ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی اس کا قلم اعتدال سے زیادہ شوخ ہوگیا ہے! کیونکہ وہ آزادمشرب آدمی تھا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے مناکحت ہی کو انسانی محبت کا اعلیٰ ترین معیار قرار دیا ہے۔ میگھ دوت میں فرقت نصیب مکیش جس معشوق کی یاد میں تڑپا ہے وہ اس کی بیوی تھی۔ رتو سنگھار میں بھی جابجا اسی کے اشارے ہیں۔

وہ مہ وشیں جو بدلتی ہیں کروٹیں شب بھر رلا رہی ہے لہو جن کو دوریٔ شوہر
برس رہی ہے اداسی اب ان کی صورت پر جگر کی آگ قیامت ہے اک قیامت پر

کالی داس اور شیکسپیئر

کالی داس عام طور پر ہندوستان کا شیکسپیئر کہا جاتا ہے اور اس میں مطلق مبالغہ نہیں۔ دنیا میں صرف شیکسپیئر ہی ایسا شاعر ہے جس کا اس سے موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ دونوں ڈرامانویس ہیں دونوں فطرت انسانی کے مبصران کے خیالات، ان کی بندشیں، اکثر مقامات پر لڑ گئی ہیں۔ ایک ہی شاعرانہ دماغ قدرت کی جانب سے دونوں کو عطا ہوا تھا۔ کسی شے کو جس نگاہ سے شیکسپیئر دیکھتا ہے اسی نگاہ سے کالی داس بھی اسے دیکھتا ہے۔ رنج وغم حسرت و انتقام، عشق و فراق میں انسان کے دل میں کیسے جذبات موجزن ہوتے ہیں، جس خوبی سے شیکسپیئر نے دکھائے ہیں اسی رنگینی کے ساتھ کالی داس نے بھی دکھائے ہیں۔ شیکسپیئر کے جتنے کیرکٹر ہیں وہ سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ہر ایک میں کوئی نہ کوئی امتیازی خصوصیت موجود ہے۔ کالی داس کے کیرکٹروں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ شیکسپیئر کے میکبتھ اتھیلو، رومیو، جولیٹ کی تصویروں کو کالی داس کے دشنیت، شکنتلا، پریم بدلا کی تصویروں کو مقابلہ میں رکھنے سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ ان دونوں شاعروں کو انسان کی خصلت کا کیسا علم تھا۔ شیکسپیئر اور کالی داس میں اگر کچھ فرق ہے تو یہ ہے کہ شیکسپیئر کو فطرت انسانی کے کرشمے دکھانے میں زیادہ ملکہ ہے اور کالی داس کو مناظر فطرت کی تصویر نگاری میں۔ شیکسپیئر کو انسانی طبائع میں جو رسائی تھی وہی کالی داس کو قدرت کے عجائبات میں تھی۔ اسی لیے شیکسپیئر کا کلام دقیق ہے۔ اور کالی داس کا رنگین، شیکسپیئر کو جس طرح اپنے مقدم اور موخر شعرا پر فضیلت ہے اسی طرح کالی داس کے کلام کی رنگینی اور لطافت سنسکرت میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔

کالی داس کا کمال تبحر

کالی داس کی نظموں اور ناٹکوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فن شعر اور فن عراض کے علاوہ مختلف علوم و فنون میں مہارت تمام رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں جا بجا فلسفیانہ خیالات بکھرے پڑے ہوئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ فلسفہ سانکھ اور یوگ پر عبور رکھتے تھے اور شیو کے اوپاسک مگر خیال ان کا ویدانت کی طرف جھکا ہوا تھا۔ آتما اور پرماتما، روح اور جسم، مایا اور دنیا وغیرہ پیچیدہ روحانی مسئلوں سے انھوں نے دوران کلام میں بڑی آزادی کے ساتھ بحث کی ہے۔ علم ہیئت کا اس زمانہ میں بڑا چرچا تھا۔

اوجین اس علم کا اس زمانہ میں مرکز تھا، وہ آہ مہر جو نامور ہیئت دان ہوکر گزرا ہے کالی داس کے دوستوں میں تھا اور اس میں اب کوئی شک نہیں ہوسکتا کہ کالی داس کو اس صیغہ علم میں کمال حاصل تھا انھوں نے خود جوتش پر ایک معرکے کی کتاب لکھی ہے جو آج تک مروج ہے۔ ان کی جغرافی معلومات بھی بہت وسیع تھیں۔ انھوں نے ہندوستان کے ہر ایک گوشہ میں سفر کیا تھا۔ میگھ دوت میں ان کی جغرافیہ دانی کا کافی ثبوت ملتا ہے، جہاں کہیں بحری مناظر بیان کیے ہیں ان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ کسی چشم دید نظارہ کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔ علوم نظری میں بھی انکی نگاہ باریک اور صحیح تھی۔ جوار بھاٹا، طوفان، چندر، اور سورج گہن وغیرہ قدرتی کرشموں کے انھوں نے جو تذکرے کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے متعلق انھیں وہی علم تھا جس پر آج کے ماہرین سائنس متحد ہیں۔ اور آئین فرماں روائی کے تو وہ گویا ایک دریا تھے، رگھوبنس میں اول سے آخر تک راجاؤں ہی کا ذکر ہے اس میں صدہا ایسے تلامذے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں آئین تاجداری سے پوری واقفیت تھی۔ راجہ کسے کہتے ہیں۔ اس کا کیا دھرم ہے۔ رعایا کے ساتھ اس کا کیسا برتاؤ ہونا چاہیے۔ رعایا کے اس پر کیا حقوق ہیں ان باتوں کو جیسا کچھ کالی داس سمجھے تھے شاید آج بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی وہ علم نہ ہوگا۔

الغرض کالی داس ایک جامع کمالات انسان، قادر الکلام شاعر اور بحر علوم تھا۔ اس کی دماغی وسعت پر ہم کو حیرت ہوتی ہے دنیائے تشبیہ میں دنیا کا کوئی شاعر اس سے آنکھیں نہیں ملا سکتا۔ اس کی تشبیہیں ایسی موزوں، ایسی برجستہ ایسی تصور انگیز ہیں کہ اگر انھیں شعر میں سے نکال دیجیے تو شعر بالکل بے مزہ اور بے رس ہوجاتا ہے۔ منظر قدرت کا کوئی ایسا کرشمہ نہیں جس سے اس نے تشبیہ اخذ نہ کی ہو۔ اگرچہ ہندوستان کو اس کے مولد ہونے کا فخر حاصل ہے مگر در اصل وہ ہندوستان کا نہیں بلکہ تمام دنیا کا شاعر ہے۔ ہندوستانیوں کو اس کے کلام سے جو لطف حاصل ہوسکتا ہے وہی کسی دوسرے ملک کے آدمی کو حاصل ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے دنیا ایک دفتر شاعری تھی جس چیز پر نگاہ ڈالی ہے اسے اپنی شاعری کا زیور بنالیا ہے۔ وید پران پر تاریخ، فلسفہ وغیرہ علوم جنھیں شعرا خشک سمجھتے ہیں اور جنھیں شاعری سے کوئی مناسبت نہیں بتلائی جاتی وہ کالی

داس کے احاطۂ شاعری میں آ کر کچھ او رہی رنگ روپ اختیار کرلیتے ہیں۔ موجودات عالم کو زیور شاعری سے آراستہ کرنے والا۔ ٹھنڈ درختوں، اور ویران کھنڈروں میں وہ لطف پیدا کرنے والا جو ہرے بھرے درختوں اور آراستہ و پیراستہ محلوں سے نہ حاصل ہوسکے، ایسا خدائے سخن دنیا میں دوسرا نہیں پیدا ہوا اور جب تک کیفیات شاعری کے قدردان، اور تماشائیان جلوہ گاہ حسن باقی رہیں گے اس وقت تک کالی داس کا نام قائم رہے گا۔ وہ سنسکرت شاعری کا بدر کامل ہے، اور جو شخص جتنا ہی شاعرانہ ذوق اور وجدان صحیح رکھتا ہے وہ کالی داس کے کلام سے اتنا ہی لطف اٹھا سکتا ہے۔

کالی داس کی تصانیف

کالی داس کی تصانیف جن کا اب تک پتہ چلا ہے تعداد میں سولہ ہیں مگر ان کی شہرت اور مقبولیت کا جن کتابوں پر دارومدار ہے وہ سات سے زیادہ نہیں اور ان ساتوں میں کوئی ایک کتاب اس کے بقائے دوام کے لیے کافی ہے۔ اس سبعہ سیارہ کے چار رکن چار شاعرانہ تصانیف ہیں: (۱) رگھوبنس (۲) کمارسنبھو (۳) میگھدوت اور (۴) رتو سنگھار۔ اور باقی تین وہ ڈرامے ہیں جنھوں نے نقادان فن کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ (۱) شکنتلا (۲) وکرم اروسی (۳) مالو کا گنی متر۔ مہذب دنیا میں ان تصانیف کی جو قدر و منزلت ہوئی ہے وہ شاید ہی کسی دوسرے شاعر کو نصیب ہوئی ہو۔ یورپ کے بیشتر زبانوں میں ان کا ترجمہ ہوجانا ان کی عام قبولیت کی زبردست دلیل ہے۔ ہندوستان کی تقریباً سب زبانوں میں بھی ان کے ترجمے ہوگئے ہیں۔ ڈراموں کی ہر دلعزیزی کی یہ کیفیت ہے کہ وہ یورپ اور امریکہ کے تھیٹروں میں کھیلے جاچکے ہیں اور کالی داس کی تصانیف سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنی تہذیب میں داخل ہوگئی ہے۔ آج ہندوستان کے مصور کالی داس کے کیرکٹروں اور منظروں کو کھینچنا اپنے کمال کا معراج سمجھتے ہیں۔ راجہ روی ورما کی تصویر ''شکنتلا پتر'' بجائے خود حسن اور عشق کی ایک دنیا ہے۔ جہاں قدرت نے لطف انگیز اور سرور افزا سامان درد و غم بہم کردیے ہیں ایسے ہی تخیلات اور مناظر سے کالی داس کا کلام بھرا ہوا ہے۔ ڈراموں میں اول دو کا ترجمہ اردو زبان میں بھی ہوگیا ہے۔ شکنتلا کا ترجمہ راجہ شیو پرشاد مرحوم نے کیا تھا، اور وکرم اروسی کا چند سال گزرے مولوی محمد عزیز مرزا صاحب نے۔ شکنتلا کا ترجمہ اصل سنسکرت سے کیا گیا ہے،

اور اس لیے اصل کی لطافت کچھ باقی ہے وکرم اروسی غالباً انگریزی سے اردو میں آئی ہے۔ اس لیے اصل لطافت نہ پیدا ہوسکی تاہم بسا غنیمت ہے۔ مگر چاروں نظموں میں سے ایک کا ترجمہ بھی اردو میں اب تک نہیں ہوا۔ اس تقصیر کی شکایت مسلمان ادیبوں سے نہیں۔ مگر ہندو حضرات کے لیے یہ بڑی ندامت کی بات ہے۔ کتنے ہی ہندو اصحاب ہیں جنھیں فن شعر سے ذوق ہے۔ جو غزلیں اور قصیدے لکھتے ہیں، اور گل و بلبل کے قضیوں میں سر کھپاتے ہیں۔ مگر اتنی توفیق یا جرأت نہیں ہوتی کہ سنسکرت شعرا کے کلام سے قوم اور زبان کو فیض پہنچائیں، اردو شعر و سخن کا چرچا زیادہ تر کائستھوں اور کشمیریوں میں ہے۔ اور یہ دونوں فرقے اب تک عموماً سنسکرت کے مطالعہ سے محترز ہیں۔ مگر اب چونکہ سنسکرت کی طرف رجحان ہونے لگا ہے اس سے امید کی جاتی ہے کہ شاید کچھ دنوں میں ہم رگھو بنس، میگھدوت اور کمار سنبھو کا اردو زبان میں مطالعہ کرسکیں ۔ رہا ''رتو سنگھار'' وہ اب ''اکسیر سخن'' کے نام سے دنیائے اردو میں پہلی بار جلوہ افروز ہوتا ہے۔ حضرت شاکر نے یہ ترجمہ کرکے اردو زبان پر ایسا احسان کیا ہے جس سے وہ بھی سبک دوش نہیں ہوسکتی۔ ایک افسوس ناک کمی جو اردو شعرا اور سخن سنجوں کے لیے مایۂ ندامت تھی حضرت شاکر کی کاوشوں کی بدولت ایک حد تک پوری ہوگئی۔ ان کے شاعرانہ انہماک نے اردو پبلک کو کالی داس کے لطیف جذبات اور خیالات سے حظ اٹھانے کا موقع دیا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس رنگ میں انہیں پیش رو کا طرز حاصل ہے۔ نومبر ۱۹۰۹ء میں کالی داس پر ایک مضمون رسالہ ''مخزن'' میں ان کے قلم سے نکلا تھا۔ اس کے دوران میں آپ نے فرمایا تھا:

> ''اگر ہمارے باکمال شعرا کالی داس کی تصنیفات کو ملاحظہ فرمائیں گے تو وہ دیکھیں گے کہ ان کی طبع رسا اور بار آور قوت خیال کے لیے کیسا وسیع میدان موجود ہے اور ان کی جدت پسند طبع کے لیے ان میں کیسے کیسے اچھوتے مضامین بھرے پڑے ہیں، اس لیے ہمیں امید رکھنا چاہئے کہ ہمارے شعرائے نامدار اس طرف توجہ فرما کر نہ صرف اپنے ملک کے لٹریچر کو فائدہ پہنچائیں گے بلکہ خود بھی سچی اور لازوال شہرت حاصل کریں گے۔''

حضرت شاکر نے بمصداق اس کے کہ "مثال تلقین سے بدرجہا بہتر ہے" اپنے مشورہ پر خود عمل کیا ہے ان کی امید انہیں کی ذات سے پوری ہوگئی۔

رتو سنگھار

اوپر لکھا جاچکا ہے کہ "رتو سنگھار" کالی داس کی چار اعلیٰ ترین نظموں کا ایک خاص رکن ہے۔ اس میں شاعر نے ہندوستان کے چھ موسموں کے مناظر اور تغیرات اور ان سے پیدا ہونے والے جذبات اور خیالات نہایت دلکش اسلوب سے بیان کیے ہیں۔ چونکہ اردو فارسی میں تین ہی موسم مانے گئے ہیں اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان چھوں موسموں کی یہاں تشریح کردی جائے۔

نمبر شمار	نام موسم	ہندی مہینے	انگریزی مہینے
۱	گریشم	جیٹھ۔اساڑھ	جون۔جولائی
۲	برکھا	ساون۔بھادو	اگست۔ستمبر
۳	شرد	کنوار۔کاتک	اکتوبر۔نومبر
۴	ہیمنت	اگھن ۔ پوس	دسمبر۔ جنوری
۵	ششر	ماگھ۔ پھاگن	فروری۔ مارچ
۶	بسنت	چیت۔ بیساکھ	اپریل۔ مئی

اردو اور فارسی شعرا نے موسمی جذبات کو صرف اسی حد تک اپنے اشعار میں دخل دیا ہے۔ جہاں تک بہار اور خزاں کا تعلق ہے حتیٰ کہ بہار اور خزاں بھی استعارے ہیں ایام مسرت اور ایام غم کے لیے ہاں ابر سیاہ کو دیکھ کر کبھی کبھی پیر مغاں کی یاد آجاتی ہے۔

ساقیا مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد   تند و پرشور، سیہ مست، زکہسار آمد

ہندوستان میں موسمی جذبات معاشرت میں داخل ہوگئے ہیں۔ ہمیشہ سے ان کا عملی اظہار ہوتا آیا ہے۔ برکھارت آئی اور گھروں میں جھولے پڑ گئے۔ ساون اور ملار کی تانیں گونجنے لگیں۔ نازنینوں نے ہاتھ پاؤں میں مہندی رچائی! جذبۂ درد محبت نے

دلوں کو بے چین کرنا شروع کیا حتی کہ گلیوں اور بازاروں میں بارہ ماسے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ سنسکرت شعرا نے بسنت کو ”رت راج“ یا موسموں کا راجہ مانا ہے۔ درختوں میں نئی نئی کونپلیں نکلیں۔ آم کے بور کی مہک سے ہوا معطر ہوگئی۔ کھلیانوں میں خوشۂ زریں کے انبار لگ گئے۔ کوئل آم کی ڈالیوں پر بیٹھ کر کوکنے لگی۔ عشاق کو رونے کی سوجھی، شوق نے دلوں کو گدگدایا۔ معشوق اپنی بے نیازیوں کو بھول گئے۔ بسنت کی خوش آئند صدا کانوں میں آئی۔

آئی بسنت بہار۔ بالم گھر نہ آئے سکھی

کالی داس نے انھیں موسمی مناظر کو اپنے جادو طراز قلم سے کھینچا ہے اور اس خوبی سے کھینچا ہے کہ ہر ایک موسم کا سماں آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ خصوصاً بسنت، رت کا بیان ایسا لطیف، ایسا واقعیت سے لبریز اور جذبات نازک سے اس قدر مرصع ہے کہ اس کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔

پھول کھلتے ہیں جو ٹیسو کے بیابانوں میں
جان پڑ جاتی ہے عشاق کے ارمانوں میں
آتے ہیں روپ پہ آموں کی اسی رت میں شجر
کوئل آتی ہے اسی رت میں درختوں پہ نظر
چھیڑتی ہے لب جو آکے ترانہ اپنا
سارے عالم کو سناتی ہے فسانہ اپنا
بھونرے پھولوں پہ ہیں سرمست مئے جوش بہار
جھومتے ہیں اثر بادِ صبا سے اشجار
چٹکیاں لیتی ہیں رہ رہ کے امنگیں دل میں
نشہ شوق کی اٹھتی ہیں ترنگیں دل میں

کالی داس کے دیگر تصانیف کی طرح رتو سنگھار کا ترجمہ بھی یورپ کی بیشتر زبانوں میں ہوگیا ہے۔ ہندی بھاشا میں لالہ سیتارام صاحب اور راجکمار بابو دیو کی نندن صاحب نے ان کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا بنگال کے مشہور مصور بابو اپندرو

ناتھ ٹھاکر نے رتو سنگھار کے موسمی مناظر کی تصویریں کھینچی تھیں۔ جو بہت مقبول ہوئیں۔ نیز بمبئی کے مشہور ومعروف مصور مسٹر دھرندھر نے بھی رتو سنگھار کے متعلق چھ تصویریں کھینچی ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یورپین نقادان فن اس مختصر مگر دلآویز نظم کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مستند مورخ الفنسٹن کہتا ہے:

''ذکر جذبات کے ساتھ ساتھ یہ شاعر ان تمام کیفیات کی تصویر کھینچ دیتا ہے جو ان جذبات کے محرک ہوئے اور مناظر کی خوبیان اور دل فریبیاں ایسے جادو کار الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ وہ شخص بھی جو ان پودوں اور جانوروں سے بیگانہ ہو ہندوستانی منظر کا خاکہ اپنے دل میں قائم کرسکتا ہے۔''

سر آمد مستشرقین مانیر ولیمس لکھتا ہے:

'' اس نظم کا ایک شعر کسی نہ کسی ہندوستان منظر کی ایک مکمل اور جامع تصویر ہے۔''

نقادانِ فن کا خیال ہے کہ رتو سنگھار کالی داس کے سن شباب کی تصنیف ہے اور کئی وجوہ سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے ۔ شباب کا زمانہ عشق و محبت اور عیش وعشرت کا زمانہ ہوتا ہے اس وقت تک غم کے کانٹے پہلو میں نہیں کھٹکتے اور زمانہ کی سرد مہریوں کا تجربہ نہیں ہوتا۔ نوجوان شاعر کا کلام یاس و حسرت، اور رنج و مصیبت کے جذبات سے خالی ہوتا ہے۔ شاعر کو محبت کی داستان وصال کی خوشیوں اور معشوق کے راز و نیاز سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ حسرت کا راگ گائے جب دل ہنستا ہو تو آنکھیں کیوں کر روئیں۔ رتو سنگھار اول سے آخر تک جذبۂ الفت میں ڈوبا ہوا ہے ارمانوں کے دن ہیں مرادوں کی راتیں۔ وہ حرکت، وہ جوش، وہ بے تکلفی، وہ رنگینی، وہ تازگی، وہ چہل پہل، جو شباب کی خصوصیات ہیں۔ اس نظم میں اول سے آخر تک بھری ہوئی ہیں۔ حسینوں کے تذکروں سے شاعر کا جی نہیں بھرتا، کہیں ان کے گلوں کے گجروں کا بیان ہے کہیں ان کے حنا آلودہ ہاتھوں کا۔ شاعر نے ہر ایک موسم کو حسینوں کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ہر ایک خیال ایک جذبہ حتی کہ استعارے اور تلازمے حسینوں کی حسن سے سجے ہوئے ہیں یہ بھی نوجوان شاعر کی ایک خصوصیت ہے اسے ہر ایک جگہ عورت ہی سوجھتی ہے۔ نوجوان شاعر

کے دل پر کوئی جادو اتنا اثر نہیں کرتا جتنا کہ جادو حسن حسین عورت ہی اس کے جذبات کو ابھارتی ہے۔ حسین عورت اس کی امیدوں کی ابتدا، اس کی آرزوں کی انتہا اور اس کی دلفریبیوں کا مخزن ہوتی ہے۔ المختصر رتو سنگھار ایک جوان نظم ہے، جوانی کی خوشیوں سے منور، جوانی کی محبت سے معطر اور جوانی کی امیدوں سے معمور۔

دنیائے اردو بھی اس دلکش نظم سے روشناس ہوچکی ہے۔ مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے اپنے رسالہ ''دلگداز'' میں رتو سنگھار کی دو تین رتوں کا ترجمہ نثر میں کیا تھا۔ جون ۱۹۱۴ء کے دلگداز میں انھوں نے اس نظم کے متعلق ان الفاظ میں اپنا خیال ظاہر کیا ہے:

> ''ہندوستان کے شیکسپیئر کالی داس نے رتو سنگھار کے نام سے چھ نظمیں چھ موسموں کے بیان میں لکھی ہیں، جن میں خاص ہندوستان کی یہ رُتیں اس خوبی اور لطف کے ساتھ دکھائی ہیں کہ پڑھنے سے موسمی کیفیت کی تصویریں آنکھوں میں پھر جاتی ہیں۔ ان مضامین میں نئی تشبیہیں نئے خیالات اور نئی بندشیں ہیں جو اس لٹریچر کے لیے جس کا نشو و نما ہندوستان میں ہوا۔ انگریزی اور فارسی لٹریچر کے طرز انشا سے زیادہ موزوں اور پر اثر ہیں۔''

اس نظم میں کالی داس کی رنگین بیانی بعض اوقات دائرہ اعتدال سے متجاوز ہوگئی ہے۔ پھل جب زیادہ میٹھا ہوجاتا ہے تو اس میں کیڑے پڑ جاتے ہیں۔حضرت شاکر نے ان مقامات کو جیسا کہ اس کا اخلاقی فرض تھا نظر انداز کردیا ہے اور اب سارے مجموعہ میں ایک بھی ایسا شعر نہیں جو طبائع سلیم کو مکدر کرسکے۔ ہاں وہ زاہد خشک جس کی طبیعت کو شاعری سے کوئی مس نہ ہو اب بھی بعض خیالات کو سوقیانہ اور عامیانہ سمجھ کر ناک بھوں سکوڑ سکتا ہے، مگر ثقات کی خشک بیانی کو شعرا کی رنگینی سے کوئی نسبت نہیں ہوتی اور ان کی خردہ گیریوں سے بچنا کسی شاعر کے حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ کاش شعراء اردو مولانا شرؔر کی طرح سمجھتے کہ ان مضامین کی نئی تشبیہیں نئے خیالات اور نئی بندشیں اردو لٹریچر کے لیے انگریزی اور فارسی لٹریچر کے طرز انشا سے زیادہ موزوں ہیں تو آج اردو شاعری اس قدر مطعون اور منکوت نہ ہوتی۔ مگر مولانا شرر نے اس نظم کا

ترجمہ نثر ہی میں لکھنے پر قناعت کی۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ شاعرانہ خیالات کچھ نظم ہی میں مزہ دیتی ہیں نثر کے قالب میں آ کر ان کی وہی کیفیت ہوجاتی ہے۔ جو مئے خوشگوار کی حلقۂ زاہدمیں یا کسی مہ وش نازنین کی لباس برہنگی میں۔ بہرحال کالی داس کے خیالات کو اردو میں نظم کرنابڑی عرق ریزی، کاوش اور فکر کا کام ہے۔ او رحضرت شاکر کو اردو پبلک سے حوصلہ افزا داد ملنی چاہئے۔ مولانا شوکت میرٹھی جیسے پختہ کار ادیب کے خیال میں یہ ترجمہ: ''لاجواب ہے۔ دوسرے کا یہ حوصلہ نہیں۔ اس کو سہل ممتنع کہنا بجا ہے۔''

اکسیر سخن

گو یہ ترجمہ ہے مگر حضرت شاکر نے ترجمہ میں آمد کا لطف پیدا کردیا ہے۔ سلاست اس مجموعہ کی بہترین صفت ہے۔ سنسکرت کے پیچیدہ اور عمیق جذبات کو نظم کرنے میں سلاست کو ملحوظ رکھنا اور اس میں کامیاب ہوجانا شاعر کی پختہ مشقی اور قوت نظم کی دلیل ہے۔

تھے برنگ دیدۂ عشاق جو چشمے پر آب
اڑ رہی ہے خاک انھیں صورت موج سراب
سطح گردوں کو سمجھ کر چشمہ آب رواں
تک رہے ہیں دیدہ حسرت سے ہوکر نیم جان

کتنا سچا اور نیچرل خیال ہے اور کتنی خوبصورتی سے نظم کیا گیا!

دھوپ سے ہیں ایسے گھبرائے ہوئے مار سیاہ
بازوئے طاؤس کے سایہ میں لیتے ہیں پناہ

مور سانپ کا دشمن ہے۔ مگر شدت گرمی نے ان کے حواس اس درجہ مضمحل کردیے ہیں کہ نہ سانپ کو خوف رہا اور نہ مور کو تاب شکار۔ اردو میں ایسے خیالات عنقا ہیں اور مترجم نے قابل داد بلاغت سے انھیں نظم کیا ہے۔ ؎

دھوپ کی شدت سے یوں آتش بجان طاؤس ہیں
بازوئے زریں نہیں ہیں شعلہ فانوس ہیں

کس قدر جدت آمیز، انوکھا اور اچھوتا خیال ہے۔ اختصار نظم اس پر قند مکرر!

ٹھنڈ کچھ سوکھے ہوئے آتے ہیں صحرا میں نظر
چونچ کھولے جس پہ دم لیتی ہیں چڑیاں بیٹھ کر

کیسی تصویر کھینچ دی ہے! اسی کا نام شاعری ہے۔ شاعر کی نگاہ کس قدر جز رس ہے۔ جنگلی جھڑ بیریاں اور کروندے کے درخت بھی اس سے نہیں بچے۔ جن کی طرف اردو شاعر کبھی بھول کر بھی آنکھ نہیں اٹھاتا۔

عجب انداز سے بیلوں کو ہلاتی ہے نسیم
اور کروندے کے درختوں کو نچاتی ہے نسیم
بدن ہر اک پھول پہ ٹیسو کے برستی ہے بہار
سرخ جیسے کسی طوطے کی نکیلی منقار
پھول شاخوں پہ ہیں کھوئے ہوئے آغوش نشاط
بھونرے کنجوں میں ہیں سرمست مئے جوش نشاط

ان مثالوں سے ناظرین پر روشن ہوگیا ہوگا کہ ترجمہ میں کس قدر اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ اور روانی جو کسی اوریجنل نظم میں پائی جاتی ہے۔ یہاں اول سے آخر تک موجود ہے، اس امر کو زیادہ وضاحت سے دکھانے کے لیے شاعر کو کس حد تک ترجمہ میں کامیابی ہوئی ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ سنسکرت اشعار اور اس کا ترجمہ بالمقابل لکھے جاتے۔ مگر اردو میں سنسکرت کے سمجھنے والے بہت کم ہیں اور ان موشگافیوں سے کچھ حاصل نہیں۔

موسم گرما کی نظم کو مترجم نے کسی قدر مختصر کردیا ہے کیونکہ اس میں زیادہ ایسے جانوروں کا ذکر تھا جن کے نام سے بھی اردو ناظرین مانوس نہ ہوں گے۔ کالی داس کی قادر کلامی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ ایک ہی خیال کو بار بار مختلف پیرایہ سے ظاہر کرتا ہے۔ اور اس خیال کی تازگی میں فرق نہیں آتا۔ اردو جیسی کم مایہ زبان میں الفاظ کی یہ بہتات کہاں! ایسے خیالات چونکہ خوبصورتی سے نظم نہیں ہوسکتے تھے۔ اس لیے غالبًا اعادہ کے خوف سے مترجم نے انھیں نظر انداز کردیا ہے اور ہمارے خیال میں یہ معذوری ان کی نہیں بلکہ اردو زبان کی ہے۔

ان چند سطور پر ہم یہ مقدمہ ختم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اردو پبلک

اس مجموعہ کی وہی قدر کرے گی جس کا وہ اپنے محاسن کی بنا پر مستحق ہے۔ ممکن ہے اس مثال سے بعض دیگر شعراء کو اس رنگ میں طبع آزمائی کرنے کی جرات ہو۔ اگر ایسا ہوا تو ''اکسیر سخن'' کا دنیائے اردو میں آنا ایک مبارک اور قابل یادگار واقعہ ہوگا۔

پیارے لال شاکر کی کتاب
'اکسیر سخن' کا مقدمہ

کالی داس کی شاعری

یوں تو سنسکرت ادب کی آج تک تھاہ نہیں ملی۔ ایک ساگر ہے کہ جتنا ڈوبو اتنا ہی گہرا معلوم ہوتا ہے۔ مگر تین شعرا بہت مشہور و معروف ہیں۔ والمیکؔ، ویاسؔ، اور کالی داس۔ ان کی تصانیف ایک ایک دور کی جامع تاریخیں ہیں اور یہی ان کی شہرت کی بنیاد ہے۔ والمیکؔ سب سے متقدم تھے ان کے کلام میں فرض اور صداقت کا رنگ غالب ہے۔ ویاس جو ان کے بعد ہوئے معرفت اور محبت کی طرف جھکے۔ اور کالی داس نے حسن اور عشق کو اپنی فکر کی جولا نگاہ بنایا۔ ''رامائن'' والمیک کی اور مہا بھارت ویاس کی مقبول عام کتابیں ہیں اور یہ دونوں ہندو دھرم کا جزو بن گئی ہیں۔ مگر کالی داس کو ہم کچھ بھول سا گئے تھے۔ اور اگر انگریز علما اور مصنفین نے ہماری رہنمائی نہ کی ہوتی تو شاید ہم اب تک اس زندہ جاوید شاعر کو گوشۂ بے قدری میں پڑا رہنے دیتے۔ کالی داس کا اس وقت جو کچھ چرچا ہے یہ انگریزی تعلیم کی برکت ہے۔ کئی صدیوں کے بعد کالی داس کا ستارہ چمکا ہے۔ اور آج اس کے حالات، زمانہ، اور تصانیف پر انگریزی اخبارات اور رسائل میں بہت باتحقیق اور عالمانہ مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ ہندوستان اور یورپ میں یکساں سرگرمی سے اس کے حالات کی تفتیش کی جا رہی ہے گو ابھی تک تحقیق کے ساتھ سوانحی حالات دستیاب نہیں ہوئے۔

کالی داس کی شاعری چند لفظوں میں لطیف جذبات اور مرصع خیالات کی شاعری ہے۔ متقدم شعرا کے کلام میں ساری اور عمومیت کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ استعارے اور تشبیہات عام جذبات سچے مگر سادہ، طرز بیان سلیس، اور یہی وجہ ہے کہ عوام میں متقدمین کو جو مقبولیت حاصل ہوتی ہے اس پر متاخرین ہمیشہ رشک کیا کرتے ہیں کیونکہ ان کا کلام جسے ضروریات مذاق اور حالات زمانہ رنگین، لطیف اور پیچیدہ بنا دیتے ہیں عوام کی سمجھ سے باہر ہوتا ہے۔ مگر متاخرین میں تقلید، تصنع اور افلاس مضامین کی جو عام

کمزوری پائی جاتی ہے۔ اس سے کالی داس کا کلام بالکل پاک ہے۔ رنگینی اور لطافت کے ساتھ ان کے کلام میں وہی سلاست، وہی مضمون آفرینی اور وہی کثرت خیالات موجود ہے جو متقدم شعرا کے کلام میں پائی جاسکتی ہے۔ اس کا ذہن وقاد کسی خاص صنف یا رنگ میں قاصر نہیں۔ اس کی بزم آرائیاں نظامی کو شرمندہ کر دیتی ہیں۔ اور رزم کے میدان میں فردوسی کا اشہب فکر بھی ایسی جولانیاں نہیں دکھاتا، صرف میگھ دوت میں حسن و عشق،فرقت اور وصال کے جذبات اس قدر موجود ہیں جن پر کسی زبان کی مایۂ شاعری کو ناز ہوسکتا ہے۔ اس نظم کے ایک خیال پر اہل ذوق سلیم محو حیرت ہوجاتے ہیں پہلے دل و جگر پر ایک بامزہ اثر ہوتا ہے۔ اور پھر فوراً جذبات کی لطافت، خیال کی نوعیت، اور حسن بیان کو دیکھ کر حیرت ہوجاتی ہے۔ ہمارے اردو کے عشاق نے صبا کو نامہ بر بنایا۔ امیر نے اولاً یہ خدمت صبا کو سونپی اور داغ کو بھی اس سے زیادہ تیز رو اور بے نیاز و زبان کوئی قاصد نظر نہ آیا۔ دو صدیوں تک صبا نے یہ خدمت انجام دی اور اب بھی اس کا گلا نہ چھوڑا۔ مگر کالی داس نے ایک نیا قاصد ڈھونڈ نکالا۔ وہ میگھ یعنی ابر کو اپنا حدیث غم سناتا ہے۔ ایسی ہی جدتوں سے اس کا کلام مالا مال ہے۔

سنسکرت شعرا کی یہ خاص صفت ہے کہ وہ اپنے کلام میں مناظر قدرت کی خوب چاشنی دیتے ہیں۔ ان کے شاعرانہ خیالات سدا بہار پھولوں اور پتیوں سے سجے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کالی داس میں یہ صفت حد کمال کو پہنچ گئی ہے۔ برگ و گل کا جس حسن اسلوب اور ندرت سے اس نے استعمال کیا ہے وہ سنسکرت میں بھی کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ اس کی تشبیہات نئی نئی کونپلیں ہیں اور استعارات مہکتے ہوئے خوش رنگ پھول۔ یہ صحیح ہے کہ اردو اور فارسی کے شعرا نے بیل بوٹوں کا استعمال کیا ہے۔ مگر ان کے پھول پتے مرجھائے ہوئے بے رنگ و بے مزہ ہیں۔ ان کی بلند پروازی انھیں آسمان پر اڑا لے گئی اور وہاں زحل اور عطارد، زہرہ اور مشتری سے ان کا تعارف کرا دیا حتی کہ اب کسی فارسی قصیدہ کو سمجھنے کے لیے ہیئت اور فلکیات کا جاننا ضروری ہے۔ سنسکرت شاعری اس قدر بلند نہ اڑ سکی، مگر اس نے اسی دنیا کی ہر چیز کو خوب غور سے دیکھا بھالا۔ اور مطالعہ کیا وہ کسی مینار کی طرح بلند نہیں بلکہ ایک سبزہ زار کی طرح وسیع ہے جس میں ہرن کلولین کرتے ہیں۔ خوش رنگ طیور چہچہاتے ہیں، سبزہ لہلہاتا ہے

اور بلورین چشمے بہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ سنسکرت شاعری کو موجودات ثلاثہ سے یکساں دلچسپی ہے وہ جس دنیا میں پیدا ہوئی ہے اس دنیا کی ہر ایک شے سے مانوس ہے۔ اور یہ صرف شکنتلا ناٹک کا پہلا پارٹ پڑھنے سے اس خوبی سے واضح ہوجاتا ہے جو ضبط تحریر میں نہیں آسکتا۔ ہرن اور بھونرا، مادھوری اور کیتکی، کدم اور نیم، یہ سب ہمارے سامنے آتے ہیں بے جان اور بے حس چیزوں کی طرح نہیں۔ شاعر نے ان میں ایک جان ڈال دی ہے۔ وہ سب قدرت کی ہمدردی سے یکساں متصف معلوم ہوتے ہیں۔ اسی سین کو پڑھ کر مشہور شاعر گیتی پر وجد کا عالم ہوگیا تھا۔ اور وہ بھی محض انگریزی ترجمہ کے مطالعہ سے۔ اور اب اس امر کو واضح کرنے کے لیے زیادہ دلیلوں کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ سرور انگیز اثر جو سنسکرت شاعری ہمارے دلوں پر پیدا کرتی ہے۔ کسی دوسری زبان کی شاعری کے امکان سے باہر ہے۔ بالخصوص اردو شاعری کے جس کے مثال ان پودھوں سے دی جاسکتی ہے جو اکثر باغوں میں مصنوعی زندگی بسر کرتے نظر آتے ہیں۔ مرجھائے ہوئے پتے زرد رنگ سمٹی ہوئی شاخیں، نہ پھل نہ پھول، فارس کا پودا ہندوستان میں لگایا گیا۔ نہ وہ زمین، نہ وہ آب و ہوا، نہ دیکھنے سے آنکھوں کو تازگی ہوتی ہے نہ دل کو فرحت۔ جہاں تک تشبیہات اور منظر نگاری کا تعلق ہے اردو شاعری بڑی حد تک تصنع اور بے اصلیت کا ایک دفتر ہے۔ سنسکرت شعراء کے مناظر اور جذبات سب اسی سرزمین کی آب و گل سے خلق ہوئے ہیں۔ اور یہی ان کی تاثیر کا راز ہے۔ دیکھیے کالی داس برکھارت میں شہد کی مکھیوں کا شہد جمع کرنا کس لطافت سے دکھاتا ہے۔

تلاش شہد میں مکھیاں سبک پرواز
مگر مزاج میں یہ سادگی کے ہیں انداز
کہ ناچتے کہیں آتے ہیں جب نظر طاؤس
فضائے دشت میں پھیلائے بال و پر طاؤس
ترانے گاتی ہوئی جب قریب آتی ہے
کنول کے پھولوں کے دھوکے میں بیٹھ جاتی ہے
مہک رہی ہے ہوا کیتکی کے پھولوں سے
بسی ہوئی ہے صبا کیتکی کے پھولوں سے

ہر اک روش پہ ہے جمگھٹ پری جمالوں کا
عجب بناؤ ہے پھولوں کے گہنے والوں کا
چمن میں کرتی ہوئی صبح دم گل افشانی
لچک لچک کہ ہے پودوں کو دے رہی پانی
کہیں کدم کے درختوں پہ چھا رہی ہے بہار
ہرے ہرے کسی جانب ہیں نیم کے اشجار

سروسہی، شمشاد و صنوبر کے مقابلہ میں کدم اور نیم اور کیتکی کیسے مانوس معلوم ہوتے ہیں۔

قطع نظر ان شاعرانہ خوبیوں کے کالی داس نے فطرت انسانی کا بھی بڑی غائر اور دقیق نگاہوں سے مشاہدہ کیا تھا۔ انسانی طبائع کی نزنگیوں پر اسے پورا عبور تھا۔ کن حالات سے انسان کے دل میں کیسے جذبات اور خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اس نے حیرت انگیز واقعیت کے ساتھ دکھلائے ہیں۔ اس کے ڈرامے فطرت انسانی کے مرقع ہیں۔ جن کے اعضا کے تناسب رنگوں کی موزونیت اور خدوخال کی صفائی کی تعریف کانی طور پر نہیں کی جاسکتی۔ اور عشق کی گھاتیں اور محبت کے اشارے و کنائے تو اس نے ایسی نزاکت سے دکھائے ہیں جو وجدان صحیح کو بیخود اور سرشار کردیتے ہیں۔ اس رنگ میں نہ کوئی اس کا رقیب ہے نہ ہمسر وہ اس رنگ کا استاد ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی اس کا قلم اعتدال سے زیادہ شوخ ہوگیا ہے! کیونکہ وہ آزاد مشرب آدمی تھا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے مناکحت ہی کو انسانی محبت کا اعلیٰ ترین معیار قرار دیا ہے۔ میگھ دوت میں فرقت نصیب مکیش جس معشوق کی یاد میں تڑپا ہے وہ اس کی بیوی تھی۔ رتو سنگھار میں بھی جابجا اسی کے اشارے ہیں۔

وہ مہ وشیں جو بدلتی ہیں کروٹیں شب بھر   رلا رہی ہے لہو جن کو دوریٔ شوہر
برس رہی ہے اداسی اب ان کی صورت پر   جگر کی آگ قیامت ہے اک قیامت پر

کالی داس عام طور پر ہندوستان کا شیکسپیئر کہا جاتا ہے اور اس میں مطلق مبالغہ نہیں۔ دنیا میں صرف شیکسپیئر ہی ایسا شاعر ہے جس کا اس سے موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ دونوں ڈرامانویس ہیں دونوں فطرت انسانی کے مبصران کے خیالات، ان کی بندشیں، اکثر مقامات پر لڑ گئی ہیں۔ ایک ہی شاعرانہ دماغ قدرت کی جانب سے دونوں کو عطا ہوا

تھا۔ کسی شے کو جس نگاہ سے شیکسپیئر دیکھتا ہے اسی نگاہ سے کالی داس بھی اسے دیکھتا ہے۔ رنج و غم حسرت و انتقام، عشق و فراق میں انسان کے دل میں کیسے جذبات موجزن ہوتے ہیں، جس خوبی سے شیکسپیئر نے دکھائے ہیں اسی رنگینی کے ساتھ کالی داس نے بھی دکھائے ہیں۔ شیکسپیئر کے جتنے کیرکٹر ہیں وہ سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ہر ایک میں کوئی نہ کوئی امتیازی خصوصیت موجود ہے۔ کالی داس کے کیرکٹروں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ شیکسپیئر کے میکبتھ اتھیلو، رومیو، جولیٹ کی تصویروں کو کالی داس کے دشنیت، شکنتلا، پریم بدلا کی تصویروں کو مقابلہ میں رکھنے سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ ان دونوں شاعروں کو انسان کی خصلت کا کیسا علم تھا۔ شیکسپیئر اور کالی داس میں اگر کچھ فرق ہے تو یہ ہے کہ شیکسپیئر کو فطرت انسانی کے کرشمے دکھانے میں زیادہ ملکہ ہے اور کالی داس کو مناظر فطرت کی تصویر نگاری میں۔ شیکسپیئر کو انسانی طبائع میں جو رسائی تھی وہی کالی داس کو قدرت کے عجائبات میں تھی۔ اسی لیے شیکسپیئر کا کلام دقیق ہے۔ اور کالی داس کا رنگین، شیکسپیئر کو جس طرح اپنے مقدم اور موخر شعرا پر فضیلت ہے اسی طرح کالی داس کے کلام کی رنگینی اور لطافت سنسکرت میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔

کالی داس کی نظموں اور ناٹکوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فن شعر اور فن عراض کے علاوہ مختلف علوم و فنون میں مہارت تمام رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں جا بجا فلسفیانہ خیالات بکھرے پڑے ہوئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ فلسفہ سانکھ اور یوگ پر عبور رکھتے تھے اور شیو کے اوپاسک مگر خیال ان کا ویدانت کی طرف جھکا ہوا تھا۔ آتما اور پرماتما، روح اور جسم، مایا اور دنیا وغیرہ پیچیدہ روحانی مسئلوں سے انھوں نے دوران کلام میں بڑی آزادی کے ساتھ بحث کی ہے۔ علم ہیئت کا اس زمانہ میں بڑا چرچا تھا۔ اوجین اس علم کا اس زمانہ میں مرکز تھا، وہ آہ مہر جو نامور ہیئت دان ہوکر گزرا ہے کالی داس کے دوستوں میں تھا اور اس میں اب کوئی شک نہیں ہوسکتا کہ کالی داس کو اس صیغہ علم میں کمال حاصل تھا انھوں نے خود جوتش پر ایک معرکے کی کتاب لکھی ہے جو آج تک مروج ہے۔ ان کی جغرافی معلومات بھی بہت وسیع تھیں۔ انھوں نے ہندوستان کے ہر ایک گوشہ میں سفر کیا تھا۔ میگھ دوت میں ان کی جغرافیہ دانی کا کافی ثبوت ملتا ہے، جہاں کہیں بحری مناظر بیان کیے ہیں ان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ

کسی چشم دید نظارہ کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔ علوم نظری میں بھی انکی نگاہ باریک اور صحیح تھی۔ جوار بھاٹا، طوفان، چندر، اور سورج گہن وغیرہ قدرتی کرشموں کے انھوں نے جو تذکرے کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے متعلق انھیں وہی علم تھا جس پر آج کے ماہرین سائنس متحد ہیں۔ اور آئین فرماں روائی کے تو وہ گویا ایک دریا تھے، رگھوبنس میں اول سے آخر تک راجاؤں ہی کا ذکر ہے اس میں صدہا ایسے تلانذے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں آئین تاجداری سے پوری واقفیت تھی۔ راجہ کسے کہتے ہیں۔ اس کا کیا دھرم ہے۔ رعایا کے ساتھ اس کا کیسا برتاؤ ہونا چاہیے۔ رعایا کے اس پر کیا حقوق ہیں ان باتوں کو جیسا کچھ کالی داس سمجھے تھے شاید آج بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی وہ علم نہ ہوگا۔

الغرض کالی داس ایک جامع کمالات انسان، قادر الکلام شاعر اور بحر علوم تھا۔ اس کی دماغی وسعت پر ہم کو حیرت ہوتی ہے دنیائے تشبیہ میں دنیا کا کوئی شاعر اس سے آنکھیں نہیں ملا سکتا۔ اس کی تشبیہیں ایسی موزوں، ایسی برجستہ ایسی تصور انگیز ہیں کہ اگر انھیں شعر میں سے نکال دیجیے تو شعر بالکل بے مزہ اور بے رس ہوجاتا ہے۔ منظر قدرت کا کوئی ایسا کرشمہ نہیں جس سے اس نے تشبیہ اخذ نہ کی ہو۔ اگرچہ ہندوستان کو اس کے مولد ہونے کا فخر حاصل ہے مگر در اصل وہ ہندوستان کا نہیں بلکہ تمام دنیا کا شاعر ہے۔ ہندوستانیوں کو اس کے کلام سے جو لطف حاصل ہوسکتا ہے وہی کسی دوسرے ملک کے آدمی کو حاصل ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے دنیا ایک دفتر شاعری تھی جس چیز پر نگاہ ڈالی ہے اسے اپنی شاعری کا زیور بنالیا ہے۔ وید پران پر تاریخ، فلسفہ وغیرہ علوم جنھیں شعرا خشک سمجھتے ہیں اور جنھیں شاعری سے کوئی مناسبت نہیں بتلائی جاتی وہ کالی داس کے احاطۂ شاعری میں آکر کچھ او رہی رنگ روپ اختیار کرلیتے ہیں۔ موجودات عالم کو زیور شاعری سے آراستہ کرنے والا۔ ٹھنڈ درختوں، اور ویران کھنڈروں میں وہ لطف پیدا کرنے والا جو ہرے بھرے درختوں اور آراستہ و پیراستہ محلوں سے نہ حاصل ہوسکے، ایسا خدائے سخن دنیا میں دوسرا نہیں پیدا ہوا اور جب تک کیفیات شاعری کے قدردان، اور تماشائیان جلوہ گاہ حسن باقی رہیں گے اس وقت تک کالی داس کا نام قائم رہے گا۔ وہ سنسکرت شاعری کا بدر کامل ہے، اور جو شخص جتنا ہی شاعرانہ ذوق اور

وجدان صحیح رکھتا ہے وہ کالی داس کے کلام سے اتنا ہی لطف اٹھا سکتا ہے۔

کالی داس کی تصانیف جن کا اب تک پتہ چلا ہے تعداد میں سولہ ہیں مگر ان کی شہرت اور مقبولیت کا جن کتابوں پر دارومدار ہے وہ سات سے زیادہ نہیں اور ان ساتوں میں کوئی ایک کتاب اس کے بقائے دوام کے لیے کافی ہے۔ اس سبعہ سیارہ کے چار رکن چار شاعرانہ تصانیف ہیں: (۱) رگھوبنس (۲) کمار سنبھو (۳) میگھدوت اور (۴) رتو سنگھار۔ اور باقی تین وہ ڈرامے ہیں جنھوں نے نقادان فن کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ (۱) شکنتلا (۲) وکرم اروسی (۳) مالو کا گنی متر۔ مہذب دنیا میں ان تصانیف کی جو قدر و منزلت ہوئی ہے وہ شاید ہی کسی دوسرے شاعر کو نصیب ہوئی ہو۔ یورپ کے بیشتر زبانوں میں ان کا ترجمہ ہوجانا ان کی عام قبولیت کی زبردست دلیل ہے۔ ہندوستان کی تقریباً سب زبانوں میں بھی ان کے ترجمے ہوگئے ہیں۔ ڈراموں کی ہر دلعزیزی کی یہ کیفیت ہے کہ وہ یورپ اور امریکہ کے تھیٹروں میں کھیلے جاچکے ہیں اور کالی داس کی تصانیف سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنی تہذیب میں داخل ہوگئی ہے۔ آج ہندوستان کے مصور کالی داس کے کیرکٹروں اور منظروں کو کھینچنا اپنے کمال کا معراج سمجھتے ہیں۔ راجہ روی ورما کی تصویر ''شکنتلا پتر'' بجائے خود حسن اور عشق کی ایک دنیا ہے۔ جہاں قدرت نے لطف انگیز اور سرور افزا سامان درد و غم بہم کردیے ہیں ایسے ہی تخیلات اور مناظر سے کالی داس کا کلام بھرا ہوا ہے۔ ڈراموں میں اول دو کا ترجمہ اردو زبان میں بھی ہوگیا ہے۔ شکنتلا کا ترجمہ راجہ شیو پرشاد مرحوم نے کیا تھا، اور وکرم اروسی کا چند سال گزرے مولوی محمد عزیز مرزا صاحب نے۔ شکنتلا کا ترجمہ اصل سنسکرت سے کیا گیا ہے، اور اس لیے اصل کی لطافت کچھ باقی ہے وکرم اروسی غالبًا انگریزی سے اردو میں آئی ہے۔ اس لیے اصل لطافت نہ پیدا ہوسکی تاہم بسا غنیمت ہے۔ مگر چاروں نظموں میں سے ایک کا ترجمہ بھی اردو میں اب تک نہیں ہوا۔ اس تقصیر کی شکایت مسلمان ادیبوں سے نہیں۔ مگر ہندو حضرات کے لیے یہ بڑی ندامت کی بات ہے۔ کتنے ہی ہندو اصحاب ہیں جنھیں فن شعر سے ذوق ہے۔ جو غزلیں اور قصیدے لکھتے ہیں، اور گل و بلبل کے قضیوں میں سر کھپاتے ہیں۔ مگر اتنی توفیق یا جرأت نہیں ہوتی کہ سنسکرت شعرا کے کلام سے قوم اور زبان کو فیض پہنچائیں ، اردو شعر و سخن کا چرچا زیادہ تر کایستھوں

اور کشمیریوں میں ہے۔ اور یہ دونوں فرقے اب تک عموماً سنسکرت کے مطالعہ سے محترز ہیں۔ مگر اب چونکہ سنسکرت کی طرف رجحان ہونے لگا ہے اس سے امید کی جاتی ہے کہ شاید کچھ دنوں میں ہم رگھو بنس، میگھدوت اور کمار سنبھو کا اردو زبان میں مطالعہ کرسکیں ۔ رہا ''رتو سنگھار'' اس کا ترجمہ مسٹر شاکر کی مدد سے حضرت سرور مرحوم نے کیا ہے اور اکثر موسموں کی نظمیں زمانہ میں ہدیہ ناظرین ہوچکی ہیں۔[1]

ہم لکھ چکے ہیں کہ ''رتو سنگھار'' کالی داس کی چار اعلیٰ ترین نظموں کا ایک خاص رکن ہے۔ اس میں شاعر نے ہندوستان کے چھ موسموں کے مناظر اور تغیرات اور ان سے پیدا ہونے والے جذبات اور خیالات نہایت دلکش اسلوب سے بیان کیے ہیں۔ چونکہ اردو فارسی میں تین ہی موسم مانے گئے ہیں اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان چھوں موسموں کی یہاں تشریح کردی جائے۔

نمبر شمار	نام موسم	ہندی مہینے	انگریزی مہینے
۱	گریشم	جیٹھ۔اساڑھ	جون۔جولائی
۲	برکھا	ساون۔بھادو	اگست ۔ستمبر
۳	شرد	کنوار۔کاتک	اکتوبر۔نومبر
۴	ہیمنت	اگھن ۔ پوس	دسمبر۔ جنوری
۵	ششر	ماگھ۔ پھاگن	فروری۔ مارچ
۶	بسنت	چیت۔ بیساکھ	اپریل۔ مئی

اردو اور فارسی شعرا نے موسمی جذبات کو صرف اسی حد تک اپنے اشعار میں دخل

[1] مسٹر شاکر نے ان نظموں کے مجموعے کو اکسیر سخن کے نام سے اپنے نام سے شائع کیا ہے۔ زمانہ میں اشاعت کے لیے بھی یہ نظمیں ہم کو انھیں سے ملی تھیں اور ان کے آخر میں انھیں کا نام ثبت تھا۔ مگر بعد میں ہم کو تحقیقی طور پر ثابت ہوا کہ نظموں کا نثری ترجمہ مسٹر شاکر نے کیا ہے اور ان کو نظم کا جامہ سرور مرحوم نے پہنایا ہے۔ ہمارے پاس اس کا تحریری ثبوت ہے اس لیے منشی پریم چند نے اس مضمون میں نو سنگھار کے مترجم کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں ہم نے محض اپنے ذمہ داری پر ترمیم کردی ہے۔ یہ مضمون اکسیر سخن کے دیباچہ سے ماخوذ ہے۔ زمانہ بابت ۱۹۱۰ء میں تین نظمیں شائع ہوچکی ہیں۔ ایک موسم گرما پر دوسری موسم برسات پر اور تیسری بسنت رت پر۔

دیا ہے۔ جہاں تک بہار اور خزاں کا تعلق ہے حتی کہ بہار اور خزاں بھی استعارے ہیں ایام مسرت اور ایام غم کے لیے ہاں ابر سیاہ کو دیکھ کر کبھی کبھی پیر مغاں کی یاد آجاتی ہے۔

ساقیا مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد تند و پرشور، سیہ مست، زکہسار آمد

ہندوستان میں موسمی جذبات معاشرت میں داخل ہوگئے ہیں۔ ہمیشہ سے ان کا عملی اظہار ہوتا آیا ہے۔ برکھارت آئی اور گھروں میں جھولے پڑ گئے۔ ساون اور ملار کی تانیں گونجنے لگیں۔ نازنینوں نے ہاتھ پاؤں میں مہندی رچائی! جذبۂ درد محبت نے دلوں کو بے چین کرنا شروع کیا حتی کہ گلیوں اور بازاروں میں بارہ ماسے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ سنسکرت شعرا نے بسنت کو ''رت راج'' یا موسموں کا راجہ مانا ہے۔ درختوں میں نئی نئی کونپلیں نکلیں۔ آم کے بور کی مہک سے ہوا معطر ہوگئی۔ کھلیانوں میں خوشۂ زریں کے انبار لگ گئے۔ کوئل آم کی ڈالیوں پر بیٹھ کر کوکنے لگی۔ عشاق کو رونے کی سوجھی، شوق نے دلوں کو گدگدایا۔ معشوق اپنی بے نیازیوں کو بھول گئے۔ بسنت کی خوش آئند صدا کانوں میں آئی۔

آئی بسنت بہار۔ بالم گھر نہ آئے سکھی

کالی داس نے انھیں موسمی مناظر کو اپنے جادو طراز قلم سے کھینچا ہے اور اس خوبی سے کھینچا ہے کہ ہر ایک موسم کا سماں آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ خصوصاً بسنت رت کا بیان ایسا لطیف، ایسا واقعیت سے لبریز اور جذبات نازک سے اس قدر مرصع ہے کہ اس کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔

پھول کھلتے ہیں جو ٹیسو کے بیابانوں میں
جان پڑ جاتی ہے عشاق کے ارمانوں میں
آتے ہیں روپ پہ آموں کی اسی رت میں شجر
کوئل آتی ہے اسی رت میں درختوں پہ نظر
چھیڑتی ہے لب جو آکے ترانہ اپنا
سارے عالم کو سناتی ہے فسانہ اپنا

بھونرے پھولوں یہ ہیں سرمست مئے جوش بہار
جھومتے ہیں اثر بادِ صبا سے اشجار
چٹکیاں لیتی ہیں رہ رہ کے امنگیں دل میں
نشہ شوق کی اٹھتی ہیں ترنگیں دل میں

کالی داس کے دیگر تصانیف کی طرح رتو سنگھار کا ترجمہ بھی یورپ کی بیشتر زبانوں میں ہوگیا ہے۔ ہندی بھاشا میں لالہ سیتارام صاحب اور راجکمار بابو دیو کی نندن صاحب نے ان کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا بنگال کے مشہور مصور بابو اپندرو ناتھ ٹھاکر نے رتو سنگھار کے موسمی مناظر کی تصویریں کھینچی تھیں۔ جو بہت مقبول ہوئیں۔ نیز بمبئی کے مشہور ومعروف مصور مسٹر دھرندھر نے بھی رتو سنگھار کے متعلق چھ تصویریں کھینچی ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یورپین نقادان فن اس مختصر مگر دلآویز نظم کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مستند مورخ الفنسٹن کہتا ہے:

> ''ذکر جذبات کے ساتھ ساتھ یہ شاعر ان تمام کیفیات کی تصویر کھینچ دیتا ہے جو ان جذبات کے محرک ہوئے اور مناظر کی خوبیاں اور دل فریبیاں ایسے جادو کار الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ وہ شخص بھی جو ان پودوں اور جانوروں سے بیگانہ ہو ہندوستانی منظر کا خاکہ اپنے دل میں قائم کرسکتا ہے۔''

سر آمد مستشرقین مانیر ولیمس لکھتا ہے:

> '' اس نظم کا ایک شعر کسی نہ کسی ہندوستان منظر کی ایک مکمل اور جامع تصویر ہے۔''

نقادانِ فن کا خیال ہے کہ رتو سنگھار کالی داس کے سن شباب کی تصنیف ہے اور کئی وجوہ سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ شباب کا زمانہ عشق ومحبت اور عیش وعشرت کا زمانہ ہوتا ہے اس وقت تک غم کے کانٹے پہلو میں نہیں کھٹکتے اور زمانہ کی سرد مہریوں کا تجربہ نہیں ہوتا۔ نوجوان شاعر کا کلام یاس وحسرت، اور رنج ومصیبت کے جذبات سے خالی ہوتا ہے۔ شاعر کو محبت کی داستان وصال کی خوشیوں اور معشوق کے راز ونیاز سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ حسرت کا راگ گائے جب دل ہنستا ہو تو آنکھیں کیوں کر

روئیں۔ رتو سنگھار اول سے آخر تک جذبۂ الفت میں ڈوبا ہوا ہے ارمانوں کے دن ہیں مرادوں کی راتیں۔ وہ حرکت، وہ جوش، وہ بے تکلفی، وہ رنگینی، وہ تازگی، وہ چہل پہل، جو شباب کی خصوصیات ہیں۔ اس نظم میں اول سے آخر تک بھری ہوئی ہیں۔ حسینوں کے تذکروں سے شاعر کا جی نہیں بھرتا، کہیں ان کے گلوں کے گجروں کا بیان ہے کہیں ان کے حنا آلودہ ہاتھوں کا۔ شاعر نے ہر ایک موسم کو حسینوں کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ہر ایک خیال ایک جذبہ حتی کہ استعارے اور تلازمے حسینوں کی حسن سے سجے ہوئے ہیں یہ بھی نوجوان شاعر کی ایک خصوصیت ہے اسے ہر ایک جگہ عورت ہی سوجھتی ہے۔ نوجوان شاعر کے دل پر کوئی جادو اتنا اثر نہیں کرتا جتنا کہ جادو حسن حسین عورت ہی اس کے جذبات کو ابھارتی ہے۔ حسین عورت اس کی امیدوں کی ابتدا، اس کی آرزوں کی انتہا اور اس کی دلفریبیوں کا مخزن ہوتی ہے۔ المختصر رتو سنگھار ایک جوان نظم ہے، جوانی کی خوشیوں سے منور، جوانی کی محبت سے معطر اور جوانی کی امیدوں سے معمور۔

حضرت سرور کے علاوہ مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے اپنے رسالہ ''دلگداز'' میں رتو سنگھار کی دو تین رتوں کا ترجمہ نثر میں کیا تھا۔ جون ۱۹۱۴ء کے دلگداز میں انھوں نے اس نظم کے متعلق ان الفاظ میں اپنا خیال ظاہر کیا ہے ''ہندوستان کے شیکسپیئر کالی داس نے رتو سنگھار کے نام سے چھ نظمیں چھ موسموں کے بیان میں لکھی ہیں، جن میں خاص ہندوستان کی یہ رُتیں اس خوبی اور لطف کے ساتھ دکھائی ہیں کہ پڑھنے سے موسمی کیفیت کی تصویریں آنکھوں میں پھر جاتی ہیں۔ ان مضامین میں نئی تشبیہیں نئے خیالات اور نئی بندشیں ہیں جو اس لٹریچر کے لیے جس کا نشو و نما ہندوستان میں ہوا۔ انگریزی اور فارسی لٹریچر کے طرز انشا سے زیادہ موزوں اور پر اثر ہیں۔'' اصل نظم میں کالی داس کی رنگین بیانی بعض اوقات دائرہ اعتدال سے متجاوز ہوگئی ہے۔ پھل جب زیادہ میٹھا ہوجاتا ہے تو اس میں کیڑے پڑ جاتے ہیں مگر مترجم نے ان مقامات کو جیسا کہ اس کا اخلاقی فرض تھا نظر انداز کردیا ہے۔ کاش شعراء اردو مولانا شرؔر کی طرح سمجھتے کہ ان مضامین کی نئی تشبیہیں نئے خیالات اور نئی بندشیں اردو لٹریچر کے لیے انگریزی اور فارسی لٹریچر کے طرز انشا سے زیادہ موزوں ہیں تو آج اردو شاعری اس قدر مطعون اور منکوت نہ ہوتی۔ مگر مولانا شرر نے اس نظم کا ترجمہ نثر ہی میں لکھنے پر قناعت کی۔

حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ شاعرانہ خیالات کچھ نظم ہی میں مزہ دیتی ہیں نثر کے قالب میں آ کر ان کی وہی کیفیت ہوجاتی ہے۔ جو مئے خوشگوار کی حلقۂ زاہدمیں یا کسی مہ وش نازنین کی لباس برہنگی میں۔ بہرحال کالی داس کے خیالات کو اردو میں نظم کرنے کا کام جوانمرگ سرور مرحوم کے ذمہ رہا اور اس کو انھوں نے جس شاندار کامیابی کے ساتھ انجام دیا ہے اس کی تمام اردو پبلک کو قدر کرنی چاہیے۔ دراصل شاعر نے ترجمہ میں آمد کا لطف پیدا کردیا ہے۔ سلاست اس مجموعہ کی بہترین صفت ہے۔ سنسکرت کے پیچیدہ اور عمیق جذبات کونظم کرنے میں سلاست کوملحوظ رکھنا اور اس میں کامیاب ہوجانا شاعر کی پختہ مشقی اور قوت نظم کی دلیل ہے۔

تھے برنگ دیدۂ عشاق جو چشمے پر آب
اڑ رہی ہے خاک انھیں صورت موج سراب
سطح گردوں کو سمجھ کر چشمہ آب رواں
تک رہے ہیں دیدہ حسرت سے ہوکر نیم جان

کتنا سچا اور نیچرل خیال ہے اور کتنی خوبصورتی سے نظم کیا گیا!

دھوپ سے ہیں ایسے گھبرائے ہوئے مار سیاہ
بازوئے طاؤس کے سایہ میں لیتے ہیں پناہ

مور سانپ کا دشمن ہے۔ مگر شدت گرمی نے ان کے حواس اس درجہ مضمحل کردیے ہیں کہ نہ سانپ کو خوف رہا اور نہ مور کو تاب شکار۔ اردو میں ایسے خیالات عنقا ہیں اور مترجم نے قابل داد بلاغت سے انھیں نظم کیا ہے۔ ؎

دھوپ کی شدت سے یوں آتش بجان طاؤس ہیں
بازوئے زریں نہیں ہیں شعلہ فانوس ہیں

کس قدر جدت آمیز، انوکھا اور اچھوتا خیال ہے۔ اختصار نظم اس پر قند مکرر!

ٹھنڈ کچھ سوکھے ہوئے آتے ہیں صحرا میں نظر
چونچ کھولے جس پہ دم لیتی ہیں چڑیاں بیٹھ کر

کیسی تصویر کھینچ دی ہے! اسی کا نام شاعری ہے۔ شاعر کی نگاہ کس قدر جز رس ہے۔ جنگلی جھڑ بیریاں اور کروندے کے درخت بھی اس سے نہیں بچے۔ جن کی طرف

اردو شاعر کبھی بھول کر بھی آنکھ نہیں اٹھاتا۔

عجب انداز سے بیلوں کو ہلاتی ہے نسیم
اور کروندے کے درختوں کو نچاتی ہے نسیم
بدن ہر اک پھول پہ ٹیسو کے برستی ہے بہار
سرخ جیسے کسی طوطے کی نکیلی منقار
پھول شاخوں پہ ہیں کھوئے ہوئے آغوش نشاط
بھونرے کنجوں میں ہیں سرمست مئے جوش نشاط

ان مثالوں سے ناظرین پر روشن ہوگیا ہوگا کہ ترجمہ میں کس قدر اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ اور روانی جو کسی اوریجنل نظم میں پائی جاتی ہے۔ یہاں اول سے آخر تک موجود ہے، اس امر کو زیادہ وضاحت سے دکھانے کے لیے شاعر کو کس حد تک ترجمہ میں کامیابی ہوئی ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ سنسکرت اشعار اور اس کا ترجمہ بالمقابل لکھے جاتے۔ مگر اردو میں سنسکرت کے سمجھنے والے بہت کم ہیں اور ان موشگافیوں سے کچھ حاصل نہیں۔ موسم گرما کی نظم کو مترجم نے کسی قدر مختصر کردیا ہے کیونکہ اس میں زیادہ ایسے جانوروں کا ذکر تھا جن کے نام سے بھی اردو ناظرین مانوس نہ ہوں گے۔ کالی داس کی قادر کلامی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ ایک ہی خیال کو بار بار مختلف پیرایہ سے ظاہر کرتا ہے۔ اور اس خیال کی تازگی میں فرق نہیں آتا۔ اردو جیسی کم مایہ زبان میں الفاظ کی یہ بہتات کہاں! ایسے خیالات چونکہ خوبصورتی سے نظم نہیں ہوسکتے تھے۔ اس لیے غالبًا اعادہ کے خوف سے مترجم نے انھیں نظر انداز کردیا ہے اور ہمارے خیال میں یہ معذوری ان کی نہیں بلکہ اردو زبان کی ہے۔

''زمانہ'' اگست ۱۹۱۴ء

کملا

کملا: یہ ایک ڈرامہ ہے جس میں صرف اتنی خصوصیت ہے کہ وہ برج نرائن چکبست لکھنوی کے قلم سے نکلا ہے۔ نئی تہذیب اور پرانی قدامت پرستی کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ اور دونوں ہی کے تاریک پہلو دکھائے گئے ہیں۔ ایک ٹھاکر کا لڑکا ولایت سے بیرسٹر ہوکر آتا ہے اور اپنے گھر میں نئے خیالات رائج کرتا ہے۔ بوڑھے ٹھاکر اس پر بگڑتے ہیں اور بار بار اپنی دہکانی بھاشا میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ کتاب میں صرف یہی بوڑھا ایک دلچسپ شخص ہے جس کی ٹھیٹھ بولی پر ہنسی روکنا مشکل ہے اس کے سوا اور کوئی کیریکٹر توجہ کے قابل نہیں۔ زبان میں بھی ڈراما کے جذبات نہیں ہیں۔ غیر معمولی طور پر خشک اور بے مزہ ہے۔ ہم کو حضرت چکبست سے اس سے بدرجہا بہتر امید تھی۔ کیا یہاں یہ نیا مسئلہ پیدا ہوگا کہ شاعر ڈرامیٹیسٹ نہیں بن سکتا۔

'زمانہ' نومبر ۱۹۱۵ء

---

۱ یہ لفظ اصل خط میں غالباً لکھنے سے رہ گیا ہے۔

سرورؔ اور شاکرؔ کے خطوط

(اکسیر سخن کے بارے میں)

اگست ۱۹۱۴ء کے زمانہ میں ادبیات کے ذیل میں کالی داس کی مشہور تصنیف رِتو سنگھار کے اردو ترجمے کا (جسے اکسیر سخن کے نام سے مسٹر پی ایل شاکر میرٹھی نے شائع کیا ہے) تمہیدی مضمون نقل کرتے ہوئے ہم نے یہ لکھا تھا کہ گو اکسیر سخن کی چھ نظموں میں سے تین نظمیں ۱۹۱۰ء رسالہ زمانہ میں حضرت شاکر کے نام سے ہدیہ ناظرین زمانہ کی گئی تھیں۔ لیکن بعد میں ہم کو تحقیقی طور پر معلوم ہوگیا کہ ان نظموں کا صرف نثری ترجمہ ہی مسٹر شاکر نے کیا ہے۔ اور نظم کا جامہ در اصل سرور مرحوم نے پہنایا ہے۔ اس بیان کی تردید کرنے کا اگر کسی کو حق تھا تو خود مسٹر شاکر کو، لیکن انھوں نے کسی مصلحت سے ہم سے کوئی جواب طلب نہیں فرمایا۔ البتہ الناظر بابت دسمبر ۱۹۱۴ء میں ان کی طرف سے ایک صاحب ''ابو الرشاد'' نے ''مۓ دو آتشہ'' کے عنوان سے اکسیر سخن پر ایک طولانی مضمون لکھا ہے جس کے دوران میں انھوں نے ہمارے نوٹ مذکورۂ بالا پر نہ صرف اعتراض ہی کیا ہے۔ بلکہ ہم سے کوئی ثبوت طلب کیے بغیر محض سطحی دلائل پر اسے ''معاصرانہ حسد و انتقام'' اور ذاتی ''کدر'' کا نتیجہ قرار دے کر غلط ثابت کرنا چاہا ہے۔ میں اپنی دلی صفائی کے متعلق کچھ نہ کہوں گا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ایسی کوئی وجہ موجود نہیں ہے جس سے مجھے شاکر صاحب سے حسد یا انتقام کا خیال ہو۔

لیکن اکسیر سخن کے بارے میں ہمارے بیان کے متعلق چونکہ بحث چھڑ گئی ہے۔ اس لیے ہم ناظرین زمانہ کے سامنے اس ثبوت کو بجنسہ پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ جس کا ہم نے زمانہ اگست ۱۹۱۴ء میں ذکر کیا تھا۔ یہ ثبوت در اصل خود مسٹر شاکر کے خطوط سے ملتا ہے جو انھوں نے ۱۹۰۵ء و ۱۹۱۰ء میں سرور مرحوم کے پاس بھیجے تھے۔

اور جو ان کی وفات کے بعد ۱۹۱۱ء میں ان کے ورثاء سے میرے ہاتھ لگے۔ در حقیقت سرور مرحوم کی حیات ہی میں مجھ کو خود ان ہی سے ان نظموں کی تصنیف کے متعلق اصلی حالات معلوم ہوگئے تھے۔ لیکن سرور نے اپنی زندگی میں اس راز کی افشا کی مجھے اجازت نہیں دی اور اس لیے میں خاموش رہا۔ یہ تو مجھے معلوم ہی تھا کہ جناب نظر کی طرح حضرت سرور کی بدولت بھی بعض اصحاب شاعر بنے ہوئے ہیں۔ لیکن ابتدا میں مجھے صحیح طور پر معلوم نہ تھا کہ کالی داس کی یہ نظمیں بھی جن کے ترجمہ کا فخر شاکر صاحب نے حاصل کرنا چاہا تھا اور اصل سرور کی طبع وقاد کا نتیجہ ہیں۔ اس کا علم مجھے سب سے پہلے محض ایک اتفاقیہ واقعہ سے ہوا جس کا بیان یہاں پر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ زمانہ دسمبر ۱۹۰۹ء میں شردرُت کا ترجمہ ہدیہ ناظرین ہوا اور جنوری ۱۹۱۰ء کے پرچے میں اسی سلسلے کی دوسری نظم ہیمنت کا ترجمہ شائع ہوا۔ اس نظم میں اٹھارہ بند تھے جو چھ چھ بند کے حساب سے تین علیٰحدہ علیٰحدہ اوراق پر لکھے ہوئے آئے تھے۔ اتفاق سے درمیان کا ایک ورق یا تو لفافہ ہی میں رہ گیا یا کسی اور طرح غائب ہوگیا اور نظم کے اول اور آخر کے صرف بارہ بند ہی درج رسالہ ہوئے۔ زمانہ بابت جنوری ۱۹۱۰ء کے شائع ہوتے ہی اس سہو کے متعلق جس کی مجھے مطلق خبر نہ تھی۔ سب سے پہلے مجھے سرور صاحب نے لکھا۔ سرور صاحب ان دنوں اپنے وطن جہان آباد ضلع پیلی بھیت میں تھے۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ سرورؔ صاحب بعض صاحبوں کے لیے نظمیں کہا کرتے ہیں۔ اس لیے معاً یہی خیال گذرا کہ یہ نظمیں بھی انھیں کی ہیں۔ اس وقت مجھے صحیح یاد نہیں لیکن جہاں تک خیال ہوتا ہے اس پرچے کی اشاعت کے بعد سرور صاحب کانپور آگئے۔ کیونکہ وہ اکثر ہولی کے زمانے میں میرے پاس کانپور آجایا کرتے تھے۔ بہر نوع جب ملاقات ہوئی تو مجھے اپنے خیال کی تصدیق خود سرورؔ صاحب سے ہوگئی۔ لیکن انھوں نے مجھے یہ کہہ کر آج کل میری بسر اوقات انھیں کاموں پر رہ گئی ہے مجھ سے اس واقعہ کو کم سے کم کچھ عرصے تک پوشیدہ رکھنے کا وعدہ لے لیا۔ تاہم میرا جی نہ مانا اور میں نے اپریل یا مئی میں شاکر صاحب کو ان نظموں کے ترجمے پر مبارکباد دیتے ہوئے شاید کسی نہ کسی طرح یہ بھی جتا دیا کہ میں اصلیت سے بالکل ناواقف نہیں ہوں۔ میری تحریر کی نقل اس وقت میرے سامنے نہیں ہے لیکن شاکر صاحب نے اس کا

جو جواب لکھا وہ ہدیۂ ناظرین ہے۔ ۱۵ر مئی ۱۹۱۰ء کے خط میں الٰہ آباد سے وہ لکھتے ہیں:

جناب مکرمی تسلیم!

کارڈ ملا، مشکور ہوں، آپ نے نظم[1] کو بے حد پسند فرمایا ہے۔ ڈبل شکریہ ادا کرتا ہوں۔ سرور صاحب کا رنگ بھلا میں کیا اڑا سکتا ہوں۔ البتہ ان کے مشورہ نے میرے رنگ سخن کو چمکا دیا ہے۔ براہ کرم اگر (نظم پر) نوٹ لکھیں تو اس میں اس قسم کی داد نہ دیجیے گا۔ کیونکہ اس سے تقلید کا دھبہ لگے گا...

خاکسار پیارے لال شاکر

سرور صاحب کی زندگی میں تو میں ان کے پاس خاطر سے اس کی حقیقت کو ظاہر نہ کرسکا۔ ان کے بعد تحریری ثبوت کے بغیر میں کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ اس کے دستیاب ہونے میں کچھ وقفہ گزرا اور اس عرصہ میں ادیب کی ایڈیٹری شاکر صاحب کے سپرد ہوگئی۔ اور میں نے قصداً اس وقت اس راز کے اظہار کو نامناسب سمجھا۔ کیونکہ اگر ابو الرشاد صاحب اب اس وقت اس راست بیانی کو ''معاصرانہ حسد'' و ''ذاتی تکدر'' پر محمول فرماتے ہیں تو اس وقت نہ صرف ان کا بلکہ اور بہت سے تنگ خیال حضرات کا بھی ایسا ہی خیال ہوسکتا تھا۔ بہرحال میں نے اس بحث کو اکسیر سخن کی اشاعت ہی پر اٹھا رکھا۔ لیکن شاکر صاحب نے اس کی اشاعت مجھ سے پوشیدہ رکھی۔ کیونکہ نہ تو انھوں نے یہ کتاب زمانہ کو ریویو کے لیے ارسال فرمائی اور نہ کسی اور ہی ذریعہ سے مجھے اس کی طبع ہونے کا حال اگست ۱۹۱۴ء سے پہلے معلوم ہوسکا۔ غرض اکسیر سخن کی اشاعت کے بعد جو وقفہ گزرا محض لاعلمی میں گزرا۔ لیکن اس کی ذمہ داری بھی در اصل مسٹر شاکر ہی پر ہے۔

ابو الرشاد صاحب کے دو اور اعتراضات ہیں وہ لکھتے ہیں کہ اگر :

''راست بازی اور صفائی قلب کے ساتھ نگم صاحب اس تحریری ثبوت کے بہم پہنچنے پر جس سے ان کو تحقیقی طور پر ثابت ہوگیا کہ

---

[1] غالباً برکھارت مراد ہے جو زمانہ جولائی ۱۹۱۰ء میں چھپی

سرور نے یہ نظمیں ترجمہ کی ہیں۔ مسٹر شاکر سے اس بارے میں دریافت کرلیتے اور قابل تشفی جواب نہ پاکر پبلک کو اصلیت سے مطلع فرما دیتے تو بمقابلہ اس پیچیدہ کار روائی کے زیادہ مناسب ہوتا۔"

ہم در اصل اپنے ثبوت کو اس قدر زبردست سمجھتے ہیں کہ ہم نے اس کے متعلق شاکر صاحب سے استفسار کی ضرورت کبھی محسوس ہی نہیں کی۔ لیکن کیا ہم مسٹر ابو الرشاد صاحب سے انھیں کے الفاظ میں دریافت نہیں کرسکتے ہیں کہ "اگر راست بازی اور صفائی قلب کے ساتھ ابو الرشاد صاحب ہمارے مختصر نوٹ کو کافی نہ سمجھتے تھے تو ہم سے وہ تحریری ثبوت طلب فرما لیتے جس کا ہم نے اپنے نوٹ میں ذکر کردیا تھا تو یہ بمقابلہ اس پیچیدہ کارروائی کے جو انھوں نے شاکر صاحب کی حمایت میں مدعی سست گواہ چست کے مصداق اختیار کی بدرجہا بہتر و مناسب ہوتا۔" اس ثبوت کے متعلق شاکر صاحب نے ہم سے کچھ دریافت نہیں کیا۔ لیکن ان کی طرف سے ابو الرشاد صاحب نے حق رفاقت ادا کرنے کی کوشش کی۔ مگر اب شاکر صاحب ایسے دوستوں سے پناہ مانگیں تو بیجا نہ ہو جو نفس معاملہ کو سمجھے بغیر جو کچھ چاہتے ہیں لکھ ڈالتے ہیں۔ کیا حقیقت حال کے جستجو کی خواہش محض ہم سے وہ تحریری ثبوت طلب کرنے سے جس کا ہم نے اپنے نوٹ میں ذکر کیا تھا۔ پوری نہ ہوسکتی تھی؟ معلوم نہیں کہ ذاتیات کی بحث سے ابو الرشاد صاحب نے کون سا فائدہ سوچا تھا؟ اور ثبوت دیکھے بغیر اس طمطراق کے ساتھ اس کی تردید و تحقیر کی ان کو کیا ضرورت تھی؟

دوسرا اعتراض ابو الرشاد صاحب نے یہ کیا ہے کہ ہم نے مسٹر پریم چند کے تحریر میں محض اپنی ذمہ داری پر کیوں ترمیم کردی؟ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہم کو ترمیم کا کوئی حق نہ تھا تو ابو الرشاد صاحب کو بھی اس پر اعتراض کا کوئی موقع نہیں خصوصاً جبکہ خود مسٹر پریم چند نے اس ترمیم سے اتفاق کیا ہے۔ جب ہم نے مسٹر شاکر کے اصل خطوط جو ہمارے پاس موجود ہیں اور جن کی نقلیں درج ذیل ہیں ان کے پاس معہ "الناظر" دسمبر ۱۹۱۴ء کے بغرض ملاحظہ بھیجے تو انھوں نے ہماری ترمیم سے اتفاق کلی ظاہر کیا۔ اور لکھا کہ "کاش مجھے پہلے اس کا علم ہوتا تو میں ہرگز یہ دیباچہ لکھنے کے لیے قلم نہ اٹھاتا۔"

ہم مسٹر پریم چند کے خط کو گذشتہ نمبر میں بجنسہٖ شائع کر چکے ہیں ، اب ہم اپنے وعدہ کے بموجب ان شہادتوں کو درج کیے دیتے ہیں۔ جن پر ہمارا دعویٰ مبنی ہے۔ ان خطوط سے جو سب خود مسٹر شاکر کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس اصلیت پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ درحقیقت شاکر صاحب کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف اکسیر سخن ہی کی نظمیں نہیں بلکہ بہت سی اور نظمیں بھی جو شاکر صاحب کے نام سے ملک کے اردو رسالوں میں شائع ہوچکی ہیں اور جن کی بابت تحسین کا خراج مسٹر موصوف لے چکے ہیں وہ در اصل سب سرورؔ ہی کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ اور ان کے لیے تحسین و تعریف دراصل سرور ہی کا حصہ ہے۔

دیا نراین نگم

محلہ کٹرہ، الٰہ آباد (سرور مرحوم کے نام مسٹر پیارے لال شاکر میرٹھی کے چند خطوط)

۲۷/ جون ۱۹۰۹ء

مکرمی جناب سرور صاحب۔ تسلیم !

میں امید کرتا ہوں کہ میرا گذشتہ خط[1] آپ کو مل گیا ہوگا ۔ مگر میں نے آپ سے یہ درخواست کی تھی کہ رسید بواپسی ڈاک ارسال فرما دیجیے گا۔ تا کہ اطمینان ہوجائے۔ مگر آپ نے اس پر مطلق خیال نہ فرمایا۔

فرمایئے ان نظموں[2] کے بارے میں کیا رائے ہے۔اگر کوئی ایسا مضمون ہو جس پر آپ کی طبیعت مائل نہ ہوسکے تو چنداں ضرورت نہیں کہ آپ سر مغزن کریں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ نظمیں نہایت دلکش اور پرزور ہوں۔ (What I Love for) بہت عمدہ نظم ہے امید ہے کہ آپ نے اس کو ضرور پسند فرمایا ہوگا۔

اس وقت دو نظموں کا مصالحہ اور ارسال خدمت کرتا ہوں:

(۱) کسینبکا۔ مشہور انگریزی نظم ہے۔ اغلب ہے کہ اردو میں اس کا ترجمہ بھی کیا گیا ہو، مگر میری نظر سے نہیں گزرا۔ امید ہے کہ اردو نظم انگریزی نظم سے کسی طرح کم

---

[1] اس خط کے ساتھ شاکر صاحب نے کئی انگریزی نظمیں بغرض ترجمہ نظم سرورؔ صاحب کے پاس بھیجی تھیں۔ ا۔ز [2] سرورؔ صاحب نے بعض صاحبوں سے اس بارہ میں رنج اٹھایا تھا۔ یعنی بعض حضرات نے کام تو ان سے لے لیا تھا۔ لیکن معاوضہ دینے کے وقت اپنے معاہدہ پر قائم نہ رہے۔ ا۔ز

نہ ہوگی۔ آپ بالکل ترجمہ پر اکتفا نہ فرمایئے گا۔ بلکہ انگریزی خیالات کو اردو جامہ پہنا کر خاتمہ پر خود نصیحت اخذ کیجیے گا۔ گویا نظم میں انگریزی خیالات کی صرف جھلک باقی رہے۔ یعنی ہندوستانی مذاق بھی قائم رہے۔

(۲) رانڈ کا چرخہ[1] سرخی نے تو غالباً آپ کو بھی پھڑکا دیا ہوگا۔ اس کا نثر میں خاکہ ارسال کر رہا ہوں۔ یہ ایسا مضمون ہے کہ آج تک کوئی نظم اس پر نہیں کہی گئی۔

کالی داس سنسکرت کے مشہور ملک الشعرا کی چند نظموں کا اردو ترجمہ نثر موجود ہے۔ اب جب آپ کی طرف سے سلسلہ جاری ہو تو ادھر سے برابر مصالحہ ارسال ہوتا رہے۔ آپ کسی طرح خیال نہ فرمایئے۔ انشاء اللہ تعالیٰ میرے ساتھ معاملہ کرنے میں آپ کو میری ذات سے کبھی رنج نہ پہنچے گا۔ اور حتی الامکان میں ہر طرح سے آپ کی خدمت کرنے کو تیار رہوں گا۔

(۱) گرو گوبند سنگھ کے لڑکوں کا استقلال، اور (۲) 'میں کیوں زندہ ہوں' ان دونوں نظموں کا انتظار کر رہا ہوں۔ میرے پاس دلچسپ مضامین علاوہ کالی داس کی نظموں کے تیار ہیں۔ چند ایک سرخیاں یہ ہیں۔

(۱) میری ماں کی قبر (۲) آسمانی گھر،(۳) مداد بیکساں (۴) آج (۵)خاتمہ بالخیر، شروع کے تینوں عنوان انگریزی نظم ہیں۔ ''آج'' اور ''خاتمہ بالخیر'' نثر ہیں۔ مگر انگریزی خیالات ان میں موجود ہیں۔ خصوصاً خاتمہ بالخیر تو انگریزی ہی مضمون کا ترجمہ ہے۔ مگر نہایت دلچسپ، اب آپ کے جواب کا بے حد انتظار ہے۔ یہ واپسی تحریر فرمایئے۔

والسلام

خاکسار پیارے لال شاکر

(۲)

(یہ کارڈ ہے جس پر کوئی تاریخ نہیں ہے لیکن پتہ کی جانب ڈاکخانہ و روانگی) الٰہ آباد۔ ایم ایس کی ۲۴/اگست ۱۹۰۹ء کی مہر لگی ہوئی ہے)

جناب مکرم تسلیم!

---

[1] سرور صاحب نے اس مضمون پر جو نظم لکھی اس کا مسودہ سرور صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہمارے پاس موجود ہے۔

کارڈ لکھ کر رکھ دیا تھا اور تاکید کردی تھی کہ ڈاکخانہ میں ڈلوادیئے جائیں۔ مگر مجھے کسی کار ضروری کی وجہ سے اسی دن کانپور جانا پڑ گیا۔ مجھے سخت افسوس ہوا، کل واپس آیا تو آج ارسال خدمت ہیں۔ امید کہ آپ معاف فرمائیں گے۔ نظمیں جو تیار ہیں جلد ارسال فرمایئے۔ میں چند خاص مضامین ارسال خدمت کروں گا۔ اور چونکہ وہ کسی قدر طول ہیں اس لیے اجرت میں بھی عذر کا اضافہ۔ اس وقت مجھے مطلق فرصت نہیں مفصل دوسرے وقت لکھوں گا...

خاکسار شاکر میرٹھی

(۳)

۴رستمبر ۱۹۰۹ء

الٰہ آباد مکرمی جناب سرور زاد لطفہ

تسلیم: میں نے دو عدد لفافہ ویک کارڈ معہ منی آرڈر ۱۵ر ارسال خدمت کیے۔ مگر ایک کا بھی ہنوز جواب وصول نہیں ہوا۔ تشویش ہے، خدا کرے آپ کی (طبیعت[۱]) ناساز نہ ہو۔ بہ واپسی اپنے حالات سے مطلع فرمایئے۔

''آنے والی گھڑی'' اور ''خاتمہ'' کا انتظار ہے۔ امید کہ جلد ارسال فرمایئے گا۔

کالی داس کی نظموں کے ترجمہ کے باب میں کیا رائے ہے۔ میرے خیال میں آپ نے اس سلسلہ کو پسند تو ضرور کیا ہوگا۔ مجھے بے حد محنت صرف کرنا پڑی ہے۔ ابھی تین نظموں کا ترجمہ کرنا باقی ہے۔ اس میں بھی ابھی بہت محنت ہوگی۔

ملٹن (تاج الشعرائے انگلستان) کی ایک مشہور و معروف نظم ''پیرے ڈائز لاسٹ'' یعنی وہ بہشت جو ہاتھ سے جاتا رہا ہو۔ میں نے اس کا مختصر سا خلاصہ کیا ہے جو شاید کالی داس کی نظم سے کم ہوگا وہ میں آپ کو کسی وقت ارسال کروں گا۔ اور اسی وقت اس کے متعلق کچھ تحریر کروں گا۔

بہرکیف آپ جواب جلد عنایت فرمایئے تاکہ اطمینان ہو۔ کہیں مبلغات کی روانگی میں جو غیر معمولی تاخیر ہوئی اس سے تو آپ بددل نہیں ہوگئے۔ اس کا آپ ہرگز خیال نہ فرمایئے۔ نیاز مند سے آپ کو کبھی مبلغات کے بارے میں شکوہ شکایت کا

۱۔ یہ لفظ اصل خط میں غالباً لکھنے سے رہ گیا ہے۔

موقع نہ ملے گا۔ اتفاقیہ حادثات کبھی کبھی آپڑتے ہیں۔ ہمیشہ نہیں، آپ مطلق اس کو میری سستی و غفلت پر محمول نہ فرمائیں۔ میں اپنی ضرورت کے مطابق ہی آپ کی ضروریات کا خیال کرتا ہوں۔ اور خصوصاً اس صورت میں جبکہ وہ آپ کی مشقت کا حق ہو امید ہے کہ آپ اسی وقت نہیں بلکہ آیندہ بھی میری طرف سے اپنے دل میں میل نہیں آنے دیں گے۔

اگر آپ برائے کسی عمدہ مسلسل نظم کا ترجمہ کرنا چاہیں اور میں اس میں آپ کی کچھ مدد کرسکتا ہوں تو اس کے لیے بدل و جان تیار ہوں۔ صرف عندیہ سے اطلاع دیجیے۔ میں کوشش میں کوئی دقیقہ اپنی طرف سے نہ اٹھا رکھوں گا۔

مفصل جواب سے شاد فرمایئے۔ کالی داس کی نظموں کے بارے میں آپ کی رائے کا ازحد منتظر ہوں۔ ''آنے والی گھڑی'' اور ''خاتمہ'' کا بھی بے دلی کے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔ امید کہ مزاج عالی بخیریت ہوگا۔ زیادہ نیاز۔

خاکسار

پیارے لال شاکر

(۴)

۱۷/اکتوبر ۱۹۰۹ء

مکرمی جناب سرور زاد لطفہ

تسلیم!

کل آپ کا کارڈ ملا۔ افسوس ہوا کہ آپ کی طبیعت ناساز تھی[1]۔ خدا تعالیٰ سے امید ہے کہ اب آپ اچھے ہوں گے۔

آنے والی گھڑی کا تو نہیں البتہ ''خاتمہ'' کا مجھے افسوس ہے۔ مگر اس کی وجہ خاص ہے ایک تو وہ مذہبی نکتہ خیال سے لکھا گیا تھا۔ دوم اس پر تین چار مصنفین سے خیالات میں مددلی گئی تھی۔ مگر جو ہوگیا سو ہوگیا۔ اس کا کچھ خیال نہ فرمایئے۔

''میرے مضامین سے آپ اس امر کا اندازہ فرما سکتے ہیں کہ میں بہت محنت سے

---

[1] گذشتہ خط کا جو جواب سرور صاحب نے لکھا اسی کے جواب میں غالباً یہ خط ہے پچھلے خط میں سرور صاحب کے سکوت کی شکایت کی گئی تھی۔ سرور صاحب نے اس کی معذرت میں اپنی ناسازی طبع کا ذکر کیا ہوگا۔

انھیں تیار کرتا ہوں۔ جس طرح ایک نثری مضمون کے لیے بہت سی کتابوں اور مضمون کے خیالات سے امداد لی جاتی ہے۔ اسی طرح محنت سے یہ خاکے تیار کرتا ہوں۔''

اگر آپ ''خاتمہ'' کا خاکہ مجھے بھیج دیں تو میں اس کو دوسرے طرز پر لکھ کر آپ کو ارسال کردوں۔ کیونکہ اس مضمون سے مجھے بہت انس تھا۔ اور پیشتر بھی میں اس کے لیے آپ سے خاص طور پر عرض کرچکا تھا۔ ہاں! حسب وعدہ نظمیں جلد ارسال فرمائیں ''ہم نشین'' اور ''پرواز وقت'' کو پہلے لیجیے۔ ان میں سے ہم نشین[1] پر زیادہ توجہ دیں۔ اب ذرا جلدی جلدی تمام مضامین ختم کریں تاکہ اور مضامین ارسال کروں۔ کالی داس کی نظمیں بھی جلد ختم کرنے کی فکر کیجیے۔ ایک نظم کالی داس کی اور تیار ہے۔ یعنی اوس کی رت۔ وہ انشاء اللہ جلد ارسال خدمت کروں گا۔

آپ کچھ خیال نہ فرمایئے گا یہ کوئی ایسا افسوس نہیں جس کی تلافی نہ ہوسکے۔ امید کہ آپ بہ واپسی نظمیں ارسال فرمانے کی کوشش کریں۔ زیادہ نیاز

نیاز آگیں

خاکسار پیارے لال شاکر

از: الہ آباد

(۵)

کارڈ

مکرمی جناب سرور تسلیم!

کہیے طبیعت کا آج کل کیا حال ہے۔ امید کہ اب کسی قسم کی شکایت آپ کو نہ ہوگی۔ میں آپ کی عنایت کا منتظر ہوں۔ اس مرتبہ تو آپ نے بہت انتظار کھنچوایا۔ امید کہ جلد خبر لیجیے گا۔ روز مرہ اشتیاق سے ڈاکیہ کی راہ دیکھتا ہوں۔ مگر جب آپ کا کوئی خط نہیں آتا تو طبیعت اداس ہوجاتی ہے۔ عنایت فرماکر اب آپ مہر سکوت کو توڑیں۔ اور تاوقتیکہ کل مضامین ختم نہ ہولیں سلسلہ جاری رکھیں۔ آنے جانے کا سلسلہ دونوں طرف سے برابر جاری رہے۔ فرمایئے۔ آپ نے کوئی تازہ نظم کہی کہ نہیں؟ ''ہم

---

[1] اس کا اصل خاکہ جو نثر میں ہے۔ شاکر صاحب کے قلم کا لکھا ہوا۔ میرے پاس موجود ہے۔ ایڈیٹر ''زمانہ''۔

نشین'' اور ''پرواز وقت'' کا بیتابی سے انتظار کر رہا ہوں۔ زیادہ نیاز

منتظر عنایات
خاکسار پیارے لال شاکرؔ

(۶)

۱۴؍نومبر ۱۹۰۹ء

مکرمی جناب سرورؔ تسلیم!

عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ منی آرڈر ارسال خدمت ہے۔

کالی داس کی ایک نظم کا میں نے اور ترجمہ کیا ہے مگر اس نظم کا نصف سے زیادہ پودھوں کے ناموں سے بھرا ہوا تھا کہ جن کے اردو نام باوجود تلاش مجھے معلوم نہ ہوسکے۔ بدیں وجہ میں نے بالفعل اس حصے کو نظر انداز کردیا ہے۔ اور صرف ۱۹؍ اشعار کا ترجمہ کیا ہے۔ مگر میں کوشش کرتا رہوں گا کہ بقیہ اشعار کا بھی ترجمہ جلد ہوجائے۔ تاکہ نظم مکمل ہوسکے۔ بقیہ ترجمہ جب کبھی ہوجائے گا آپ کو ارسال کردوں گا۔ وہ علیحدہ ایک نظم شمار ہوجائے گی[1] اور میں دونوں کو ایک کرلوں گا۔

آپ عنایت فرماکر اب کی دفعہ اسی (شبنم باری[2]) پر طبع آزمائی کیجیے اور اس کے ساتھ (۱) رانڈ کا چرخہ (۲) ''امداد بیکساں'' کو لیں اور جس قدر جلد ممکن ہو انھیں میرے نام ارسال کردیجیے۔ شبنم باری۔ ملاکر آپ کے پاس ۱۳ مضامین ہوئے۔

شبنم باری کو تو مثنوی ہی کی صورت میں رہنے دیں اور دوسری نظم کو اگر ''رانڈ کا چرخہ'' ہو مسدس اور اگر ''امداد بیکساں'' ہو تو اسی قسم کے ترجیع بند جیسا کہ آپ نے ''یاران رفتہ'' (مندرجہ مخزن) کہا تھا کہیں مگر اس بات کی ایسی کوئی بڑی ضرورت نہیں ہے کہ آپ خواہ مخواہ اس کی قید کریں اگر کوئی اور مرغوب طرز ہو تو اسی میں سہی مگر ہاں بحر بدل دیجیے۔ آج ہم نشیں، گل بے خار، اور پرواز وقت کئی نظمیں ایک ہی بحر میں ہوچکی ہیں اب کوئی اور بحر سہی۔

رانڈ کا چرخہ میں نے صرف ''خاکہ'' ہی بھیجا تھا۔ آپ بلحاظ مضمون اس پر خود

---

[1] یہاں معاوضہ سے مراد ہے [2] اس کا مسودہ خط کے ساتھ شاکر صاحب نے روانہ کیا تھا اور یہ مسودہ میرے پاس موجود ہے، ایڈیٹر ''زمانہ''

اضافہ کرلیں[1] ہم نشین، والی نظم خوب رہی! موسم خریف میں مجھے امید ہے کہ آپ نے جابجا مناسب تبدیلیاں کردی ہوں گی۔ رباعیات بھی میں نے زمانہ کو بھیجی ہیں۔ جب آپ کے پاس بغرض اصلاح آئیں تو ذرا عنایت فرماکر زیادہ توجہ سے کام لیجئے گا۔[2] یہ گویا مجھ پر احسان ہوگا۔

''ہم نشین'' مخزن کو اور ''پرواز وقت' ادیب کو ارسال کی ہیں۔

نیرنگ[3] کی ایک نظم ''انسان کی فریاد'' مخزن میں چھپی تھی پہلا شعر ہے ۔

ہاں اے مصاف ہستی مت پوچھ مجھ سے کیا ہوں
ایک عرصۂ بلا ہوں اک لقمۂ فنا ہوں

میری خواہش ہے کہ اس پر ایک خمسہ ہوجائے۔ یہ نظم گویا میرے دلی خیالات کا آئینہ ہے، اگر آپ کے پاس اس کی نقل نہ ہو تو تحریر فرمایئے گا میں کسی وقت آپ کو بھیج دوں گا۔

خاتمہ بہت عمدہ رہا، اور تنویر الشرق[4] میں اس کو دیکھ کر طبیعت بے حد موثر ہوئی۔

مبلغات کی روانگی میں حسب معمول کسی قدر توقف ہوا۔ امید کہ معاف کیا جاؤں گا۔ جواب سے جلد اطلاع فرمایئے گا۔ میں دونوں نظموں کا جلد انتظار کروں گا۔ امید کہ اب آپ کی طبیعت رو بصحت ہوگی۔ کیا کبھی آپ کا الٰہ آباد آنے کا ارادہ نہیں ہے۔

والسلام
خاکسار شاکر

---

[1] اس خاکہ کی بنا پر سرور صاحب نے جو نظم لکھی تھی اس کا مسودہ اولین خود سرور صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا میرے پاس موجود ہے ۔ایڈیٹر

[2] ۱۹۰۹ء میں زمانہ کے حصہ نظم کے لیے نظموں کا انتخاب اکثر سرور صاحب کے مشورہ سے ہوتا تھا۔ ایڈیٹر ''زمانہ''۔

[3] میر نیرنگ بی اے۔ وکیل انبالہ

[4] تنویر الشرق ۱۹۰۰ء میں کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔

(۷)

پوسٹ کارڈ

۳/ جنوری ۱۹۱۵ء

مکرمی تسلیم!

کارڈ ملا مگر اس وجہ سے جواب نہیں دیا کہ آپ مفصلات میں تھے۔ میں افسوس کرتا ہوں کہ بوجوہات چند میں آپ کے ارشاد کی تعمیل نہیں کرسکا... آپ نے رباعیات و نظمیں ارسال نہ کیں۔ بہت انتظار ہے۔ امید کہ جلد شکر گزاری کا موقع عنایت فرمائیے گا۔ والسلام

(۸)

الٰہ آباد ۔ ۲۵/ جنوری ۱۹۱۰ء

جناب مکرمی حضرت سرور صاحب زاد لطفہ تسلیم!

کل آپ کا بیرنگ خط اور پوسٹ کارڈ ملا۔ تعمیل ارشاد میں ۵۰ عدد لفافے بذریعہ بیرنگ ڈاک ارسال خدمت ہیں۔ امید ہے کہ آپ ان کو پسند کریں گے ... میں اس وقت ایک مضمون ''میں نے کسے دیکھا'' آپ کو ارسال کرتا ہوں عنایت فرماکر دو تین دن کے اندر نظم کرکے مجھے بھیج دیں ... ایک بات کا خیال رہے کہ ہر ایک شعر باقافیہ و ردیف ہو۔ وزن میرے خیال میں وہ بہتر ہوگا۔ جو ''چلمن'' کا ہے یاجو آپ مناسب خیال کریں و جابجا حسب ضرورت آپ مضمون کا اضافہ کرسکتے ہیں۔ مگر یہ آپ مجھ پر احسان کریں گے۔ اگر بہت جلد اِس کو مجھے بھیج دیں گے۔

تم مجھ سے پوچھتے ہو میں نے کسے دیکھا

اور

سنبھالو۔ سنبھالو۔ نہیں تو میں گرا

یہ ہر حصہ کا پہلا اور آخری شعر ہوگا۔ لہٰذا اسے بہت چست کہیں تاکہ تکرار میں مزا آئے۔ پھر تاکید ہے کہ آج ہی اسے شروع کردیں۔ اور بہت جلد مجھے بھیج دیں۔ احسان ہوگا، ہر ایک شعر باقافیہ و ردیف ہو۔

والسلام

احقر پیارے لال شاکر (میرٹھی)

(۹)

(ایک پوسٹ کارڈ جس پر تاریخ درج نہیں ہے۔ لیکن ڈاک خانہ الہ آباد کی مہر روانگی ۲۸ رجنوری ۱۰ء کی لگی ہوئی ہے۔)

جناب مکرمی! کل شام آپ کا لفافہ پہنچا۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ آپ تکلیف میں ہیں۔ میں آپ کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں، میں آپ کی تعمیل ارشاد کے لیے ہر وقت تیار ہوں۔ صرف پاس ہونا شرط ہے ...''میں نے کسے دیکھا'' کا سخت انتظار ہے۔ اگر جلد ارسال فرما سکیں تو ممنون ہوں گا ...

خاکسار

پیارے لال شاکر ، الہ آباد

(۱۰)

میرے مہربان حضرت سرور زاد لطفہ

تسلیم!

مجھے افسوس ہے کہ میں ہنوز مبلغات ارسال نہ کر سکا۔ مگر اس کو میری غفلت پر محمول نہ فرمائیے۔ ... آپ میری طرف سے کسی قسم کا خیال اپنے دل میں نہ کیجیے۔ بلکہ اس کو مجبوری تصور فرمائیے۔ امید ہے کہ مزاج مبارک بخیریت ہوگا۔ مجھ کو کوئی سنبھالو کا شکریہ ادا کرتا ہوں عنایت فرما کر وہ مسودہ بھی ارسال کر دیجیے۔ اگر تلف کر دیا ہو تو خیر۔ رباعیات کے لیے چشم براہ ہوں۔

امید ہے کہ لفافے مل چکے ہوں گے۔ آپ نے خط میں ان کا کچھ ذکر نہیں کیا۔ اس دفعہ بیرنگ بھیجے گئے تھے امید ہے کہ تلف نہ ہوئے ہوں گے۔

مجھے بہت خوشی ہوگی اگر آپ الہ آباد آ کر قیام فرمائیں۔ اس وقت کوشش کی جائے گی کہ کوئی ٹیوشن آپ کو مل جائے میں آپ کی بہتری کو اپنی ذاتی بہتری سمجھ کر ہر قسم کی کوشش کرنے کو تیار ہوں۔ زمانہ نے ہیمنت کو شائع کیا۔ مگر نامعلوم چھ بند کیوں چھوڑ دیئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرے تحریری کاغذ کا ایک صفحہ گم ہوگیا، میں نے ہر صفحہ پر چھ بند لکھے تھے اور ایک ہی صفحہ کے چھ بند شائع نہیں ہوئے۔ میں نے منشی دیانرائن صاحب کو خط لکھ کر استفسار کیا ہے۔ زیادہ نیاز

سرور اور شاکر

فروری کے زمانہ میں ''سرور اور شاکر'' کے عنوان سے جو بحث درج ہے اس میں آپ نے فرط محبت سے میرا ذکر بھی کردیا ہے حالانکہ مجھے اس سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔لیکن چونکہ یہ واقعات اس زمانہ کے ہیں جبکہ میں الہ آباد میں موجود تھا اور ادیب کو نکال رہا تھا لہٰذا جن واقعات کا آپ نے تحریری ثبوت دے کے لٹریری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے وہ میرے چشم دید واقعات ہیں سرور مرحوم اور مسٹر شاکر کے شاعرانہ تعلقات کا علم مجھے اسی زمانہ میں ہوا تھا جب مرحوم الہ آباد آئے تھے اور مسٹر شاکر کے یہاں مقیم ہوئے تھے۔ اس زمانہ میں وہ دونوں وقت روز مرّہ میرے پاس تشریف لاتے تھے۔ کالی داس کی نظموں کا سنسکرت سے ترجمہ مسٹر شاکر نے اپنے پنڈت صاحب کی مدد سے نثر میں بطور خاکہ کیا تھا اور سرور اسے نظم کرتے تھے۔ شاعر کا یہ طبعی خاصہ ہے کہ وہ جو کچھ نظم کرتا ہے خواہ وہ کسی دوسرے ہی کے لیے کیوں نہ ہو لیکن اسے اپنے ہمراز دوستوں کو ضرور سنا دیتا ہے۔ سرور بھی مجھے ان نظموں کے اشعار روز مرّہ سنایا کرتے تھے۔ مجھ سے یہ راز پوشیدہ نہ تھا کہ مسٹر شاکر کی نظمیں دراصل سرور مبرور کے زور طبع کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ میں اس راز کو زبان تک نہ لاتا اگر آپ نے اسے فاش نہ کردیا ہوتا لیکن چونکہ اب وہ عالم آشکارا ہوگیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے دوسروں کو عبرت ہوگی۔ لہٰذا اس سلسلے میں بعض واقعات کا اضافہ نامناسب نہ ہوگا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ مجھے شاکر سے آپ ہی کے یہاں شرف نیاز حاصل ہوا تھا جب وہ بنون سے تشریف لاکر زمانہ کے انتقامی امور سر انجام دیتے تھے اس زمانے میں مسٹر شاکر کی جو نظمیں زمانہ میں شائع ہوئی ہیں وہ محض ابتدائی مشق کا نتیجہ معلوم ہوتی تھیں۔ اس کے دو ہی سال کے بعد جب میں نے

ادیب نکالا تو مسٹر شاکر حسن اتفاق سے الٰہ آباد میں موجود تھے۔ اور ان کی موجودگی کی اطلاع مجھ کو مسٹر پریم چند کے ایک پرائیویٹ خط سے ہوئی تھی۔ جس پر میں نے دوسرے اہل قلم کی طرح ان سے بھی ادیب کے لیے مضامین مانگے۔ اس کے جواب میں مسٹر شاکر خود تشریف لائے اور نہایت کشادہ دلی سے اپنے کئی مضامین اور نظمیں عنایت فرمائیں ان نظموں کو دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی جن سے ان کا پیشتر کا کلام کوئی مناسبت نہ رکھتا تھا۔ بہرحال اس وقت سے مسٹر موصوف مجھے قریب قریب روز مرّہ سرفراز فرمانے لگے۔ میں ان کے اس خلوص و اتحاد کا ہمیشہ ممنون ہوں گا۔ خصوصاً اس بے تکلفی کا جس کی بدولت میں ان سے ادیب کے متعلق کوئی بات پوشیدہ نہ رکھتا تھا تھوڑے عرصہ کے بعد حضرت سرور نے لکھا کہ میں الٰہ آباد آنے والا ہوں اور بالآخر وہ اپریل ۱۹۱۰ء کے ابتدائی زمانہ میں تشریف لائے سرور مرحوم سے بھی مجھے آپ ہی کے یہاں نیاز حاصل ہوا تھا اور وہ دلی محبت جو مرحوم کو مجھ سے ہوگئی تھی۔ آپ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ سرور کے زمانہ قیام میں میری خواہش تھی کہ ادیب میں ان کا کلام زیادہ نکلے۔ لیکن وہ بہت مشکل سے ہر ماہ ایک نظم دے سکے جب میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ شاکر صاحب کے کاموں سے انھیں بالکل فرصت نہیں ملتی اور اگرچہ ادیب کی طرف سے مرحوم کو نظموں کا معاوضہ بالکل قلیل نہیں دیا جاتا تھا۔ تاہم شاکر صاحب کی مروت انھیں دوسرے کاموں سے باز رکھتی تھی۔ انتہا یہ کہ جب شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کے انتقال کی خبر آئی (غالباً ۷ رمئی کو) تو میں نے اسی روز سرور صاحب سے ایک نظم کی فرمائش کی اور انھوں نے حتمی وعدہ کیا۔ دوسرے روز نظم کے چند ابتدائی بند بھی سنائے۔ تیسرے روز آ کر اور بند سنائے اور کہا کہ کل یہ نظم ختم ہوجائے گی لیکن تقریباً پندرہ روز تک ان کا وعدہ پورا نہ ہوا۔ چونکہ رسالے کی اشاعت کا زمانہ قریب آ گیا تھا لہٰذا ایک روز میں نے ان سے سخت تقاضا کیا۔ اس سختی کے لیے خدا مجھے معاف کرے کیونکہ مرحوم نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور چپ ہوگئے۔ میں نے خاموشی کا سبب پوچھا تو انھوں نے آبدیدہ ہوکر کہا کہ ''وہ نظم مسٹر شاکر نے اپنے نام سے زمانہ کو بھیج دی۔ نظیر صاحب میں آپ سے سخت شرمندہ ہوں لیکن اس کی تلافی ضرور کروں گا اور جلد ہی ایک اور نظم کہہ کے ادیب کی ضرورت پوری کردوں گا۔ میرے خیال میں یہ

سہل کام نہیں ہے کہ ایک ہی سبجیکٹ پر دوبارہ طبع آزمائی کی جائے اور وہ بھی نہایت قلیل عرصے میں۔ بہرحال سرور مرحوم نے تیسرے روز وہ نظم آکر سنائی جو مئی کے ادیب میں شائع ہوئی۔ سرور صاحب اپریل سے جون تک تقریباً تین ماہ الہ آباد میں رہے تھے اور اس عرصے میں انھوں نے نہ صرف کالی داس کی نظموں کا ترجمہ کیا بلکہ وہ تمام نظمیں جو بعد کو مسٹر شاکر کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ تقریباً اسی زمانہ کی کہی ہوئی تھیں۔ ''رانڈ کا چرخہ'' جس کا ذکر خطوط میں کیا گیا ہے ادیب ہی میں شائع ہوئی تھی۔ ان کے علاوہ تقریباً ایک سو یا اس سے زائد رباعیاں بھی سرور صاحب نے اسی زمانہ میں کہی تھیں جنھیں میں نے پہلے سرور صاحب اور بعد کو شاکر صاحب کی زبان سے مسودے کی حالت میں سنا تھا اور جو بعد کو رباعیات شاکر کے عنوان سے عرصے تک شائع ہوتی رہیں۔ اس وقت تک میں یہ سمجھتا تھا کہ شاکر صاحب نے سرور سے تلمذ اختیار کیا ہے جیسا کہ ایک ادھ موقع پر خود انھوں نے بھی فرمایا تھا اور سرور صاحب ان کے کلام کو محنت اور توجہ سے درست کردیے ہیں اور کبھی کبھی کوئی نظم خود کہہ کر انھیں دے دیتے ہیں۔ لیکن ایک موقع پر مجھے تجربہ ہوا شاکر صاحب فن نظم سے بالکل بہرہ نہیں رکھتے۔ آپ کو خیال ہوگا کہ ادیب میں ''جنگل کی برسات'' کے عنوان سے ایک نظم شائع ہوئی تھی۔ اس نظم کو اس تصویر سے مطابق کرنے کے لیے جو رام چندر جی کے زمانہ قیام چتر کوٹ کے متعلق اسی نمبر میں شائع ہوئی تھی۔ میں نے شاکر صاحب سے کہا کہ اس کے آخر میں دو تین بند کا اضافہ کرکے نظم کو تصویر سے مطابق کردیجیے۔ شاکر صاحب نے عدیم الفرصتی کا عذر کیا لیکن زیادہ اصرار پر نظم کو لے گئے پانچ روز کے بعد مع اضافہ واپس لائے۔ میں نے اضافہ شدہ بندوں کو پڑھا تو وہ اس بحر سے بھی تعلق نہ رکھتے تھے جس میں اصل نظم موزوں کی گئی تھی۔ آخر شاکر صاحب نے فرمایا کہ آپ خود ہی اضافہ کردیجیے اور ایسا ہی ہوا۔ چنانچہ اس نظم کے دو آخری بند جن میں رام و سیتا جی کا ذکر ہے میں نے نظم کردیے تھے۔ میں نہیں جانتا کہ اس وقت سے اب تک مسٹر شاکر نے اس فن میں کتنی ترقی کی ہے ممکن ہے کہ اب وہ نظم کرنے لگے ہوں۔ کیونکہ ان کی ذہانت اور شوق میں شک کی گنجائش نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ بغیر کسی دوسرے شخص کی مدد کے وہ اب بھی اپنے خیالات کو اسی دل کشی

سے نظم نہیں کر سکتے جس کے لیے پچھلے تین چار سال میں انھوں نے غیر معمولی شہرت حاصل کی ہے۔

نوبت رائے نظر

ایڈیٹر اودھ اخبار لکھنؤ

بندہ نواز آب و نیاز

سرور اور شاکر کے عنوان سے جو مضمون ماہ فروری کے رسالہ زمانہ میں شائع ہوا ہے، وہ واقعی یادگار زمانہ رہے گا۔ ہمیشہ اس کے لیے نہ صرف آپ کا ہی ممنون ہونا چاہیے بلکہ مولانا ابو الرشاد صاحب کا بھی جن کا زور قلم انکشاف حقیقت کا باعث ہوا ہے نہ وہ آپ پر معاصرانہ چشمک زنی کا اتہام دھرتے اور نہ یہ خطوط پردۂ خفا سے باہر آتے۔ میرے خیال میں اس راز سربستہ کے منکشف ہوجانے سے دو فائدہ ظہور میں آئے ہیں ۔ اول تو یہ کہ ''حق بحق دار رسید'' یعنی خواہ اکسیر سخن کی داد طلب نظموں کو کسی شخص کے نام سے کیوں نہ منسوب کیا جائے لیکن آج اس پر بخوبی روشنی پڑ گئی ہے کہ پس پردہ کون ہے اور دراصل یہ کس کی دماغ سوزی اور جگر کاوی کا نتیجہ ہیں اور اس کے لیے مستحق داد کون ہے۔

دویم یہ کہ ابتدائے زمانہ کی جوہر ناشناسی اور ناقدردانی کے باعث حضرت سرور جیسے سراپا کمال اور نازک خیال شاعر کے انمول جواہرات کوڑیوں کے مول نذر کردینے پر مجبور ہونا پڑا اور یہ کس قدر قابل افسوس امر ہے۔

یوں پھریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

بسا اوقات میں اس حیرت انگیز دلی الفت سے جو سرور اور شاکر کے کلام میں پائی جاتی ہے حیران رہ جایا کرتا تھا مگر آج معلوم ہوا کہ اکسیر گر در اصل کون ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس حقیقت کے انکشاف سے آپ نے سرور مبرور کی روح کو بھی ثواب پہنچایا ہے۔ زیادہ حد ادب۔

خیر طلب

برقؔ دہلوی

'زمانہ' جنوری ۱۹۱۵ء

پریم چند کے ادبی کارناموں پر تحقیقی کام کرنے والوں میں
مدن گوپال کی اہمیت مسلم ہے پریم چند کے خطوط کے حوالے سے
بھی انھیں اولیت حاصل ہے۔ ان کی پہلی کتاب انگریزی میں بہ
عنوان "پریم چند" 1944 میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اسی کتاب کی
وجہ سے غیر ممالک میں بھی پریم چند کے بارے میں دلچسپی پیدا
ہوئی۔ "ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ لندن" نے لکھا ہے کہ مدن گوپال وہ
شخصیت ہے جس نے مغربی دنیا کو پریم چند سے روشناس کرایا۔
اردو، ہندی ادیبوں کو غیر اردو ہندی حلقے سے متعارف کرانے میں
مدن گوپال نے تقریباً نصف صدی صرف کی ہے۔

مدن گوپال کی پیدائش اگست 1919 میں (ہانسی) ہریانہ میں ہوئی۔
1938 میں سینٹ اسٹیفن کالج سے گریجویشن کیا۔ انھوں نے تمام
زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزاری۔ انگریزی، اردو اور ہندی
میں تقریباً 60 کتابوں کے مصنف ہیں۔ پریم چند پر اکسپرٹ کی
حیثیت سے مشہور ہیں۔ ویسے پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کے
ماہر ہیں۔ مختلف اخبارات، سول ملیٹری گزٹ لاہور، اسٹیٹس مین
اور جن ستہ میں بھی کام کیا۔ بعدازاں حکومتِ ہند کے پبلکیشن
ڈویژن کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے 1977 میں ریٹائر ہوئے اس
کے علاوہ دینک ٹریبون چنڈی گڈھ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے
1982 میں سبکدوش ہوئے۔